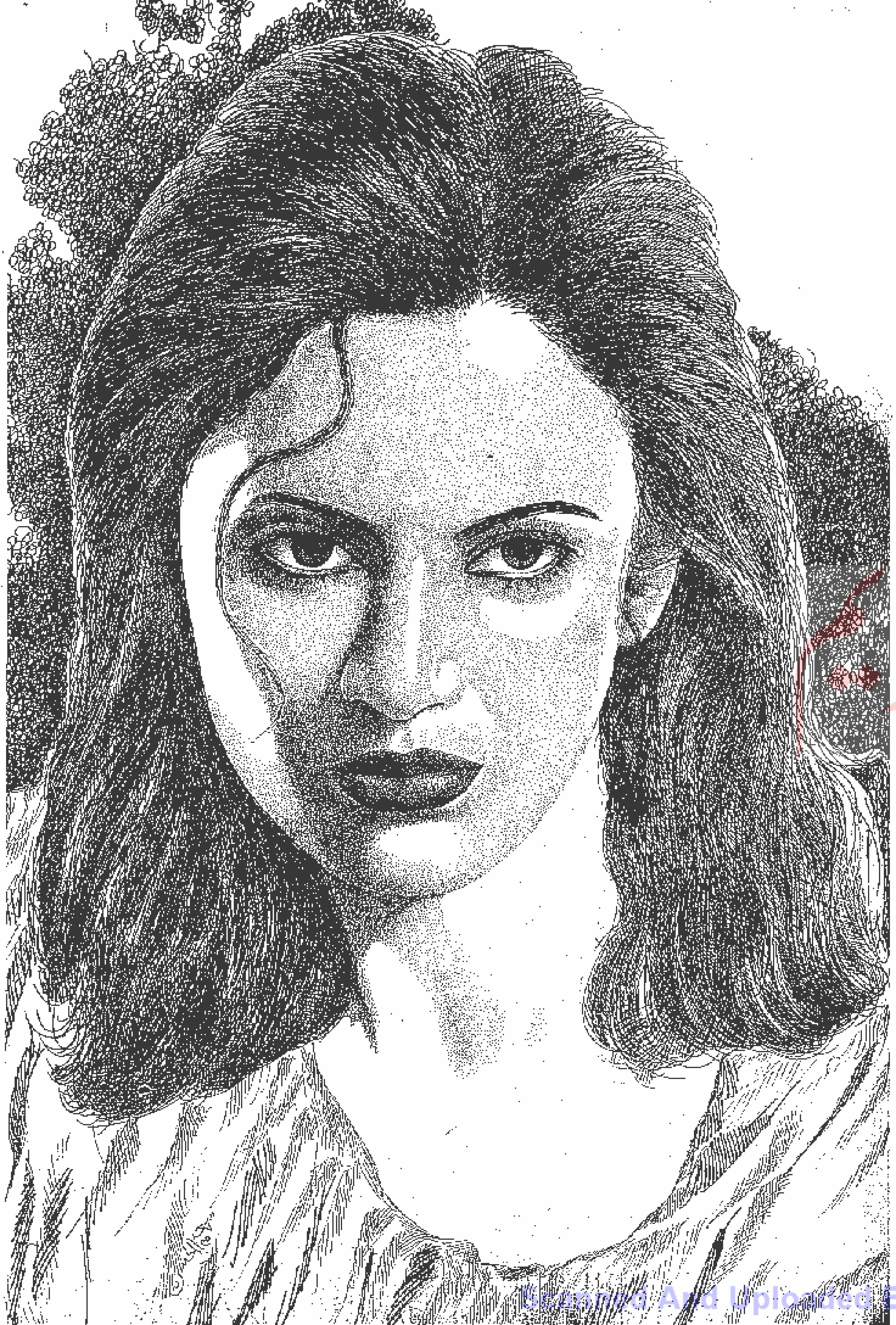


شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

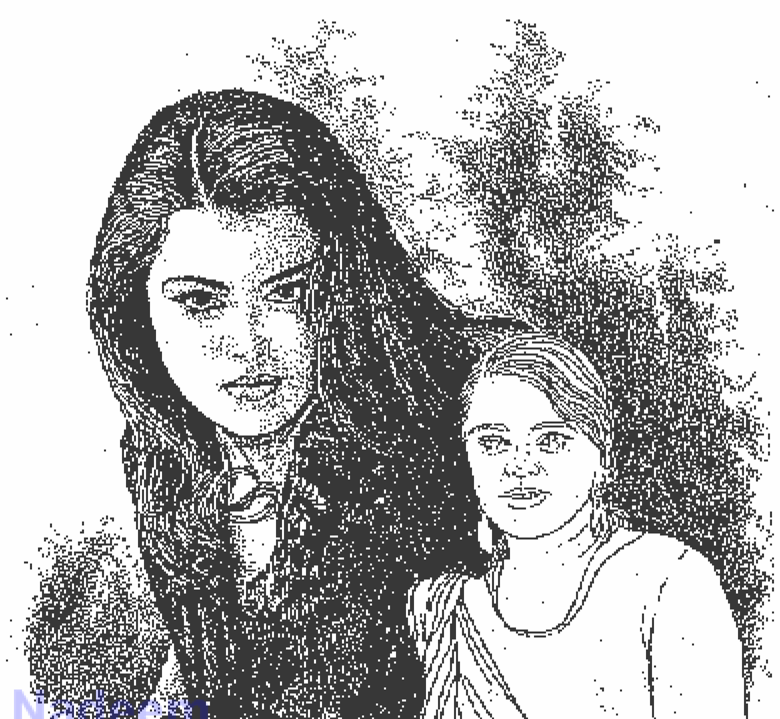
شیریں حیدر

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہئیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں- بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آ جاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے- غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے

قسط 1



سوتے میں اسے عجیب سا احساس ہوا، اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتی اس کے اندر پلنے والے وجود نے بھرپور حرکت کی۔ اس نے بھی اپنی ماں کے وجود پر سرسراتے والے ہاتھ کو محسوس کر لیا تھا، ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی۔

''جہانگیر لوٹ آئے شاید...... جہانگیر تو کہہ گئے تھے کہ وہ بابو جی کے ساتھ رات کو کھیتوں میں ہی رکیں گے پھر وہ لوٹ کر کیسے آسکتے ہیں، کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو جہانگیر کو آکر مجھے جگا لینا چاہیے تھا۔'' وہ الجھن میں مبتلا ہوگئی۔ کچھ سوچ کر مڑنے لگی مگر اُن ہاتھوں نے اسے مضبوطی سے اس کی اسی پوزیشن میں تھام لیا۔

''اتنے سخت اور کھردرے ہاتھ جہانگیر کے تو نہیں ہوسکتے...... تو پھر......'' وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس کا پورا بدن سن ہوگیا پھر بھی اس نے اپنے اندازے کو جانچنے کے لیے آواز دی۔ ''جہانگیر!''

''کیوں، کیا پوری دنیا میں ایک جہانگیر ہی مرد ہے؟'' کسی نے بھرپور خباثت بھرے لہجے میں کہا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کون ہوگا، وہ جھٹکا لے کر ہٹی اور اٹھ کر بیٹھ گئی...... کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ لالٹین کی لو وہ سوتے وقت مدھم کر دیتی تھی مگر ایسا بھی نہ تھا کہ وہ شجاع کو بھی نہ پہچان سکتی۔ پہچان تو اس نے اس کی آواز سے ہی لیا تھا۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے اور اپنے بھائی کے بستر پر بیٹھنے کی؟'' اسے اپنے بستر پر دیکھ کر اس نے اسے خود سے دور دھکیلا اور اس کو بھائی کو یاد کروا کر غیرت دلانے کی کوشش کی۔

''دروازے کھلے ہوں، نظارے دعوت دینے والے ہوں تو کون کافر ان سے منہ موڑ سکتا ہے!'' اس نے اسی خباثت اور ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

''ہوش میں تو ہو تم...... کیا نشہ کر رکھا ہے تم نے، جو تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ تم کیا بات کر رہے ہو اور کس کے ساتھ!'' اسے شجاع کی سب خراب عادتوں کا علم تھا، اس لیے وہ یہی سمجھی کہ وہ نشے میں ہے۔

''ابھی تو میں نے کوئی بات کی ہی نہیں، ابھی تو آیا ہوں! ساری رات پڑی ہے باتیں کرنے کے لیے۔'' وہ مکروہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ''باتیں کریں گے...... اور بھی بہت کچھ کریں گے تم تعاون کرو تو!''

تڑاخ...... کی آواز آئی اور اس کے نازک ہاتھوں کا بھرپور تھپڑ شجاع کے منہ پر پڑا تھا، وہ بستر سے اتر کر کھڑی ہوگئی تھی، اسے تھپڑ یہی سوچ کر مارا تھا کہ وہ نشے میں تھا، تھپڑ کھا کر شاید اس کا نشہ ہرن ہو جاتا۔ وہ اپنے گال کو مسل رہا تھا، بھلا ان نازک ہاتھوں کے تھپڑ سے اس کا کیا بگڑنا تھا۔

''اٹھو اور اس کمرے سے دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ میں چیخ چیخ کر سب کو یہاں اکٹھا کر لوں۔'' وہ دہاڑی تھی مگر اندر سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ ''تمہاری اس حرکت پر تمہیں وہ سبق سکھاؤں گی کہ عمر بھر یاد رکھو گے!''

''تم سبق سکھاؤ گی مجھے؟ ہونہہ...... کون یقین کرے گا تمہاری بات کا، کیا بتاؤ گی سب کو؟ کیا، کیا ہے میں نے، کچھ بھی تو نہیں ہوا...... اور اگر چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کرو گی تو میں بھی تو ان سے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مجھے خود اپنے کمرے میں بلایا تھا...... کوئی تمہاری بات کا یقین کرے گا، کوئی میری بات کا...... کوئی مجھے جھوٹا کہے گا

کوئی تمہیں۔" اس نے شیطانی انداز میں قہقہہ لگایا۔

"دفع ہو جاؤ تم، کہہ رہی ہوں میں تم سے!" وہ اپنے اندر کے خوف کو دبا کر چیخی۔

"جاتا ہوں، جاتا ہوں...... سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے تم نے میرا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اور سنو!" اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر اس سے کہا۔ "ایک لفظ بھی کسی سے کہا تم نے تو دیکھنا میں کیا کروں گا!"

"کیا کرلو گے تم؟" وہ غصے سے بولی۔

"سب کچھ ملیا میٹ کردوں گا...... سب سے پہلے تو تمہارا یہ گھڑے جیسا پیٹ پھاڑ دوں گا خنجر گھونپ کر، جس میں تم اپنی دانست میں اس خاندان کا وارث لیے پھر رہی ہو...... کچھ بھی نہیں چھوڑوں گا، کچھ بھی نہیں بچے گا...... کوئی شک ہے تو کسی سے بات کر کے دیکھ لو۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر بھی سکتا ہے، وہ سہم گئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں کہ میں انتقام میں کس حد تک جا سکتا ہوں۔" اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "میں تمہارے ساتھ ایسا کروں گا کہ تم یہ خوب صورت چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل بھی نہیں رہو گی!"

وہ خاموش رہی، اس وقت جہانگیر گھر پر تھا نہ اس کے سسر، اس وقت خاموشی ہی بہترین حکمتِ عملی تھی، اس جابر شخص سے کچھ بعید نہ تھی۔ جہانگیر تو اسے جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں بتاتے تھے کہ اس میں انہی کی بے عزتی تھی مگر شجاع کی بدتمیزیوں کی داستانیں گاؤں میں عام تھیں اور اس نے بھی انہیں سن رکھا تھا۔ اس وقت تو اسے اس مصیبت کو ٹالنا تھا، اسے خاموش دیکھ کر وہ گھورتا ہوا کمرے سے باہر کی طرف چل دیا...... وہ اس کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف چل دی...... دروازے کے پاس پہنچ کر وہ مڑا، بیہودگی سے اسے دیکھ کر آنکھ ماری، وہ وہیں رک گئی۔

"کیا بات ہے، رک کیوں گئی ہو، میرے پیچھے پیچھے کیوں آرہی تھیں، کچھ کہنا ہے مجھ سے؟" وہ پھر خاموش رہی۔ اس کے نکلتے ہی بھاگ کر اس نے دروازہ بند کیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ آنسو اس کا گریبان بھگونے لگے...... اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔

"کچھ ہو جاتا تو؟ اللہ نے بچا لیا، جانے کس نیکی کے عوض......" اس نے دروازے کی کنڈی لگائی، یہ وہ دروازہ تھا جو اس سے قبل کبھی بند نہیں ہوا تھا، اس طرف سوائے اس کے اور جہانگیر کے آتا ہی کون تھا...... گھر کا یہ حصہ اس کی شادی کے بعد سے اس کے اور جہانگیر کے لیے مخصوص تھا، اس طرف بے مقصد کوئی نہیں آتا تھا اور مقصد بھی صرف گھر کی خاص ملازماؤں کا ہوتا تھا، اس حصے کی صفائی ستھرائی کے لیے۔ بابو جی اور بے جی تو کبھی اس طرف نہیں آتے تھے، نہ ہی شجاع اور شیر علی کا اس طرف کوئی کام ہوتا تھا۔

وہ ہولے ہولے قدموں سے چلتے ہوئے آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئی، اس کے اندر کا وجود بھی بے چین سا تھا...... اس نے گہری گہری سانسیں لیں اور اپنے کھوئے ہوئے حواس بحال کیے۔

"کیوں کیا تھا اس نے ایسا...... نشے میں تو نہیں تھا وہ؟" اتنا تو اس کو اندازہ ہو گیا تھا۔ شجاع کی حرکتیں باہر جیسی بھی تھیں، اس سے قبل اس کو بھی غرض رہی تھی نہ اس کو کوئی فرق پڑتا تھا...... مگر جب بھڑکتی ہوئی

آگ آپ کا دامن جلانے لگے تو آپ کیونکر لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ وہ بدبختی سے اس کے کمرے میں آیا تھا......

یہ تو اس کے رب کا شکر تھا کہ اس نے اس کو محفوظ رکھا تھا، اس کے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی......

''مجھے ابھی اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' یہ سوچ کر وہ وضو کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، نیند تو یوں بھی نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

اس وقت وہ اپنے ڈیرے پر تھا، یہ ڈیرا گاؤں سے قدرے باہر تھا اور گاؤں کو جانے والے راستے سے دور سے نظر بھی نہیں آتا تھا۔ گاؤں کو جانے والا کچا راستہ چوڑا تھا اور اس کے دونوں اطراف گھنے اور سایہ دار درختوں کی قطاریں تھیں۔ اس کا ڈیرا چار کمروں پر مشتمل تھا، جس میں سے ایک بیٹھک تھی، ایک کھانے کا کمرا اور اور ایک سونے کا...... جبکہ چوتھا کمرا بظاہر تو اسٹور ہی کہلاتا تھا مگر اس کے اندر کے بھیدوں کا کسی کسی کو ہی علم تھا۔

اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل نہ ہونے پر وہ زخمی درندے کی طرح بے چین تھا...... وہ تو اپنے اس بھائی کی عزت خاک میں ملا دینا چاہتا تھا جس نے اس کی دانست میں اس کے ڈیرے پر آکر اس کی بے عزتی کی تھی۔ کیسے بھول سکتا تھا وہ دن...... اس دن کا خیال آتے ہی وہ غصے سے بپھرا ہوا سانڈ بن گیا تھا۔ وہ دن اس کی آنکھوں کے آگے کسی تصویر کی طرح تھا...... وہ اپنے خاص کمرے میں تھا۔

''چھوٹے سرکار...... بڑے سرکار اس طرف آرہے ہیں، ابھی ابھی کامو آیا ہے بھاگتا ہوا، اس نے بتایا ہے کہ کھیتوں کا چکر لگا کر ان کا ارادہ اسی طرف آنے کا ہے!'' فیضی نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا تھا۔ کامو جہانگیر لالہ کا خاص آدمی تھا مگر ایسے مواقع پر وہ شجاع کے لیے مخبری کر دیتا تھا، تھوڑے سے انعام کے لالچ میں۔

''کیوں آرہے ہیں وہ؟'' کمرے کے اندر سے ہی غصے سے اس نے چلا کر پوچھا تھا۔

''یہ تو علم نہیں سرکار مگر ذرا جلدی!'' فیضی نے التجائیہ لہجے میں کہا تھا۔

''میں کیا جلدی کروں، تم اندر آؤ اور نکالو ان کو کسی پچھلے راستے سے اور میں دیکھتا ہوں لالہ جی کو!'' اس نے اسی طرح غصے اور جھنجھلاہٹ میں فیضی سے کہا تھا۔ ''اور یہ کامو کہاں ہے؟''

''وہ تو چلا گیا ہے سرکار، ورنہ بڑے سرکار کو خبر ہو جاتی کہ وہ کہیں غائب ہوا ہے۔'' فیضی نے کمرے میں داخل ہو کر کمرے کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی اور سر جھکا لیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، بعد میں اسے کچھ دے دلا دینا، اچھا لڑکا ہے، اکثر ہماری مدد کرتا رہتا ہے۔'' اس نے سخاوت کا مظاہرہ کیا۔

''جو حکم سرکار۔'' کہہ کر فیضی نے شجاع کے کمرے میں موجود ان لڑکیوں کو بکریوں کی طرح ہانکا جو اس وقت چھوٹے سرکار کی ''سیوا'' میں مصروف تھیں۔ شجاع اپنی ضرورت کے لیے اس بات میں تمیز نہیں کرتا تھا کہ اس کی سیوا کے لیے آنے والی کیسی تھیں، اس کا طلب پوری کرنا مقصد تھا...... نہ ہی نشے کے لیے پابندی تھی کہ شراب دیسی ہو یا ولایتی، اس کے ڈیرے پر ہر طرح کا مال چلتا تھا۔ جہانگیر کے آنے سے نہ صرف اس کے

نشے کا مزہ کرکرا ہوا تھا بلکہ ان لڑکیوں پر صرف کی گئی رقم بھی ڈوب گئی تھی۔

جہانگیر کے پہنچنے سے پہلے پہلے فیضی نے لڑکیاں غائب کر دی تھیں اور شراب کی بوتلیں بھی...... شجاع نے اپنے ملازموں سے کہا تھا کہ فوراً سب کچھ کہیں چھپا دیں اور اپنے ساتھ شغل میں مصروف چیلوں اور چمچوں سے کہا تھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھ جائیں، فوراً شطرنج کی بازی سجالی گئی اور ایک گروہ تاش لے کر بیٹھ گیا...... تھوڑی دیر میں ہی جہانگیر پہنچ گیا، شجاع نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کی، بھائی کا استقبال کرنے کو کھڑا ہوا تو ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔

''آئیں، آئیں لالہ جی! بڑے دن کے بعد نظر آئے ہیں آج آپ؟'' اس نے آگے بڑھ کر بھائی سے ہاتھ ملایا۔ ''کہیے کیسے رونق بخشی ہمارے ٹھکانے کو، کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیتے لالہ جی! آپ نے کیوں زحمت کی؟''

''بس یونہی یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تمہیں دیکھتا ہوا چلوں!'' جہانگیر نے کہا۔ ''کیا شغل میلہ ہو رہا ہے؟'' جہانگیر نے اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔ شجاع کو لگا کہ جہانگیر کو شک ہو گیا تھا۔

''کچھ نہیں لالہ جی! بس یونہی یار دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی چل رہی تھی۔'' شجاع نے مختصراً کہا۔ جہانگیر نے ایک ناگوار سی نظر اس کے ان فضول حلیے والے دوستوں پر ڈالی.... جہانگیر کو ان سب کے بارے میں علم تھا کہ وہ کتنے کتنے پانی میں تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک آوارہ، بگڑا ہوا اور بدکردار۔

''شجاع میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری صحبت اچھی ہے نہ تمہاری سرگرمیاں۔'' جہانگیر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ابھی تک تو لوگ تمہاری شکایتیں مجھ تک پہنچاتے ہیں، جس دن بابو جی تک کوئی بات پہنچی تمہیں علم ہے کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا!'' ان سب کو دیکھ کر کوشش کے باوجود بھی جہانگیر اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکا اور اس بات پر شجاع کو اپنی بے عزتی محسوس ہونا قدرتی امر تھا۔

''کیا بابو جی نے آپ سے کہا ہے کہ آپ مجھے یہ دھمکی دیں؟'' گستاخ لہجے میں شجاع نے پوچھا، بھائی نے دوستوں کا لحاظ نہیں کیا تو وہ بھی حدِ ادب بھول گیا۔

''میں نے ایسا کب کہا ہے؟'' لہجے میں دانستہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کر کے جہانگیر نے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب تو اس کا وہی ہے جو کچھ آپ نے ابھی ابھی کہا ہے۔'' شجاع نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ویسے تو تم ان کہی باتوں سے بھی مطلب نکال لیتے ہو لیکن اپنے اچھے برے کی پہچان نہیں ہے تمہیں، کئی بار کہا ہے کہ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے...... جن لوگوں کے ساتھ تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہے ان کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے اور بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے تمہیں اچھے برے سے آگاہ کرنا میرا کام ہے!'' جہانگیر نے ناراضی سے کہا۔

''لالہ آپ میری اور میرے دوستوں کی توہین کر رہے ہیں!'' شجاع نے غصے سے کہا تھا۔ ''کیا برائی ہے اگر میں اپنے ان دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کر لیتا ہوں، کھیل لیتا ہوں یا شو کے کو بلا کر ہم گانا شانا سن لیتے ہیں؟''

''میری معلومات کے ذرائع اتنے ناقص نہیں ہیں شجاع! میں جانتا ہوں تم لوگ مل کر کون کون سے کھیل کرتے ہو...... چند دن پہلے مجھے خبر ملی تھی کہ تمہارے ڈیرے پر ساتھ والے گاؤں کی لڑکیاں تھیں، اب جانے تم انہیں زبردستی اٹھا کر لائے تھے یا...'' جہانگیر نے کہا تو شجاع کا خون کھول اٹھا۔ دل ہی دل میں وہ حیران ہوا کہ جانے کون کم بخت اس کی مخبری کر رہا تھا، اس طرح کی بات بابو جی تک پہنچتی تو واقعی وہ اسے گھر سے بھی نکال سکتے تھے...... پہلے ہی وہ ہمیشہ اسے اس کی کاہلی اور بے پروائی پر سخت سست کہتے تھے اور اس سے نالاں رہتے تھے۔

''وہ ضرورت مند تھیں لالہ جی، میری بات کا یقین کریں۔ ہمارے پاس مدد کے لیے آئی تھیں، ان کی ضرورت پوری کر دی تو وہ چلی گئی تھیں! آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں۔'' شجاع جن لوگوں کو گواہی کے لیے پیش کر رہا تھا، وہ وہی تھے جن سے ابھی جہانگیر نے اس کو دور رہنے کے لیے کہا تھا۔

''عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے شجاع...... اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ خون کی گرمی کو دور کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔'' جہانگیر نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''یار دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے سے میں تمہیں منع نہیں کرتا مگر برائی سے دور رہو، بے شک کھیل کھیلو، شکار وغیرہ کرو۔''

''جی لالہ جی!'' شجاع نے سعادت مندی سے کہا، وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس سعادت مندی کا مطلب کیا تھا۔

''اور ہاں! شکار بھی چھوٹے اور معصوم جانوروں کا نہ کرنا۔'' جہانگیر نے تاکید کی۔ ''نہ ہی شکار کے دوران سرحد پار کرنا، آج کل بہت سختی ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں لالہ جی، شکار کے بارے میں مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔'' کہہ کر وہ بے شرمی سے ہنسا، اس کے چیلوں نے اس ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔

''چلتا ہوں!'' جہانگیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے بیٹھیں نا لالہ جی...... آتے ہی باتوں میں ایسے مصروف ہو گئے کہ لسی پانی کا خیال ہی نہیں آیا!'' شجاع نے بظاہر شرمندگی سے کہا۔

''لسی پانی ادھار رہا، گھر پر اماں اس وقت ہم سب لوگوں کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں، تم بھی کوشش کیا کرو کہ شام سے پہلے گھر لوٹ آیا کرو۔'' کہہ کر وہ باہر کی طرف چلا، شجاع نے بلند آواز سے ملازموں کو آواز دے کر لالہ جی کا گھوڑا تیار کرنے کو کہا۔

جہانگیر نے شجاع سے ہاتھ ملایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا، شجاع دل میں اپنے دوستوں سے شرمندہ ہوا جن سے ہاتھ ملانا تو کجا لالہ جی نے منہ سے بھی سلام کرنا یا ان کے سلام کا جواب دینا گوارا نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

''یہ لالہ جی کوئی زیادہ ہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے نہیں پڑ گئے، ان کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔'' جہانگیر کو باہر تک جا کر رخصت کر کے جب شجاع واپس لوٹا تو غصے سے اس کے خون میں ابال آ رہے تھے۔

''بڑے بھائی ہیں تمہارے۔'' اصغر نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا حالانکہ دل میں وہ اس

بات پر خوش ہوا تھا کہ شجاع اور جہانگیر کی آپس میں کھٹ پٹ ہو...... ابھی کیسے وہ ان سب کی بے عزتی کر گیا تھا اور ان کی تاب نہ تھی کہ اس کے سامنے ایک لفظ بھی بولتے۔

''بڑے بھائی...... ہونہہ!'' اس نے زمین پر تھوکا۔ ''یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ بڑے ہیں اور اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ڈیرے پر کون آیا تھا اور کیوں آیا تھا، ہر وقت اسی بات کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ خود تو گھر پر مال ہے ان کے پاس اور ہمیں باہر منہ مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

''ان کے پاس مال ہے تو تم بھی شادی کر لو...... تمہیں کس نے منع کیا ہے شادی سے؟'' شاہد نے آنکھ مار کر اسے مشورہ دیا تھا۔

''شادی...... جیسے میرے ہی اختیار میں ہے نا شادی کرنا! بابو جی کہتے ہیں کہ ابھی میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں بابو جی کے انداز کی نقل اتاری۔

''تو پریشانی کیا ہے جگر...... اپنی قابلیت کے جوہر ان کو دکھا دو۔'' اصغر نے بھی بیہودگی سے اسے مشورہ دیا۔

''وہ تو اب دکھانے ہی پڑیں گے...... بابو جی کو بھی اور لالہ کو بھی۔'' اس کا ذہن ایک غلیظ منصوبہ بندی کر رہا تھا، اس پر عمل کرنے کے لیے اسے زیادہ عرصہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اگلے دو چار دن میں ہی فصل کی بوائی ہونے والی تھی اور اس سلسلے میں بابو جی اور لالہ دونوں رات بھر کے لیے باہر رہنے والے تھے۔

زمین اور فصل کے معاملات میں وہ دلچسپی نہیں لیتا تھا اور اسی سلسلے میں بابو جی اس سے نالاں رہتے تھے۔ ایک روز قبل ہی تو بابو جی نے اسے خاصی جھاڑ پلائی تھی، جب انہوں نے اس سے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ چاہتے تھے کہ وہ بوائی میں ان کے ساتھ ہوتا کہ اسے بھی کام کا علم ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ ان دنوں جہانگیر کا گھر پر رہنا ضروری تھا کیونکہ اس کی بیوی رابعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بابو جی بہت نرمی سے بات کر رہے تھے مگر جب اس نے ان سے یہ کہا کہ اسے زمین کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو وہ سیخ پا ہو گئے اور اس کے خاصے لتے لیے، اسے نالائق، آوارہ، نکما اور جانے کیا کیا کہا تھا۔

☆☆☆

مراد نگر کا نام چوہدری مراد علی کے دادا کے نام پر رکھا گیا تھا اور ان کا نام ان کے دادا کے نام پر ہی مراد علی رکھا گیا تھا۔ ان کے خاندان نے بہت سال قبل اس گاؤں میں آ کر رہائش اختیار کی تھی، تقسیم ہند کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم زیادہ تر ہندو ہندوستان جا چکے تھے باسوائے چند کے کہ جن کے پاس وہاں جانے کا کوئی جواز نہ تھا کہ ان کے آباؤ اجداد نے یہیں عمریں بسر کر دی تھیں۔

مراد علی کے خاندان کے کتنے ہی گھر اس گاؤں میں تھے اور زیادہ تر زمینیں بھی انہی لوگوں کی تھیں۔ مراد علی اور نور علی بھی دو بھائی تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بنایا تھا، اتنا مختلف کہ وہ دونوں ایک باپ کی اولاد ہی نہیں لگتے تھے۔ مراد علی کو اللہ نے تین بیٹوں سے نوازا تھا، جہانگیر، شجاع اور شیر علی...... ان کی زمینیں نہ صرف اس گاؤں میں تھیں بلکہ ارد گرد کے کئی دیہات میں بھی تھیں۔ نور علی کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے، اکبر علی اور بابر علی۔

سیالکوٹ کے نواحی علاقے میں اس گاؤں میں کاشتکاری کے علاوہ کاروبار کے مواقع بھی کافی تھے۔ سامانِ تجارت سہولت سے ان شہروں کی طرف بھی لے جایا جاتا تھا جو کہ ہندوستان کا حصہ بن گئے تھے۔ مسلمان، ہندو اور سکھ...... سبھی اکٹھے رہتے تھے، کوئی کدورت تھی نہ نفرت، نہ ہی بین المذاہب اختلافات کی زندگی کے عام معاملات میں کوئی خاص اہمیت تھی۔ زندگی سادہ تھی، گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، خواہ وہ خوشی رام گوپال کے گھر میں ہو، بلبیر سنگھ کے یا رب نواز کے...... خوشی کا مطلب سب کے لیے خوشی ہوتا تھا اور دکھ بھی اسی طرح سب کا سانجھا تھا۔ مل جل کر رہنا، ایک دوسرے کی مدد کرنا، ایک دوسرے کا خیال رکھنا، مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا...... سب کا یہی وتیرہ تھا۔

زیادہ تر گھر کچی مٹی کی لپائی والے تھے مگر کچھ گھر پختہ بھی بنے ہوئے تھے...... ایک خاص بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی گھر چھتوں سے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ مرد تو گاؤں میں جہاں بھی جانا ہوتا تھا، گلیوں میں سے جاتے تھے مگر عورتیں اور لڑکیاں بالیاں چھتوں چھتوں پر سے ہوتے ہوئے سارا گاؤں گھوم لیتی تھیں...... کبھی کہیں کچھ سیکھنے جانا ہے، کہیں کچھ دیکھنا ہے، کہیں یونہی لڑکیوں بالیوں کی محفل سجی ہے، کہیں کسی کے گھر کوئی نئی چیز آئی ہے، کسی نے کروشیے کا نیا نمونہ بنایا ہے، شادی ہے یا غمی...... غرض یہ سبھی کام گھروں کی چھتوں کی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے کیے جاتے تھے۔ بے فکری کا دور تھا کیونکہ سب کی عزت کو سانجھا سمجھا جاتا تھا اور سب کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں۔

سرِ شام کھانا کھالیا جاتا اور پھر گاؤں کی چوپال میں محفلیں سجتیں جن میں بچے بھی ہوتے، بوڑھے بھی اور جوان بھی۔ ناسٹلجیا میں مبتلا بوڑھے اپنی جوانی کے پُرجوش قصے سناتے، ان میں جنگوں کے واقعات بھی ہوتے، شاہی درباروں کے قصے، شکار کے بھی اور ڈاکوؤں سے مقابلوں کے یا پھر کسی کی جان بچانے کے...... کوئی اپنے ناکام یا کامیاب عشق کا افسانہ لے بیٹھتا، یہی سب ذریعۂ تفریح تھا نوجوانوں کے لیے۔ ان میں بھی ایسی بہادری کی امنگ جاگتی تو کبھی ایسا پُرخطر عشق کرنے کو جی چاہتا، جس میں کبھی کبھار جان بھی خطرے میں پڑ جاتی تھی...... مگر بوڑھوں کا کہنا تھا کہ اب کے نوجوان میں وہ جذبہ ہی نہیں ہے۔

نوجوانوں کو وہ قصے خیالوں اور خوابوں کی طرح لگتے، وہ انہیں سنتے اور سر دھنتے...... بزرگوں کو ان کی بہادری کی داد دیتے، ان پر رشک کرتے تھے۔ بزرگوں کو بات کرنے کا قرینہ تھا اور نوجوانوں کو سننے کا۔ کبھی کسی پر کوئی پھبتی کستا نہ کوئی طنز کرتا، مذہبی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو نہیں کی جاتی تھی تاکہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ کبھی کوئی نوجوان اپنی سُریلی آواز کا جادو بکھیر دیتا، ہیر وارث شاہ یا سیف الملوک کی تان فضا میں بکھرتی تو برگد کے احاطے میں نوجوان لڑکیوں کے دل کے تار بھی چھیڑ دیتی تھی۔

چوپال سے چند سو گز کے فاصلے پر وہ احاطہ تھا جہاں برگد کے بڑے پیڑ کے علاوہ بھی کئی پیڑ تھے...... یہ جگہ گاؤں کی لڑکیوں بالیوں کی تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ وہ یہاں جمع ہوتیں، شرارتیں کرتیں، ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتیں، درختوں پر پڑے جھولے جھولتیں، ککلی، کوٹلا چھپاکی، لکن میٹی، شاہ شٹاپو اور دیگر کھیل کھیلتیں۔ ان کے تحفظ کی کسی کو فکر نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ سب کی بیٹیاں تھیں، کوئی انہیں میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا تھا اور گاؤں کے نوجوانوں کو خاص تاکید تھی کہ جو وقت لڑکیوں کے کھیلنے کے لیے مخصوص ہے اس میں اس

احاطے کے نزدیک بھی کوئی نہیں پھٹکے گا۔

ریاستی قوانین تو سخت تھے ہی مگر لوگوں کے وضع کردہ اصول اس سے زیادہ مستند تھے۔

☆☆☆

مراد علی ایک انوکھی ہی طبیعت کے انسان تھے۔ گاؤں کے لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ بہت نیک، دیندار، دیالو، انصاف پسند، پرہیزگار اور سمجھدار آدمی تھے۔ غلط کو غلط اور درست کو درست کہتے تھے، خواہ اس میں ان کے اپنے مفادات متاثر ہوتے ہوں۔ فیصلہ کرتے وقت اپنے ذاتی مفادات کو ہمیشہ پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔ گاؤں کے کرتا دھرتا وہی تھے اور تمام معاملات پر ان کی گرفت تھی۔ اپنے لوگوں کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ وہ ان کے ایک اشارے پر گردن کٹوانے کو بھی تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن بدقسمتی نے ان کے گھر کا راستہ دیکھا بھی تو کس طرح کہ جتنی اللہ نے جہانگیر کو ہدایت دی تھی اور ماں باپ کا فرمانبردار بنایا تھا، اتنا ہی شجاع کو بے ہدایت......

''بابو جی!'' ہولے سے آواز آئی تو وہ اپنے خیالات سے چونکے۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا، ان کی بہو رابعہ تھی، انہوں نے سلام کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کو کہا۔ اس نے سر جھکا کر ان سے سر پر ہاتھ پھروایا، جب سے اس کا جسم پھیلنا شروع ہوا تھا وہ کم ہی ان کے سامنے آتی تھی اور اس طرح ان کے کمرے میں تو وہ پہلی بار آئی تھی۔ رابعہ ان کی بہن کی بیٹی تھی اور بڑی سمجھدار لڑکی تھی، ساس اور سسر دونوں کی لاڈلی بہو تھی۔

''کیسی طبیعت ہے بیٹی؟'' وہ جانتے تھے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ ''خیریت سے آئی ہو، مجھے بتا تیں میں آجاتا!''

''ارے نہیں بابو جی!'' شادی سے پہلے وہ انہیں ماما جی کہتی تھی مگر شادی کے بعد اس نے جہانگیر کی تقلید میں بابو جی کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''یونہی دل چاہا کہ آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھوں، آپ کے پاس گھر والوں کے لیے تو وقت ہی نہیں ہوتا بابو جی۔''

''تمہیں تو علم ہے بیٹی کہ میرے کندھوں پر کیسے کیسے بار ہیں!'' انہیں رابعہ کا چہرہ دیکھ کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کوئی خاص بات کرنے کے لیے آئی ہے، انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی اور یہ تو ان کا اپنا خون تھی۔ ذرا سی سوچ آئی کہ کہیں اس کا جہانگیر سے کوئی جھگڑا نہ ہو گیا ہو...... مگر یہ اتنی پریشانی کی بات نہیں تھی، میاں بیوی میں تو جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔

''کیا بات ہے بیٹی، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟'' انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں بابو جی!'' اس نے انہیں تسلی دی، دل ہی دل میں وہ ان الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی جن سے وہ اپنی بات احسن طریقے سے ان تک پہنچا سکے۔ ''یونہی ایک بات پریشان کر رہی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے کہوں۔''

''سب ٹھیک تو ہے نا میری بیٹی؟'' انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''جہانگیر نے کچھ غلط ملط تو نہیں کہہ دیا یا ہماری بیٹی کو کوئی پیسے ویسے تو نہیں چاہئیں؟''

''نہیں بابو جی...... جہانگیر کو آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ وہ کتنے اچھے انسان ہیں، سب کا خیال

رکھتے ہیں اور پیسے...... آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں بھی کسی شے کی کمی ہو سکتی ہے بھلا!"

"پھر کیا بات ہے...... اتنا تو میں تمہارا چہرہ دیکھ کر بھی بتا سکتا ہوں کہ بات کوئی پریشانی والی ہے، یونہی ہمارے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگانے کو تو ہماری بیٹی کا دل کبھی نہیں چاہتا۔" وہ مسکرائے۔

"کسی کا دل چاہے بھی آپ سے بات کرنے کو تو آپ کون سا ہمیں مل جاتے ہیں بابو جی...... اب بھی ایک بات کرنے کو کتنے دنوں سے موقع دیکھ رہی تھی۔" اس نے شکوہ کیا۔

"ارے ارے! یہ تو بڑی بری بات ہے کہ ہماری بیٹی کو ہم سے بات کرنے کے لیے اتنے دن تک انتظار کرنا پڑے!" وہ ہنسے۔ "کہو میری بیٹی؟"

"بابو جی...... بات بہت بڑی ہے اور میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی کہ......" وہ جھجکی۔

"کہو کہو...... جو بھی بات ہے کہو، مجھ میں ہر بات سننے کا حوصلہ ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا، انہیں بہت بے چینی ہو رہی تھی۔ "ضرور زرتاج اور جہانگیر کے مابین جھگڑا ہوا ہوگا، اس نے ساس سے شکایت کی ہوگی اور اس نے اسی کو ڈانٹ دیا ہوگا، ممانی جو ہوئی جتنا بھی بہو سے پیار کرتی ہو، اپنے بیٹے کے مقابلے میں تو اس کو ترجیح نہیں دے گی، اسی لیے اب رابعہ میرے پاس شکایت لے کر آئی ہے۔" انہوں نے رابعہ کے بات کرنے سے پہلے ہی سب کچھ سوچ ڈالا اور ساتھ ہی یہ بھی منصوبہ بنانے لگے کہ اس معاملے میں انہیں کس طرح غیر جانبدار رہنا ہے۔ انسان انصاف کے معاملات میں کتنا ہی غیر جانبدار رہنے والا کیوں نہ ہو مگر جب معاملہ اپنی اور پرائی اولاد کے بیچ میں ہو تو سوچ کے قدم لڑکھڑا ہی جاتے ہیں، اسی لیے تو اولاد کو آزمائش کہا جاتا ہے۔

"بعض باتیں انسان کے حوصلے کے پیمانے سے بھی بڑی ہوتی ہیں بابو جی!" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ایک تو یہ جو لوگ بات کو گھما پھرا کر کرتے ہیں، ان سے بڑی الجھن ہوتی ہے مجھے!" وہ خفگی سے بولے۔ "بات کرنی ہے تو سیدھی طرح کرو، اتنی لمبی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے بابو جی۔" اس نے رسان سے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بات شروع کرنے سے پہلے دروازہ بند کر لوں، کہیں کوئی آ نہ جائے۔" وہ اٹھی۔

"اب تو مجھے واقعی ڈر لگنے لگا ہے کہ تم کوئی بہت بڑی بات کرنے والی ہو۔" انہوں نے حیرت سے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑی اور بہت انوکھی...... اور سب سے بڑھ کر یہ بابو جی.. کہ آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آپ سے کیا بات کرنے والی ہوں!" اس نے پورے یقین سے کہا تو مراد علی کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

☆☆☆

کتنے ہی دن تک تو وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ یہ بات وہ کس سے کرے...... اپنی ساس سے کرتی تو تھیں اس کی ممانی اور انہیں اپنی بہو سے پیار بھی بہت تھا کیونکہ اللہ نے اس کے روپ میں ان کو بیٹی دے دی تھی مگر کیا وہ اس کی طرف سے اپنے بیٹے کی شکایت پر غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں گی؟ اسے یقین تھا کہ نہیں، ایک وہی تو تھیں گھر میں جو شجاع کے خلاف کسی کو کوئی بات نہیں کرنے دیتی تھیں کہ وہ ان کا لاڈلا بلکہ بگڑا ہوا بچہ تھا مگر ہر

ماں کی طرح وہ ان کو تمام عیوب سے پاک نظر آتا تھا۔ دنیا کی ہر ماں ایسی ہی ہوتی ہے اسی لیے تو جو اولاد بگڑ جاتی ہے اس کا سارا الزام معاشرہ ماں کو ہی دیتا ہے، چاہے ماں قصور وار ہو یا نہ ہو۔

پھر سوچتی کہ جہانگیر سے بات کرے...... مگر...... یہ بات اسے سب سے مشکل نظر آتی تھی۔ جہانگیر اس کی بات کا یقین تو کر لیتا مگر دونوں بھائیوں کے درمیان جو جھگڑا اٹھے گا...... بالآخر اس کے لیے اسے ہی موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا۔ اس کی جس فہم و فراست کے اس کے ماموں ممانی اور سارا خاندان قصیدے پڑھتا تھا، وہ اس کی اس بے وقوفی کی دھند میں کھو جائے گی۔ جہانگیر مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھا لیتا جو اسے اور شجاع کو بھی نقصان پہنچاتا اور ان کے خاندان کی ساکھ مٹی میں مل جاتی۔ لوگ ان کے منہ پر تھو تھو کرتے۔

اپنی اماں سے بات کرتی تو وہ آؤ دیکھتیں نہ تاؤ اور آ کر اپنے بھائی اور بھاوج پر چڑھائی کر دیتیں...... یا اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گھر لے جاتیں، وہ تو پہلے ہی اس بات پر بھائی بھاوج سے خفا رہتی تھیں کہ انہوں نے اپنے اس بیٹے کی تربیت میں غفلت کی تھی، اسے سیدھے راستے پر نہیں رکھا، اسے آوارگیوں اور عیاشیوں کی اجازت دے رکھی ہے اصل میں تو انہیں زیادہ یہ فکر رہتی تھی کہ ان کے داماد کے سر پر سارا بار تھا اور شجاع بغیر ہاتھ ہلائے ہر وقت عیاشیوں میں مصروف رہتا تھا۔

بابو جی سے بات کرنے میں یہ جھجک مانع ہوتی تھی کہ وہ یہ بات بابو جی سے کس طرح کر پائے گی...... بابو جی اس کے بارے میں کیا سوچیں گے، اس کے ماموں سہی مگر نہ جانے جب اپنی اولاد اور بہو کے درمیان کوئی اختلافی معاملہ ہوگا تو وہ کس طرح غیر جانبدار رہ پائیں گے۔ یہی سوچ سوچ کر اس نے کتنے ہی دن بتا دیے تھے، اگرچہ اس کے بعد اس کا شجاع سے سامنا بھی نہیں ہوا تھا مگر ایک عجیب سا خوف اس کے وجود میں بس گیا تھا...... جو اس نے کہا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ کر بھی سکتا تھا۔ ضد میں آ کر اگر وہ جہانگیر کو کوئی نقصان پہنچاتا تو وہ بھی اسی کا نقصان تھا، اس گھر کا نقصان تھا، اس خاندان کا نقصان تھا۔

انہی سوچوں کے باعث اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی، سر بھاری رہتا اور کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ساس، عابدہ بیگم نے محسوس کیا تھا کہ وہ چپ چپ تھی اور کھانے پینے میں بھی بے پروائی کر رہی تھی۔ انہوں نے اسی دن دایہ کو بلایا تھا کہ اس کو دیکھے، دایہ ایک ماہر دایہ تھی اور اس کا کافی تجربہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اسے شہر کے اسپتال لے کر جانا پڑے مگر دایہ معراج بی بی نے تسلی دی تھی اور کہا تھا کہ پورے دنوں میں آ کر عورتوں میں اسی طرح کی کیفیت ہو جاتی ہے اور اس کا باعث خوف بھی ہو سکتا تھا۔ اماں اور خود دایہ تو اس خوف کو بچے کی ولادت سے وابستہ سمجھ رہی تھیں...... مگر کاش کہ وہ ان کو بتا سکتی کہ اس کے اس خوف کا باعث کیا تھا۔

"زرتاج کیسی ہے بی بی جی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے رابعہ بیٹی...... تمہارا بہت پوچھ رہی تھی۔" دایہ نے کہا۔

"کام سیکھ لیا ہے اس نے بھی کہ نہیں؟" رابعہ نے پوچھا تھا۔

"کام تو میں اسے ساتھ کے ساتھ سکھا رہی ہوں مگر تمہیں معلوم ہی ہے بیٹا کہ کنواری بچیوں کے کرنے کا کام نہیں ہے، میں نے تو باقاعدہ کورس کیا تھا اور اس کو بھی کورس کرواؤں گی، اس لیے کہ عورت کے ہاتھ میں

کوئی ہنر ہو تو اس کو میرے جیسے حالات میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتے...... زرتاج کے ابا کے مرنے کے بعد میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا، اس لیے اپنا سیکھا ہوا ہنر کام آ گیا۔ اب تو ہاتھ ایسا بیٹھ گیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں ہمارا خاندانی کام ہے یہ۔'' اپنی بات مکمل کرکے وہ ہنسی۔

''واقعی معراج...... بڑا ہنر ہے اور اللہ نے تیرے ہاتھ میں بڑی شفادی ہے۔'' اماں نے بھی اعتراف کیا تھا۔ ''اور سن! وہ نور علی کی بہو بھی تو۔''

''جی چوہدرانی جی! اس کا بھی ایک آدھا مہینہ ہی رہ گیا ہے۔'' معراج کو ہمیشہ سے لمبی بات کرنے کی عادت تھی۔ ''پر جی اس کو تو آپ کی دیورانی نے اس دفعہ کہہ دیا ہے کہ اب کی بار لڑکی پیدا کی تو اس کو کاغذ دے کر فارغ کریں گی اور اپنے بیٹے کی اور شادی کریں گی۔''

''اللہ معاف کرے ایسے لوگوں سے اور ان کے تکبر کے بولوں سے...... خود بھی تو اس نے چھ بیٹیاں پیدا کی تھیں!'' اماں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''پر اس میں سے تو دو مر کھپ گئیں...... اب تو وہ خود کو صرف دو بیٹوں کی ماں کہلاتی ہے...... مجھے تو لگتا ہے جی کہ جو دو مری تھیں وہ بھی اس نے خود ہی۔'' معراج نے بات کرتے کرتے سرگوشی کی۔

''معراج!'' اماں نے سرزنش کی۔ ''میرے سامنے اس طرح کی فضول بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

انہیں علم تھا کہ اس طرح ان کے گھروں میں کام کرنے والے لوگوں کو ایک گھر سے بات اٹھا کر دوسرے گھر جا کر کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ محتاط رہتی تھیں۔ رابعہ کو بھی ان کی یہ عادت بہت پسند تھی حالانکہ چھوٹے ماموں کے گھر سے کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی بات سننے کو مل جاتی تھی مگر اس کی ساس کبھی کسی کی ایسے معاملات میں حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھیں۔

''کسی دن لانا بی بی، زرتاج کو بھی۔'' رابعہ نے ماحول پر چھا جانے والی ناگواری کو کم کرنے کو کہا۔

''جی اگلی دفعہ لاؤں گی۔'' معراج نے رابعہ سے وعدہ کیا۔

''زرتاج اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہے بی بی؟'' رابعہ کے سوال پر معراج خاموش ہو گئی، اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب بھی نہیں تھا۔ زرتاج کو ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ لے کر جانا معراج کی مجبوری بھی تھی، جوان لڑکی تھی اسے کہاں چھوڑتی، اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اسے یہ کام ساتھ ساتھ سکھا دیا تھا۔ صرف گاؤں کے چند بڑے گھروں میں جاتے وقت وہ اسے تھوڑی دیر کو اپنی ہمسائی کی طرف چھوڑتی تھی مگر سارا وقت دھیان اسی کی طرف رہتا تھا۔

معراج کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک رابعہ اس کی بیٹی کی بابت سوچتی رہی تھی، وہ غزالی آنکھوں اور دودھیا رنگت والی لڑکی...... رابعہ نے جب بھی دیکھا تھا اسے اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی نظر آتی تھی جو اس کی عمر کا خاصہ نہ تھی۔ اپنی عمر کی لڑکیوں سے مختلف، نہ کسی کھیل میں شریک ہوتی تھی، نہ برگد والے احاطے میں ان کے ساتھ جھولے جھولتی تھی۔ دیکھنے میں رابعہ سے کم عمر ہی لگتی تھی مگر اس کا چہرہ یوں تھا جیسے کسی مستقل غم کی پرچھائیں اس پر ہو۔

ادھر اپنے گھر میں معراج ضبط کی جانے کن منزلوں سے گزر رہی تھی، اپنے زخموں پر پھاہے رکھنے کی

کوشش میں اس کی انگلیاں فگار ہوئی جاتی تھیں، ان کے ٹانکے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اکھڑنے لگتے تھے۔ درد کے جس لاوے کو اپنے وجود میں سموئے ہوئے تھیں، اس کے لیے پہاڑ جتنا کلیجا ہی چاہیے تھا۔ اپنی بیٹی کو دیکھتیں تو اندازہ ہوتا کہ اس حادثے نے، اس غم نے ان کی بیٹی کی معصومیت اور مسکراہٹ چھین لی تھی...... اس حادثے کی یاد کے ساتھ ہی بند زخموں کے منہ کھل گئے، اس حادثے نے ان سے کتنا کچھ چھین لیا تھا۔'' یہ تاجی کہاں چلی گئی؟'' انہوں نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔

☆☆☆

''شاکر دی ہٹی'' دکان پر بورڈ لگا تھا، بہ مشکل آٹھ مربع فٹ کی دکان تھی، اس میں ایک طرف لوہے کی الماری رکھی تھی اور سامنے کی طرف شوکیس تھا جس میں سونے اور چاندی کے زیورات کے تین ڈبے رکھے تھے، ایک میں ناک کے کوکے اور لونگ تھے، دوسرے میں زنانہ اور مردانہ انگوٹھیاں اور تیسرے ڈبے میں کانوں کے ٹاپس اور بالیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ یہی عام اور روزمرہ بکنے والے زیورات تھے، الماریوں میں بند سامان مہینوں تک بند ہی پڑا رہتا تھا کیونکہ ان کے گاہک فقط شادیوں کے موسم میں ہوتے تھے۔ گاؤں میں سنار کی یہ واحد دکان تھی۔

گاؤں دیہات میں ان وقتوں میں شادیوں کا بھی موسم ہوتا تھا اور وہ اس وقت ہوتا تھا جب فصل کٹتی تھی، لوگوں کے ہاتھ میں کچھ پیسہ آتا تھا اور وہ اپنے جوان بچوں کے فرائض سے فارغ ہو جاتے تھے۔ یہاں بھی معاملہ پرچون کے سودوں کی طرح بسا اوقات ادھار پر چلتا تھا، لوگ ادھار پر بھی زیور لے لیتے تھے اور کچھ نہ کچھ گروی رکھ کر بھی۔

دکان کے اندر شوکیس کے عین عقب میں بیٹھا ہوا وہ نوجوان شاکر پچیس چھبیس سال کی عمر کا ہوگا، اس کے چہرے پر ہمہ وقت ایک مسکراہٹ سی رہتی تھی جو کہ اس کے کاروبار کی ضرورت تو تھی ہی مگر یوں بھی وہ خوش طبع اور مسکراتے رہنے والا انسان تھا۔ گاہکوں سے نرمی سے بات کرتا اور ادھار سودا دیتے وقت بھی زیادہ مین میخ نہیں کرتا تھا، اس کی یہی ادا سب کا دل موہ لیتی تھی۔

وہ گزشتہ چند سالوں سے اس دکان پر بیٹھ رہا تھا، اس وقت سے جب اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ اس سے قبل زندگی کیسی بے فکری کی گزر رہی تھی، اس کے سر پر کوئی بوجھ تھا نہ فکر و پریشانی۔ اس کے والد اگرچہ اپنی بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہو کر ہی اس دنیا سے گئے تھے اور شاکر اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر میں تنہا رہ گیا تھا مگر زندگی میں ذمے داریاں اور مشکلات کیا ہوتی ہیں، یہ اسے اچانک ہی علم ہوا تھا اور وہ اس دوڑ میں شریک ہو گیا تھا۔ کچھ وقت سنبھلنے میں ضرور لگا، کچھ کام کو سمجھنے میں مگر اس نے اپنا اور اپنی ماں کا ذمہ اٹھا ہی لیا۔

زرتاج اپنی اکلوتی سہیلی عائشہ کے ساتھ تھی جو کہ اُن کی پڑوسن کی بیٹی تھی، جہاں اس کی ماں اسے چھوڑ کر جاتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت شاکر کی دکان پر تھیں، عائشہ کو اپنے لیے ناک کی لونگ پسند کرنا تھی اور وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر زرتاج کو ہمراہ لے کر آئی تھی۔ زرتاج اگر چاہتی تو جانے سے انکار کر دیتی جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی جب بھی عائشہ اسے برگد والے احاطے میں جانے کو کہتی تھی مگر برگد والے احاطے میں وہ اس لیے نہیں جاتی تھی کہ اس کی ماں کی اجازت نہیں تھی اور یہاں اس لیے چلی آئی تھی کہ یہاں آنے میں اس کے

دل کی رضا تھی، جہاں دل کی رضا تھی، وہاں اسے ماں سے اجازت لینے کا خیال بھی نہیں رہتا تھا۔

شاکر، عائشہ کو ناک کے کوکے، لونگ اور تھلیاں دکھا رہا تھا، اس کی نظر زرتاج کے صبیح چہرے پر تھی، زرتاج کے چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جو اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کے ہونٹوں پر دیکھی نہیں تھی۔ عائشہ ان دونوں کی کیفیت سے بے نیاز تھی، اپنے لیے ایک تھلی کا انتخاب کر کے اس نے زرتاج کی رائے مانگی تو وہ چونکی۔

''سو رہی ہو کیا؟'' اس نے حیرت سے زرتاج کو دیکھا جو اس کے سوال پر اس کا منہ دیکھ رہی تھی کیونکہ اس نے اس کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ شاکر نے مسکرا کر اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔

''چلو برگد کے احاطے چلتے ہیں!'' تھلی لے کر ناک میں ڈال کر عائشہ نے شاکر کو بتایا کہ پیسے اماں دے جائیں گی پھر اس نے زرتاج کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

''اماں گھر آ گئی ہوں گی۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح بہانہ کیا۔ عائشہ خفا خفا سی چل دی کیونکہ وہ ہمیشہ اسی طرح وہاں جانے سے کتراتی تھی۔ دونوں دکان سے نکلیں تو زرتاج نے مڑ کر آخری مسکراہٹ شاکر کی طرف دیکھ کر ہونٹوں پر بکھیری۔

☆☆☆

''ککلی کلیر دی...... پگ میرے ویر دی!'' لڑکیوں کے لیے مخصوص احاطے میں سے لڑکیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، چند بڑے بوڑھوں کے علاوہ اس وقت گاؤں کے سبھی لوگ کھیتوں کھلیانوں میں ہوتے تھے اس لیے ان اوقات میں لڑکیاں آزادی سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی تھیں۔

''اچیاں لمیاں ٹالیاں وے...... وچہ گجری دی پینگ وے ماہیا۔'' جھولا جھولتے ہوئے کسی نوجوان لڑکی نے اپنی سُریلی آواز میں تان لگائی۔

''اور زور سے جھلاؤ۔'' عائشہ نے آواز لگائی تو کلثوم اور فاطمہ نے مل کر جھولے کو دھکا دیا۔

''تم دونوں میں تو زور ہی نہیں ہے...... کویتا تم آؤ مجھے جھولا جھلانے کے لیے!'' عائشہ نے چلا کر کہا۔

''آ و نا کویتا۔''

جھولا اور بلند ہوا...... اس کے پاؤں ایک اونچے سے درخت کی نچلی ٹہنیوں سے ٹکرائے...... ہوا میں اونچا...... اور اونچا اڑنے کی خواہش اس کے من میں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوئی۔ ''اور اونچا جھلاؤ، آسمان تک اونچا۔'' جھولا اور بھی بلند ہوا، اس دفعہ عائشہ کا دوپٹا درخت کی ٹہنیوں میں پھنس گیا...... اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گلے کو الجھے ہوئے دوپٹے کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ زور سے اس کے گلے کو پھندا لگا، اس نے دوسرا ہاتھ بھی دوپٹے کو ہٹانے کے لیے جھولے سے ہٹایا...... دونوں ہاتھوں کے ہٹتے ہی اس کا توازن بگڑا اور وہ دھپ کی بھاری سی آواز کے ساتھ بلندی سے زمین پر آ رہی...... عائشہ تو چیخ ہی رہی تھی مگر اس کے ساتھ باقی تمام لڑکیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں...... اور یہ آوازیں جس جس کے کانوں تک پہنچی تھیں وہ اسی احاطے کی طرف بھاگا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی عورتوں اور مردوں کی ایک کثیر تعداد وہاں پہنچ چکی تھی اور جتنے منہ اتنی باتیں۔

کوئی عائشہ کو مشورہ دے رہا تھا تو کوئی اس سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا...... کوئی باقی لڑکیوں سے تفتیش...... تمام لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں اور اس صورتِ حال پر گھبرائی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر کویتا تو سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ لڑکیاں عائشہ کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں، کوئی اسے اپنی اوڑھنی سے پنکھا جھل رہی تھی، کوئی اس کے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہی تھی.... کوئی اس کے آنسو...... ایک لڑکی اسے ٹیک دیے بیٹھی تھی اور اس کے کندھے بھی دبا رہی تھی۔ عائشہ کی چیخیں ہی نہیں تھم رہی تھیں، کسی کو ساتھ والے گاؤں میں بھگایا گیا تھا، وہاں پر ہڈی جوڑ کا ایک ماہر تھا۔ وہی آ کر عائشہ کے ساتھ ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

کویتا کی ماں دودھ میں ہلدی ڈال کر وہیں لے آئی تھی اور سب عائشہ کی منتیں کر رہے تھے کہ وہ دودھ پی لے تاکہ درد کی شدت کچھ تو کم ہو۔ منت ترلے کروا کروا کر عائشہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک گھونٹ لے رہی تھی۔ تب تک عائشہ کے گھر تک اطلاع پہنچ چکی تھی اور اس کی پریشان حال ماں بھاگتے ہوئے وہاں پہنچی تھی۔

''کیا ہوا میری شہزادی کو؟'' بیٹی کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ''کس نے گرایا ہے تمہیں؟'' کویتا کا دل اس کے وجود میں گھٹن محسوس کرنے لگا...... وہ سننے کے لیے تیار تھی کہ ادھر عائشہ کے منہ سے اس کا نام نکلا اور اُدھر اس کی شامت آئی۔ اس کا جسم شاید کانپ رہا تھا...... اگر کاجل اسے تھام نہ لیتی تو وہ دھڑام سے نیچے جا گرتی۔

''میں خود ہی گر گئی تھی اماں...... سب میری سہیلیاں ہیں، مجھے کون گرائے گا، میں خود ہی جھولا اونچا لے رہی تھی۔'' عائشہ کے الفاظ تھے یا کویتا کے لیے زندگی کی نوید۔ اس نے جان بوجھ کر عائشہ کو نہیں گرایا تھا مگر اسے یہ ڈر ضرور تھا کہ اگر عائشہ اس کا نام لے دیتی تو پھر بات بہت بڑھ جاتی اور اس کے بعد شاید اس کا گھر سے نکلنا بھی بند ہو جاتا۔

ہڈیاں جوڑنے کا ماہر پہنچ گیا تھا، کسی بزرگ نے لڑکیوں کو گھُرکا۔ ''دفعہ ہو جاؤ تم ساری کی ساری اپنے اپنے گھروں کو، گھیرا ڈال کر بیٹھی ہو، راستہ دو پہلوان جی کو...... ہٹو بڑی آئیں اس کی ہمدرد۔ پہلے گرانا ہی نہیں تھا اس کو۔'' لڑکیاں ڈانٹ کھا کر چھٹنے لگیں۔

''عائشہ! بھگوان تمہیں جلد ٹھیک کرے گا...... تم نے میرا نام نہ لے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے!'' اٹھنے سے پہلے کویتا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''قصور واقعی میرا اپنا تھا...... میری ضد کی وجہ سے ہی میرا دوپٹا الجھ گیا تھا تم تو ہو ہی بے قصور تو میں تمہارا نام کیوں لیتی!'' عائشہ نے اس کی سرگوشی کے جواب میں ہولے سے اس کے کان میں کہا۔

پہلوان صاحب نے معائنہ کیا، تھوڑی کھینچ تان کی اور کچھ پٹیاں وغیرہ باندھ دیں۔ انہوں نے تسلی دی کہ بڑا نقصان نہیں ہوا تھا، چھوٹی چھوٹی چوٹیں تھیں، جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔

''دوبارہ اس طرح جھولا جھولا تو پھر مجھے پیغام بھی نہ بھیجنا۔'' پہلوان صاحب نے مذاق میں ڈانٹا۔

''وہ تو میں جھولوں گی چاہے چاہے دس دفعہ گروں۔'' عائشہ نے شرارت سے کہا تو اس کی ماں اور ساری سہیلیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

''سین زبر سَا، لام زبر لَا، میم زبر مَا...... سَلَمَ! جیم زبر جَا، رے زبر رَا، بے زبر بَا...... جَرَبَ!'' بچوں کی مشترکہ آوازوں سے وسیع وعریض صحن گونج رہا تھا۔

''کیا بات ہے پتر آج روٹی نہیں کھائی تم نے؟'' بی بی جی نے ایک بچے کا کان پکڑ کر ہر دوسمت میں مروڑ کر چھوڑا تو اس کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں تیزی آگئی تھی۔

''کم بختو! گلی میں کھڑے ہو کر گالیاں دیتی ہوں یا آپس میں لڑنا ہو تو بڑی آوازیں نکلتی ہیں تم لوگوں کی...... صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لیتے وقت من من کرتے ہو!'' بی بی جی نے ایک اور بچے کو دھموکا جڑا تو وہ سسک کر رہ گیا...... بی بی جی کے آگے کسی کی دم مارنے کی اوقات کہاں تھی۔

''بی بی جی!'' ایک باریک اور سُریلی سی آواز آئی۔

''اب کس کو تکلیف ہوئی ہے؟'' بی بی جی نے بغیر دیکھے کہا۔

''بی بی جی سلام!'' دوبارہ آواز آئی۔

''وسلام...... کیا بات ہے، کیوں آنا ہوا اس وقت؟'' بی بی جی کے ماتھے کے بل صاف بتا رہے تھے کہ انہیں اس کا آنا کتنا ناگوار گزر رہا ہے۔

''وہ جی!'' وہ ہکلائی۔ ''کملا چاچی دوپٹوں میں رنگ دار لہریے ڈالنا سکھا رہی ہے۔''

''تو؟'' بی بی جی نے ابرو اچکا کر کہا۔

''میں کلثوم کو لینے کے لیے آئی تھی بی بی جی!'' اس کی آواز میں بھی لرزش تھی۔

''تجھے کس نے کہا کہ تو کلثوم کو لینے کے لیے آجا؟'' بی بی جی نے ایک گھوری ماری تو اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

''ساری سکھیاں باہر کھڑی ہیں بی بی جی، انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں کلثوم کو لے آؤں، وہ کہتی ہیں... بی بی جی تیری بات نہیں ٹالتیں۔'' اس نے تھوک نگل کر بات پوری کی۔

''کیوں، تم کیا ہو بی بی جی کی، ذرا ان سے پوچھ کر بتانا۔''

''جی بی بی جی...... تو؟'' اس نے پُراُمید نظروں سے بی بی جی کو دیکھا۔

''بھاگو یہاں سے...... جاؤ تم لوگ!'' بی بی جی نے غصے سے کہا۔ ''کلثوم نہیں جاسکتی، اس کا لالہ آنے والا ہے۔''

''اس کے آنے میں ابھی پورا ایک پہر باقی ہے بی بی جی، ہم اس سے پہلے ہی آجائیں گے۔'' اس نے التجا کی۔

''جو کہہ دیا سو کہہ دیا...... خوامخواہ بحث مت کرو!'' بی بی جی کا انداز حتمی تھا۔ ''اگلے روز بھی تم لوگ یہی کہہ کر اسے لے گئی تھیں اور دیر کر کے آئیں تو اسے اس کے لالے سے ڈانٹ بھی پڑی...... عباس کو یوں لڑکیوں کا گھر گھر میں پھرنا پسند نہیں ہے۔''

''اس روز تو بی بی جی! آپ کو علم ہے کہ عائشہ گر گئی تھی جھولے سے۔''

''آج بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا تم لوگوں کو بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔'' بی بی جی نے درشتی سے کہا۔

''آج تو بی بی جی ہم نے کام سیکھنا ہے...... کھیلنے تھوڑی جانا ہے!'' وہ منمنائی۔

''تو جا، سیکھ کر آجا اور کسی اور دن آکر یہیں گھر پر کلثوم کو سکھا دینا۔'' بی بی جی نے آسان حل پیش کیا۔ اس کے نین کٹوروں میں پانی آگیا، وہ مڑی اور ابھی ایک قدم بھی نہ چلی تھی کہ آواز آئی۔

''دیا!'' وہ مڑی۔ ''لے جا کلثوم کو!'' حیرت کے ساتھ نینوں میں بے یقینی در آئی تھی۔

''لے جاؤں بی بی جی؟'' وہ چلائی۔ ''سچی مچی!''

''چیخو مت، بچے پڑھ رہے ہیں۔'' بی بی جی نے بے نیازی سے کہا، اسی بے نیازی میں ان کا جواب پوشیدہ تھا۔ ''اور ہاں! اگر آج کلثوم، عباس کے آنے سے پہلے نہ لوٹی تو دوبارہ کبھی اس کو لینے کے لیے مت آنا، میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں ہے کہ عباس کو روٹی پانی دے سکوں، اس روز بھی تم لوگ یہی کہہ کر اس کو لے گئی تھیں کہ بس یوں گئیں اور یوں آئیں۔''

''بی بی جی بتایا تو ہے کہ اس روز عائشہ گر گئی تھی۔'' دیا نے بی بی جی کی بات کا جواب دیا اور اندر کی طرف بھاگی۔ ''کلثوم! نی کلثوم۔'' اور کلثوم بھلا کیا کر رہی تھی، وہ تو جانے کو تیار بیٹھی تھی، صرف ماں کے حامی بھرنے کی منتظر، دیا کے ساتھ باہر کو لپکی۔

''کلثوم!'' بی بی جی کی گرجدار آواز آئی، وہ ڈر کر مڑی کہ روک نہ لیں۔ ''اوڑھنی ٹھیک طرح پھیلا کر لے اور یہ باہر جانے کا کون سا طریقہ ہے نہ سلام نہ دعا۔'' اس نے اپنی اوڑھنی کو خوب اچھی طرح پھیلا لیا اور چند قدم واپس پلٹ کر ماں کو خدا حافظ کہہ کر نکل گئی، باہر ساری سکھیاں ان دونوں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ کلثوم کو دیکھ کر سب نے مسرت کا اظہار کیا۔

''دیکھا دیا!'' کاجل نے کہا۔ ''میں نہ کہتی تھی کہ بی بی جی تیری بات نہیں ٹالتیں۔''

''رہنے دو تم لوگ یہ مسکے بازی...... اپنی جان پر کھیل کر لائی ہوں، اتنی ڈانٹ کھا کر...... پہلے تو بی بی جی نے انکار ہی کر دیا تھا۔''

''تجھے تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتیں۔'' کاجل نے اسے چٹکی بھری۔

''کیوں بھلا؟'' فاطمہ نے حیرت سے پوچھا۔ دیا نے کاجل کو گھورا تو وہ خاموش ہو گئی۔

''کب تک چھپاؤ گی اپنی سکھیوں سے کہ بی بی جی کے لاڈلے نے تمہارا دل چرا لیا ہے؟'' کاجل نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو دیا کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ کاجل اس کی ہم راز تھی مگر اتنی ہی منہ پھٹ بھی...... اس لیے دیا کو ہر وقت اپنے راز کے افشا ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

''کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں؟'' کسی نے پوچھا تو دیا پریشان ہو گئی۔

''کچھ بھی تو نہیں۔'' کاجل نے فوراً کہا۔ ''میں دیا کو بتا رہی تھی کہ اگلے چاند پر میری ماسی میرے بیاہ کی تاریخ لینے آرہی ہیں۔''

''ہائے کاجل...... تو چلی جائے گی ہمیں چھوڑ کر...... ہم اداس ہو جائیں گے۔''

''ابھی کون سا بیاہ ہو رہا ہے...... ابھی تو تاریخ مقرر ہو گی جانے کتنے برس بعد کی۔'' وہ ہنسی۔ ''اس سے پہلے تم سب کی شادیاں ہو جائیں گی!'' ان کو ٹالنے کے لیے اس نے یونہی شوشہ چھوڑا تھا مگر اب وہ کون سا اس

کی جان چھوڑنے والی تھیں، دیا کی جان میں جان آئی تھی۔

☆☆☆

"بس بابو جی ایک چھوٹی سی پریشانی تھی، ایک بات کرنا تھی مگر سوچ رہی تھی کہ اماں سے کروں تو شاید وہ میری بات کا یقین نہ کریں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"بھئی وہ تو تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔ تم ان کی لاڈلی بہو ہو، تمہاری کسی بات کا وہ یقین نہ کریں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" مراد علی نے حیرت سے کہا۔

"جہانگیر سے بات کرتی تو بات شاید اتنی بڑھ جاتی کہ پھر اسے قابو کرنا مشکل ہو جاتا، بھائی بھائی کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔"

"رابعہ بیٹی! اب مزید میرا صبر نہ آزماؤ...... جو بات ہے کہہ ڈالو!"

"بابو جی آپ میری بات کا یقین کریں گے ناں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں بھئی یقین کرنے والی بات ہوگی تو کیوں نہیں یقین کریں گے۔" انہوں نے کہا۔

"یوں نہیں بابو جی! یہی تو مسئلہ ہے، یہ بات میں نے آپ سے کہنے کے لیے بڑی مشکل سے ہمت باندھی ہے، جب تک آپ مجھے یہ ضمانت نہیں دیں گے کہ آپ میرا یقین کریں گے، میں بات نہیں کروں گی۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا۔ "مجھے اس بات پر بھروسا ہے کہ کم از کم آپ میری بات پر شک نہیں کریں گے...... آپ میرا یقین کریں گے!"

"کہو بیٹی! کہو جو کہنا ہے...... اور تم جو کچھ بھی کہو گی میں اس پر یقین کروں گا۔" انہوں نے اسے یقین دلایا۔

"بابو جی! اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ اس گھر میں میری عزت محفوظ نہیں ہے...... جن رشتوں کو احترام سے دیکھا جانا چاہیے، ان رشتوں کو روندنے کی کوشش کی گئی ہے...... تو آپ میری بات کا یقین کریں گے ناں آپ...... کوئی بھائی اپنے بھائی کی عزت یوں مٹی میں ملانے کی کوشش کرے تو بھائیوں کا رشتہ تو ختم ہو جائے گا ناں بابو جی...... اگر میں جہانگیر کو بتا دوں تو!" اس نے آنسوؤں کے ساتھ بھیگے ہوئے لفظوں میں ساری بات بابو جی سے کہہ دی، اس کی دھمکی بھی کہ وہ سب کچھ تباہ کر دے گا...... مراد علی کو نہ تو کچھ نظر آ رہا تھا نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں بابو جی...... کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اس نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔

"نہیں میری بیٹی! تم سچ ہی کہہ رہی ہو مگر میرے وجود میں اس سچ کو سہنے کی ہمت نہیں ہو رہی بیٹی اور اپنے اوپر شرم آ رہی ہے کہ میں کس قسم کا باپ ہوں...... کس طرح کی اولاد کا باپ ہوں۔" وہ سمجھ گئے تھے کہ رابعہ کی نامکمل بات کا کیا مطلب تھا اور اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ شجاع کے علاوہ یہ گھٹیا حرکت اور کون کر سکتا تھا، شیر علی تو ابھی بچہ ہی تھا۔ "تم نے یہ بات کسی اور سے تو نہیں کہی؟"

"نہیں بابو جی...... میرے، اس کے اور اب آپ کے علاوہ کسی شخص کو اس بات کا علم نہیں!" اس نے ان سے کہا۔

"کسی سے کہنا بھی نہیں...... جہانگیر سے بھی نہیں، اپنی اماں سے بھی نہیں...... اور کبھی بھی نہیں، صدیوں کے بعد بھی نہیں۔" انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس بات کا زہر اتنا تیز ہوگا کہ نسلوں تک اس کا اثر جائے گا اور اس بدبخت کو بھی یہ علم نہ ہونے پائے کہ تم نے مجھ سے یہ بات کی ہے۔" انہوں نے بے خیالی کے انداز میں کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں بابو جی...... میں بھی نہیں چاہتی کہ اس بات کا آج یا کبھی بھی کسی کو علم ہو...... اس گھر کے سب لوگ اتنے اچھے ہیں اور مجھے اتنے پیارے ہیں کہ ان کی خاطر میں اس راز کو عمر بھر کے لیے خود تک محدود رکھ سکتی ہوں، ورنہ میں ایک پل میں یہاں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیتی!" اس نے کہا تو مراد علی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے تم سے ایسی ہی سمجھداری کی توقع تھی بیٹی، اگر تم چاہتیں اور مجھ سے کہتیں تو جو سزا مجھ سے بن پڑتی میں اس نالائق کو دیتا...... اب بھی میں اسے اس کی اس حرکت کی سزا دوں گا لیکن اس وقت اور اس طرح کہ اسے یہ اندازہ ہی نہ ہو کہ اسے یہ سزا کیوں ملی ہے...... اس سے پہلے مجھے اور بہت سے اہم کام کرنے ہیں۔" مراد علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے بابو جی کہ اس نے مجھے کیا دھمکی دی ہے کسی کو بتانے کی صورت میں۔" اس نے من و عن شجاع کے الفاظ تو نہیں دہرائے تھے اور نہ ہی دہرا سکتی تھی مگر اس کے الفاظ کا لب لباب انہیں بتا دیا تھا۔

"مجھے گھر کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا اور شجاع پر سختی کرنا ہوگی، چند دن قبل مجھے اس کی کچھ شکایات ملی تھیں تو میں نے جہانگیر سے کہا تھا کہ اسے گھر سے باہر نہیں سمجھائے...... میں سمجھتا تھا کہ باپ اور بیٹوں کے رشتے میں ایک حدِ فاصل قائم رہنی چاہیے، ایک جھجک رہنی چاہیے کیونکہ یہ احترام کا رشتہ ہے مگر اس نے میری خاموشی کو میری نرمی سمجھ لیا ہے۔" مراد علی کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیوں کی چھنک تھی......

رابعہ خاموش تھی، اس کے پاس اب کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

"تم جاؤ اپنے کمرے میں اور جب جہانگیر گھر لوٹے تو اسے میرے پاس بھیجنا...... میرے ناقص ذہن میں اس مسئلے کا جو فوری حل آتا ہے، وہ یہی ہے کہ تم لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر اور اس ناہنجار کی دسترس سے کہیں دور بھجوا دوں۔" انہوں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم کہیں اور کہاں جا سکتے ہیں؟ کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنی اماں کے گھر چلی جاؤں؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"اس بات پر جہانگیر کی اماں تیار نہیں ہوں گی، وہ تو ہر وقت تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"تو پھر اور کیا مطلب ہے آپ کا بابو جی؟" وہ حیران ہوئی۔

"ابھی تو میں خود الجھا ہوا ہوں...... مجھے کچھ سوچ لینے دو پھر میں پہلے تم سے بات کروں گا اور تمہارے مشورے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوگا!" انہوں نے اس کو تسلی دی۔

"ٹھیک ہے بابو جی، میں چلتی ہوں...... جہانگیر آنے والے ہوں گے!" کہہ کر وہ مڑی۔

”اپنا وعدہ یاد رکھنا بیٹی، عمر بھر کے لیے۔“ انہوں نے اسے کہا تو وہ مڑی اور مسکرائی۔

”میری اور آپ کی عزت کوئی الگ الگ نہیں ہے بابو جی! اور اگر میں نے کسی کو بتانا ہوتا تو آپ سے بات کرنے سے پہلے بتا چکی ہوتی۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں، دروازے کی طرف بڑھی، یہ دروازہ اس نے اندر آ کر خود بند کیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ چیختے چیختے رکی...... اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھولتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو ملے گی۔

”جانے یہ کب سے یہاں...... شاید اندر ہونے والی ساری گفتگو راز نہ رہی ہو۔“ اس نے سوچا۔

☆☆☆

تقسیمِ پاکستان سے کچھ عرصے پہلے کی بات ہے، خوشحال نگر ایک سرسبز گاؤں تھا...... وہاں کے مکین سادہ دل اور مہمان نواز لوگ تھے۔ فصل کٹتی تو اپنے استعمال کے لیے اناج رکھ کر بقایا اناج شہر بھجوا دیا جاتا تھا، اس کے لیے سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ ان کے گاؤں کے عین بیچوں بیچ سے ریلوے لائن گزرتی تھی اور ایک ننھا سا اسٹیشن بھی تھا۔ جہاں عام معمول میں تو ٹرین نہیں رکتی تھی مگر فصل کٹنے کے بعد کے دنوں میں جب کسان اپنی فصل کو بوریوں میں بند کر کے اسٹیشن پر پہنچا لیتے تھے تو اشارہ دے کر ٹرین کو روک لیتے تھے اور سامان والے ڈبوں میں بوریاں لاد کر شہر لے جاتے تھے۔

قائم علی اس گاؤں کا ایک بڑا زمین دار تھا اور صاحبِ عزت آدمی بھی۔ وہ گاؤں میں اپنی بیوی اور چار بیٹیوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اس کی نوجوانی میں ہی اس کا باپ چل بسا تھا، اسے وہ وقت یاد تھا جب ذمے داریوں کا بوجھ اس کے سر پر آ پڑا تھا۔ اتنی بڑی زمینداری سنبھالنا اس کے لیے مشکل تھا، اس نے اپنی عقل اور فراست کے باعث نیا کاروبار شروع کیا۔ گاؤں کے سب کسان اپنی اپنی فصل خود شہر لے جا کر بیچتے تھے اور کبھی کبھار دو کسان مل کر اپنی فصل لے جاتے تھے۔ شہر کی اپنی ایک دنیا تھی، اپنا انداز...... یہ لوگ کبھی کبھار گھبرا بھی جاتے تھے جبکہ قائم علی کو شہر جانا بہت پسند تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی زمین ٹھیکے پر دے دی اور اپنی فصل کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے کسانوں کی فصلیں بھی شہر لے کر جاتا اور وہاں بیچ دیتا...... اس کے عوض وہ ان سے اپنے کرایے وغیرہ کی مد میں رقم وصول کرتا۔

شہر جانے سے اس کے ذہن میں کاروبار کی کافی سوجھ بوجھ ہو گئی تھی۔ پہلے وہ کسانوں سے ادھار پر ان کی فصل خرید لیتا اور پھر ایک ہی دفعہ ساری بوریاں اکٹھے ہی بک کروا کر شہر لے جاتا تھا۔ ہوتے ہوتے اب اس کے پاس اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ وہ نقد رقم دے کر گاؤں کے سبھی کسانوں سے اناج خرید لیتا اور کچھ عرصے کے بعد جب قیمتیں کچھ بڑھ جاتیں تو وہ شہر میں اناج بیچ کر مزید منافع کما لیتا۔ اس نے اپنے کام میں معاونت کے لیے کچھ لوگ بھی رکھے ہوئے تھے، اسی طرح شہر میں بھی اس کے روابط تھے، شہر میں نعیم اس کا کاروباری شراکت دار تھا، جس کے گھر میں اس کی حیثیت گھر کے فرد کی سی تھی۔

گھر میں نعیم کے ابا جو کہ تھوک کی دکان کرتے تھے، اس کی ماں اور دو چھوٹے بھائی رہتے تھے۔ قائم علی نے تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی مگر شہر میں آنے جانے اور شہر کے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باعث، اس کی ظاہری حالت سے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان پڑھ تھا۔ اس دفعہ بھی وہ حسبِ معمول اپنے کاروباری

دورے پر شہر میں ہی تھا اور ہمیشہ کی طرح اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ نعیم کے گھر چلا گیا، دروازہ کھٹکھٹانے پہ دیر تک دروازہ نہیں کھلا تو وہ پریشان ہو گیا، اس نے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا۔

”جانے کیسے کیسے جنگلی لوگ ہوتے ہیں...... دروازہ کھٹکھٹانے کی بھی تمیز نہیں...... معلوم بھی ہے کہ نماز کا وقت ہے، لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔“ نسوانی آواز میں بلند بڑبڑاہٹ وہ باہر کھڑے بھی سن رہا تھا۔ ”ویسے اس وقت ہے کون، کسی شریف آدمی کے آنے کا وقت تو نہیں لگ رہا!“ دروازہ دہاڑ سے کھلا، دروازے کے باہر کھڑے قائم علی اور اندر سے دروازہ کھولنے والی...... دونوں کے چہروں پر شرمندگی تھی۔

”معذرت چاہتا ہوں مخل ہونے پر۔“ قائم علی نے کہا۔

”مگر آپ ہیں کون؟“ اس نے پوچھا۔

”یہی سوال تو میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”میرا تو یہ گھر ہے، مجھ سے یہ سوال پوچھنے کی آپ کو ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے تپ کر کہا۔

”موجی! کون ہے باہر بیٹی؟“ نعیم کی امی کی آواز آئی تھی۔

”معلوم نہیں امی کون ہے۔“ اس نے کہا تو قائم کو اندازہ ہوا کہ وہ ان کی بیٹی ہو سکتی ہے مگر اس نے پہلے کبھی اس کو دیکھا تھا نہ ہی گھر میں کسی نے اس کا ذکر کیا تھا۔

”آپ نعیم کی بہن ہیں؟“ اس نے شائستگی سے پوچھا تھا۔ ”میں نعیم کا دوست ہوں، قائم علی۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے ناز سے کہا۔ ”آپ کا دوست اس وقت گھر پر نہیں ہے، وہ دیر سے گھر آتا ہے!“

”معلوم ہے مجھے...... اگر آپ کا بھائی اور آپ کے ابا جی رات کو دیر سے گھر آتے ہیں تو سرِ شام آنے والوں پر آپ نے شریف نہ ہونے کا الزام کیوں لگا دیا؟“ وہ خوامخواہ اس سے بات کو طول دے رہا تھا۔ اس کی اس بات پر موجی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا، وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”کون ہے بیٹی؟“ اندر سے پھر آواز آئی تھی۔

”کوئی قائم علی ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو اس کو اندر لے کر آؤ نا بیٹی...... میرا بیٹا ہی سمجھو اس کو!“ اندر سے دوبارہ آواز آئی تو اس نے ہٹ کر اس کو راستہ دیا۔ قائم علی نے اندر آ کر صحن میں چارپائیاں بچھانا شروع کر دیں تو وہ اس کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے اس کے انداز سے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر میں کس قدر بے تکلف ہے مگر حیرت اسے اس بات پہ تھی کہ اسے آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے، کسی نے اس کے ساتھ اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ اتنا اہم تھا وہ اس گھر میں اور اس کی بابت بات کرنا غیر اہم تھا اور وہ ایسا بھی نہیں لگتا تھا کہ جس کے بارے میں اسے بالخصوص نہ بتایا جاتا، وہ جو چند لمحوں میں اس کے دل کے بند دروازے کھول گیا تھا۔

”کوئی شربت وغیرہ بنا لیتی ہیں آپ...... موجی؟“ اس نے کس بے تکلفی سے کہا تھا اور وہ جو اسے ہی سوچے جا رہی تھی، یکدم چونکی...... جیسے نیند سے جاگی ہو اور شربت بنانے چل دی، یوں جیسے کوئی سوتے میں چل رہا ہو۔

سمجھدار، برداشت والے اور معاملہ فہم تھے، اتنے ہی نور علی جلد باز، غصیلے، ہتھ چھٹ اور بے عقل تھے۔ کبھی کبھار تو مراد علی کو لگتا کہ شجاع کی ساری عادتیں اپنے چچا پر پڑی ہیں۔ نور علی کو اللہ نے چھ بیٹیاں اور دو بیٹے عطا کیے تھے، ان کی دو بیٹیاں چند دن کی عمر میں ہی چل بسیں، کہنے والے تو یہی کہتے تھے کہ اچھی بھلی تھیں شاید خود ہی ان میاں بیوی نے کچھ کر دیا ہو مگر مراد علی اور ان کی بیوی کو کبھی اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کیونکہ اولاد تو جانور کو بھی پیاری ہوتی ہے، ہاں البتہ یہ وہ ضرور سوچتے تھے کہ ان دونوں سے کچھ بعید بھی نہ تھی۔

جوانی بھی نور علی نے بھرپور گزاری تھی اور بڑھاپے میں بھی ان کے وہی چھچھن تھے، وہی وتیرہ...... شاید اس طرح کی گھٹیا عادات سے کچھ مرد یہ مراد لیتے ہیں کہ آدمی کی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی حال ان کے بیٹوں کا تھا، ابھی اتنا قد کاٹھ بھی نہ نکالا تھا مگر ان کے جوان ہونے کی خبر ارد گرد کے درجنوں دیہات کو تھی، لوگ باگ اپنی بیٹیوں کو ان سے چھپاتے پھرتے تھے۔ گاؤں میں لوگوں میں اتحاد تھا اور دوسرے کی بیٹی پر بری نظر ڈالنا انتہائی غلط کام کے زمرے میں آتا تھا، خواہ بیٹی غریب کی ہو اور نظر امیر کی۔

اپنے گھر میں چار بیٹیاں تھیں مگر نور علی کو پھر بھی کبھی خوف خدا نہ آیا۔ ان کے گھر میں تو کام کرنے والی ملازمائیں بھی محفوظ نہ تھیں۔ غریب لوگ اپنی ضرورتوں کی خاطر اپنی بیٹیوں کو ان کے ہاں کام پر بھیجتے اور یہی سمجھتے تھے کہ جن کے اپنے گھر میں بیٹیاں ہوں ان کے لیے دوسروں کی بیٹیاں بھی اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ مگر کتنی ہی بیٹیاں ان کی حیوانیت کا شکار ہو چکی تھیں...... لوگ اپنی عزت کی خاطر خاموش ہو جاتے تھے۔ ہاں یہ ہوا کہ جوں جوں لوگوں کو اندازہ ہوا، انہوں نے اپنی بچیوں کو ان کے گھر بھیجنا چھوڑ دیا، ایسے پیسے اور اناج سے انہیں بھوکا مرنا زیادہ پسند تھا جس کی خاطر انہیں اپنی عزت داؤ پر لگانا پڑتی تھی۔

نور علی کی بیوی شکیلہ بھی ایک سخت مزاج اور کرخت لہجے میں بات کرنے والی عورت تھی۔ اپنے علاوہ کسی دوسرے کو انسان سمجھتی ہی نہ تھیں۔ دو بیٹوں کی پیدائش نے ان کے قدم جما دیے تھے ورنہ شادی کے بعد چھ برسوں میں چھ بیٹیوں کی ولادت نے سمجھا دیا تھا کہ وہ اس گھر میں ایک فالتو شے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، جب تک کہ وہ بیٹے نہ پیدا کر لیں۔ دو بیٹیوں کے مرنے پر ان کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا، انہیں معلوم تھا کہ ان بیٹیوں کو ان کے پیدا ہونے کی بڑی کڑی سزا ملتے رہنا تھی، وہ سمجھتی تھیں کہ جو مر گئی تھیں وہ بڑے مصائب سے نجات پا گئی تھیں۔

بیٹوں کو پیدا کر لینا اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ عمر بھر وہ اس پر اتراتی رہ سکتی تھیں۔ اس کے بعد ان کی تربیت کی ذمے داری کس پر تھی اس کا نہ انہیں علم تھا نہ ان کے باپ کو...... اسی وجہ سے وہ لڑکے اتنے اچھے خاندان کے ہونے کے باوجود عام گلی محلے کے بچوں جیسی عادات رکھتے تھے۔ گالی گلوچ، آوازے کسنا، لڑائی جھگڑا، چھیڑ چھاڑ...... انہی اوصاف کے ساتھ وہ اپنی جوانی کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ لڑکیاں شکیلہ نے اپنے میکے کے رشتے داروں میں ہی بیاہ دی تھیں حالانکہ نور علی کی خواہش تھی کہ ان کے بھائی کے گھر میں ان کی دو بیٹیوں کے جوڑ کے رشتے موجود تھے، بیٹیوں کا باپ ہونے کے باوجود خود بڑے بھائی سے بات بھی کی مگر عابدہ بیگم اور خود مراد علی بھی، شکیلہ کو جانتے ہوئے اس حق میں نہ تھے۔ انہوں نے جہانگیر کا رشتہ اپنی بہن کے ہاں طے کر دیا اور نور علی نے اپنی ساری بیٹیاں سال دو سال کے وقفے سے بیاہ دیں۔

بھائی تو وہ آپس میں تھے مگر مزید رشتے قائم نہ ہونے کے باعث بھائیوں میں بھی کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ نور علی کی بیٹیوں کی شادیوں میں تو ان کے تایا اور ان کا خاندان بھرپور انداز میں شریک ہوئے تھے مگر جہانگیر کے بیاہ میں ان کے چچا کے خاندان کے افراد کے انداز میں کھنچاؤ اور تناؤ کو سبھی نے محسوس کیا تھا۔

نور علی کی بیٹیاں جن گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں، ان گھروں کی عورتوں کے جو مزاج تھے وہ اس سے قطعی مختلف نہ تھے جو ان کی ماں نے ان کی تربیت میں روا رکھے تھے۔ اکثر ہی وہ لڑ جھگڑ کر میکے آتیں پھر صلح صفائی ہوتی۔ شکیلہ بیٹیاں بیاہ کر کبھی فارغ نہ ہوئی تھیں، انہیں ان کے جھگڑے نمٹانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ رابعہ بیاہ کر آئی تو اس نے اپنی سمجھ بوجھ سے اپنی سسرال والوں کے دل جیت لیے تھے، اس کی ساس عابدہ بیگم کبھی کبھار تو یہ سوچ کر ہول جاتیں کہ اگر انہیں شکیلہ کی بیٹی کو بہو بنانا پڑتا تو وہ اس گھر میں ہی نہ رہ سکتیں۔ شکیلہ اپنی بہو بھی اپنے میکے سے ہی لے آئی تھیں۔

مراد علی اور ان کی بیوی اپنی بہو جو کہ ان کی بھانجی بھی تھی، اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس کے ہاں شادی کے تین سال کے بعد پہلے بچے کی آمد آمد تھی جبکہ نور علی کے ہاں تب تک تین پوتیاں اور بے شمار نواسے نواسیاں آ چکے تھے۔ ان کے ہاں پوتیوں کی پے در پے ولادت کو بھی دل جلے ان کے لیے اللہ کی طرف سے سزا کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی کسی کی عزت کو اپنی عزت نہیں سمجھا تھا اور اب ان کے آنگن میں بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں۔ چوتھی بار تو شکیلہ نے اپنی بھتیجی کو آگاہ کر دیا تھا کہ اب اگر اس نے بیٹی پیدا کی تو اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ بات معراج بی بی نے مراد علی کی بیوی کو بتائی تھی اور وہ ہول کر رہ گئی تھیں۔

کون کہتا ہے کہ مرد عورت کی تکریم نہیں کرتا اور اس کا استحصال کرتا ہے...... عورت کی سب سے بڑی دشمن تو خود عورت ہی ہے، وہی اس کو گھر میں جگہ دیتی بھی ہے اور وہی اس کے لیے گھر میں جگہ تنگ بھی کرتی ہے۔ وہی اس سے مطالبات کرتی ہے، ایسے مطالبات جو اس کے دائرۂ اختیار میں ہوتے بھی نہیں...... وہی اس کے لیے جینا مشکل کرتی ہے اگرچہ اس میں حوصلہ ہو تو وہ اس کے لیے آسانیاں بھی پیدا کر سکتی ہے۔

☆☆☆

"آپ کب آئے؟" رابعہ بالکل توقع نہیں کر رہی تھی کہ اچانک جہانگیر گھر آ جائے گا، وہ تو شام کو لوٹنے والا تھا اسی لیے رابعہ کو یہ موقع غنیمت لگا تھا اور اس نے بابو جی سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

"کیوں، برا لگا میرا آنا؟" جہانگیر نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ "اور تم کیا بابو جی سے میری شکایتیں لگا رہی تھیں، کیا کیا شکایتیں لگائی ہیں؟"

"آپ اندر جائیں، آپ کو بابو جی بلا رہے ہیں...... آپ کے کان کھینچیں گے تو آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے آپ کی کون کون سی شکایتیں لگائی ہیں!" اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"اماں کہاں ہیں؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"اماں گھر پر ہی ہیں، ان کے پاس ان کے گاؤں کی کچھ عورتیں اپنے مسائل لے کر آئی ہوئی ہیں، اس لیے وہ ان کے ساتھ مصروف ہیں۔" اس نے جہانگیر کو بتایا۔ "اب آپ جائیں، اس سے پہلے کہ بابو جی باہر

”جاتا ہوں، جاتا ہوں..... مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ اس کو کچھ یاد آیا۔

”کیوں، میں اپنے ماموں سے کوئی بات اکیلے میں نہیں کر سکتی؟“ اس نے ناز سے کہا۔

”کیوں نہیں کر سکتی ہو..... جتنی چاہے کرو، میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”یونہی خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں کوئی ضرورت ہو اور مجھے کہنے کے بجائے بابو جی سے کہہ رہی ہو۔“

”اول تو ایسی کوئی بات نہیں اور ایسی بات ہو بھی اور میں بابو جی سے کہہ بھی دوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے فوراً کہا تھا۔

”تمہیں جو بھی کہنا ہو مجھ سے کہا کرو..... بابو جی کو تو اس عمر میں اور بھی بہت پریشانیاں ہیں اور ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی!“ جہانگیر نے پیار سے کہا، رابعہ کو لگا جیسے اس نے باہر کھڑے ہو کر کچھ سن نہ لیا ہو، اس کے چہرے پر وہ کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں نے بابو جی سے کیا کہنا ہے..... بس یونہی جھجک کی وجہ سے کتنے ہی دنوں سے ان سے ملی نہیں تھی، آج سوچا کہ ان کی طبیعت کا پوچھتی چلوں۔“ رابعہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کہا تھا۔

”تم چلو میں بابو جی سے مل کر آتا ہوں۔“ جہانگیر نے کہا تو وہ چل دی مگر اس کے چہرے پر الجھن تھی، اسے شک ہو رہا تھا کہ چاہے ساری بات نہ سہی مگر بات کا کچھ نہ کچھ حصہ جہانگیر نے ضرور سن لیا ہوگا۔

”اتنی جلدی تمہیں میرا پیغام مل گیا؟“ بابو جی نے اس کے سلام کا جواب دے کر پوچھا تھا۔

”رابعہ نے مجھے ابھی باہر بتایا ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا ہے، میں پہلے ہی ادھر آ رہا تھا۔“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”ہوئی تمہاری بات اس بدبخت سے؟“ بابو جی نے سوال کیا۔

”جی بابو جی، اس کے خاص آدمی نے مجھے مخبری کی تھی کہ اس روز بھی اس کے ڈیرے پر لڑکیاں تھیں۔ میں گیا تو اس کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے تھا مگر اسے شاید کسی نہ کسی طرح میرے جانے کی خبر ہو گئی تھی۔“ جہانگیر نے باپ کو بتایا۔

”تم اپنے لوگوں کی پڑتال کرواور دیکھو کہ اُن میں سے کون شجاع کے لیے مخبری کر رہا ہے، اگر شجاع کا خاص آدمی تمہیں اطلاع کر سکتا ہے تو تمہارے لوگوں میں بھی کوئی اس کے لیے کام کر رہا ہوگا!“ بابو جی نے بہت پتے کی بات کی تھی۔

”ممکن ہے بابو جی لیکن میرے ساتھ تو میرے بہت بااعتماد لوگ ہیں۔“ جہانگیر کو اس بات پر یقین نہ تھا کہ کوئی اس کو دھوکا دے سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاص آدمیوں کا بہت خاص خیال رکھتا تھا۔

”اس بات کو دوبارہ دیکھ لینا، وہ کون سا باز آنے والا ہے۔“ بابو جی نے کہا۔ ”جہانگیر پتر! میں تم سے کچھ خاص بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ وہ کہہ کر رکے۔

”حکم کریں بابو جی!“ جہانگیر نے اسی سعادت مندی سے کہا جو کہ اس کا خاصہ تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ تم شہر چلے جاؤ..... قائم علی کے مرنے کے بعد ہمارے کاروبار کے حالات کچھ

”مم..... میں؟“ جہانگیر نے تھوک نگلا۔ ”میں کیسے شہر جا سکتا ہوں بابو جی۔“

”میں سمجھتا ہوں بیٹا..... تم رابعہ کو بھی ساتھ لے کر جاؤ!“ انہوں نے اس کی جھجک کو محسوس کیا اور وہ بخوبی اس کی جھجک کے اسباب کو جانتے تھے۔

”وہ اگر تھوڑا عرصہ ٹھہر جائیں، رابعہ فارغ ہو جائے تو۔“ وہ باپ سے اتنی جرح کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔

”ایک، ایک دن اہم ہے بیٹا! تم لوگ جتنی جلدی ہو سکے چلے جاؤ!“ انہوں نے رسان سے کہا۔

”پھر میں چلا جاتا ہوں، رابعہ یہیں رہے، یہاں اماں اس کا خیال رکھ سکتی ہیں، وہاں اکیلے میں کون اس کا خیال کرے گا؟“

”تم شہر میں جا کر کہاں باہر کا کھانا کھاؤ گے، کہیں بیمار و بیمار پڑ گئے تو..... اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تمہاری اماں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی چلی جائیں گی!“ بابو جی نے حتمی انداز میں کہا۔

☆☆☆

”اے لو! تمہارے بابو جی کا تو لگتا ہے کہ دماغ کام کرنا چھوڑ گیا ہے!“ عابدہ بیگم نے جہانگیر کو بلوا کر اس سے بات کی۔

”میں تو خود اماں اس کی حمایت میں نہیں ہوں مگر آپ کو علم ہے کہ بابو جی کا حکم میں کبھی بھی نہیں ٹال سکتا!“ جہانگیر نے نرمی سے کہا۔ ”میں نے تو بابو جی سے یہ بھی کہا کہ میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔“

”گھر کا گھی شکر چھوڑ کر ان حالات میں ہم شہر جا کر نا خالص غذائیں کھائیں یا تم اکیلے جا کر شہر میں رہو، مجھے یہ دونوں صورتیں منظور نہیں، تم کہہ دو اپنے بابو جی سے۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”بابو جی سے تو اماں آپ ہی بات کریں گی، میں نہیں کر سکتا البتہ میرا خیال ہے کہ میں اکیلا چلا جاتا ہوں!“ جہانگیر نے اپنی دانست میں آسان اور قابلِ عمل حل پیش کیا۔

”اکیلے تو تمہیں پردیس میں، میں نہیں جانے دوں گی، اتنا بڑا شہر ہے اور اس میں میرا بیٹا جا کر تنہا رہے، نہ گھر کا کھانا نہ سکون..... نہ بال بچے کا ساتھ، نہیں بیٹا میں تمہیں تنہا تو نہیں جانے دینے والی۔“ ان کا دل بیٹے کی تنہائی کے خیال سے پسیج گیا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں اماں، آپ کو گاؤں سے جو کچھ بھی چاہیے ہوگا وہ آپ کو باقاعدگی سے مل جایا کرے گا، گھی، مکھن، دیسی مرغی، گھر کا دودھ۔“ اس نے ماں کے کندھے تھام کر کہا۔

”وہ کیسے بیٹا؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم گاڑی لے لیں گے اماں۔“ جہانگیر نے حل بتایا تو ان کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا، گاڑی ان کے دیور کے پاس تھی تو سہی اور انہوں نے دیکھ بھی رکھی تھی مگر کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ان کے پاس بھی گاڑی ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ گاڑی لے نہیں سکتے تھے بلکہ اس سے قبل گاڑی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ شہر جانے، گاڑی میں بیٹھنے کا تصور ایسا خوش کن تھا کہ کچھ دیر کے لیے انہیں وہ سارے مسائل بھول گئے جو اُن کے

ہے۔ جب تک وہ گھر میں تھا، اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے لیے وہ کتنا اہم ہے اور جب وہ گیا تو اسے لگا اس کے جسم سے کوئی اہم عضو نکل گیا ہو...... اپنی سوچ پر وہ خود ہی ہنسی، تھی نا نرسوں والی سوچ...... وہ تو کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتی تھی کہ وہ پھر کب آئے گا اور اگر اسے معلوم ہو بھی جاتا تو وہ کون سا اسے ملنے کو آسکتی تھی۔ وہ جو عشق اور محبت کو دماغ کا خلل سمجھتی تھی کیونکہ اس نے مردوں کی طرف سے ہمیشہ عورت پر لالچ کی نظر ہی پڑتے دیکھی تھی۔ اس نے ایسی نظر کب دیکھی تھی، جو چپکے چپکے کسی کے وجود کا احاطہ کیے رکھے اور یہ بھی کوشش کرے کہ کسی کو علم بھی نہ ہو۔ اس نے تو مرد کے اندر ہوس دیکھی تھی، طلب دیکھی تھی، وحشت اور حیوانیت دیکھی تھی۔ اس نے کب ایسی پاک صاف نظر دیکھی تھی، جس نظر کے حصار میں رہنے کو اس کا دل چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

''زرتاج! تم یوں چپ چپ کیوں رہتی ہو؟'' رابعہ نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تمہاری عمر کی لڑکیاں تو اتنی شوخ و شنگ ہوتی ہیں، تم گاؤں کی باقی لڑکیوں کی طرح کھیلنے بھی نہیں جاتی ہو۔''

''کوئی خاص وجہ نہیں باجی...... بس میری عادت ہی ایسی نہیں ہے، مجھے باہر جانا بھی اچھا نہیں لگتا!'' زرتاج نے مختصراً کہا تھا۔

''کیا تمہاری اماں منع کرتی ہیں تمہیں؟'' رابعہ نے پھر سوال کیا، اسے یہ پانی سے بھرے نین کٹوروں والی لڑکی بہت پیاری لگتی تھی، جو آتی تو اپنا کام خاموشی سے کرتی تھی، اپنی ماں کے بالکل برعکس...... اس وقت بھی وہ خاموشی سے اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

''اماں منع نہیں کرتیں، بس میرا من ہی نہیں کرتا!'' وہ مسکرائی۔ ''اماں تو بلکہ چاہتی ہیں کہ میں سکھیاں، سہیلیاں بناؤں، ان کے ساتھ کھیلوں تا کہ اماں کو اپنے کام پر جاتے سمے یہ پریشانی نہ ہو کہ مجھے کہاں چھوڑنا ہے۔''

''تو بناؤ نا تم سہیلیاں۔'' رابعہ نے فوراً اصلاح دی۔ ''اور ہاں جب ہمارے ہاں آنا ہو تو اماں کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ تمہیں کہاں چھوڑنا ہے، مجھے تو تم ہی مالش وغیرہ کیا کرو۔ سچ تمہارے ہاتھوں سے بڑا سکون آرہا ہے، تم ویسے بھی مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔''

''جی اچھا!'' اس نے کہا۔ ''یوں بھی اب اماں کی نظر کافی کمزور ہوگئی ہے، اس کام کے لیے اسے اب میری مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''ارے، یہ تو بہت اچھی بات ہے، جب میرا بچہ دنیا میں آرہا ہوگا تو تم میرے پاس آؤ گی نا؟'' رابعہ نے فرمائش کی۔

''جی ضرور...... ویسے آپ سے پہلے تو نور علی کی بہو کی باری ہے، اس کا تو اماں بتا رہی تھیں کہ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے۔'' زرتاج نے بتایا۔ حویلی کی ایک ملازمہ نے آکر کہا کہ رابعہ کو اس کے سسر نے بلوایا ہے، اسے اس وقت دبوانے اور زرتاج سے باتیں کرنے میں اتنا لطف آرہا تھا کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ کس کی تاب تھی کہ بابو جی بلائیں اور کوئی انکار تو کیا دیر بھی کرے۔

شہر جانے کے باعث پیدا ہونے والے تھے۔ شجاع، شیر علی اور خود مراد علی...... وہ سب ان کے بغیر کیسے رہتے۔

''چلو چند ہی دن کی تو بات ہے، رابعہ کے فارغ ہوتے ہی میں واپس آجاؤں گی، تب تک رابعہ کا دل بھی بچے کے ساتھ بہل جائے گا!'' دل ہی دل میں وہ ان ملازموں کی فہرست مرتب کرنے لگیں جن کو وہ شہر ساتھ لے کر جانے والی تھیں۔

☆☆☆

دو دن...... دو دن وہ ان کے گھر رہا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر میں ہی نہیں بلکہ اس گھر کے مکینوں کے دلوں میں رہتا تھا...... امی جان اور ابا جی کے ساتھ وہ کتنے احترام سے بات کرتا اور نعیم سے دوستی تھی تو مذاق بھی چلتا تھا اور چھوٹے دونوں کے ساتھ وہ کھیلتے ہوئے بالکل بچہ بن جاتا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا مگر اس نے کتنی ہی بار اس کی نگاہوں کی چوریاں پکڑی تھیں اور خود اس کا دل اس کی کتنی ہی باتوں کا مطلب سمجھ کر دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

یہ عمر ہی ایسی نادان ہوتی ہے، وہ کوئی ایسی الھڑ اور نادان لڑکی نہیں تھی، نرس بن رہی تھی، یہ اس کا شوق تھا۔ اس شوق کی خاطر اسے کالج سے وابستہ اسپتال کے ہاسٹل میں رہنا پڑتا تھا، چھٹیوں میں وہ گھر آتی تھی۔ دوسرے شہر میں رہنے کے باعث ہاسٹل میں رہنا اس کی مجبوری تھی۔ وہ آخری سال میں تھی اور اسی عرصے میں نعیم کی قائم علی سے دوستی ہوئی اور اس کا گھر پر آنا جانا ہوا تھا، اس کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے ہی نعیم کے والدین نے قائم علی کو اپنے گھر کے فرد کی طرح گھر میں آنے جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

ایک ہفتے کی چھٹیوں پر وہ گھر آئی تھی، اس میں سے وہ دو دن کیسے گزرے...... اسے علم ہی نہیں ہوا اور اس کے بعد کا وقت کیوں تھم گیا تھا...... یہ بھی اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ''جان نہ پہچان، میں تیرا مہمان! ہونہہ!'' اس نے خود کو بے وقوفی پر ڈانٹا۔ ہر روز ڈیوٹی کے دوران اسے اور اس کی ساتھیوں کو کتنے ہی عاشق مزاجوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جو آتے تو کسی اور بیماری کی وجہ سے تھے لیکن نرسوں کی پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے غلط فہمی کا شکار ہو کر اُن کے عشق میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ نہ صرف وہ گھٹیا باتیں کرتے، کبھی کبھار تو انہیں شادی تک کی پیش کش کر دیتے تھے۔

ایسے مریضوں سے اس کا بھی بارہا پالا پڑا تھا مگر اسے ان سے نمٹنا آتا تھا۔ اگر کوئی زیادہ لیچڑ ہونے کی کوشش کرتا تو اس کی شکایت کی جاتی تھی ورنہ عام عاشقوں سے نمٹنا تو ان سب کو آ گیا تھا۔ صرف مریضوں پر ہی نہیں، کبھی کبھار عشق کا جعلی بھوت ان کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹروں کے سروں پر بھی سوار ہو جاتا تھا...... خصوصاً جن ڈاکٹروں کے ساتھ انہیں رات کی ڈیوٹی سر انجام دینا ہوتی تھی۔ اگر یہ ساری باتیں وہ اپنے والدین کو بتاتی تو وہ کبھی اسے اس کا شوق پورا نہ کرنے دیتے مگر اپنے شوق کی تکمیل کے لیے وہ اس معاملے سے خود ہی نمٹ لیتی تھی، نہ صرف وہ بلکہ اس کی باقی ساتھی لڑکیاں بھی، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ رات دیر سے ڈیوٹی کے اوقات میں اپنی کسی ساتھی کو تنہا نہیں ہونے دیا جائے۔ کبھی کبھار وہ ساری رات مختلف وارڈوں کے راؤنڈ لگا کر گزار دیتی تھیں۔

نعیم کا دوست کیا ہو کر گیا تھا، اس کے دل کی دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی...... عورت بھی عجیب ہی شے ہے، جو

"بابو جی کو کہلواؤ کہ میں آرہی ہوں۔" اس نے سستی کو جھاڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں بیٹھو زرتاج، میں تھوڑی دیر میں واپس آتی ہوں!"

"جی میں یہیں ہوں مگر میں بڑی بی بی کے کمرے میں چلی جاؤں گی، یہاں اکیلی کیا کروں گی۔ اماں کے آنے تک مجھے یہیں رکنا ہے۔" رابعہ کو اس کی احتیاط پسندی اچھی لگی۔ وہ اس کے اٹھتے ہی اٹھی اور رابعہ کی ساس کے کمرے میں جا کر ان کی چارپائی کی پائنتی بیٹھ کر ہولے ہولے ان کے پاؤں دبانے لگی، وہ بھی آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں جانے لگیں۔

"تم بہت اچھا دباتی ہو بیٹی!" انہوں نے اس کی تعریف کی۔ "مگر تم اپنی ماں کی طرح بولتی نہیں ہو، یہ تم میں اچھی بات ہے!"

"جی بہت شکریہ۔" اس نے حسبِ عادت مختصراً کہا۔

برآمدے کی طرف سے بھاری قدموں اور سیٹی کی آواز آرہی تھی۔ آواز قریب آرہی تھی، وہ الجھن میں تھی کہ بیٹھی رہے یا...... اسی اثنا میں وہ اندر آگیا، اسے دیکھ کر چونکا۔ اماں تو سو رہی تھیں۔

"کون ہو تم؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

وہ گڑبڑا گئی...... خاموش رہی۔

"گونگی ہو کیا تم؟" اس نے سر جھکا لیا۔ یہ تو اسے علم تھا کہ آنے والا مراد علی کا کوئی بیٹا ہی ہے لیکن تینوں میں سے کون سا...... یہ اسے علم نہیں تھا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی ماں جاگ گئی۔

"آؤ آؤ...... میرے بچے، کب آئے تم؟" اس نے ان کے آگے سر جھکایا اور انہوں نے اس کی بلائیں لیں۔

"ابھی آیا ہوں اماں! یہ کون ہے؟" اس نے بلا جھجک پوچھا تھا۔

"جو کوئی بھی ہے، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے!" ان کے انداز میں تنبیہہ تھی، جسے وہ خاطر میں کب لاتا تھا۔

"پھر بھی اماں ہے کون، اپنے گاؤں کی ہے کیا؟" اس نے اصرار کیا۔

"اپنے گاؤں ہی کی ہے۔" انہوں نے مختصراً کہا۔

"کس گھر میں یہ ہیرا چھپا ہوا تھا اور ہمیں خبر ہی نہیں تھی۔" اس نے بے شرمی سے کہا۔

"شرم کرو شجاع! تمہیں اپنی ماں کے سامنے بات کرنے کی تمیز ہونی چاہیے۔" انہوں نے اسے ڈانٹا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے اماں، اچھی چیز کی تعریف تو کرنی چاہیے ناں!" ڈھٹائی سے اس نے کہا۔

"ویسے یہ ہے کون اماں، واقعی اسے کبھی کہیں دیکھا نہیں ہے؟"

"تم اپنے کام سے کام رکھو۔" انہوں نے اسے گھور کر کہا۔

"یہی تو اپنا کام ہے اماں!" وہ ہنس کر ان کی گود میں لیٹ گیا۔

"تم باہر جاؤ لڑکی۔" انہوں نے اسے جانے کو کہا۔ وہ اٹھی اور باہر نکل کر سوچنے لگی کہ کس طرف کو جائے۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔

جانے میرے ساتھ بار بار قسمت ایسے مذاق کیوں کرتی ہے؟" اس نے بڑبڑا کر خود سے سوال کیا۔

"تم ٹھیک تو ہو زرتاج؟" جانے کہاں سے اچانک رابعہ نکل کر آ گئی تھی۔

"جی، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے اپنی آنکھوں کو مسل کر ان میں آنے والے آنسوؤں کا گلا گھونٹا۔

☆☆☆

اپنا سامان باندھ کر وہ تیار بیٹھی تھی اور انتظار میں تھی کہ نعیم گھر آئے تو اسے اس کے ہاسٹل چھوڑ کر آجائے۔ امی جان ہر دفعہ کی طرح اداس تھیں، جب بھی وہ چھٹی ختم ہونے کے بعد واپس جاتی تھی وہ اسی طرح اداس ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے تھے، جنہیں چھپانے کے لیے وہ منہ چھپا چھپا کر بیٹھتیں۔

"اب کی بار آؤں گی نا امی...... تو پھر بہت عرصے آپ کے پاس رہوں گی کیونکہ میں اپنے آخری امتحان سے فارغ ہو کر ہی آؤں گی!" اس نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔

"اور وہ اب کے کب آئے گی؟" وہ اداس ہو رہی تھیں۔

"صرف دو ماہ کے بعد امی...... اور اس دوران میں بالکل بھی نہیں آسکتی!" اس نے ماں کے دل کی کیفیت سے بے نیاز ہو کر کہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ مائیں اولاد کے انتظار میں گھڑیاں بھی صدیوں کی طرح بتاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی ابل کر باہر آ گیا تھا، مو جی ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس سے انہیں کتنا پیار تھا یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔

"آپ رو رہی ہیں امی؟" اس نے ان کے آنسو پونچھے۔ "روئیں نہیں امی! مجھے ہنس کر الوداع کہیں۔ اب آؤں گی تو پھر تو ہمیشہ آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ نوکری بھی کروں گی تو ایسی کہ مجھے اسی شہر میں رہنا پڑے۔" اس نے ماں کو دلاسہ دیا۔

"میرے پاس تو کب رہے گی، بیٹیاں ماں باپ کے گھر تھوڑی رہتی ہیں۔ اب تو تیرا پرائے گھر جانے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہارے ابا جی کو تو تمہارے اس شوق سے اسی لیے بیر ہے کہ اُن کے خیال میں اس عمر میں لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں ہوتی ہیں۔" امی جان نے کہا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "تم امتحان سے فارغ ہو کر آؤ تو اس بارے میں بھی فیصلہ کرنا ہے۔"

اسے معلوم تھا کہ اس کے خاندان میں کتنے ہی لڑکے اور ان کی مائیں اس کی طلب گار تھیں۔ بہت سوں نے تو اپنا سوال اس کے والدین تک پہنچا بھی رکھا تھا، رشتے تو سبھی اچھے تھے مگر اس بارے میں فیصلہ اس کی پڑھائی کے خاتمے تک موخر کر دیا گیا تھا۔ نعیم کے آجانے سے موضوع تبدیل ہو گیا تھا، اس نے اپنا سامان باندھ کر نعیم سے تانگہ لانے کو کہا اور خود ماں کے گلے سے لگ کر جانے کیوں رونے لگی۔

"نہ رو میری بیٹی، تم نہ آسکیں تو میں خود نعیم کو ساتھ لے کر تمہیں ملنے کو پہنچ جاؤں گی!" وہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ ان کی جدائی کے خیال سے اداس ہو رہی ہے، وہ بات بھی اپنی جگہ تھی مگر اس وقت وہ کیوں رو رہی تھی...... اسے خود بھی علم نہیں تھا۔

☆☆☆

وقت تھا...... دن مختصر ہوتا تھا، لوگ باگ کام کر رہے تھے، ایسے میں وہ زرتاج کو کہیں چھوڑ بھی نہ سکتی تھی اور یوں بھی کچھ عرصے سے اب اس سے کام ہوتا بھی نہیں تھا...... اس کے ہاتھوں کی لرزش اور نظر کی کمزوری نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ زرتاج پر زیادہ انحصار کرتی تھی۔ گاؤں میں دائیاں تو اور بھی تھیں مگر معراج کے ہاتھ پر سب کو اعتماد تھا...... اب اس کا ہنر اس کی بیٹی کو منتقل ہوا تھا تو یقیناً لوگ اسی کو ترجیح دیتے۔ ابھی تک زرتاج نے مکمل طور پر کوئی بھی زچگی نہیں کرائی تھی، ابھی اسے ماں کی مدد کے بغیر خود پر یقین ہی نہ تھا۔

معراج نے اپنی سلیٹی رنگ کی بڑی سی چادر اوڑھی اور زرتاج کو تیار ہونے اور اپنا سامان ساتھ رکھنے کو کہا۔ زرتاج نے ماں کے کہنے پر اپنی سیاہ چادر سے اپنے وجود کو چھپایا اور ماں کے پیچھے چل دی۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار سے ہو کر جانے والے راستے پر وہ دونوں آگے پیچھے چل دیں۔ سنار کی چھوٹی سی دکان کے سامنے زرتاج کے قدم سست پڑ گئے، اس نے سر کو ہلکا سا موڑ کر دکان کی طرف دیکھا...... وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا مگر زرتاج کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، زرتاج نے شرمیلی سی مسکراہٹ سے اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔ یہی اُن کا آپس کا تعلق تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھتے تو آپس میں مسکراہٹ کا تبادلہ کر لیتے تھے۔

شاکر، زرتاج کے ساتھ کی خواہش رکھتا تھا، ایک اس کی اکیلی ذات تھی، ابا کی وفات کے کچھ عرصے کے بعد اماں کا بھی انتقال ہو گیا تو وہ بھری دنیا میں تنہا ہو گیا۔ اس کی بہنیں اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں اور انہوں نے اپنی سی کوشش بھی کی، اپنے اپنے سسرالوں سے رشتے بھی پیش کیے۔ اس نے بہنوں کو ٹال دیا تھا کیونکہ اس کی نظر میں جو جچی تھی اس کے بارے میں وہ ابھی اپنی بہنوں سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ بات کرتا تو وہ طوفان کھڑا کر دیتیں، غیر خاندان یا غیر برادری میں وہ کیونکر اپنے اکلوتے بھائی کا رشتہ طے کر سکتی تھیں۔

اس نے معراج بی بی سے اس سلسلے میں بات بھی کر رکھی تھی۔ اس کا عندیہ لینا سب سے ضروری تھا، اپنی بہنوں سے وہ بعد میں بات کرتا۔ معراج بی بی کو بظاہر تو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر شاکر کے پاس اپنا رہنے کا ٹھکانا ایک کمرے پر مشتمل تھا جو کہ اس کی دکان کے ساتھ ہی تھا۔ معراج بی بی چاہتی تھی کہ کم از کم اس کی بیٹی کا ہاتھ بھی اس کام میں بیٹھ جائے اور تب تک شاکر اپنی دکان سے کچھ بچت جمع کر کے اپنے گھر کی حالت بہتر کر لے۔ اس نے دنیا دیکھی تھی اور اس بات کو سمجھتی تھی کہ اس کی بیٹی کا بیاہ ہو گا تو وہ جلد ہی دو سے تین اور تین سے چار ہو جائیں گے...... اس لیے ان کی ضرورت سے وہ گھر چھوٹا بھی تھا اور کچا بھی۔

شاکر علی، معراج بی بی کے اس مطالبے کو بالکل جائز سمجھتا تھا اور اس کا عہد تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو لے جانے سے پہلے اپنا گھر بنائے گا...... معراج بی بی سے اس نے کہا تو نہیں تھا مگر وہ سوچتا تھا کہ جیسی شہزادیوں کی آن بان جیسی اس کی زرتاج ہے، اس کے لیے وہ اس کے شایانِ شان گھر بنائے گا! اپنے گھر میں زرتاج کا تصور ایسا خوش کُن تھا کہ اس تصور میں وہ زندگی بتا سکتا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے...... قدم سست کیوں پڑ گئے ہیں تیرے؟“ معراج بی بی نے تھوڑی دیر ہی مسکراہٹوں کا تبادلہ برداشت کیا تھا۔ چوہدرانی کے مزاج کو بھی سمجھتی تھی اور شاکر کی دکان میں بیٹھے ہوئے گاہک بھی اسے

نظر آرہے تھے۔ یہ بات شاکر اور معراج کے درمیان ہی تھی مگر معراج کو یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کی بیٹی شاکر کا ساتھ پا کر خوش رہے گی اور غالباً شاکر کی خواہش میں اس کی بیٹی کی خواہش کا ساتھ بھی تھا۔ بیٹی کو اسے بیاہنا تو تھا، اس گاؤں میں کون سا ان کے کوئی اور رشتے دار تھے۔ شوہر کا سایہ سر سے اٹھا تو اسے اندازہ ہوا کہ مردوں کی اس دنیا میں جوان بیٹی کے ساتھ نے اس کی زندگی کو اور بھی مشکل کر دیا تھا...... اس نے زندگی میں کیا کٹھنائیاں دیکھی تھیں اور کن دکھوں نے اس کے وجود کو کھوکھلا کر دیا تھا، وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنی بیٹی کو وہ کسی قیمتی چیز کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ کسی زور آور کی نظر اس پر نہ پڑے، وہ تو اپنی کوششوں پر مطمئن تھی...... اسے یہ علم نہیں تھا کہ لعل تو گدڑی میں چھپے ہوئے بھی نظر آ جاتے ہیں اور اس کی چھپا چھپا کر رکھی ہوئی بیٹی کسی کی بدنظر میں آ چکی تھی کیونکہ زرتاج نے اس دن کی باتیں ماں کو بتائی ہی نہیں تھیں۔ جانے کیوں ماں کو ہر بات بتانے والی یہ بات چھپا گئی تھی، شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کی ماں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی...... اسی بات کو سوچتے ہوئے وہ اپنی ماں کے ساتھ نور علی کی حویلی میں پہنچ چکی تھی۔ اس حویلی میں وہ پہلی بار آئی تھی، یہ حویلی مراد علی کی حویلی سے قدرے بڑی لگ رہی تھی...... وہ اس حویلی کا پھیلاؤ دیکھ کر متاثر ہو گئی تھی۔

ماں کے قدموں پر قدم رکھتی وہ ملازمہ کی معیت میں طویل برآمدہ طے کر کے جب ایک کمرے میں داخل ہوئی...... شدید تکلیف کے باوجود بھی نور علی کی بہو نے چتون چڑھا کر ملازمہ سے کہا کہ اس لڑکی کو کمرے سے باہر نکال دیا جائے...... تو زرتاج بے چون و چرا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ ایک وسیع و عریض صحن کے گرد لپٹے ہوئے برآمدے میں کھڑی تھی۔ برآمدے کی منقش محرابیں تھیں اور ان برآمدوں کے آگے اتنے کمرے تھے کہ وہ شمار ہی نہیں کر سکتی تھی۔

”ان کمروں کے بند دروازے اپنے اندر جانے کتنے ہی بھید لیے ہوئے ہوں گے۔“ وہ اپنے ہی خیال میں کھڑی تھی، صحن میں درجنوں ملازمائیں کام میں مصروف تھیں...... کوئی لال مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ رہی تھی جنہیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالا گیا تھا۔ کوئی گندم صاف کر کے چکی میں پیس رہی تھی، کوئی بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ تین چار اکٹھے صحن کے ایک طرف بنے کھرے میں کپڑے دھو دھو کر الگنیوں پر پھیلا رہی تھیں۔ اسے اپنا وجود غیر ضروری محسوس ہوا، وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے کہ ایک ملازمہ نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے، وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دی۔

طویل برآمدہ طے کر کے ملازمہ ایک طرف کو مڑی تو اسے سامنے ہی سے منظر نظر آیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص آرام کرسی پر دراز تھے، ان کے ہاتھ میں حقے کی نے تھی، وہ کسی خیال میں گم نظر آ رہے تھے۔ ان کی شکل چوہدری مراد علی سے کتنی ملتی تھی، اسی لیے اس نے قیافہ لگایا کہ وہ چوہدری نور علی ہو سکتے تھے۔ نزدیک پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی زمین پر بیٹھی، ان کی پنڈلیوں پر کسی تیل سے مالش کر رہی تھی۔ اسے یہ منظر دیکھ کر بہت جھجک آئی، وہ لڑکی ان کی بیٹی تو نہیں ہو سکتی تھی یقیناً کوئی ملازمہ ہی تھی۔ کھلے سے گریبان کی قمیص پہنے، وہ نور علی کی آنکھوں کے لیے تراوٹ کا سامان بھی کر رہی تھی۔ اس نے نظریں چرا لیں...... ہلکی سی آواز میں اس نے سلام کیا، انہوں نے بغیر دیکھے سلام کا جواب دے دیا۔ یہی سمجھے ہوں گے کہ کوئی ملازمہ ہے۔

ے، انہوں نے اسے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ جو کچھ ان کے اور ان کے بیٹے کے
ے میں سن رکھا تھا، ان سے ایسی توقع نہ تھی۔

''جانے چوہدرانی صاحبہ خود کہاں ہیں اور وہ یہ سب نہیں دیکھ سکتیں کیا؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''آجاؤ جی!'' ملازمہ اسی کمرے میں داخل ہوئی تھی، جس کے دروازے کے باہر نور علی بیٹھے استراحت
ے ساتھ ساتھ مالش کروا رہے تھے۔ وہ اس کمرے میں جاتے ہوئے جھجکی کہ جانے کس کا کمرا ہوگا۔

کمرا کسی گھٹیا قسم کی تیز خوشبو میں نہایا ہوا لگ رہا تھا، اندھیرا اندھیرا سا کمرا اسے پُراسرار سا لگا جانے
یوں؟ بڑے سے کمرے میں بڑے بڑے پلنگ اور بھاری بھاری صوفے تھے، انہی پلنگوں میں سے ایک
چوہدرانی شکیلہ کسی ملکہ کی سی آن بان سے پلنگ پر دراز تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی اپنے شوہر کی طرح تفکر کا
ل تھا شاید وہ دونوں اس وقت تقدیر کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سلام کیا تو چوہدرانی نے سر اٹھا

ر دیکھا۔

یہ کشمیری سیبوں جیسے گالوں والی لڑکی کون تھی...... انہوں نے اس سے قبل اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو
سی ملازمہ سے معراج بی بی کی آمد کا دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ پہنچ گئی تھی اور ساتھ میں اس کی بیٹی بھی
تھی۔ اس بیٹی کا ذکر تو معراج اکثر ہی کرتی تھی اور اس سے وابستہ پریشانیوں کا بھی، اس کے تصور میں تو ایک
وکھی سی نوجوان لڑکی تھی جس کی جوانی سے معراج خوف زدہ تھی اور ہر وقت اس کی شادی کی فکر میں گھلتی رہتی تھی
مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ اتنی حسین ہوگی۔

''اے لڑکی...... کیا نام ہے تمہارا؟ اِدھر آؤ!'' تخاطب...... سوال اور تحکم، فقط ان الفاظ نے ہی اسے بتا
دیا تھا کہ اس حویلی کے لوگ کسی دوسرے کو انسان نہیں سمجھتے۔ بڑی حویلی میں رہنے والے چھوٹے دل اور تنگ
نظر تھے...... اس نے لمحوں میں شکیلہ بی بی اور عابدہ بیگم کا موازنہ کیا، وہ اسے اخلاق کے بلند درجے پر نظر
آئیں۔ کتنی عزت اور پیار سے بات کرتی تھیں، وہ بھی اور ان کی بہو رابعہ بھی...... شکیلہ اور ان کی بہو، دونوں کا
ہتک آمیز رویّہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے ان کے تخت کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

''اس کے بیٹھنے کے لیے کچھ لاؤ۔'' بلند آواز میں انہوں نے پکار کر حکم جاری کیا تو چند لمحوں میں ایک
ملازمہ تیزی سے ایک پیڑھی لے کر آگئی اور اسے ان کے پلنگ سے ذرا فاصلے پر رکھ دیا۔

''بیٹھو!'' اسے حکم جاری ہوا، اس نے پیڑھی کو دیکھا پھر پلنگ کو...... پھر اس پر نیم دراز چوہدرانی کو......

کچھ سوچا۔

''کیا وہ مجھے اتنا نیچ سمجھ رہی ہیں!''

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' وہ برہم ہوئیں۔ ''تم کوئی تھانے دار ہو جو کھڑی رہو گی!''

وہ ان کے غصے سے سہم گئی، ان سے بحث کرنے کی مجال نہ تھی مگر پیڑھی پر بیٹھنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔
چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ ان کے پلنگ کی پائنتی کے سرے پر ٹک گئی۔ شکیلہ کے چہرے کی
ناگواری قابلِ دید تھی۔

''ٹھیک سے بیٹھ جاؤ!'' وہ بھی ایک کائیاں اور زمانہ شناس عورت تھی، اس کی جھجک کو وہ سمجھ گئی تھیں۔ پھر اس کے تخت پر ٹک جانے سے تو وہ یہی سمجھیں کہ اس لڑکی کے پاس صرف حسن ہی نہیں...... غرور بھی ہے۔ غرور انہوں نے اپنے سوا کب کسی کا برداشت کیا تھا۔ انہیں اس کا غرور توڑنا تھا، اس کی انا کو توڑ کر ہی ان کو سکون ملنا تھا۔ انہوں نے پاؤں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کو جگہ بنائی، زرتاج ٹھیک سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شکیلہ نے اپنے دونوں پاؤں اٹھائے اور انہیں زرتاج کی گود میں رکھ دیا۔

''پاؤں دباؤ لڑکی!'' پاؤں تو وہ عابدہ بیگم کے بھی دباتی تھی مگر اس لیے کہ وہ اسے ماں جیسی مشفق لگتی تھیں...... پاؤں تو اس کی ماں بھی دباتی تھی مگر اسے اس کام کا معاوضہ ملتا تھا۔

''اپنے پاؤں پرے کریں۔'' وہ یوں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے اس کی گود میں کسی نے سانپ رکھ دیا ہو۔

☆☆☆

''چلو لڑکیو واپس چلو...... آج اتنی مشکل سے کلثوم کو لے کر آئی تھی اور وقت پر نہ لوٹی تو نہ صرف بے عزتی ہوگی بلکہ آئندہ کبھی کلثوم کو آنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی۔'' دیا نے ساری سہیلیوں سے کہا، جو مختلف کھیلوں میں مصروف تھیں، کملا چاچی نے تو اپنا کام گھنٹے بھر میں ہی سکھا دیا تھا۔ سب گھروں کے مردوں کے آنے میں دیر تھی اس لیے وہ ذرا کھیل میں مصروف ہوگئیں مگر دیا کو بی بی جی کا لہجہ یاد تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی اس لیے اس نے سب سے واپسی کے لیے اصرار کیا۔

ساری سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کی سمت میں مڑ گئیں، کاجل اور دیا کے گھر ایک ہی گلی میں تھے مگر اس سے پہلے اسے کلثوم کو گھر چھوڑنا تھا۔ تینوں آگے پیچھے چل رہی تھیں۔

''دیا تو کلثوم کو تو اپنے راز میں شریک کر لے۔'' کاجل نے اس کے کان میں کہا۔

''کیا بات کی ہے تم نے دیا کے کان میں؟'' کلثوم نے اسے سرگوشی کرتے پکڑ لیا تھا۔

''کچھ...... کچھ بھی تو نہیں!'' دیا ہکلائی۔

''بات اس نے کی ہے...... صفائیاں تم دے رہی ہو!'' کلثوم نے کہا۔ ''بتا کاجل...... کیا بات کی ہے تو نے؟'' کاجل آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

''کاجل تجھے قسم ہے میری اگر تو نے مجھ سے جھوٹ بولا، ہماری دوستی ختم ہو جائے گی اگر مجھے نہ بتایا، میں کبھی بھی تم لوگوں سے بات کروں گی نہ تمہارے ساتھ کسی کھیل اور تفریح میں شریک ہوں گی!'' اس نے ان دونوں کو دھمکی دی۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے کلثوم...... ہم تم سے کیوں چھپائیں گے اور یوں بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے...... اور اس بات کا تم سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔'' کاجل گڑبڑا گئی تھی، عجیب سی صورتِ حال ہوگئی تھی۔ وہ اپنی بے وقوفی پر خود کو کوس رہی تھی۔

''میں نے خود اپنا نام سنا ہے تمہاری سرگوشی میں...... دیکھو کاجل میں نے تمہیں اپنی قسم دی ہے۔ اگر تم نے مجھ سے یہ بات چھپائی تو اچھا نہ ہوگا!'' کلثوم نے پھر اصرار کیا۔ دیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں،

"اچھا دیکھ کلثوم...... وعدہ رہا کہ میں جلد ہی تمہیں یہ بات بتاؤں گی، ابھی وقت نہیں ہے، تمہارا لالہ بھی آنے والا ہے۔ بات لمبی ہے، سننے کو رکو گی تو دیر ہو جائے گی اور پھر بی بی جی ناراض ہوں گی!" کاجل نے اس سے وعدہ کیا۔ "اور ایک بات ضروری تمہیں بتاؤں کہ واقعی تمہارے متعلق بات نہیں ہے، تمہارا نام کیوں لیا یہ بھی تمہیں بتا دوں گی!" دونوں نے کلثوم کو اس کے گھر چھوڑا اور اپنے گھروں کی طرف چل دیں، دیا روئے جا رہی تھی۔

"چپ بھی کر جاؤ اب، کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟" کاجل نے دیا کو گھرکا۔

"تمہیں منع بھی کیا تھا مگر تم جانے کیوں خالی برتن کی طرح کھڑکتی رہتی ہو، اب تم کلثوم کو بتاؤ گی پھر ایک ایک کر کے باقی سب کو بھی۔" دیا نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ "اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں تمہیں راز دار ہی نہ بناتی!"

"تمہارا ہی فائدہ ہے اس لیے کلثوم کو راز میں شریک کرنے کا سوچ رہی ہوں...... یہ بہت ضروری ہے، اپنے لالے کے دل کی کیفیت وہی ہمیں بتا سکتی ہے۔" کاجل نے صفائی دی۔

"معلوم ہے مجھے اس کے لالے کے دل کی کیفیت!" دیا نے کہا۔

"واہ بھئی واہ! معاملہ تو بہت دور تک آگے نکل گیا ہے...... اب تمہارے نکلنے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی کہ یوں تو تمہارے پتا جی عباس سے تمہارا بیاہ کبھی بھی نہیں کرنے والے۔" کاجل نے ہنس کر وہ بات کہہ دی تھی جس کی بابت وہ اور عباس سوچتے تھے۔ عباس کہتا تھا کہ بی بی جی کبھی بھی نہ مانیں گی اور یہ کہ وہ دونوں صرف اس صورت میں شادی کر سکتے تھے اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے اور یہ شادی انہیں گھر سے بھاگ کر کرنا ہو گی۔ تاہم کاجل سے اس نے مزید کوئی بات نہ کی کیونکہ پہلے ہی اسے شریک راز بنا کر وہ پچھتا رہی تھی۔

"اری دیکھ! سامنے کھیتوں کی طرف سے کون آ رہا ہے۔" کاجل نے اسے اشارہ کر کے کہا، جسے وہ اتفاق سمجھ رہی تھی وہ ان کا منصوبہ تھا۔

"اچھا تو چل پھر آگے، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں...... اور دیکھ میرے بغیر گھر نہ جانا، اگلی گلی میں میرا انتظار کرنا!" اس نے اسے تاکید کی اور ساتھ ہی اسے آگے کو دھکیلا مبادا وہ نہ جائے۔

"میں اس وقت شام کو اکیلی کیسے گلی میں جا کر کھڑی ہو جاؤں؟" کاجل نے سوال کیا۔

"اچھی سہیلی ہے تو، میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی؟" دیا نے اسے چمکارا تو وہ بے دلی سے چل دی۔ چند قدم آگے بڑھ کر دیا، عباس کے پاس تھی، شام کا ملگجا سا اندھیرا تھا اور اس طرف سے بہت کم لوگ آتے تھے۔ دیا نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور اس پگڈنڈی پر پہنچ گئی، جہاں عباس ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا، دیا اس کے قریب پہنچی تو اس نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

☆☆☆

"بڑا نخرہ ہے تیرا۔" شکیلہ بی بی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "سمجھتی کیا ہے تو خود کو، معراج کی بیٹی ہے ناں اور سنا ہے اسی کا کام سیکھ رہی ہے۔ اگر معراج میرے پیر دبا سکتی ہے تو تجھے کیا تکلیف ہے؟"

اس نے حیرت سے سر اٹھا کر اس مغرور عورت کی طرف دیکھا، تنی تنک بھی ان کے انداز میں...... جیسے اس کی ماں کا کام کوئی گھٹیا کام ہو اور اتنا گھٹیا کہ اس کی اور اس کی ماں کی حیثیت چوہدرانی کی نظروں میں ملازماؤں کی سی تھی۔ اس نے اپنے غصے کو اپنے وجود کی گہرائی میں دبایا اور آنسوؤں کو آنکھوں میں آنے سے روکا۔ وہ اس موقع پر کمزور پڑ کر اس عورت کی انا کی تسکین نہیں کر سکتی تھی۔

"ہو سکتا ہے جی کہ میں یہ کام کروں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ کروں...... میری ماں مجھے یہ کام اس لیے سکھا رہی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ عورت کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہونا چاہیے تاکہ مشکل وقت میں اسے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ ابا کے مرنے کے بعد اماں کو یہ کام نہ آتا ہوتا تو وہ بھی......"

"بس بس زیادہ باتیں نہ بگھار۔" وہ تو پہلے ہی کم بولتی تھی، جانے کیسے اس روز زبان کھولی تھی اور ساتھ ہی اسے حکم زبان بندی مل گیا تھا۔

"واپس بیٹھو اور پاؤں دباؤ میرے۔" وہ تذبذب میں تھی کہ کس طرح انکار کرے...... یا پھر بیٹھ جائے اور حکم کی تعمیل کرے...... مگر اس کی رگوں میں بھی جوان خون تھا اور اس کے اندر بھی کوئی انا تھی۔

"کیا ہو گیا ہے چوہدرانی...... کیوں شور مچا رکھا ہے؟" باہر سے نور علی گرجے۔ "کس غریب کی شامت آئی ہے تیرے ہاتھوں؟"

"تم تو خاموش ہی رہو جی! میرے معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسی غصیلے انداز میں انہوں نے شوہر سے کہا۔ زرتاج نے تو باعزت گھرانوں کا مطلب یہی سمجھا تھا کہ جہاں سب کی عزت کی جاتی ہے لیکن یہاں تو اس نے دیکھا کہ شکیلہ بی بی کے ہاں عزت کرنے کا تصور تھا نہ کروانے کا۔

"سارا دن بک بک کر کے تھکتی بھی نہیں ہے یہ عورت۔" انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی عزت افزائی کی مگر ذرا جو وہ شرمندہ ہوتیں، الٹا سارا غصہ اسی غریب پر نکالا۔

"دفع ہو جا...... تو یہاں کھڑی ہو کر باتوں کے کیا چسکے لگا رہی ہے؟" اس کی آنکھیں تو ہر وقت ہی پانی سے بھری رہتی تھیں، حلق میں گولے سے پھنسنے لگے تاہم یہ بے عزتی نما اجازت نامہ اسے غنیمت لگا اور وہ باہر کی طرف بھاگی۔ اس وقت تک نور علی متجسس تھے کہ یہ عزت افزائی کس کی ہو رہی تھی، وہ اٹھے تھے دیکھنے کو اور وہ باہر نکلتے نکلتے ان سے ٹکراتے ہوئے بچی تھی۔ انہوں نے اس کی جھلک دیکھی اور حیران رہ گئے، وہ تو سمجھ بیٹھے تھے کہ کسی چہیتی ملازمہ کی شامت آئی تھی۔ ایسی ہی تھی شکیلہ کی عادت کہ ان کی کوئی چہیتی ملازمہ جب نور علی کی چہیتی بن جاتی تھی تو اس غریب کی شامت آ جاتی تھی...... اگرچہ نور علی کو کسی اسٹیشن پر گاڑی زیادہ عرصے تک روکنے کی عادت نہ تھی مگر شکیلہ کے عتاب کے سلسلے تب تک دراز رہتے تھے جب تک وہ اس ملازمہ کو سزا دے کر اپنی جاگیر سے نکالا نہ دے دیتیں۔

"کون تھی یہ؟" فوراً کمرے میں جا کر شکیلہ سے پوچھا۔

"سارے گاؤں کی لڑکیاں تم نے دیکھ اور برت رکھی ہیں، تم سے زیادہ کس کو معلوم ہو گا کہ کون ہے یہ۔" چڑ کر شکیلہ نے کہا۔

"بخدا، اسے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا...... اور یہ تم ہر وقت مجھے فضول کے طعنے مت دیا

کرو!'' تمام جوانی اور ادھیڑ عمری اسی طرح کے کاموں میں گزار کر اب وہ عمر کے اس دور میں تھے جب آدمی کی ہمت جواب دے جاتی ہے مگر نظر کا لالچ قائم رہتا ہے۔

''پہلے نہیں دیکھا تو اب دیکھ لیا ہے نا...... اگر تم نے اس سے بیاہ کرنا ہوا تو پھر میں تمہیں بتا دوں گی کہ کون ہے!'' شکیلہ نے اسی لہجے میں کہا۔ ان کی سہروں کی بیاہی ہوئی بیوی تھیں مگر انہیں ان کی من بھائی بیوی ہونے کا مان کبھی نہیں مل سکا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہر وقت چڑی چڑی سی رہتی تھیں اور جب بھی موقع ملتا تھا ان کی بے عزتی کر دیتی تھیں۔ جس کام سے وہ تائب ہو چکے تھے، وہ کام اب ان کے بیٹوں نے سنبھال لیا تھا۔ نور علی تو دم دبا کر بھاگ چکے تھے، ملازموں کے سامنے اس نامعقول عورت سے بے عزتی کروانے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے حالانکہ ایسی نوبت بارہا آ چکی تھی۔

ان کے جاتے ہی شکیلہ بی بی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی تھی...... ایک شیطانی خیال نے ان کے دماغ میں آ کر انہیں ایک نئی راہ سجھائی تھی...... معراج کی بیٹی کے غرور کو توڑنے کے لیے وہ اپنے شوہر کی ان ''صلاحیتوں'' کو استعمال کر سکتی تھیں جن کی وجہ سے ان کی ساری زندگی عذاب کی طرح گزری تھی۔

☆☆☆

امتحانوں سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹی تو اسے علم تھا کہ اب اس کے بیاہ کی تیاریاں ہوں گی...... اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس سے قبل تو وہ یہ سوچتی تھی کہ جو فیصلہ اس کے ماں باپ اس کے لیے کریں گے وہی اس کے لیے بہترین ہوگا مگر پچھلی بار گھر سے ہو کر آئی تھی تو دل کی کیفیت ہی مختلف تھی۔ اب جو اس کی اپنی کولیگز کے ساتھ شادی کے موضوع پر گفتگو ہوتی، ہر کوئی اپنی رائے کا اظہار کرتی تھی...... کوئی اپنے منگیتر کی بابت بتاتی، کوئی اپنی پسند اور کوئی خواہش۔

اس کی خوش شکلی اور احتیاط پسندی نے جہاں بہت سوں کو ہوس میں مبتلا کیا تھا، وہیں اس کے ایک سینیئر ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم نے اسے ایک روز اپنے دفتر میں بلوا بھیجا۔

''آپ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس جا رہی ہیں پھر جانے کب ملاقات ہو؟'' انہوں نے اس سے بات کا آغاز کیا۔ ہر وقت سنجیدہ سے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ڈاکٹر سلیم کی طلبی کا بھی اسے مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا اور ان کی بات کی تمہید......؟ وہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر ہمیشہ کی طرح سنجیدگی تھی۔

''جی سر!'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''میں بہت عرصے سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا!'' ان کے اتنے ہی الفاظ نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں، وہ خاموش رہی۔ ''میں بات کو زیادہ گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتا!''

''میں بھی سیدھی بات کرنے کی عادی ہوں سر اور زیادہ پہیلیاں بوجھنے اور بجھوانے کی شوقین بھی نہیں!'' اس کا انداز بھی دو ٹوک تھا۔

''میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور اسی لیے آپ کے ساتھ کا خواہش مند ہوں، اگر میں آپ کے والدین کے پاس رشتہ بھیجوں تو؟'' انہوں نے ذرا سا ہچکچاتے ہوئے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی دی تھی۔

''سر!'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں آپ کی منت کرتی ہوں سر ایسا نہ کیجیے گا۔

''کیوں، کیا ہوا، آپ پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میرے ابا جی کا اعتماد مجھ سے اٹھ جائے گا سر...... بلکہ دنیا کے ہر باپ کا اعتماد بیٹیوں سے اٹھ جائے گا اور پھر کوئی بیٹی نہ پڑھ سکے گی، چاہے اسے جتنا بھی شوق ہو جتنی بھی خواہش ہو۔'' اس کا لہجہ جذباتی سا ہو گیا۔

''اوہ! یہ بات ہے، میں تو ڈر ہی گیا تھا، میں سمجھا کہ آپ کی کہیں خدانخواستہ منگنی ہو چکی ہے یا آپ شاید کسی کو پسند کرتی ہوں!'' انہوں نے ٹھنڈی آہ سینے سے خارج کی۔

''وہ بات بھی ہے سر۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''کیا آپ کسی کو پسند کرتی ہیں؟'' انہوں نے مایوسی سے سوال کیا۔

''نہیں سر! میری منگنی ہو چکی ہے۔'' جانے اس نے کیسے بنا سوچے سمجھے جھوٹ بول دیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلیم کا چہرہ اس سے دیکھا نہیں گیا تھا مگر پھر بھی...... وہ ایسی بات تھی اپنی قریبی سہیلیوں سے بھی نہیں کر پاتی تھی، اس کے لبوں تک بات آ کر رہ جاتی تھی، اس کے پاس نہ کوئی منگیتر کی داستان تھی نہ پسند کا قصہ...... بس ایک موہوم سی خواہش کا سرا تھا جو اس کے ہاتھ میں بھی مضبوطی سے قائم نہ تھا۔

☆☆☆

اسے معلوم تھا کہ خاندان میں ہی اس کے امیدواروں میں سے کسی کے نام قرعہ نکلے گا...... اس کے والدین اس کی رائے بھی پوچھتے تو کیا وہ اس کا نام لینے کی جرأت کر سکتی تھی، جسے وہ اس کے نام سے زیادہ جانتی بھی نہیں تھی...... مگر کچھ تو تھا اس میں جو ایک ملاقات میں ہی اس نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

''موجی تجھے میں ہمیشہ ساتھ ساتھ بتاتی رہی ہوں، جو بھی رشتے آتے رہے وہ سب اپنے دیکھے بھالے ہیں، اپنے خاندان کے ہیں اور تو بھی ان سب کو جانتی ہے۔'' امی جان نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ''اگر تیری ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی مثبت یا منفی رائے ہو تو مجھے بتا دے۔ ماں، بیٹیاں تو ہوتی ہی ایک دوسرے کی سہیلیاں ہیں، مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ دے...... اگر تمہاری کسی کے بارے میں کوئی رائے نہیں ہے تو پھر ہم خود ہی کوئی فیصلہ کر لیں گے!''

''جی امی جان!'' اس نے کھوئے کھوئے انداز سے کہا۔

''کیا بات ہے موجی؟'' امی جان نے تشویش سے پوچھا۔ ''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

''ہوں۔'' وہ بے خیالی سے بولی۔

''موجی...... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''جی امی جان!'' وہ یکدم چونکی۔ ''سب ٹھیک ہے...... میرا مطلب ہے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں، وہ سب ٹھیک ہے!'' اس کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا، یہ کیسا راز تھا جو وہ خود سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی ماں سے کیسے کہہ دیتی۔

''مجھے بتاؤ...... کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟'' انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ''اگر ایسا ہے تو تمہارے ابا جی تو کبھی نہ مانیں گے بلکہ وہ تو اس بات پر طوفان کھڑا کر دیں گے، وہ تو تمہارے دوسرے شہر جا کر پڑھنے کے حق میں ہی نہیں تھے!''

''امی آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں...... اس بات کا میرے دوسرے شہر جا کر پڑھنے سے کوئی تعلق

''تو پھر کیا بات ہے؟'' انہوں نے اطمینان کی گہری سانس لی تھی۔
''کوئی بات نہیں ہے امی جان!'' اس نے ان سے نظر چراتے ہوئے کہا۔
''موجی میں تمہاری ماں ہوں اور مجھ سے بہتر اس بات کو کوئی نہیں جانتا کہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''یہ اور بات ہے کہ تم وہ بات مجھ سے چھپانا چاہتی ہو، میں بھی اصرار نہیں کروں گی...... لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ کسی لمحے کو ہاتھ سے کھو کر انسان ساری زندگی کے لیے پچھتاتا ہے...... میں نے تمہارے پڑھائی کے شوق کے لیے تمہارے ابا جی سے ٹکر لی تھی، اب بھی اگر کوئی ایسی بات ہے تو کہہ دو...... میں تمہاری خاطر ان سے پھر ٹکر لینے کو تیار ہوں!''
''میری پیاری امی جان!'' وہ اٹھی اور ماں سے لپٹ گئی۔ ''میں آپ کو ہمیشہ تنگ کرتی ہوں۔ آپ کتنی اچھی ہیں، میری ہر خواہش کو ترجیح دیتی ہیں۔''
''تم میری جان ہو بیٹی! تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔'' وہ اسے لپٹا کر بولیں۔ ''اب بتاؤ کہ وہی بات ہے ناں جو میں سمجھی ہوں؟''
''امی جان۔'' وہ ان کے سینے میں سر چھپا کر ہنس دی۔
''کون ہے وہ؟'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔
''آپ نے آدھی بات بوجھی ہے تو اب یہ بات بھی خود ہی بوجھیں...... میں نہیں آپ کو بتانے والی!'' اس نے لاڈ سے کہا۔ ''صرف اتنا کہوں گی کہ اس کا تعلق میرے کالج سے ہے نہ اسپتال سے۔''
''یہ تو بڑی عجیب پہیلی ہے موجی! کوئی اشارہ تو دو۔'' وہ بھی مسکرائیں۔ وہ ایسی ہی تھیں فراخ دل، اولاد کو دوست سمجھنے والی اور ان کے مسائل کو سمجھنے والی۔
''آپ کچھ دن کا وقت لیں اور خود سوچیں...... آپ کو خود معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی کے دل میں کیا ہے!'' موجی نے ماں کو آزمائش میں ڈالا۔
''چلو تم کچھ دن سوچنے کا وقت دے رہی ہو تو میں سوچ کر اس کا جواب ڈھونڈ لوں گی۔'' اسے تو انہوں نے یہ کہہ دیا تھا مگر دن کا باقی ہر پل انہوں نے اسی بات کو سوچتے ہوئے گزارا تھا۔ اسی لیے رات کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹیں تو انہیں ان کے سوال کا جواب مل چکا تھا، انہیں اپنے اندازے کی درستی پر پورا یقین تھا۔ اگرچہ اس کی تصدیق ضروری تھی مگر اپنی بیٹی کے دل کے راز کو وہ پا گئی تھیں۔
اگر ان کا اندازہ درست ہوا تو اس بات کے لیے وہ اس کے ابا کو کیسے منا پائیں گی، ایک ایسی بات جس کے لیے ان کا اپنا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ اگر ان کی لاڈلی بیٹی کو کھیلن کو چاند چاہیے تھا تو اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ جس چاند کی تمنا وہ کر رہی ہے، اس میں ایک ایسا داغ تھا...... جس کے بارے میں علم ہونے پر ان کی بیٹی خود ہی اس مطالبے سے دست بردار ہو جاتی۔ کاش اس میں یہ کمی نہ ہوتی...... تو اس سے بہتر داماد انہیں بھلا اور کون مل سکتا تھا۔ انہیں خاندان میں رشتہ ہونے کی صورت میں، کسی نہ کسی کی ناراضی مول لینا تھی۔ جس کو رشتہ دیتے وہ تو خوش ہو جاتے اور دوسرے تمام فریقین ناراض ہو جاتے۔ ان کا رجحان میکے کی طرف تھا کیونکہ ان کے
جہاں میٹرک کو ''کافی'' تعلیم سمجھا جاتا تھا کہ سب لڑکوں کو کاروبار کرنا ہوتا تھا جس کے لیے تعلیم کا ہونا نہ ہونا مترادف سمجھا جاتا تھا۔
کیسا ہیرا بچہ تھا، جس کی چاہت میں ان کی بیٹی مبتلا ہو گئی تھی...... ''مگر جب وہ جان جائے گی کہ وہ اس کے قابل نہیں ہے تو......؟ لیکن اگر موجی یہ جان کر بھی اپنی خواہش پر قائم رہی تو! وہ سوچ رہی تھیں...... اگر موجی کی چاہت برقرار رہی تو، میرا وعدہ ہے موجی...... سارے خاندان سے ٹکر لے لوں گی، تیرے ابا سمیت مگر تیری تمنا ضرور پوری ہو گی...... یہ تیری ماں کا تجھ سے وعدہ ہے!'' انہوں نے مسکرا کر کروٹ بدلی، اس طرف، جس طرف ان کی سوچوں سے بے نیاز، موجی کے ابا بہ آواز بلند خراٹے لے رہے تھے۔
''جاگتے میں بھی شور کرتا ہے یہ بندہ اور سوتے میں تو اور بھی دھاڑتا ہے!'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسیں۔

☆☆☆

اکبر علی صبح سے ہی کھیتوں میں تھا اور فصل کی بوائی کی نگرانی کر رہا تھا...... ہر طرف کام کرنے کے لیے مزارعے تھے اور کاشتکار مگر جب تک مالک خود سر پر نہ ہوں بھلا دوسرے کام کیسے کر سکتے ہیں۔ نور علی کا چھوٹا بیٹا بابر تو اپنے عیش میں ہی مصروف رہتا تھا، شجاع کی طرح اس کی سرگرمیاں بھی پُراسراری تھیں۔ مزاج اور عادات تو دونوں بیٹوں کے باپ پر ہی پڑے تھے۔ اکبر علی نسبتاً اس لحاظ سے بہتر تھا کہ شادی ہو جانے اور تین بیٹیوں کی پیدائش سے اس کی ظاہری عادات میں فرق پڑ گیا تھا۔
سورج کی حدت زیادہ محسوس ہونے لگی تو وہ اٹھ کر سائے میں آ بیٹھا اور کھیتوں میں کام کرنے والوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں تھوڑا سا احساس ہمدردی کا جاگا، ان لوگوں کے لیے جو کہ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اسی جیسے لوگ تھے جو انتھک کام کر رہے تھے اور وہ کام کی نگرانی کرتے کرتے تھک گیا تھا، آ کر چھاؤں میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ سب ایسا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کے مالک کا حکم نہ تھا اور مالک سر پر کھڑا ہو تو کوئی کام میں ڈنڈی نہیں مار سکتا تھا۔
درخت سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھا تو نیند کے ہلکے ہلکے سرور کا غلبہ آ گیا اور اس کی آنکھیں مند گئیں۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ گہری نیند میں تھا۔ اس کے قریب ہی ہلکی ہلکی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ تو ان آوازوں کو نہیں سن رہا تھا جبکہ ہنسنے والیاں نہ صرف اسے دیکھ رہی تھیں بلکہ اس کی خوب صورتی سے بھی متاثر ہو رہی تھیں۔ دونوں آپس میں اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ کیسا بانکا سجیلا نوجوان تھا...... غریب مزارعوں کی بیٹیوں نے کب خواب میں بھی ایسے خوب صورت اور گبرو جوان دیکھے ہوتے ہیں۔
وہ دونوں ذرا سی دیر کو سستانے کے لیے سائے میں آئی تھیں، اپنے کھانے کی پوٹلیاں کھول کر بیٹھی وہ مسلسل اس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں کہ یک لخت رانی کو کچھ عجیب سا احساس ہوا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''نگی!''
''کیا بات ہے رانی؟'' نگی نے پوچھا۔
''نگی، مجھے کچھ نظر آ رہا ہے، شاید کوئی سانپ ہے۔'' اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"ذرا اندھیرا سا ہے، یونہی تمہیں وہم ہوا ہوگا۔" نگی نے کہا۔

"نہیں نگی، مجھے وہم نہیں ہوا۔ کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔" اس نے سراسیمہ انداز میں اس کو گھورا۔

"تو پھر تم دور رہو، نزدیک مت جاؤ، کسی کو مدد کے لیے بلاتے ہیں۔" نگی نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ کر کھینچا۔

اس سے قبل کہ وہ دونوں کسی کو بلاتیں یا کوئی تدبیر کرتیں، انہیں اکبر علی چیختا اور تڑپتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ وہ دونوں گھبرا گئیں اور زور زور سے چیخنے لگیں، رانی نے نیچے بیٹھ کر تڑپتے ہوئے اکبر علی کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور ان کا چہرہ تھپتھپانے لگی...... بے اختیاری میں اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ ان کے شور کی آوازوں سے جلد ہی بہت سے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں آ رہی تھیں، اکبر علی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ چند نوجوان لڑکوں نے مل کر اس کو اٹھایا اور بھاگ پڑے، ان کے پیچھے پیچھے پورا ہجوم بھاگ رہا تھا اور اکبر علی کی خیریت کے لیے دعاؤں کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں رانی کے ہاتھ بھی تھے...... اس کا امنگوں بھرا دل کتنے عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔

اسے اب بھی اکبر علی کے وجود کا لمس اپنی گود میں محسوس ہو رہا تھا، جب کسی نے اسی کی اوڑھنی کو جلدی سے اس کے سر سے اتار کر اس کا آخری سرا پھاڑ کر اس کی پٹی اکبر علی کی اس ٹانگ پر سانپ کے کاٹے کے زخم کے آگے باندھا تھا، اپنی اوڑھنی کا باقی حصہ اس نے اپنے وجود کے گرد لپیٹ لیا، اس کی اوڑھنی کے حقیر سے ٹکڑے کو اس کے تن کا لمس محسوس ہوا تھا، جس کی دید نے ہی رانی کی پیاسی روح کو سیراب کر دیا تھا۔

"رانی، تیری اوقات کیا ہے، نالی کے کیڑے جیسی اور تو دل میں کیا سپنا بسا بیٹھی ہے!" اس نے خود کو سرزنش کی۔

"تو ٹھیک تو ہے رانی؟" نگی نے اس کی طرف دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

"میں؟" کھوئے کھوئے لہجے میں اس نے کہا۔ "مجھے کیا ہوا ہے۔"

"تجھے کچھ نہیں ہوا تو اس طرح چپ چپ سی کیوں ہے؟" نگی نے پوچھا۔

"پتا نہیں نگی...... مجھے لگتا ہے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے!" وہ اسی انداز میں بولی۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے، کملی نہ ہو تو!" نگی نے اسے چٹکی کاٹ کر کہا۔

"نگی! چوہدری صاحب کو کچھ ہو نہ جائے۔" وہ بڑبڑائی۔

"کچھ نہیں ہوتا چوہدری صاحب کو، گاڑی میں ڈال کر شہر لے گئے ہوں گے۔" نگی نے بے پروائی سے کہا۔ "چوہدری صاحب کوئی ہم جیسے غریب یا لاوارث تو نہیں ہیں کہ انہیں کچھ ہو جائے۔"

رانی کا دل پھر بھی مطمئن نہ تھا، وہ خاموش رہی۔

"گھر چلنا ہے یا یہیں بیٹھے رہنا ہے تجھے؟ میں تو چل رہی ہوں!" نگی نے اپنا سامان اٹھایا اور چل دی۔

"چلتی ہوں، ذرا رک تو...... کیسی جلدی میں ہے تو!" وہ بے دلی سے اس کے ساتھ چل دی دل سے وہ چوہدری صاحب کی خیریت کی دعائیں کر رہی تھی۔

"پھر جانے کب اس گاؤں میں آنا ہوگا اور علم ہوگا کہ چوہدری صاحب پر کیا گزری۔" اس نے سوچا، دل کا کیا ہے، کسی بادشاہ کا کسی کنیز پر آ جائے تو اسے کون روک سکتا ہے...... اور کسی شہزادی کا کسی غلام پر آ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جو کوئی کنیز یا غلام، بادشاہ یا شہزادی کی خواہش دل میں چھپا کر بھی کر بیٹھیں تو؟

ان کے دل میں چھپا بھید بھی انہیں دنیا میں رسوا کروا دے۔

☆☆☆

پوری حویلی میں ہنگامہ سا برپا تھا، ہر طرف شور اور بے چینی سی تھی، نور علی کی بہو کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ معراج بی بی نے مجبور ہو کر اس سے کہا تھا کہ وہ گھبرا رہی تھی اگر وہ اجازت دے تو وہ اپنی بیٹی کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوا لے۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے معراج کچھ بھی کہتی تو وہ انکار نہ کرتی۔ ناچار معراج کو پیغام بھیج کر زرتاج کو بلوانا پڑا، وہ ویسے بھی اس کی طرف سے پریشان تھی کہ جانے وہ کہاں ہو گی اور کیا کر رہی ہو گی، اس حویلی میں اس کا اس سے پہلے آنا جانا نہیں تھا۔ زرتاج کے پہنچنے تک معراج کے حواس جواب دے چکے تھے، زرتاج نے دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کیا اور ماں کی مدد کرنے لگی۔

جونہی بچے کے رونے کی آواز آئی، سب کی سانسیں جیسے تھم گئیں...... معراج اور زرتاج نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا، معراج نے اپنے شبے کے بارے میں زرتاج سے سرگوشی میں بات کی، زرتاج نے ماں کے انداز ے کی تصدیق کی، زرتاج نے نومولود کو اسے لپیٹنے کے مقصد سے رکھی گئی چادر میں لپیٹا اور پلنگ کے ساتھ رکھے پنگوڑے میں کروٹ کے بل لٹا دیا، مڑ کر پھر ماں کی مدد کرنے لگی۔

چند منٹ کے وقفے سے ایک اور ننھی سی آواز ابھری...... کمرے میں موجود ملازمہ جسے ابھی تک یہ بھی علم نہیں تھا کہ نوزائدہ کی جنس کیا ہے، ایک اور نومولود کو دیکھ کر باہر کی طرف لپکی اور باہر نکل کر شور مچا دیا۔

"چھوٹی چوہدرانی کے ہاں دو بچے ہوئے ہیں۔" لمحوں میں یہ خبر شکیلہ بی بی تک بھی پہنچی اور وہ اس کی تصدیق کے لیے اسی طرف کو آنے لگیں...... شکیلہ بی بی کی بہو، فاخرہ کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہ تھی اس لیے معراج نے کسی کو بھی اندر آنے سے منع کر دیا اور پوچھنے پر بھی کسی کو نہ بتایا کہ کیا ہوا تھا۔

شکیلہ بی بی باہر جلے پیر کی بلی کی طرح پھر رہی تھیں، وہ بھی یہی جاننے کو بے چین تھیں کہ کیا ہوا تھا۔ معراج کے مزاج کو جانتے ہوئے وہ اندر جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی تھیں۔ دل ہی دل میں وہ یہ دعا کر رہی تھیں کہ آنے والے دونوں پوتے ہوں۔ اچانک ہر طرف ہڑبونگ سی مچ گئی۔

"چھوٹے چوہدری صاحب کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔" ہر طرف یہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حویلی کے ملازموں میں ہلچل سی مچی تھی، کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ خبر نور علی اور شکیلہ کے کانوں تک نہ پہنچتی...... شکیلہ تو اپنا کلیجا تھام کر وہیں بیٹھ گئیں اور نور علی تو لمحوں میں گھر سے باہر تھے۔

معراج جب بند کمرے سے باہر نکلی تو اسی وقت شکیلہ زمین پر بیٹھ رہی تھیں، معراج سمجھی کہ انہیں علم ہو گیا تھا کہ ان کے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی پھر بھی اس نے اپنا فرض پورا کرنا ضروری سمجھا اور شکیلہ کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

"اللہ کی رضا ہے چوہدرانی جی! اس نے آپ کے گھر رحمت کی بارش کر دی ہے، دو اور پوتیاں بھیج کر۔"

"لعنت بھیجتی ہوں میں ان منحوسوں پر جو پیدا ہوتے ہی باپ کو کھانے کو دوڑی ہیں۔" انہوں نے اتنی نفرت اور غصے سے کہا کہ معراج کا دل لرز گیا۔

''موجی! میں نے ایک اندازہ لگایا ہے مگر اس اندازے کی درستگی کی صورت میں بڑی کشمکش میں پڑ جاؤں گی۔'' موجی کی ماں نے اس کے سر میں تیل لگاتے ہوئے کہا۔ موجی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا مگر وہ خاموش رہی۔

''پوچھے گی نہیں کہ میں نے کیا اندازہ لگایا ہے؟''

''آپ خود ہی بتا دیں۔'' اس نے اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔

''تیری ماں ہوں کملی!'' انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''اور تو مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپاتی ہے؟''

جواب میں اس نے مڑ کر اپنا تیل میں چپڑا ہوا سر اُن کی گود میں رکھ دیا۔

''کون ہو سکتا ہے وہ بھلا؟'' انہوں نے تجسس قائم کرنے کی کوشش کی۔

''شاید قائم ہو۔'' انہوں نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی اور وہ مزید اُن کی گود میں گھستی چلی گئی۔ انہوں نے اسے کھینچ تان کر گود سے نکالا اور خود سے دور کیا۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے، سارا تیل تم نے میرے کپڑوں پر مل دیا ہے...... اگر یہ بات نہیں ہے تو صاف صاف بول کر کہو، یہ کیا ناراضی دکھانے کو میری گود میں گھسی چلی آ رہی ہو!''

''میں نے کب کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے امی جان؟'' حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اس نے ماں کو دیکھا جو کہ شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔

''امی جان!'' اس نے پھر اپنا سر اُن کی گود میں گھسیڑ دیا۔

''مجھے تم سے اسی نادانی کی امید تھی موجی...... تم نے بھی چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیا ہے!'' ان کے لہجے میں تاسف کی سی کیفیت تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا امی جان؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا کچھ جانتی ہو تم اس کے بارے میں؟'' انہوں نے اس پر سوال داغا۔

''میں کیا جانوں گی، اس کو بیٹا تو آپ نے بنایا ہوا ہے، گھر میں اس کو مقام آپ نے دے رکھا ہے...... اس گھر میں وہ اس طرح رہتا ہے جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو...... اور مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ میں اس کے بارے میں کیا جانتی ہوں؟'' اس نے جرح کی۔

''موجی کسی کو بیٹا بنانے یا سمجھنے کے لیے شاید ایسے اوصاف کی ضرورت نہیں ہوتی، جن اوصاف کی ایک پڑھی لکھی لڑکی کا جیون ساتھی بننے کے لیے ہوتی ہے۔'' انہوں نے اس کے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

''صاف بات کریں امی! میں کچھ سمجھی نہیں اور آپ کو علم ہے کہ پہیلیاں مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہیں۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔

''قائم علی چٹا ان پڑھ ہے موجی!'' ان کے الفاظ سے ماحول پر ایک عجیب سی کیفیت اتر آئی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے کسی جرم کا اعتراف کیا ہو...... ایک طویل خاموشی کا وقفہ ان دونوں کے بیچ آ گیا تھا۔ صرف ان ہلکی ہلکی سانسوں کی آوازیں تھیں، جنہیں کوشش کر کے بھی نہ سنا جا سکتا تھا۔ ''موجی!'' دیر کے بعد موجی کو آواز آئی

جیسے کوئی گہرے اندھے کنویں سے بولا ہو۔

''میں کیا کروں امی جان؟'' اس کے لہجے میں اتنی بے بسی تھی کہ اُن کا دل اس کے دکھ سے بھر گیا، اُن کی بیٹی نے آرزو کی بھی تو ایسے چاند کی کہ جس کا داغ فراموش کیے جانے کے قابل نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس نے اپنا سر پھر ماں کی گود میں رکھ دیا اور قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

''سوچ لو۔'' انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''کوئی بھی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا...... اور ہاں! زیادہ دیر بھی نہ کرنا۔''

☆☆☆

''رانی تجھے کیا ہو گیا ہے، کام کچھ کہتی ہوں تو کرتی کچھ ہے۔'' رانی کی ماں نے اسے ڈانٹا، اس نے اسے روٹی بنانے کو کہا تھا کہ اس کا ابا آنے والا تھا اور وہ آٹے کا تھال لے کر آٹا گوندھنے بیٹھ گئی تھی۔ ''آٹا تو میں نے گوندھ دیا تھا کم بخت۔''

''صحیح کہتی ہے ماں تو! میں تو ہوں ہی کم بخت، ایسی ہی جو بختوں والی ہوتی تو!'' اس نے ماں کی پھٹکار سن کر بھگویا ہوا آٹا ڈھک کر ایک طرف رکھا اور لکڑیوں والے چولھے میں آگ جلانے لگی۔ آگ جلنا شروع ہوئی تو اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں...... اس سے پہلے تو کبھی اس طرح اس کی آنکھیں آگ جلانے سے لال نہیں ہوئی تھیں۔

''کیا کیا ہے اب تو نے اپنی آنکھ کو؟'' ماں نے پاس آ کر اس کی لال انگارہ آنکھوں کو دیکھ کر سوال کیا۔

''کچھ نہیں اماں، دھوئیں سے۔'' اس نے فوراً اپنی آنکھوں کو مسلا۔

''نہ ہی لکڑیاں گیلی ہیں نہ تو نے آگ پہلی دفعہ جلائی ہے رانی؟'' ماں نے اس کے چہرے میں جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''وہ اماں۔'' وہ گڑبڑائی۔ ''اصل میں وہاں روتی رہی تھی۔'' اس نے دل کڑا کے سچ کہہ دیا۔

''کہاں روتی رہی تھی تو اور کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں اُدھر کھیتوں میں، وہ وہاں چوہدری صاحب کو سانپ نے کاٹ لیا تھا ناں۔'' اس نے ماں کو بتایا۔

''آئے ہائے! کون سے چوہدری صاحب مرے ہیں؟'' اس نے دکھ سے پوچھا۔

''اللہ نہ کرے اماں!'' اس کے سینے پر جیسے کسی نے دھموکا دے مارا ہو۔

''تو پھر تو کیوں رو رہی ہے؟'' اس کی ماں نے اس کا منہ دیکھا۔ ''اور ہمیں اس سے کیا لینا دینا، تم وہاں کام کرنے گئی تھیں یا رونے کے لیے...... اور ہاں پیسے بھی لے کر آئی ہو کہ نہیں؟''

''اماں!'' وہ بھل بھل رونے لگی، ماں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ پیسے لائی تھی کہ نہیں؟ وہ پیسے تو کیا لاتی، اپنا دل بھی شاید کہیں وہیں بھول آئی تھی اور اپنے وجود کے اور جانے کتنے ہی ٹکڑے اسی گھنے پیڑ تلے کھو کر آ گئی تھی۔

''اب کیا ہوا؟ روٹی پکانا شروع کرے گی یا یونہی اپنے نصیبوں کو روتی رہے گی؟'' ماں کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے، وہ آنسو پیتی، روٹیاں توے پر ڈالنے لگی۔

☆☆☆

فاخرہ کی حالت بگڑ گئی تھی، دونوں ماں بیٹیوں کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ حویلی میں کسی کو اس بات سے غرض نہیں رہی تھی کہ کون دو بدنصیب تھیں جنہوں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں کہ ان کی ماں کی زندگی بھی خطرے میں تھی اور باپ کی بھی۔ بھوک کی جبلت اور دنیا میں آ کر عدم تحفظ کے احساس سے مغلوب ہو کر وہ بلند تانوں سے رو رہی تھیں...... ان کی ماں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔

معراج اور زرتاج کے پسینے چھوٹے جا رہے تھے، کسی ملازمہ کی بلند آواز فاخرہ کے کانوں میں پڑ گئی تھی کہ اس نے پھر بیٹی بلکہ ایک نہیں دو دو بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ ''کیا کمی تھی تیرے پاس میرے مولا جو مجھے انہی میں سے ایک بیٹا دے دیتا؟'' وہ بین کر کر کے رو رہی تھی۔

''یوں نہیں کہتے میری بیٹی!'' معراج اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے اس کی بیٹی جیسی تھی، اس نے زندگی اور موت کی جنگ لڑ کر ابھی دو زندگیوں کو جنم دیا تھا۔ زرتاج ملازمہ کی مدد سے اس وقت ماں کے ساتھ جدوجہد میں مصروف تھی، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ چند گھنٹے قبل ہی اس عورت نے اسے دھتکار کر اپنے کمرے سے نکال دیا تھا...... اس کے سامنے ایک ایسی مظلوم عورت تھی، جو دو بیٹیوں کو جنم دے کر ان کے اور اپنے مقدر کی سیاہی سے خوفزدہ تھی۔

''آ جائیں اماں!'' زرتاج نے ماں کو پکارا، وہ فوراً زرتاج کی مدد کو لپکی۔ گھنٹے بھر کے بعد ذرا سا سکون ہوا تھا، صورتِ حال قابو میں تھی۔ معراج نے پوری کوشش کی تھی کہ چوہدری اکبر علی کو سانپ کے کاٹنے کی خبر فاخرہ کے کانوں میں نہ پڑے ورنہ حالات اور بھی مشکل ہو جاتے۔

ملازماؤں کی مدد سے زرتاج نے ہی بچیوں کو سنبھالا، ایک کو نہلایا، دوسری کو صاف کیا کیونکہ اس کا رنگ اسے نیلا نیلا سا لگ رہا تھا...... معراج نے فاخرہ سے کہا کہ وہ ہمت کر کے اٹھے اور بچیوں کو باری باری دودھ پلائے۔

''پر بی بی جی، پہلا دودھ تو سنا ہے کہ بچے کے لیے زہر ہوتا ہے؟'' ایک ملازمہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل غلط خیال ہے یہ تو...... جانے یہ جاہل عورتیں کیسی کیسی باتیں پھیلا دیتی ہیں!'' معراج نے غصے سے کہا۔

''تو آپ کیا پڑھی لکھی ہیں؟'' ملازمہ نے حیرت سے اس سے پوچھا تو جواب میں معراج نے فقط اثبات میں سر ہلایا۔

''اور آپ کی بیٹی بھی؟'' معراج نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ زرتاج کو اس نے کم سہولیات کے باوجود بھی پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دلوایا تھا اور اب وہ ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔

''ان باتوں کو چھوڑو، ان بچیوں کے لیے کوئی دودھ کا بندوبست کرو۔'' زرتاج نے جلاتی ہوئی بچیوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''جی جاتی ہوں! بڑی چوہدرانی صاحبہ سے پوچھتی ہوں۔'' کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر کو چل دی۔

''ادھر لائیں بی بی ان پیدائشی بدقسمتوں کو۔'' فاخرہ نے حلق میں پڑنے والے پھندوں کو روکا۔ ''ان کی

دادی تو کہے گی کہ ان کو زہر دے دو، جس طرح شاید اس نے اپنی دو بیٹیوں کو دیا ہوگا۔ جتنی زندگی ہے وہ تو ان کو جی لینے دوں!''

معراج نے فوراً ایک بچی کو سمیٹ سماٹ کر ماں کی گود میں دیا اور زرتاج کے ساتھ مل کر تکیوں کے سہارے فاخرہ کو سیدھا کر کے بٹھایا۔ بچی ماں کا قرب ملتے ہی خاموش ہو گئی تھی، دوسری کو ابھی تک معراج گود میں لے کر تھپک تھپک کر چپ کروا رہی تھی...... اسے لگا کہ وہ بچی اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر زرتاج کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی بچی کو دیکھ رہی تھی، ماں کے چہرے کے تاثرات اس سے چھپے نہ تھے۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں ماں سے سوال کیا، معراج نے اس کے خدشے کی تائید کی تو اس کی آنکھوں میں پانی اترنے لگا...... جس زندگی کو اس نے تھوڑی دیر قبل ہی وجود میں آتے دیکھا تھا، کیا وہ اسے موت کے منہ میں بھی جاتے دیکھنے والی تھی۔ اسے اتنی گھٹن محسوس ہوئی کہ وہ اس کمرے سے باہر نکل آئی، اندر بیٹھے بیٹھے تو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ باہر کتنا اندھیرا چھا چکا تھا، وہ بے اختیاری میں چلنے لگی کسی معمول کی طرح۔

''یہ ماں بیٹیاں کس وقت جائیں گی اب؟'' ایک زنانہ آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

☆☆☆

''رابعہ تم سے ایک بات پوچھوں؟'' جہانگیر نے اپنی محبوب بیوی سے کہا۔

''ٹھیک ہے پوچھیں لیکن ایک ہی بات ہو!'' اس نے ہنس کر کہا۔

''میں سنجیدہ ہوں رابی!'' جہانگیر نے ہلکی سی ناراضی سے کہا۔

''سنجیدہ ہیں تب بھی ایک سوال ہی کریں!'' اس نے پھر ہنس کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں بات نہیں کر رہا تم سے۔'' جہانگیر نے کروٹ بدل لی۔

''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟'' اس نے ان کے بھاری وجود کو کھینچ کر اپنی طرف منہ پھیرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ''آپ نے خود کہا کہ ایک بات پوچھوں، میں نے کیا غلط کہا؟'' اس کی اس بات پر جہانگیر کی ہنسی نکل گئی اور وہ اس بات سے بھی لطف لے رہا تھا کہ کیسے وہ ان کے بھاری وجود کو ہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''خالص خوراکیں کھلائی ہیں ہماری ماں نے ہمیں، اتنی کمزور نہیں ہیں کہ کوئی ہمیں ہلا سکے...... ایک سے بڑھ کر ایک طاقت ور ہیں ہم سارے بھائی!'' وہ سادگی میں کہہ رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے ایک طاقت ور کی طاقت کا نشانہ بننے سے بچا لیا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا تھا، وہ خاموش رہی تھی، تھوڑی دیر پہلے چٹر چٹر بولنے والی کو فوراً چپ لگ گئی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے جی، بولتی کیوں بند ہو گئی ہے؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''آپ کچھ پوچھنے والے تھے؟'' اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''ہاں، وہ یاد آیا...... تم اس گھر میں خوش تو ہو نا؟ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' جہانگیر نے سوال کیا۔

"کیوں، میں نے کب کہا کہ میں یہاں ناخوش ہوں؟" اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو جہانگیر کو احساس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے۔

"بتائیں نا، کس نے کہا آپ سے؟" اس نے اصرار کیا۔

"کسی نے نہیں کہا، یونہی مجھے لگا۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"کس بات سے لگا آپ کو؟" اس نے سوال داغا۔

"اصل میں رابی، بابو جی نے مجھ سے کہا کہ میں اور تم شہر چلے جائیں...... تو میں سمجھا کہ شاید تم نے بابو جی سے کوئی ایسی بات نہ کی ہو کہ تمہیں یہاں کوئی مسئلہ یا تکلیف ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے کیوں ہونے لگا یہاں کوئی مسئلہ اور اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو آپ بابو جی سے پوچھ لیں!" اس کے لہجے میں اعتماد تھا جو اسے اس بات پر تھا کہ بابو جی اس کا راز کبھی آشکار نہیں کریں گے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ جہانگیر کی اس غضب کی قیافہ شناسی پر حیران بھی تھی۔ "اور مجھے کوئی شوق نہیں شہر جانے کا، میں ابھی جا کر بابو جی سے کہتی ہوں کہ وہ آپ کی جگہ شجاع کو شہر بھیج دیں!"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا، تم بابو جی سے یہ کہنے جا رہی ہو؟ اتنی جرات تو آج تک ہم میں نہیں آئی کہ ہم ان کی کسی بات سے انکار کریں!" جہانگیر نے اسے تھام لیا جیسے وہ ابھی اٹھ کر چل دے گی۔

"تو پھر ہم شہر کیسے جا سکتے ہیں، آپ کو کیا میری حالت کا اندازہ نہیں ہے؟" اس نے اس کی توجہ اپنی حالت کی طرف مبذول کرائی جیسے وہ اس کی حالت کو جانتا نہ تھا۔

"میں نے بابو جی سے بات کی تھی رابی، وہ سب سوچے بیٹھے ہیں، انہوں نے کہا ہے کہ اماں ہمارے ساتھ جائیں گی اور جب تک تم گھر سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتیں، وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی!" انہوں نے اسے بابو جی کا پورا پلان بتایا تھا۔

"مگر بابو جی۔" اس نے ذرا خفگی سے کہا تھا۔ "وہ کیسے رہیں گے" اُن کا خیال کون رکھے گا؟"

"تھوڑے عرصے کی بات ہے، بابو جی کی بات کو ٹھکرانا میرے بس کی بات نہیں رابی، انہوں نے کہا ہے تو سب کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا ہوگا۔" جہانگیر تو بات کر کے آنکھیں موند کر لیٹ گیا تھا مگر وہ کیسے سو سکتی تھی۔

☆☆☆

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابو جی؟" اس نے احتجاج کیا.... جب بابو جی نے اسے بتایا کہ ان کے ذہن میں یہ تجویز آئی تھی کہ اسے اور جہانگیر کو شہر بھیج دیا جائے۔ تب تک کے لیے جب تک شجاع کی شادی نہیں ہو جاتی یا وہ ان کی بات نہ سمجھ جائے۔

"کیا نہیں ہو سکتا بیٹی؟" انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"آپ یہاں، ہم وہاں..... نہیں نہیں، ہرگز نہیں! آپ کا خیال کون رکھے گا اگر اماں ہمارے ساتھ چلی گئیں تو؟" اس نے بحث کی تھی۔ "خاندان کے چند افراد ہیں ہم، وہ بھی بکھر جائیں، یہ تو کوئی زندگی نہ ہوئی بابو جی!"

"میں عزت کو زندگی سے اہم سمجھتا ہوں رابعہ اور جب تک حالات موافق نہیں ہو جاتے ہمیں اسی تجویز پر عمل کرنا ہوگا..... فی الوقت میرے ذہن میں اس کے علاوہ اور کوئی قابلِ عمل منصوبہ نہیں ہے۔" انہوں نے ہی لہجے میں کہا تھا۔

"مسئلہ تو میرا ہی ہے نا بابو جی تو میں تھوڑے عرصے کے لیے امی کے پاس چلی جاتی ہوں۔" اس نے ایک اور حل تجویز کیا۔

"کیوں جاؤ گی تم آپا کی طرف اور یہ کیسے کہہ دیا کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے، یہ میرا مسئلہ ہے، اس گھر کا مسئلہ ہے، میری عزت کا مسئلہ ہے۔" وہ گرجے تھے۔ "اب میں اس کے بعد اس بارے میں مزید بات نہ سنوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے بحث کے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ اسے پھر بھی گمان تھا کہ جب بابو جی اماں یا جہانگیر سے بات کریں گے تو وہ ان کو ان کے اس ارادے سے باز رکھ سکیں گے مگر ایسا ہوا نہیں تھا اور بابو جی نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔

جہانگیر نے بتایا تھا کہ انہوں نے کسی کو شہر بھیج دیا تھا کہ وہ کرایے پر شہر میں گھر دیکھیں، اس کے بعد خود جہانگیر کو جا کر اس گھر میں ضروری سامان ڈلوانا تھا تا کہ جب رابعہ اور اماں جائیں تو گھر مکمل طور پر سیٹ ہو۔ باقی ماندہ کام تو ساتھ لے جائے جانے والے ملازم بھی کر سکتے تھے۔ اماں بھی اس پروگرام سے واقف تھیں اور بابو جی کو قائل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھیں۔

شہر دیکھنے کی خواہش تو ہمیشہ اس کے اندر جاگتی تھی مگر یوں اپنا گھر چھوڑ کر شہر جا کر آباد ہونا..... اس کی خواہشوں کے کسی کھاتے میں نہ تھا۔ کیسے وہ شہر جا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے، جانے کب تک انہیں شہر رہنا ہوگا، اپنوں سے دور..... شجاع کی شادی تک یا اس کے سدھرنے تک؟ شادی تو ہو سکتا ہے کہ ہو جائے مگر اس کا سدھرنا تو ناممکنات میں سے تھا۔

"واہ ری قسمت۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، جانے آنے والا وقت اپنے جلو میں ان کے لیے کیسی کیسی انوکھی دنیائیں لانے والا تھا۔

☆☆☆

"تو نا باجی جی! وہ ہے نا اپنا میکل..... میرا خصم جی۔" اس نے چبا چبا کر بات کی۔ "کہتا ہے اگر تو کام نہیں چھوڑے گی تو میں تجھے چھوڑ دوں گا!"

"تو چھوڑ دے کام..... اگر تیرا خاوند نہیں چاہتا کہ تم کام کرو۔" مریم نے اس سے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔

"تو باجی جی، آپ نے کیا کام چھوڑا اپنے خاوند کے کہنے پر جی، اسی نے آپ کو چھوڑ دیا نا!" جینا کے یوں کہنے پر اس کے وجود میں جیسے بجلی کا کرنٹ لگا تھا، جانے اس کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا مگر وہ اس کی معلومات کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔

"جس بات کا علم نہ ہو، اس بارے میں یوں بک بک نہ کیا کرو جینا! تمہیں کیا علم کہ میرا خاوند کیسا برا انسان تھا۔" اس نے غصے سے کہا۔ "وہ مجھ سے اسکول کی باعزت نوکری چھڑوا کر دھندا کروانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں میری آمدنی کم تھی۔"

”یہی بات...... بالکل یہی بات ہے، یہی تو میکل کہتا ہے باجی!“ اس نے جھاڑو بھی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ ”وہ بھی تو مجھے دھندا ہی کرنے کو کہتا ہے، اس کی دارو کے لیے میری کمائی کم ہے۔“

”تو کیا خود وہ کوئی کام نہیں کرتا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی مریم اس سے پوچھ بیٹھی۔

”نکما ہے جی بالکل، آپ کے خاوند کی طرح۔“ اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔

”تمہیں فضول بکواس کرنے کی بہت عادت ہے جینا، اپنا کام کرو اور میرے ساتھ بے مقصد باتیں کر کے نہ میرا وقت ضائع کرو نہ اپنا...... دس گھروں میں تم نے کام کرنا ہوتا ہے اور خالی خولی اوپر اوپر سے جھاڑو لگا کر چلی جاتی ہو۔“ حقیقت ہی سہی مگر اس کی کڑواہٹ مریم کے اندر تک اتر گئی تھی...... اس محلے میں اس کے بارے میں معلومات اس طرح پھیل چکی ہوں گی، اسے اس کا گمان بھی نہ تھا تو کیا اسے گھر بدل لینا چاہیے؟

”جینا۔“ اس نے جینا کو پکارا۔

”جی باجی جی؟“ اس نے پھر جھاڑو سے توجہ ہٹائی اور ہمہ تن گوش ہوگئی۔

”تمہیں میرے اور میرے حالات کے بارے میں کس نے بتایا؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”اے لو باجی جی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، سارا محلّہ جانتا ہے...... جب آپ لوگوں کا جھگڑا ہوا اور وہ آپ کو طلاق دے کر چلا گیا...... جس کو نہیں پتا تھا اس کو بھی آپ کی ہمسائیاں بتا دیتی ہیں بلکہ ان کا تو مقابلہ ہوتا ہے کہ پہلے کون نئے آنے والوں کو اس اندر کی خبر سے آگاہ کرے۔“

”اتنے گندے ذہن کے لوگ بستے ہیں اس محلے میں، اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں یہ محلّہ ہی چھوڑ دوں۔“ اس کا دل عجیب سی تکلیف سے دوچار ہوگیا تھا، اس نے تو کبھی کسی کی بات نہیں کی تھی، کسی کا برا نہ چاہا تھا تو پھر لوگ کیوں اس کے بارے میں ایسی خبریں دلچسپی لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے۔

”محلّہ تبدیل کر لینے سے عورت کی بدنامی کے قصے لوگوں کو بھول نہیں جاتے باجی، کوئی جا کر نئے محلے میں شوق سے آپ کی داستان کسی ایک کو چٹخارے لے لے کر بتا کر آ جائے گا...... اور پھر وہی کافی ہوگا۔“ جینا نے کہا، وہ جو سوچ بیٹھی تھی کہ محلّہ تبدیل کر لے گی تو اس کی پہچان بدل جائے گی، ملول ہوگئی۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ بے بسی سے وہ اسی سے پوچھ رہی تھی، جسے وہ تھوڑی دیر قبل بک بک کرنے سے منع کر رہی تھی۔

”اسی لیے تو میں میکل سے طلاق نہیں لیتی باجی جی...... لولا لنگڑا، ٹوٹا پھوٹا...... جیسا بھی ہو، مرد کے ساتھ کا بڑا آسرا ہوتا ہے جی عورت کو، ایک طلاقن کی وقعت ہی کیا ہے جی؟“ جینا بولنا شروع ہوگئی تھی۔ ”اور پھر میری تو اولاد بھی نہیں ہے، وہ چاہے تو اور بیاہ کرلے۔“ جینا جیسے اسے اسی کی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ بھی تو پانچ سالوں میں اولاد پیدا نہیں کر سکی تھی اور وہ بھی شاید اس سے جان ہی چھڑانا چاہتا تھا جو ذرا سی بات کو بہانہ بنا کر...... جھگڑا بنا کر، اسے گلی میں کھڑے ہو کر طلاق دے گیا تھا۔

”کام ختم کرو جینا جلدی، میرے سر میں درد ہے۔“ اس نے اسے ٹالا۔

”سر دبا دوں باجی؟“ جینا نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”نہیں، تم کام ختم کرو، میں نماز پڑھ لوں پھر چائے بنا کر پیتی ہوں۔“

☆☆☆

”امی جان!“ اس نے بھاری آواز میں کہا تو انہوں نے رب کا شکر ادا کیا کہ وہ ذرا ہوش میں آئی تھی۔

”کیا بات ہے امی کی جان؟“ انہوں نے اس کے تپتے ہوئے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”کوئی یوں بھی بیمار پڑتا ہے، خود نرس ہو اور اتنا تیز بخار ہوگیا ہے تمہیں...... ہلکی حرارت محسوس ہوتے ہی اپنی دوا وغیرہ لے لیتیں تم!“

”میں ٹھیک ہوں اب۔“ کمزور سی آواز میں اس نے کہا۔

”خاک ٹھیک ہو، سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے تم نے...... یہ تو بھلا ہو قائم علی کا...... جو تمہاری کیفیت بتا کر ڈاکٹر سے دوا لے کر آ گیا اور تمہارے بخار کا زور ٹوٹا ہے۔“ اس کی ماں نے انکشاف کیا تو وہ نقاہت کے باوجود مسکرا دی، وہ جو اس ساری بیماری اور غنودگی میں پل پل اس کے ساتھ رہا تھا، حقیقت میں بھی یہاں آیا تھا۔

”اس نے کیسے کیفیت بتا دی میری ڈاکٹر کو؟“ اس نے ماں سے پوچھا۔

”جانے کیسے، بس آ کر تمہیں دیکھا اور کہا جا کر ڈاکٹر کو کیفیت بتا کر دوا لے کر آتا ہوں، وہ تو چاہ رہا تھا کہ تمہیں لے جا کر ڈاکٹر کو دکھایا جائے مگر تمہارے ابا ہی راضی نہ ہوئے۔“ امی جان بتا رہی تھیں۔

”میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھولوں تو پھر چائے۔“ اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم ٹھیک تو ہو ناں موجی؟“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہوں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں...... کوئی نہیں، ساری پریشانیاں دور ہوگئی ہیں۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”سمجھ جائیں گی، جب میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی!“

”اور تم مجھے سمجھانے کی کوشش کب کرو گی؟“ انہوں نے ضدی انداز میں سوال کیا۔

”جب مجھے ایک کپ چائے ملے گی۔“ وہ ہنسی، کمزور سی ہنسی۔

”اور اگر میں کہوں کہ پہلے سمجھ پھر چائے تو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”چلیں پہلے سمجھا دیتی ہوں۔“

”میں انتظار کر رہی ہوں!“ اس کے ذرا سے توقف پر بھی اُن کو بے چینی ہو رہی تھی اور وہ جو اپنی بات ان کو سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہی تھی، ان کے مخل ہونے پر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا بات ہے موجی؟“

”امی جان!“ اس نے بے سوچے سمجھے کہا۔ ”میں اب بھی قائم علی سے شادی کرنا چاہتی ہوں، آپ اس کا عندیہ لے لیں اور ابا جی سے بات کر لیں۔“ انہوں نے شدتِ جذبات سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

☆☆☆

”جینا مجھے کچھ دنوں کے لیے پشاور جانا ہے۔“ مریم نے اس سے کہا۔ ”تم کام سے چھٹی کر لینا!“

''مگر میں تو چھٹی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے تردد کیا۔
''گھر بند ہوگا، تم کام کیسے کروگی؟'' اچانک اسے سمجھ میں آگیا کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہی تھی۔ ''بھئی تنخواہ نہیں کٹے گی تمہاری، فکر نہ کرو۔''
''پر باجی جی آپ جا کیوں رہی ہیں؟'' اس نے باچھیں پھیلا کر پوچھا۔
''وہاں میری ایک خالہ زاد رہتی ہے، میری اپنی تو بہن کوئی نہیں تھی، اس لیے اس کا اور میرا پیار بالکل ایسے ہی تھا جیسے ہم سگی بہنیں ہوں۔ وہ بیاہ کر پشاور چلی گئی اور پھر ملاقات کم کم ہوگئی۔'' اس نے جینا کو بتایا۔
''مگر میں نے تو تین سالوں میں کبھی آپ کی بہن کو آتے ہوئے نہیں دیکھا؟'' جینا نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں، وہ اپنے گھر شوہر اور بچوں میں مصروف ہے، اب ذرا بیمار سی ہے اور مجھے یاد کر رہی تھی، یوں بھی چھٹیاں ہیں تو میں نے سوچا جا کر اس سے مل آؤں...... اس کی عرصہ دراز کی شکایت بھی دور ہو جائے گی اور اس کے بچوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی، بہت عرصے پہلے جب ملے تھے تو بہت چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ انہیں تو اپنی خالہ کی شکل بھی یاد نہ ہوگی۔'' جانے کیسے اپنی عادت کے برخلاف اس نے اتنی لمبی بات کی تھی۔
''شاید مجھے جینا کے ساتھ رہ رہ کر بے مقصد لمبی گفتگو کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
''جلدی آجانا باجی جی!'' جینا نے اس سے کہا۔
''تمہیں اس سے کیا کہ میں کب آتی ہوں، تمہیں تو اپنی پوری تنخواہ مل جائے گی۔'' اس نے جینا کو گھورا۔
''وہ تو مجھے پتا ہے باجی جی، پر ویسے ہی کہہ رہی تھی۔'' اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔
''تم کیا اداس ہو جاؤ گی میرے لیے؟'' ایک موہوم سی امید کے سہارے اس نے پوچھا، دنیا میں اس کے سوا اور کون تھا، جسے اس کے بارے میں فکر ہوتی...... جس کی خاطر ماں باپ اور ان کا گھر چھوڑا تھا، وہی بیچ راہ میں چھوڑ گیا تھا تو اور کسے اس کی پروا ہوتی...... صرف ماں باپ کا گھر ہی نہیں چھوڑا تھا، جب ملک کا بٹوارا ہونے والا تھا اور وہ سب ملک چھوڑ دور دیس جا بسے تھے تو وہ اس روز کتنی تنہا ہوئی تھی...... شاید وہ اسی لیے یہ ملک چھوڑ گئے تھے کہ بدنامی کا جو طوق ان کی بیٹی نے ان کے گلے میں ڈالا تھا، وہ جیتے جی ان کے گلے سے اترنے والا نہ تھا۔
''اداس تو میں بہت ہو جاؤں گی باجی، اس میں کیا شک ہے۔'' جینا نے کہا تو اسے کتنی مسرت ہوئی تھی۔
''ویسے بھی جس جگہ آپ جا رہی ہیں، ایسی نہیں کہ آپ زیادہ عرصہ رہ سکیں۔''
''وہ کیوں بھئی، میری بہن کا گھر ہے وہ؟'' اس نے جینا کی طرف دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔
''یونہی باجی جی، آپ کو جانتی ہوں نا اچھی طرح!''
''تو تم سمجھ رہی ہو کہ میں بھی تمہارے لیے اداس ہو جاؤں گی؟'' وہ مسکرائی تھی۔
''میں ایسی کون سی چیز ہوں باجی، جس کے لیے آپ اداس ہو جائیں گی، بس یونہی ایک خیال آگیا تھا۔'' جینا نے حقیقت پسندی سے کہا۔

''کیا خیال آگیا تھا، ذرا میں بھی تو سنوں تمہارے سنہری خیالات؟'' چائے کی چسکی لے کر مریم نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
''یونہی، ذرا کہنا تھا کہ احتیاط کریں، آپ کی بہن کا کوئی شوہر بھی ہوگا...... آپ کا بہنوئی، اس سے ذرا محتاط رہیے گا۔ اکیلی عورت تو مردوں کے لیے اسی طرح ہوتی ہے جیسے کتوں کے لیے گلی میں پڑی ہوئی ہڈی۔'' جینا نے بے دھڑک ہو کر کہا۔
''شرم کرو جینا، تم نے انہیں دیکھا نہیں ہے اس لیے اس طرح کی فضول بات کر رہی ہو...... وہ تو میرے بڑے بھائیوں جیسے ہیں، ان کے تو بچے بھی جوانی کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں...... میری شادی میں صرف جاوید بھائی اور سائرہ آپا نے شرکت کی تھی۔'' مریم نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔
''سگے بھائیوں کے علاوہ کوئی بھائی ہوتا ہے نہ بھائی جیسا، نہ کوئی بیٹا نہ باپ...... رشتے وہی ہیں باجی جو خدا نے بنا دیے ہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے رشتوں کے علاوہ کوئی اپنا نہیں بنتا۔''
''اب تم زیادہ سقراط نہ بنو تو بہتر ہے جتنی بات پوچھی جائے اتنا ہی جواب دیا کرو۔'' مریم کی ڈانٹ سن کر وہ بدمزہ ہوگئی تھی، کتنے آرام سے وہ بیٹھی ان کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کر رہی تھی۔
''کام ختم کرو اور اپنا مگ لے کر آؤ، میں تمہیں چائے ڈال دوں۔''
''جی اچھا!'' پل پل رنگ بدلنے والی یہ باجی بھی عجیب ہی تھی۔

☆☆☆

وہ جہاں تھی، وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ماں بیٹیوں سے مراد وہ اور اس کی ماں بھی ہوسکتی ہیں...... وہ تو صرف ان کے سرگوشیانہ انداز سے ٹھٹکی تھی۔ اس نے سانس بھی روک لی اور ہمہ تن گوش ہوگئی۔
''چوہدرانی جی نے کہا ہے کہ کسی کو شک نہ ہو، وقت اور موقع ایسا دیکھنا ہے کہ کسی سے سامنا ہونے کا امکان نہ ہو!'' ایک آواز نے کہا تھا۔ ''مجھے تو ترس بھی آرہا ہے، دل ہی نہیں چاہتا کہ۔''
''جو کام چوہدرانی جی نے کہا ہے، وہ تو کرنا پڑے گا۔'' دوسری آواز نے کہا۔ ''جتنا انعام اس کام کا ملا ہے، آج تک کسی کام کا نہیں ملا حتیٰ کہ چوہدری صاحب کے کاموں پر پردہ ڈالنے پر بھی نہیں۔''
''لیکن یہ کتنا بڑا گناہ ہوگا، قتل کے برابر۔'' پہلی آواز میں خوف تھا۔
''تو وہ کیا گناہ نہیں ہوتے یا قتل نہیں کہلاتے؟'' دوسری آواز نے کہا۔
''وہ تو ایک لحاظ سے نیکی بھی ہوتی ہے ان معصوم لڑکیوں کے ساتھ، جو اپنی معصومیت گنوا بیٹھتی ہیں اور دوسروں کے گناہ کا بوجھ بھی انہیں ڈھونا پڑ جاتا ہے۔''
''تو کیوں کرتے ہیں گناہ یہ بڑے لوگ؟ سزائیں غریب بھگتیں...... اچھا ہے گلی گلی اور گھر گھر پیدا کریں ان کی اولادوں کو اور چھوڑ دیں انہیں رُلنے کے لیے۔'' اس آواز میں بغاوت کی بو تھی۔
''تو انہیں کیا پروا ہے، ان گلیوں میں رُلنے والی اولادوں کی...... جانے کتنی ہی رُل رہی ہوں گی، ختم تو وہ ہوتی ہیں جن کو چوہدرانی پکڑ لیتی ہیں...... انہیں ان اولادوں کی کیا پروا جو گناہ کا نتیجہ ہیں، جنہیں جائز

اولادوں کے قتل کا حکم صادر کرتے وقت بھی خوفِ خدا نہیں آتا۔“ دوسری آواز نے بتا دیا تھا کہ چوہدرانی صاحبہ نے کیا حکم صادر کیا تھا، اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں، اسے لگا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو سکے گی۔

”بس تو نے تو میرا ساتھ دینا ہے، ہمت کر۔“

”میں نے کبھی ایسا کام کیا نہیں، اس لیے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ خوف اس آواز میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔

”میں نے کہا نا کہ تم نے میرا ساتھ دینا ہے، کام تو میں ہی کروں گی مگر ایک ہوتی تو میں اکیلی بھی کر لیتی، اس سے پہلے ایسے کام ہوتے رہے ہیں اور ہماری مائیں یہ کام کرتی رہی ہیں…… اب ہم نے ان کی ذمے داریاں سنبھالنی ہیں، اس لیے ذرا بہادر بن۔ اپنی حرکتوں سے کسی کو شک میں نہ ڈال دینا!“ دوسری آواز نے کہا تھا۔

”ٹھ…… ٹھیک ہے!“ اس نے کہا، زرتاج کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ دونوں شکیلہ بی بی کی خاص ملازمائیں تھیں اور اس کی جڑواں پوتیوں کے قتل کی خاص الخاص ذمے داری پر متعین کی گئی تھیں۔

”کس قدر بے رحم عورت ہے یہ۔“ زرتاج نے خود سے کہا اور آہستگی سے واپسی کی راہ پر چل دی۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم؟“ معراج بی بی اس کی غیر حاضری پر پریشان تھی، اس کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ ”میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی، اس حویلی میں یوں مت گھوما پھرو۔“

”یونہی ذرا دل گھبرا رہا تھا اماں۔“ اس نے دل کی کیفیت کو دبانے کی کوشش کی۔

”سب ٹھیک تو ہے نا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ معراج نے اس کو تشویش سے دیکھا۔

”کیسی ہے اب یہ چھوٹی؟“ اس نے موضوع بدلا تا کہ ماں کی جرح سے بچ سکے، ہمت پا رہی تھی نہ اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ کس طرح وہ ماں کو وہ گفتگو بتائے جو وہ باہر سن کر آ رہی تھی۔ اس معصوم جان کو دیکھ کر اسے ترس آ رہا تھا، جس کی قسمت کا فیصلہ وہ عورت کر رہی تھی جو اس کی سگی دادی تھی…… اس کا دل بھر آیا۔

”کیا کرتی ہو، یوں نہ روؤ! اللہ کرم کرے گا۔“ معراج سمجھی کہ اس کی بیٹی بچی کی حالت دیکھ کر رو رہی ہے، اسے بھی اندازہ تھا کہ وہ بچی بچنے والی نہیں ہے۔

”ابھی تک ان کی دادی نہیں آئی، ان کو دیکھنے کے لیے؟“ اس نے اس کے ننھے سے گال کو چھوا۔

”ان کے باپ کو سانپ نے ڈس لیا تھا، سب اسی پریشانی میں ہیں۔“ معراج نے مڑ کر فاخرہ کی طرف دیکھا اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ سو رہی ہے، ہلکی سی سرگوشی میں کہا تھا۔

”اوہ۔“ زرتاج کو سن کر دکھ ہوا۔ ”اللہ بہتر کرے ان سب کے لیے!“

”چوہدرانی آ جائے تو ہم چلیں…… یہ بچی تو مشکل ہی ہے کہ بچے تاہم اگر کسی طرح اسے شہر لے جائیں تو اس کے بچنے کے امکانات ہیں!“ معراج نے اسے بتایا۔

”شہر۔“ زرتاج بڑبڑائی۔ ”وہ تو ان کی جان کے درپے ہیں، وہ ان کی جان بچانے کو نہیں کیونکہ شہر لے کر جائیں گے، شکر کریں گے کہ ایک خود ہی چلی گئی، صرف ایک قتل کروانا پڑی تھی ان کو۔“

”کچھ کہا تم نے؟“ معراج نے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں…… نہیں تو، میں بھلا کیا کہوں گی!“ اس نے فوراً کہا۔

”زرتاج یہ بچی چند لمحوں کی مہمان نظر آتی ہے مجھے، تم یہیں ٹھہرنا، باہر نہ نکلنا…… زچہ بچہ کو اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں اور میں جا کر اطلاع کروں چوہدرانی کو کہ بچی ٹھیک نہیں اور مجھے بچنے والی نہیں لگتی۔“ معراج اسے ہدایات دے کر رخصت ہوئی۔

”جائیں اور اطلاع کریں، خوش خبری سنائیں انہیں…… اس کے عوض شاید وہ آپ کا منہ موتیوں سے بھر دیں۔“ وہ خود سے ہی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ بچی اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی…… اس نے اس کمزور اور بے جان پڑتے جسم کو اٹھایا اور ماں کی ساری نصیحتیں بھلا کر باہر کو لپکی، اسے معلوم تھا کہ چوہدرانی کا کمرا کس طرف تھا۔ اسے سینے سے لگائے وہ اُدھر کو لپکی۔

”تمہیں کہا ہے معراج کہ اسے مرنے دو جو خود مر رہی ہے بلکہ کچھ ایسا کرو کہ وہ دوسری بھی۔“ چوہدرانی شکیلہ کی آواز آ رہی تھی۔

”خدا کا خوف کریں چوہدرانی جی، کیوں اپنے سر ایسا گناہ لیتی ہیں۔“ معراج بی بی گھگیائی تھی۔

”کہہ دیا سو کہہ دیا۔“ شکیلہ کی آواز میں شدید غصہ تھا۔ ”اب تو میں اس بدبخت کو طلاق دلوا کر رہوں گی جس نے میرے گھر میں ڈائنیں اکٹھی کرنا شروع کر دی ہیں۔“

”اپنی جیسی عورت کو آپ ایسے جرم کے لیے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہیں جس میں اس کا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔“ معراج بی بی نے ہمت کر کے کہا۔ ”شاید آپ کو علم نہیں کہ بیٹا یا بیٹی ہونے کا ذمے دار مرد ہوتا ہے عورت نہیں۔“

”اپنے پاس رکھو تم اپنی حکمت کی باتیں۔“ شکیلہ نے غصے سے کہا، وہ تو اس کم عقل عورت کو یہ بھی نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ یہ سائنسی حقائق تھے جسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سائنس کیا ہے۔

”اماں…… یہ۔“ زرتاج اب اس بچے کو لے کر مزید وہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

”کچھ کریں چوہدرانی جی، اس کو شہر کے بڑے اسپتال میں پہنچانا ہوگا کسی نہ کسی طرح۔“ معراج نے التجا کی۔

”شہر پیدل جایا جا سکتا ہے نہ گھوڑوں پر، گاڑی پہلے ہی میرے لال کو لے کر شہر گئی ہوئی ہے…… ہائے میرا لال…… جانے کس حال میں ہوگا؟“ وہ زور زور سے سینہ پیٹنے لگیں تو ملازماؤں کا جمگھٹا جمع ہو گیا تھا…… بچی زرتاج کے ہاتھوں سے معراج کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے…… ملازمائیں سسکیاں لے کر رونے لگیں، زرتاج کی آنکھوں سے بھی موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔

”کم بخت ماریو!“ شکیلہ نے اپنی ملازماؤں کو ڈانٹا۔ ”رو کس بات پر رہی ہو، دفعہ ہو جاؤ ساری باہر اور جا کر غسل کو بندوبست وغیرہ کرنے کو کہو، ایک مر گئی ہے جانے دوسری بھی بچے کہ نہیں…… شہر سے اب تو چوہدری صاحب بھی آنے والے ہوں گے۔“ ان کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں اس بچی کی وفات کا ذرہ بھر بھی دکھ ہوا ہے اور ہوتا بھی کیوں…… وہ تو ان دونوں بچیوں کے موت کے پروانے پر دستخط کر چکی تھیں، اس بے چاری نے تو مر کر بھی انہیں اپنے ناحق خون کے گناہ سے بچا لیا تھا۔

☆☆☆

''اماں مجھے لیٹرین جانا ہے۔'' زرتاج کے پیٹ میں بھنور سے پڑ رہے تھے۔

''وہیں ہے فاخرہ کے کمرے کے ساتھ ہی بلکہ میں یہاں ہوں، تم یوں کرو کہ جاؤ اور وہیں رہو!'' معراج نے اسے سمجھایا۔

''جاتی ہوں اماں، آپ بھی جلدی آجانا۔'' وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے رکھے فاخرہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

غسل خانے سے باہر نکلی تو فاخرہ گہری نیند میں تھی، اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کھو چکی ہے اور جانے اور کیا کیا کھونے والی ہے...... شوہر کو سانپ نے ڈس لیا تھا، اسے یہ بھی علم نہ تھا۔ دوسری بچی ماں کے پہلو میں سو رہی تھی، معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے۔ زرتاج نے جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اسے اٹھا لیا، کتنی پیاری بچی تھی۔ جانے یہ اس کا ارادی عمل تھا یا قدرت اس سے یہ نیکی کروانا چاہ رہی تھی، بچی کو سینے سے لگائے وہ اس حویلی سے اس طرح نکلی تھی کہ کسی کی نظر میں بھی نہیں آئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی، اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو اس بات سے خوف زدہ ہوتی کہ اس کے اس عمل کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے، وہ کسی معمول کی طرح کھڑی تھی کہ دور سے سست قدموں کی آواز قریب آگئی اور دروازہ کھلا۔

''تم!'' شاکر اسے رات کے اس پہر اپنے گھر کے دروازے پر تنہا دیکھ کر جتنی بھی حیرت کا اظہار کرتا، کم تھا۔

☆☆☆

''معراج بی بی، ولد علی احمد! آپ کا نکاح قائم علی ولد حاکم علی کے ساتھ بعوض حق مہر دس ہزار روپے کے کیا جاتا ہے، کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟'' قاضی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''دس ہزار روپے؟'' آس پاس موجود لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں، شادیوں پر سلامی میں جس زمانے میں ایک روپیہ بہت بڑی سلامی سمجھی جاتی تھی، اس وقت دس ہزار کا حق مہر معمولی بات نہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک سو تولہ سونا زیورات کی صورت میں بری کے ایک سو ایک جوڑوں کے ساتھ آیا تھا۔ قائم علی نے معراج کو دوسروں کے علاوہ اس کی اپنی نظروں میں بھی معتبر کر دیا تھا۔ ابھی تو وہاں لوگوں کو اس جائیداد کی تفصیل کا علم ہی نہ تھا جو قائم علی، معراج کو شادی کے تحفے کی صورت میں دینے والا تھا بلکہ اس کے نام لکھوا چکا تھا۔ معراج کے والدین اور بھائیوں کو البتہ اس کی بابت معلوم تھا۔

''ہوں!'' گھونگٹ کی آڑ سے ہلکی سی آواز آئی۔

''بیٹا! واضح طور پر بولیں تاکہ نکاح کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے!'' قاضی صاحب نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے۔

''جی...... قبول ہے!'' اس کے منہ سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ نکاح نامے پر ولی اور گواہان کے دستخط لیے گئے، نکاح کا رجسٹر موجی کے سامنے رکھ کر قاضی صاحب نے اسے بتایا کہ اسے کہاں پر انگوٹھا لگانا ہے۔

''پین دیں!'' اس نے آہستگی سے کہا تو قاضی صاحب نے پین اسے تھمایا، اس نے نکاح نامے پر

مطلوبہ خانوں میں دستخط کر کے اپنی زندگی کو قائم علی کے نام کر دیا تھا۔ مردوں کا سارا قافلہ باہر نکل گیا تو موجی کو دلہن بنایا جانے لگا۔ قاضی صاحب اب قائم علی سے نکاح کی کارروائی پوری کرنے گئے تھے۔ وہی قائم علی، جس سے جب موجی کی ماں نے پوچھا تھا کہ کیا وہ موجی کو پسند کرتا ہے اور اگر وہ کہیں کہ اُن کی بیٹی سے شادی کر لو تو...

''آپ مذاق کر رہی ہیں امی؟'' وہ ہکلانے لگا تھا۔

''تم میرے بیٹے ہو، تم سے تو میں مذاق کر سکتی ہوں مگر یہ مت بھولو کہ موجی میری بیٹی ہے اور کوئی ماں اپنی بیٹی کے بارے میں مذاق نہیں کر سکتی۔'' انہوں نے بڑے رسان سے کہا تھا۔

''میں۔'' وہ تذبذب میں تھا۔ ''نہیں۔''

''کیا تمہیں یہ کہنا ہے کہ تم موجی سے شادی نہیں کر سکتے؟'' ان کے سوال میں اتنا دکھ تھا کہ کوئی اُن کی بیٹی کو یوں بیک جنبشِ زبان ٹھکرا بھی سکتا ہے اور وہ بھی وہ، جس کے سپنے ان کی بیٹی اپنی نادان آنکھوں میں بسا بیٹھی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں، وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ اُن کی اس پیشکش کو وہ اپنی خوش قسمتی سمجھے گا، وہ نہیں کہہ رہا تھا...... کیسے کیسے مطلبی اور خود غرض لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔ کیا وہ اس نوجوان کو اس کے انکار کے بعد بھی بیٹا کہہ سکیں گی؟ وہ سوچ رہی تھیں ...... ان کی محبت میں غرض شامل ہو گئی تھی، وہ تو نعیم کا دوست تھا اور اس وقت سے تھا جب سے موجی کو اس نے دیکھا بھی نہ تھا۔

''تو کیا میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں...... بیٹا؟'' بیٹے کا لفظ بھی ان کے منہ سے بہ مشکل ادا ہوا تھا۔

''انکار؟'' وہ حیران ہوا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان...... میں، میں کس طرح جرأت کر سکتا ہوں انکار کی اور اقرار کی۔ میں تو خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ میرے بارے میں آپ اس انداز سے سوچیں!''

''تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟'' انہوں نے سینے سے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''اعتراض، امی جان ایک اعتراض ہے، وہ یہ کہ آپ تو میری ماں ہیں اس لیے آپ نے محبت میں ایسی بات سوچی، میری فرمانبرداری تو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ میں آپ سے بحث بھی نہ کروں مگر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری ذات کی جس خوبی نے بھی آپ کو متاثر کیا ہے، وہ اپنی جگہ...... مگر مجھ میں جو کمی ہے اسے آپ شاید نہیں جانتیں، میں لکھا پڑھا نہیں ہوں امی جان! جتنا آپ کی بیٹی نے پڑھا ہے، اتنا تو درکنار، میں اپنا نام اور گنتی کے چند حروف کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، کیا میں یہ سب نہیں جانتی!'' وہ مسکرائیں۔ ''تمہیں بیٹا کہتی ہوں تو کیا سمجھتی نہیں ہوں اور مائیں کیا بیٹوں کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتیں؟''

''تو پھر آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا کہ میں؟'' اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''جو بات پوچھی ہے، اس کا سیدھا سادہ سا جواب دے دو!'' اُن کے لہجے میں پیار تھا، اطمینان تھا۔ انہیں یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کو اپنی کمی کے باعث ہی اعتراض تھا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہ تھی۔

''بہتر ہو گا کہ آپ پہلے اُن سے پوچھ لیں۔'' اس نے سادگی سے کہا تو اُن کی ہنسی نکل گئی۔

”یہ اُن کون ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔
”جج جی..... موجی سے میرا مطلب ہے۔“ شرمندگی سے اس نے کہا تھا۔
”بس اب اس بات کو تم خود تک محدود رکھنا، جب تک میں نہ کہوں۔ سب سے میں خود ہی بات کروں گی، موجی سے، اس کے ابا سے اور نعیم سے بھی۔“ انہوں نے اس کو سمجھایا۔ ”میں خوش ہوں کہ تم نے میری خواہش کا احترام کر کے میرا مان رکھا!“ انہوں نے پیار سے اس کا کندھا تھپکا تھا۔
”میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔
بیٹی کی ماں تھیں، اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش کا ذکر بھی نہیں کیا تھا بلکہ اس کا سارا بار اپنے کندھوں پر اس طرح لیا تھا کہ موجی کی خواہش ان کے اپنے دل کی خواہش بن گئی تھی۔

☆☆☆

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟“ علی احمد دہاڑے تھے۔
”اس میں دماغ کی خرابی کی کیا بات ہے نعیم کے ابا، کیا بیاہنا نہیں ہے بیٹی کو، گھر ہی بٹھا کر رکھنا ہے؟“ انہوں نے ایک مشکل مقدمہ لڑنا تھا، اس لیے خاموش رہنا یا دبنا نہیں چاہتی تھیں۔
”تم کیا جانتی ہو اس کے بارے میں، یونہی کسی کو جانے بوجھے بغیر تم کچھ اور نہیں اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار ہو گئی ہو۔ اس سے بڑھ کر کم عقلی کا کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے اسی غصیلے لہجے میں کہا۔
”جاننا کیا ہے، اتنے عرصے سے وہ ہمارے گھر میں آ رہا ہے، کماؤ ہے، شریف ہے...... اور کیا درکار ہوتا ہے کسی بیٹی کے ماں باپ کو!“ انہوں نے رسان سے کہا۔
”نہ ذات کا پتا نہ پیچھے کا...... دوستی کرتے میں یہ باتیں نہیں جانچی جاتیں لیکن رشتے داری کرتے وقت بیٹی کے ماں باپ کو بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے!“ بیوی کا لہجہ دھیما دیکھ کر انہوں نے بھی اپنے لہجے پر ذرا سا قابو پانے کی کوشش کی۔
”تو کروا لیں پتا، معلوم کر لیں اس کا آگا بھی اور پیچھا بھی۔“ انہوں نے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”جب خاندان میں اتنے رشتے موجود ہیں تو کیوں ہم کسی اور طرف دیکھیں، اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے جو ہمارے خاندان کے لڑکوں میں نہیں ہے؟“ ان کے لہجے میں پھر غصہ آ گیا تھا۔
”بے شک ہمارے خاندان کے سبھی لڑکے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن ہم اپنی بیٹی کا رشتہ اس کی ننھیال میں کریں گے تو اس کے ددھیال والے ناراض ہوں گے اگر ددھیال میں رشتہ دیں گے تو ننھیال والے ناراض ہوں گے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ کسی تیسری جگہ پر کر دیں تاکہ خاندان میں کسی سے بھی ناراضی نہ ہو!“ انہوں نے انتہائی نرم لہجے میں شوہر سے کہا۔
”تمہیں شاید اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ وہ چٹا ان پڑھ ہے، اس نے نعیم سے دستخط کرنا سیکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ ہماری بیٹی اتنا پڑھ گئی ہے جتنا ہمارے خاندان میں کوئی بھی نہیں پڑھا ہے۔“ ان کے لہجے میں اپنی بیٹی کے لیے فخر تھا۔
”وہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر زندگی گزارنے کے لیے عورت کو فقط تعلیم کافی نہیں ہوتی، اسے کھانے اور پہننے اوڑھنے کے لیے بھی اچھا چاہیے ہوتا ہے اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ ہماری بیٹی کو خوش رکھے گا!“ اُن کے لہجے میں اعتماد تھا۔
”عجیب سی بات کر رہی ہو تم۔“ وہ کشمکش میں تھے۔ ”مجھے تو یہ بات سن کر ہی عجیب لگ رہا ہے کہ ایک اجنبی کو ہم اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیں جسے ہم ٹھیک سے جانتے بھی نہیں۔“
”تو میرا رشتہ ہونے سے پہلے، ہم اور آپ کون سا ایک دوسرے کو جانتے تھے، جہاں نصیب لکھے ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ اسباب خود ہی پیدا کر دیتا ہے۔“ انہوں نے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔
”دل نہیں مانتا...... نعیم کی امی! بیٹی کو ایک بالکل انجان شخص سے کیسے بیاہ دیں؟“ تذبذب کی کیفیت سے وہ نکل ہی نہیں رہے تھے۔
”آپ اپنا ذہن بنائیں، سوچ لیں اور جانچ پڑتال بھی کر لیں، جب تک آپ کی تسلی نہ ہوگی یہ بات ہم دونوں کے بیچ میں ہی رہے گی۔ جب آپ کی تسلی ہو جائے گی تو میں موجی کی رائے لے لوں گی!“ انہوں نے بیٹی کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا ضروری سمجھا۔
”تو کیا...... اگر ہم اس بات پر فیصلہ کر لیں تو قائم سے ہم اپنے منہ سے بات کریں گے کہ“ ان کے ماتھے پر لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا۔
”اس کی خواہش تو ہے، میں ہی بہت دن تک سوچتی رہی ہوں کہ کیا یہ جوڑ مناسب ہے کہ نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔ ”میں نے سوچ سمجھ کر ہی یہ بات آپ سے کی ہے۔ میرے دل کی تسلی ہوئی ہے تو آپ سے بات کر رہی ہوں...... اور اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں......؟“
”ہوں!“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔
”کچھ یہی صورتِ حال نہیں تھی میرے اور آپ کے وقت بھی...... آپ نے بھی تو کچھ بھی نہیں پڑھا تھا!“ انہوں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔
”میں جانتا تھا کہ زندگی میں کسی نہ کسی وقت مجھے اس بات کا طعنہ سننے کو ملے گا اور دیکھ لو، چوبیس سال کے بعد ہی سہی مگر تم نے جتلا تو دیا نا!“ ان کا انداز جتلانے والا تھا۔
”اللہ نہ کرے کہ میں آپ کو جتلاؤں“ انہوں نے اپنا سر اُن کے کاندھے پر رکھ کر پیار سے کہا۔ ”میں نے زندگی میں کبھی ایسا سوچا ہی نہیں، یونہی راہ چلتے ذکر آ گیا، کیا آج تک کبھی میں نے آپ کو کسی قسم کا احساسِ کمتری دلایا ہے، کیا کسی کے سامنے میں نے آپ کو شرمندہ کیا ہے اس بات کو لے کر؟“
”نہیں!“ انہوں نے مختصراً کہا اور انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔
”ہماری بیٹی قائم کے ساتھ خوش رہے گی، یہ میں آپ کو پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں، آپ اپنی تسلی کر لیں اور یہ رشتہ طے ہو گیا تو خاندان کا شیرازہ بھی نہیں بکھرے گا۔“
”ٹھیک ہے، میں نعیم کو ہی یہ ذمّے داری دیتا ہوں کہ اس کے بارے میں تفصیلی طور پر چیک کر لے، تب تک تم موجی سے بات کر لینا...... اور ہاں موجی سے یہ بات مت چھپانا کہ وہ ان پڑھ ہے!“ ان کا کہنا تھا کہ

وہ ان سے لپٹ گئیں، انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا اہم مرحلہ انہوں نے طے کرلیا ہے۔ دل ہی دل میں وہ ہنس رہی تھیں، اور اس وقت کا انتظار کررہی تھیں جب وہ موجی کو یہ خوش خبری سنائیں گی۔

''احمد علی! مجھے یقین تھا کہ آپ میری بات کو رد نہیں کریں گے!'' وہ تصور ہی تصور میں اپنی موجی کو دلہن کے روپ میں، مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی...... اور ان کے پاس ہی حسبِ معمول علی احمد خراٹے لینے میں مشغول ہو چکے تھے۔

☆☆☆

جن وقتوں میں ان کا بیاہ ہوا تھا، اس وقت صالحہ نے آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں، وہ وقت تھا جب لڑکیوں کا اسکول جانا بھی ناممکن اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر صالحہ کے والد کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو بھی اس حد تک تعلیم تو حاصل کرنی چاہیے کہ انہیں کسی کی محتاجی نہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو اگلی نسل کی تربیت کرنا ہوتی ہے اور ایک تعلیم یافتہ عورت اپنی نسل کی بہتر تربیت کرسکتی ہے۔

علی احمد کا رشتہ بھی ہر لحاظ سے موزوں تھا کہ ایک بڑے کاروباری گھرانے سے آیا تھا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد جس طرح علی احمد نے اُن کے کاروبار کو سنبھالا تھا، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان کے اسی احساسِ ذمے داری نے صالحہ کے والد کو متاثر کیا تھا۔ تعلیم کی کمی ایک اہم پہلو تھا جس کو کہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر ان کی خاندانی ساکھ اور علی احمد کی شرافت نے انہیں اس کی بابت سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے تھے، انہیں اپنے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوا تھا۔

دونوں میاں بیوی کے درمیان خوب نبھ رہی تھی، چھوٹے موٹے اختلافات تو کسی نہ کسی معاملے میں ہر گھر میں ہوتے ہیں مگر علی احمد نے گھر کی مکمل ذمے داری اور اختیار صالحہ کو تفویض کردیے تھے اور انہیں گھر سے باہر کی کسی فکر میں کبھی مبتلا نہیں کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ پیار کے ساتھ ساتھ عزت اور احترام کا وجود ان کے مابین رشتے کو تقویت دیتا تھا۔ صالحہ کے والدین نے مرتے دم تک اپنے داماد کی عزت اور قدر کی، علی احمد نے بھی ان کو اپنے حقیقی والدین کی طرح احترام دیا اور ہمیشہ ان کی فرمانبرداری اور احسان مندی کی۔

اسی رشتے پر مان تھا جو صالحہ نے اپنی بیٹی کی خواہش کو اپنے شوہر سے جیت لیا تھا۔

☆☆☆

''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' کلثوم تجسس سے بھری ہوئی تھی۔

''ذرا صبر کرو، بتاتی ہوں مگر مجھے حیرت ہے کہ دیا آج کیسے جلدی چلی گئی، جاتے ہوئے بتا کر بھی نہیں گئی!'' کاجل نے حیرت سے کہا۔ ''جانے اس کی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو یا گھر پر ایسا کچھ مسئلہ نہ ہوگیا ہو؟''

''چلو وہ تو تمہیں گھر جا کر ہی معلوم ہوگا مگر اس وقت تو تم مجھے وہ بات بتاؤ جو اس روز چھپا رہی تھیں؟'' کلثوم نے پھر اصرار کیا۔

''بات تو میں تمہیں بتا دوں مگر ڈر اس بات کا ہے کہ دیا ناراض نہ ہو جائے مجھ سے!'' کاجل نے جھجک کر کہا۔

''تو یوں کہو نا کہ میں تمہاری کچھ نہیں ہوتی، دیا ہی ہے سب کچھ۔'' کلثوم ٹھنکی۔

''اچھا چلو، میں تمہیں بتا دیتی ہوں، اپنا مان کر مگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' کاجل نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بولو؟'' کلثوم کے چہرے پر اب بھی ناراضی کے آثار تھے۔

''اتنا تو ناراض نہ ہو۔'' کاجل نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر پیار سے کہا۔ ''بس ایک وعدہ کرو کہ دیا کو نہ معلوم ہو کہ میں نے تمہیں یہ بات بتائی ہے!''

''اچھا ٹھیک ہے!'' کلثوم نے اپنی ناراضی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''اصل میں نا...... دیا کو تمہارے لالے سے پیار ہوگیا ہے!'' کاجل نے رک رک کر جملہ مکمل کیا۔

''کیا ہوگیا ہے؟'' کلثوم نے حیرت سے پوچھا۔ جس انداز میں بی بی جی نے اس کی پرورش کی تھی اور اس کو ہمیشہ شیر کی نگاہ سے دیکھا تھا، اسے کیا معلوم کہ دیا کو اس کے لالے سے کس تعلق سے پیار ہوگیا تھا۔ (یہ اس وقت کی بات ہے کہ نہ ٹیلی وژن تھا نہ نئی نسل کو بگاڑنے کے لیے اور خرافات۔ نوجوان لڑکیوں کو سختی سے رکھا جاتا تھا کہ کسی ''ایسی ویسی'' چیز کا شکار نہ ہوجائیں مگر یہ کب کس کے بس کی بات رہی ہے، دل پہ کس کو اختیار رہا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں عشقیہ داستانیں جنم لیتی رہی ہیں)

''دیا کو تیرا لالہ اچھا لگتا ہے۔'' کاجل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تا میرا لالہ تو ہے ہی اچھا، سب کو اچھا لگتا ہے، دیا کو بھی اچھا لگ گیا تو اس میں ایسی کون سی بات ہے جو تم دونوں سرگوشیوں میں کرتیں؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''یوں نہیں جیسے تمہیں یا بی بی جی کو لالہ اچھا لگتا ہے...... اور طرح سے!'' کاجل نے آنکھوں کو مٹکا مٹکا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور کس طرح سے؟'' معصومیت سے کلثوم نے کہا، ابھی اس کی عمر بھی کیا تھی سترہ برس...... جبکہ کاجل اور دیا بیس برس یا اس سے کچھ اوپر ہی ہوں گی۔ ان کے فہم اور کلثوم کی سوچ میں بہت فرق تھا۔

''بھئی جیسے لڑکے لڑکیوں کو آپس میں ہوتا ہے، وہ دونوں آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' کاجل نے چڑ کر بلی تھیلے سے نکال ہی دی۔

''شادی...... لالہ اور دیا......؟'' اس کی حیرت دیدنی تھی، دونوں آنکھیں حلقوں سے باہر آگئی تھیں۔

''ہاں بس دھرم کا مسئلہ ہے، وہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں، دیا تیرے لالے کی خاطر اپنا دھرم بھی چھوڑنے کو تیار ہے مگر اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ بی بی جی اور دیا کے ماتا پتا سے کون بات کرے؟'' کاجل نے مزید وضاحت

لی۔

''اصل مسئلہ یہ نہیں ہے'' وہ کاجل کا منہ دیکھ کر بولی۔''اصل مسئلہ یہ ہے کہ لالے کی منگنی تو میری ماسی کی بیٹی سے کب سے طے ہے!''

''منگنی کی کیا حیثیت ہوتی ہے کلثوم، ساری بات دلوں کے سودے کی ہے...... دل راضی ہوں تو باقی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔'' کاجل تو یوں کہہ رہی تھی جیسے کوئی معمولی سی بات ہو۔

''بی بی جی اپنی زبان کی بہت پکی ہیں، وہ لالے کی منگنی توڑنے پر کبھی راضی نہ ہوں گی!'' کلثوم نے پورے وثوق سے کہا۔ کاجل نے اس کے چہرے پر خوف سا اترتا دیکھا اور دل ہی دل میں سوچ کر ہنسی کہ جیسے اب عباس اور دیا کو اس بات کی پروا رہ گئی ہے کہ کون راضی ہوتا ہے اور کون نہیں، جس راستے پر وہ چل رہے تھے اور جس حد تک وہ جا چکے تھے، اس پر والدین کی غیر رضامندی، اولادوں کو بغاوت پر مجبور کر دیتی ہے۔ عباس ذرا سا اپنی ماں سے خوفزدہ تھا مگر دیا تو خوف کی ہر منزل کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

''یہی بات تو میں دیا کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ تمہیں اپنے راز میں شریک کر لے اور تم بی بی جی سے بات کرو کیونکہ بی بی جی تمہاری بات نہیں ٹالتیں۔'' کاجل نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''مم...... میں؟'' کلثوم نے تھوک نگلا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔''میں بی بی جی سے یہ بات کبھی بھی نہیں کر سکتی!''

''اچھا چلو، تم نہ کرو بات لیکن یوں تو خوف سے نہ کانپو، آتے جاتے لوگ دیکھ کر کیا سوچیں گے!'' کاجل نے اسے تھاما۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے کاجل!'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔''اگر اماں کو علم ہوا کہ تم نے میرے ساتھ ایسی بات کی ہے تو وہ تو میرا گلا ہی گھونٹ دیں گی۔''

''تو تم بی بی جی کو نہ بتانا نا!'' کاجل نے اسے مشورہ دیا۔

''بی بی جی سے کوئی بات چھپانا بہت مشکل ہے، وہ میرا چہرہ دیکھ کر جان جاتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔'' کلثوم کی کپکپی نہیں تھم رہی تھی۔

''اس طرح تو تم خود ہی بول کر انہیں بتا دو گی کہ کچھ نہ کچھ بات ہے۔'' کاجل نے اسے گھر کا۔''چلو اب اپنی حالت ٹھیک کرو، گھر آ گیا ہے تمہارا!''

''دیا کے بارے میں مجھے کیسے علم ہوگا کہ وہ کیوں جلدی چلی گئی، کیا تم جاؤ گی ابھی اس کے گھر؟'' کلثوم نے پوچھا۔

''نہیں اس وقت تو نہیں، اب کل ہی پتا کروں گی، اس وقت تو چاچا جی بھی گھر آ چکے ہوں گے اور تمہیں علم ہے کہ میری منگنی اس کے لالے سے ہوئی ہے اور میں ایسے وقت میں اس کے ہاں نہیں جاتی جب اس کا لالہ گھر پر ہو!'' کاجل نے وضاحت کی۔

''اچھا! مجھے علم نہیں تھا...... کیا نام ہے اس کے لالے کا؟'' کلثوم کو ان کے گھروں میں جانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے ایسی اندرونی باتوں کا اسے علم نہ تھا۔

''اس کا نام شیکھر ہے۔'' کاجل اس کا نام بتاتے وقت لجا سی گئی۔''بہت اچھا ہے، بڑا گبرو ہے۔''

''تو کیا تم اس سے ملتی ہو، ابھی تو تم کہہ رہی تھی کہ تم اس کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جاتی ہو......؟'' کلثوم نے حیرت سے پوچھا۔

''تو دیا کیا تمہارے گھر پر آ کر تمہارے لالے کو ملتی ہے؟'' کاجل کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا حالانکہ ابھی اس نے سوچا تھا کہ اس سے زیادہ کلثوم کو نہیں بتائے گی۔

''کیا؟'' کلثوم کی چیخ دبی دبی سی تھی۔''دیا لالے سے ملتی ہے؟''

☆☆☆

''کم بخت، ناس ماریاں! آدھا دن پڑنے تک پڑی اینڈتی رہتی ہیں۔'' بلند اور بھاری آواز میں اس نے ایک بار پھر چلا کر ان کو درجہ بہ درجہ پکارا۔''الماس! روبی! نیلم! یاقوت! زمرد! مرجان! فیروزہ!''

''کیا بات ہے اماں، کیوں سویرے سویرے میری نیند خراب کر رہی ہو؟'' قریب ہی سوئے ہوئے نوجوان نے بیزاری سے کہا۔

''تو ہی اٹھ جا میرا لال، جا کر ان کو جگا۔ آدھا دن یونہی گزار دیتی ہیں سو سو کر نحوست پھیلاتے ہوئے!'' اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے، اس کے چہرے پر ممتا کی شفقت دیدنی تھی۔

''آدھی آدھی رات تک جاگیں گی تو صبح کس طرح اٹھیں گی!'' نیند خراب ہونے کی بیزاری کسی میک اپ کی طرح اس کے چہرے پر لپی تھی، ماں کے ہاتھوں کا لمس اسے مزید سُرور دے رہا تھا، اٹھنے کو من ہی نہیں کر رہا تھا۔

''اٹھ میرا پیارا، میرا لال، میرا دُلی!'' ماں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

''اٹھتا ہوں اماں!'' اس نے مندی مندی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور بولا۔''اماں!''

''کیا بات ہے میرا بیٹا؟'' انہوں نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا، اب تو ان کے لال کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔

''اماں تم مجھے دُلی کیوں کہتی ہو؟'' اس نے عجیب سا سوال پوچھ لیا تھا۔

''کیونکہ یہ تمہارا پیار کا نام ہے!'' انہوں نے پیار سے کہا۔

''تم کہتی ہو کہ میرا پیار کا نام دُلی ہے اور میرا اصل نام دلاور ہے...... مگر گلی محلے کے لڑکے تو کچھ اور......''

"بکواس کرتے ہیں سارے کے سارے اتنا پیارا نام ہے میرے بیٹے کا اور اتنا خوب صورت ہے میرا لال کہ سب جلتے ہیں۔۔ اور اس گلی محلے میں کس کا بچہ ہے جو دسویں جماعت میں پڑھتا ہے، یہی بات تو ان میں سے کسی سے برداشت نہیں ہوتی!" انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے محلے کے ان ان دیکھے لوگوں کی اچھی خاصی تو اضع کر ڈالی۔

"وہ تو یہ بھی کہتے ہیں اماں کہ تیری ماں نے جو قیمتی پتھر گھر میں جمع کر چھوڑے ہیں، وہ تیری بہنیں نہیں ہیں، میں اُن کا کچھ نہیں لگتا۔" اس نے ماں کے غصے کو عروج پر پہنچا دیا۔

"جھوٹ بولتے ہیں۔" اس کے منہ سے غصے سے کف نکل رہا تھا اور دل میں اس نے کتنی ہی گالیوں کا گلا گھونٹا تھا۔ جس بات کو وہ دُلی سے چھپائے پھرتی تھی اور سمجھ بیٹھی تھی کہ اُسے عمر بھر علم نہ ہوگا، اس کی خوش فہمی ہی تو تھی۔ ایسی باتیں کہاں اور کتنا عرصہ چھپ سکتی ہیں.......... اس کو اس بات سے بے خبر رکھنے کے لیے تو وہ... ہر رات سونے سے قبل دودھ میں ذرا سی نیند کی دوا دے دیتی تھی کہ وہ غفلت کی نیند سو جائے اور کبھی رات کے کسی پہر وہ جاگ کر اس حقیقت سے باخبر نہ ہو جائے جس کو وہ اس سے ابھی اگلے کئی برس تک چھپانا چاہتی تھی یا شاید اسے خود سے اتنی دور بھیج دیتی کہ اسے کبھی اس بات کا علم ہی نہ ہو پاتا کہ اس کی ماں کا دھندا کیا ہے اور اس کے گھر میں رہنے والی ان رنگ برنگی لڑکیوں سے اس کا کیا تعلق ہے، جنہیں اس کی ماں اس سے بہنیں کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔

"اماں لوگ دوسروں کے بارے میں ایسی باتوں میں جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟" اس کے معصوم ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں جھوٹ بول سکتی ہے یا اس سے کوئی غلط بیانی کرے گی۔

"تو کیوں پریشان ہوتا ہے لوگوں کی باتوں پر، کوئی ضرورت نہیں آئندہ سے ایسوں کے منہ لگنے کی، تو گھر میں بیٹھ کر اپنی پڑھائی کیا کر۔" بیٹے کا کندھا تھپک کر اس نے پیار سے کہا۔

"لیکن مجھے کھیلنا بھی تو ہوتا ہے اماں، پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل بھی ضروری ہے، ہمارے ماسٹر صاحب کہتے ہیں!" اس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"تو برے لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلا کر۔" انہوں نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔ "تو اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کر، وہ اچھے لڑکے ہیں۔ اس محلے میں سب خراب لڑکے ہیں!"

"تو پھر ہم کسی اور محلے میں کیوں نہیں چلے جاتے، ہم اس محلے میں کیوں رہیں جہاں لوگ میرے اور میری بہنوں کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں؟" اس نے کہا۔

"اچھا تو اٹھ جا کر اپنی بہنوں کو جگا۔" انہوں نے اس سے کہا اور اس کی ابھی کہی ہوئی بات پر سوچنے لگیں۔ اس نے انہیں ایک اچھی بات سجھائی تھی۔ یہاں رہ کر وہ اپنے بیٹے کو اس ماحول سے نہیں بچا سکتی تھیں، یہی بیٹا ان کی کل متاع تھا۔

''یہ کیا ہے زرتاج؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔

''بچہ ہے یہ!''

وہ تو میں سمجھ گیا ہوں مگر کس کا بچہ ہے اور یوں رات کے اس وقت تم اس بچے کو لے کر میرے پاس کیوں آئی ہو؟'' اس کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''مجھے اندر آنے دو تو میں تمہیں بتاتی ہوں!'' اس نے تھپک تھپک کر بچی کو خاموش کروا دیا تھا۔ شاکر نے ہٹ کر اسے راستہ دیا اور وہ اسی طرح بچی کو ساتھ لگائے لگائے اس کمرے میں آ گئی جو دکان کے طور پر استعمال ہوتا تھا، ایک طرف دھرے موڑھے پر بیٹھ گئی اور اس سے پانی مانگا۔

''اب بتاؤ کہ یہ کون ہے اور تم یہاں کیوں آئی ہو، کسی نے تمہیں یہاں آتے دیکھا ہوگا تو کیا سوچا ہو گا؟'' شاکر نے تشویش سے کہا، اسے زرتاج کی عزت بھی پیاری تھی اور اپنی بھی۔

''مجھے نہیں معلوم میں نے کیسے یہ سب کر لیا، اس بچی کی زندگی خطرے میں تھی، میں ایسا ہوتے دیکھ نہ سکی اور اسے موت کے منہ سے بچا لائی ہوں۔'' اس نے مختصراً اسے بتایا۔

''مگر یہ ہے کون؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''چوہدری اکبر علی کی بیٹی!'' اس نے گویا دھماکا کیا تھا۔

''اس کی جان کو کس سے خطرہ تھا اور تم اسے کیوں اٹھا لائی ہو...... جانتی ہو کہ ان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں؟'' اس نے خفگی سے کہا۔

''اس کی جان کو خطرہ اس کے اپنوں سے ہی تھا اور مجھے کچھ علم نہیں کہ کس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں...... میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں اس معصوم بچی کو کسی طرح بچاؤں۔ میں نے اس کے نتائج کا نہ سوچا اور نہ ہی اس کو یوں لے کر آنا میرے منصوبے کا حصہ تھا مگر جانے کس طرح ایسا ہوا ہے، مجھے کچھ علم نہیں۔ مجھے تو یہاں آ کر ہوش آیا ہے اور سمجھ میں آیا ہے کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔'' اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ دیوانی ہو گئی ہو تم؟'' شاکر نے اسے گھر کا۔ ''اماں کہاں ہیں تمہاری؟''

''وہ ابھی تک وہیں ہیں، اس کے ساتھ پیدا ہونے والی دوسری بچی مر گئی ہے اور چوہدری اکبر علی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے، اس لیے وہاں کی پریشانی کی وجہ سے وہ وہیں ہیں، میں بھی وہیں تھی!'' اس نے وضاحت سے بتایا۔

''تو انہی قدموں پر اس بچی کو لے کر وہیں لوٹ جاؤ!'' شاکر نے کہا۔

''نہیں...... نہیں! اس بچی کو میں وہاں نہیں لے کر جاؤں گی، وہ اسے مار دیں گے۔ میں نے خود سنا ہے شاکر!'' اس نے التجا کی۔ ''ان بچیوں کی دادی نے ان دونوں بچیوں کے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا۔''

''تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟'' شاکر نے بے پروائی سے کہا۔

''تو کیا ہم اتنے برے ہیں کہ ہم اس کو مرنے دیں، کیا ہمارے نبی پاک ﷺ سے قبل جو کچھ جہالت کے زمانے میں ہو رہا تھا، اسے ہم پھر ہونے دیں؟'' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ''میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن۔'' وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''کیا ہوا تمہاری بہن کو؟'' شاکر اس کی آنکھوں میں آنسو کب دیکھ سکتا تھا بھلا۔

''کبھی وقت ملا تو پھر بتاؤں گی۔'' اس نے آنسو صاف کیے۔ ''کیا میں تم سے اپنی محبت کے واسطے یہ درخواست کر سکتی ہوں کہ اس بچی کو بچا لو، میرے لیے......''

''زرتاج! میری محبت کو نہ آزماؤ، تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ تم خود کو کس مصیبت میں ڈال رہی ہو۔''

''اب میں اسے واپس تو لے کر نہیں جا سکتی، تم صرف چند دن کے لیے اس کا خیال رکھو...... پھر ہم کچھ راستہ سوچیں گے۔'' اس نے شاکر کی منت کی۔

''یہاں میں اس کو کیسے رکھ سکتا ہوں، رو رو کر یہ سارے گاؤں کو خبر کر دے گی۔'' شاکر تذبذب میں تھا کہ کس نوعیت کی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

''تم اس کو شہر لے جاؤ شاکر، وہاں کسی کے پاس چند دن کے لیے چھوڑ آؤ، پھر ہم دونوں بھی شہر چلے جائیں گے!'' اپنی دانست میں اس نے بڑی عقلمندی کی بات کی تھی۔

''شہر میں اس کو کس طرح لے کر جا سکتا ہوں اور کہاں رکھ سکتا ہوں، تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے!'' شاکر قطعی یہ بھاری ذمے داری لینے کو تیار نہ تھا۔

''تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟'' اس کے انداز نے شاکر کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔

''تم جاؤ...... میں دیکھ لیتا ہوں، میں تمہیں بتا دوں گا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں!'' شاکر نے بچی کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

''یہ تھوڑا سا شہد ہے اور دودھ کی ایک بوتل، یہ اس کو لپیٹنے کے لیے ایک چادر ہے۔'' اس نے سامان شاکر کے حوالے کیا، تاریکی کا فائدہ اٹھا کر باہر نکلی اور پورے ہوش و حواس سے واپس حویلی کی طرف چل پڑی۔ تیز تیز قدموں سے جب وہ واپس حویلی میں پہنچی تو ہر طرف ہلچل تھی، اسے آتا ہوا دیکھ کر کسی نے چلا کر کہا۔

''آ گئی ہے زرتاج، کوئی اس کی ماں کو خبر کر دو، وہ اس کی غیر حاضری پر بہت پریشان تھی!''

''کدھر تھی تو زرتاج، تیری ماں تو تجھے نہ پا کر بے ہوش ہونے والی ہے۔'' کسی نے پوچھا تھا۔

''میں؟'' اس کا ذہن کسی سوچ میں تھا اور وہ کوئی جواب ڈھونڈ رہی تھی، جس سے وہ اپنی طرف دیکھتے ہوئے کتنی ہی نظروں کو مطمئن کر سکے۔

☆☆☆

''اماں۔'' اس نے ہولے سے ماں کو پکارا کہ اگر وہ سو چکی ہوں تو ان کی نیند خراب نہ ہو۔

''کیا بات ہے؟'' نیند کہاں ان کی آنکھوں میں تھی، گاؤں میں ہونے والی باتوں نے ان کا سکون بھی چھین لیا تھا۔

''اماں، گاؤں کے لوگ لالہ کے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟'' اس نے جرأت کر کے پوچھ لیا تھا۔

''تجھے کس نے کہا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"اماں آپ خود ہی تو مجھ سے بات کر رہی تھیں دن کو۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں نے۔" وہ بڑبڑائیں۔ "میں نے کیا کہا؟"

"اماں کوئی پریشانی کی بات ہے کیا؟" اس نے اپنی کہنی کے بل اٹھ کر ان کی طرف دیکھا، چاندی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے ماں کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی تھی۔

"ہوں! پریشانی...... معلوم نہیں!" کاش ان کے پاس کوئی تو رشتہ ہوتا کہ جس کے ساتھ وہ اپنے دل کا بوجھ بانٹ لیتیں۔

"آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ لالہ ہمارے کھیل والے احاطے میں آتا ہے کہ نہیں؟" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماں کو وہ بات بتائے جو کاجل نے اسے بتائی تھی کہ لالہ اور دیا باہر ایک دوسرے سے ملتے تھے، چوری چھپے...... اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یوں چوری چھپے ملنا ٹھیک نہیں ہوتا...... وہ بھی جب لڑکا مسلمانوں کا ہو اور لڑکی ہندوؤں کی...... مگر اماں اس موضوع کی طرف آ ہی نہیں رہی تھیں۔

"یونہی پوچھ لیا تھا...... تو بات کو پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے!" انہوں نے اسے گھر کا۔ "چل اب تو سو جا، صبح سویرے اٹھنے کو تیار ہی نہیں ہوتی ہے۔"

"اماں، لالہ شہر سے کب آئے گا؟" اس نے فوراً بات بدلی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ماں کو وہ بات ضرور بتائے۔

"کل آنے کا کہہ گیا ہے، تو اب آیت الکرسی پڑھ اور سو جا، میرا دماغ نہ کھا!" اماں نے اسے ڈانٹ کر کروٹ بدل کر گویا مزید گفتگو کے راستے مسدود کر دیے تھے۔

"اچھا اماں!" اس نے بھی کروٹ لی اور منہ ہی منہ میں آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ بار بار اس کا دھیان لالہ اور دیا کی خفیہ ملاقاتوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ کاجل کہہ رہی تھی کہ دیا اور لالہ شادی کرنا چاہتے ہیں، تو کیا دیا اس کی بھرجائی بن جائے گی...... یہ تصور ہی کتنا حسین تھا۔ اس تصور سے وابستہ کتنے تصور تھے لالے کی شادی پر خوب صورت اور نئے چمچماتے لباسوں کے...... ہاتھوں پر مہندی رچانے کے اور اپنی سکھیوں کے ساتھ مل کر لڈی ڈالنے کے...... اور ان تصورات کے سلسلے اتنے دراز تھے کہ ان کا آخری سرا نیند کی وادی میں جا کر ختم ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی، اس کا تصور بھی کبھی موجی نے نہیں کیا تھا۔ قائم علی اسے ہمیشہ معراج ہی کہتا تھا، موجی سے معراج تک کے سفر نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اسے قائم علی سے اتنا پیار ملا تھا کہ اس کا دامن بھی تنگ پڑ گیا تھا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ قائم علی جب بھی شہر جاتا تھا تو وہ اس کے ساتھ چلی جاتی اور جتنے دن اس کا کام ہوتا تھا، اتنے دن کے لیے وہ بھی رہ آتی تھی۔ اپنے میکے بھی کبھی وہ اکیلی نہیں جاتی تھی، اس کا جی ہی نہیں لگتا تھا قائم علی کے بغیر۔

شادی کے کچھ عرصے بعد جب اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی تو قائم نے اس سے کہا بھی کہ وہ میکے چلی جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ انہیں دیکھنے اور جاننے والے حیران ہوتے تھے حتیٰ کہ موجی کے والدین بھی

کہ ان کی بیٹی کس طرح ایک بالکل اجنبی ماحول میں، شہر کی سہولیات سے دور رہ کر بھی خوش تھی...... اس کی ماں کو تو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی بیٹی کو اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ تھا، شوہر کے سامنے بھی وہ سرخرو تھیں۔

قائم علی نے کاروبار کو اور بھی بڑھا لیا تھا، وہ موجی کو دنیا کی ہر خوشی دینے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا مگر وہ شہر منتقل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے کاروبار کا منبع گاؤں تھا اور گاؤں کی زمینیں اٹھا کر شہر بھی نہیں لے جائی جا سکتی تھیں۔ اگر وہ شہر منتقل ہو کر یہی کاروبار وہاں سے کرتا اور فصل کے فصل گاؤں آ کر مال خرید لیتا تو بھی ممکن تھا مگر جب اس نے موجی کے سامنے یہ صورت رکھی تو اس نے انکار کر دیا...... اسے گاؤں میں رہنا پسند آیا تھا اور وہ گاؤں میں رہ کر اپنی تعلیم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے امراض کے علاج کے لیے اس نے شہر سے بنیادی دوائیں منگوائی تھیں اور چھوٹے سے پیمانے پر ایک مفت علاج کے لیے ڈسپنسری بھی بنالی تھی۔

یوں بھی ہمارے معاشرے کا عام رواج ہے کہ لڑکی بیاہ کر اپنے والدین کا گھر چھوڑتی ہے، پھر وہ کیوں قائم علی کا گھر بار چھڑواتی...... شہر میں تو ان کے رشتے دار بھی تھے، جن سے شہر میں منتقلی کی صورت بہر حال رابطہ رہتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خاندان کے لوگوں کو علم ہو کہ قائم علی پڑھا لکھا نہیں ہے اور اگر علم ہو بھی تو کم از کم قائم علی کے منہ پر تو کوئی بھی نہ کہے گا۔

اس نے قائم علی کے لیے بھی کچھ کتابیں خود خریدی تھیں اور اس کے نہ نہ کرتے بھی اس نے اس کی ابتدائی تعلیم کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ اگرچہ قائم علی کو مشکل بھی لگتا کہ اس عمر میں وہ پڑھے مگر جو کام اس نے معراج کی خوشنودی کے لیے شروع کیا تھا، اس کی افادیت اسے چھ ماہ میں ہی سمجھ آ گئی تھی۔ پڑھائی کے دوران ہنسی مذاق بھی چلتا تھا مگر ان دونوں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ قائم علی اردو کا ابتدائی قاعدہ اٹھائیس سال کی عمر میں پڑھ رہا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا، جب قائم علی ہجے کر کر کے الفاظ بنا رہا تھا اور اپنا سبق اپنی استانی کو سنا رہا تھا۔

"ل سے لڑکا...... لام ڑے زبر لڑ...... کاف الف زبر کا...... لڑکا!" قائم علی نے ہجے کیے۔

"لڑکی کیسے لکھتے ہیں؟" اس نے معراج سے پوچھا۔

"جیسے لڑکا بولا ہے، اس کے آخر میں الف کے بجائے چھوٹی یے لگا کر بولیں۔" اس نے سمجھایا۔

"لام ڑے زبر لڑ، کاف یے زیر کی...... لڑکی!" اس نے ہجے کیے۔ "مجھے لڑکی چاہیے!" اس کی بات پر معراج کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"یہ بات کہنے کے لیے ہجے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تاکہ تم میری بات پر ہنسو۔" قائم نے بھی ہنس کر کہا۔

"لڑکا یا لڑکی میرے اختیار میں کہاں ہے؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تم دعا کیا کرو، میں نے سنا ہے کہ اس حالت میں عورت کی دعا قبول ہوتی ہے!" اس نے معراج کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں دعا کروں گی!" اس نے قائم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔

"تمہیں پتا ہے، میں اپنی بیٹی کا نام کیا رکھوں گا؟" اس نے پہیلی پوچھی۔
"مجھے بھلا کیا پتا؟" وہ ہنسی۔
"میں اس کا نام زرتاج رکھوں گا۔" قائم نے بلی تھیلے سے نکالی۔
"آپ تو بڑی دور کی سوچے بیٹھے ہیں۔" اس نے حیرت سے دیکھا۔
"دور کیوں، صرف تین ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔" قائم نے فوراً کہا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

☆☆☆

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھل گئی، اماں تو پہلے ہی اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ذرا خوف زدہ سی تھی، اماں بھی حیران تھیں کہ رات کے اس پہر کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، انداز عباس کا بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی چادر درست کر کے اوڑھی اور چپل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس وقت دروازہ کھولنے کلثوم کو بھی نہیں بھیج سکتی تھیں۔
"تو ذرا اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جا، میں دیکھتی ہوں کون ہے!" انہوں نے کلثوم سے کہا۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے اماں!" اس کی آواز میں لرزش تھی۔
"ڈر کس چیز سے لگ رہا ہے تجھے؟" انہوں نے اسے گھرکا۔ "اور جب تک میں نہ کہوں، باہر نہ آنا!" انہوں نے اسے تاکید کی...... آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھیں، باہر کھڑے لوگوں کو چپل کے گھسٹنے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی دروازہ کھولنے آ رہا ہے۔
"کون ہے؟" انہوں نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔
"خود ہی ہیں ہم بی بی جی! دروازہ کھولیں، آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" باہر سے مردانہ آواز آئی تھی۔
"کون خود ہیں آپ لوگ...... اور یہ کون سا وقت ہے ضروری بات کرنے کا؟" ان کے لہجے میں ناراضی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔
"ہم ہیں جی رام لال اور دیالو۔" باہر سے آواز آئی۔ کلثوم صاف ان آوازوں کو سن سکتی تھی اور اسے اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کاجل اور دیا کے پتا تھے، دونوں آپس میں رشتے دار بھی تھے...... مگر وہ اس وقت وہاں کیوں آئے تھے۔
"کس لیے آئے ہیں آپ اس وقت بھائی صاحب؟" انہوں نے اپنے لہجے کو ذرا دبا کر کہا تھا۔
"آپ دروازہ کھولیں تو بات کرتے ہیں۔" باہر سے آواز آئی۔
"گھر میں مرد نہیں ہے اس لیے رات کے اس پہر میں دروازہ نہیں کھول سکتی!" انہوں نے سختی سے کہا۔
"کہاں ہے گھر کا مرد؟" باہر سے اس سے بھی زیادہ درشتی سے پوچھا گیا۔
"شہر گیا ہے!" جواب مختصر تھا۔
"ہمارا یہی اندازہ تھا۔" باہر سے آواز آئی تو ان کا دل دھڑ دھڑانے لگا، کسی انہونی کے خیال سے وہ ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

"آپ دروازہ کھولیں ہم اپنے گھر کی عورتوں کو بھی ساتھ لے کر آتے ہیں، ہمارا اس وقت بیٹھ کر بات کرنا بہت ضروری ہے!"
"اس وقت زحمت نہ کریں، ہم صبح بھی بات کر سکتے ہیں!" بی بی جی نے انہیں ٹالنا چاہا، شاید وہ چاہ رہی تھیں کہ کلثوم کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں۔
"ہم صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔" باہر سے آنے والی آواز میں غصہ تھا۔ "آپ کی اپنی بیٹی اگر رات کو گھر میں نہ ہو تو کیا آپ رات بھر سو کر صبح ہونے کا انتظار کریں گی؟" ان کا پورا وجود لرزنے لگا اور اندر سے کان لگا کر گفتگو سننے والی کلثوم حیران تھی کہ کیا ہو رہا ہے...... اور اگر دیا یا کاجل اپنے گھر پر نہیں ہیں تو یہ لوگ ہمارے گھر کیوں آئے ہیں لیکن دونوں میں سے کون گھر پر نہیں ہے اور کیوں...... اس سوال کا جواب اس کا ننھا سا ذہن نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

"کیوں پریشان ہو گئیں اماں آپ؟" زرتاج نے ان کے ساتھ لپٹتے ہوئی کہا۔ "میں یہیں تھیں، آپ کو بتایا تھا کہ مجھے لیٹرین جانا تھا۔"
"مگر تم وہاں بھی نہیں تھیں، فاخرہ کے کمرے کے ساتھ ہی تو۔" ان کی ہچکیاں بیٹی کو دیکھ کر تھم گئی تھیں۔
"میں باہر چلی گئی تھی، میں نے سوچا چھوٹی چوہدرانی سو رہی ہیں، ان کی نیند نہ خراب ہو۔" اس نے فوراً بہانہ گھڑا۔
"اس بے چاری نے کیا سونا ہے، ہم یہاں ایک کو رو رہے تھے، وہ رونے کی آوازیں سن کر ادھر ہی آ گئی اور کافی دیر کے بعد جب واپس اپنے کمرے میں گئی تو بچی وہاں نہ تھی۔" اماں نے اسے بتایا۔
"اوں" اس نے تاسف سے کہا۔ "بے چاری!" اسے معلوم تھا کہ جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی تو بچی تو اس وقت بھی کمرے میں نہ تھی مگر اسے باہر کے شور کے باعث خیال ہی نہیں رہا ہوگا اور بعد میں جب دیکھا گیا تو بچی نہ تھی۔ سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ بچی کو اس وقت کسی نے غائب کیا ہوگا جب فاخرہ باہر آئی تھی۔ اس نے چوہدرانی شکیلہ کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غم کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کے بیٹے کی خیریت کی اطلاع آ چکی تھی، باقی ان بچیوں کے لیے جو احکامات وہ دے چکی تھی، وہ تو یہی سمجھے بیٹھی ہوگی کہ اس کی وفادار ملازماؤں نے اپنا کام کر دیا ہے، البتہ فاخرہ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔
"اماں گھر چلیں؟" اس نے ماں کا گھٹنا ہلایا۔
"اس بچی کی تدفین ہونے والی ہے اور چوہدری اکبر علی بھی گھر آنے والے ہیں، پھر فاخرہ کا غم بھی دیکھا نہیں جا رہا، ایسے میں ہمارا اٹھ کر گھر چلے جانا معیوب سی بات لگتی ہے!" معراج بی بی نے اسے سمجھایا۔
"میرا پیٹ خراب ہے اماں...... بتایا ہے آپ کو، کیا میں اکیلے گھر چلی جاؤں؟" اس نے ماں سے اجازت طلب کی، جواب میں انہوں نے اسے گھوری ماری تو وہ دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ تھوڑی سی بچوں کی نیند کی دوا کسی نہ کسی طرح شاکر کو پہنچا دے تاکہ اسے اس بچی کو لے کر شہر جانا مشکل نہ ہو۔
"تو اٹھ اور چھوٹی چوہدرانی کو اس کے کمرے میں لے جا، اس کی کمر ہولے ہولے دبانا، اسے ذرا سا

سکون ملے اور اگر وہ ذرا کی ذرا سو جائے تو اچھا ہے۔'' اماں نے اسے ہدایات دیں تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی کہ فاخرہ کو اس کے کمرے میں لے جائے۔

''میں نے کہا تھا نہ تم سے کہ ان کی دادی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو زرتاج کا دل بھی بھر آیا، اس کا دل چاہا کہ وہ اس کی بیٹی اس کو واپس لا دے مگر وہ جانتی تھی کہ اس میں اس کی اور اس کی ماں کی بدنامی بھی ہے اور اس بچی کی زندگی کو خطرہ بھی موجود رہے گا۔

''اللہ کرے گا تو آپ کی بیٹی جلد مل جائے گی!'' اس نے اسے تسلی دی، وہ دل میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ جوں ہی حالات ذرا موافق ہوں گے تو ان کی بیٹی ان کو واپس کر دے گی۔ وہ اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کر رہی تھی، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ کاتبِ تقدیر نے کیا منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس کے لیے۔

☆☆☆

چوہدری اکبر علی کو اللہ نے بال بال بچا لیا تھا، سانپ اگرچہ بہت زہریلا نہ تھا مگر اگر زیادہ دیر گزر جاتی تو کچھ بھی ہو سکتا تھا...... ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہے تھے اپنی زمین پر کام کرنے والی کسی غریب مزارعے کی بیٹی کا کہ جس نے اس خطرے کو محسوس کر کے شور مچایا تھا، اس وقت وہ کچھ ہوش میں تھے مگر اتنی بلند آواز میں چیخ کر کسی کو اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔

انہیں کچھ کچھ یاد تھا کہ کسی لڑکی نے فوراً آ کر ان کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا، آواز سے انہیں وہی لگی تھی جس نے چیخ چیخ کر لوگوں کو بلایا تھا...... مندی مندی آنکھوں سے انہیں اس کی شکل واضح نظر نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ دوبارہ کھیتوں پر جائیں گے تو اس کا پتا کروائیں گے اور اس کا شکریہ ادا کریں گے، اتنا تو اس کا حق بنتا تھا چاہے وہ کسی غریب کی بیٹی تھی مگر اس نے ان کی جان بچا کر ان پر احسان کیا تھا۔

اگلے روز ہی گھر پہنچ کر انہیں اپنے گھر میں دو بیٹیوں کی ولادت، ان میں سے ایک کی وفات اور دوسری کی گمشدگی کا علم ہوا...... پہلی خبر پر وہ بجھ سے گئے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ اس بات کو جواز بنا کر اب ان کی ماں ان کی دوسری شادی کروا ہی دیں گی۔ دوسری خبر پر انہوں نے بظاہر دکھ کا اظہار کیا تھا مگر دل ہی دل میں ٹھنڈی آہ بھری تھی، کسی صنفِ نازک کی زندگی کی ڈور ٹوٹ جانا ان کے لیے اتنا سا ہی سانحہ تھا کہ ہلکا سا تاسف کا اظہار کیا جائے، ہاں البتہ اس کی جگہ اگر لڑکا ہوتا تو اس وقت حویلی اور ان کے دل...... دونوں میں صفِ ماتم بچھی ہوتی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ تیسری خبر پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، کیسے ممکن ہے کہ ان کی حویلی کے اندر سے ایک بچی اغوا ہو جائے، وہ بھی ان کی بیٹی...... خود چاہے وہ کبھی بھی اور کسی بھی گھر سے کسی کی پلی پلائی بیٹی بھی اٹھا لائیں۔ انہوں نے اپنے خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ اگلے روز نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ ساتھ کے کئی دیہات میں بھی تلاش کا دائرہ پھیلا کر بچی کو زندہ یا مردہ حالت میں برآمد کیا جائے۔

''لیکن اس عمر کی کئی بچیاں ہوں گی ہمارے اور ساتھ کے دیہات میں...... اور جب یہ بھی علم نہیں کہ اس بچی کو پہچانا کس طرح جائے گا تو تلاش کس نکتے سے شروع ہو گی؟'' ایک کارندے نے سوال اٹھایا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے...... لیکن تم لوگ جس گھر میں بھی چھوٹی بچی دیکھو، اس علاقے کی دائیوں سے اس بات کی

تصدیق کرلو کہ اس بچی کی ولادت وہاں ہوئی ہے کہ نہیں!'' انہوں نے نکتہ پیش کیا۔

''جیسا حکم سرکار...... ہم اپنی پوری کوشش کریں گے!'' انہوں نے کہا اور تعظیم سے باہر نکل گئے۔

''اکبر بیٹا! اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بیوی تو تمہاری بے پروا ہے ہی، اکیلی بچی کو چھوڑ کر باہر نکل آئی، کیا پتا کوئی کتا یا بلی ہی اسے اٹھا کر لے گیا ہو!'' شکیلہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، اس کے ذہن میں یہ خدشہ موجود تھا کہ کہیں اس کی ہدایات میں کام کرنے والیاں، اکبر کے بندوں کے ڈر سے کچھ اگل نہ دیں۔

''اماں وہ میری بیٹی تھی، کوئی پرندہ نہیں کہ جسے کتے بلیاں لے جائیں اور کیا وہ زمین پر پڑی تھی یا کمرے کی کھڑکی کی سلاخوں میں سے اسے نکالا جاسکتا تھا۔'' اس نے ماں کی بات پر غصے سے کہا۔

''ارے بیٹا! نوزائیدہ بچہ ہوتا ہی کتنا بڑا ہے اور پھر جب ایک کی جگہ دو ہوں تو اسے تو آدھا بچہ ہی سمجھو!'' انہوں نے بیٹے کو تسلی دی۔ ''تم زیادہ فکر نہ کرو، کیسے کمزور ہو رہے ہو، ابھی خود موت کے منہ سے بچ کر آئے ہو۔'' پیار سے انہوں نے اپنے بیٹے کو ساتھ لگا لیا۔

''ارے ہاں اماں! میں کل کسی وقت کھیتوں پر جاؤں گا اور اس لڑکی کو ڈھونڈ کر اس کا شکریہ ادا کروں گا اور آپ بھی اس کے لیے کوئی کپڑے شپڑے بھجوا دیں، اس نے میری جان بچائی ہے!'' اس نے کچھ یاد آجانے پر ماں سے کہا۔

''کیا ضرورت ہے شکریہ ادا کرنے کی، یونہی سر چڑھ جاتے ہیں یہ لوگ، میں کسی کمین کے ہاتھ اس کے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا بھجوا دیتی ہوں!'' شکیلہ نے بے پروائی سے کہا۔ وہ کسی کا احسان ماننے کو تیار ہوتی تھیں نہ ہی کسی کا شکریہ ادا کرنے کی متحمل۔

''فاخرہ کہاں ہے اماں؟'' اس نے یونہی بات کا موضوع بدلا۔

''بڑی فکر ہو رہی ہے تجھے اس کی؟'' انہوں نے پھکڑپن سے کہا۔

''یونہی خیال آیا کہ وہ نظر نہیں آئی، پریشان ہوگی!'' انہوں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا حالانکہ جس وقت سے آئے تھے سوچ رہے تھے کہ اس سے افسوس ہی کر دیں اور اس کی خیریت ہی پوچھ لیں لیکن خود ان کی خیریت پوچھنے والوں نے انہیں اب تک موقع ہی نہیں دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹی، اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ زرتاج اسے کمرے میں لے آئی تھی اور اس کے کندھے اور کمر دبا کر، زبردستی اسے دودھ میں ہلدی ڈال کر پلایا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں اسے اللہ کے حوالے کر کے چلی گئیں اور وہ اپنے کمرے میں تنہا...... اب تک جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا بیٹیاں پیدا کرنا اس کا اتنا بڑا جرم تھا کہ اب تک اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا، نہ اپنی شکل دکھانے، نہ اس سے دکھ کا اظہار کرنے، وہ دن بھر تڑپتی رہی تھی، جب اسے معلوم ہوا کہ اکبر علی کو سانپ نے ڈس لیا ہے، وہ اس وقت کا انتظار کر رہی کہ جب اسے اپنے شوہر کی طرف سے خیر کی خبر ملے اور وہ کب سے آیا ہوا تھا، اس نے اس کے پاس آنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

اس نے کروٹ بدلی، اپنی کہنی کے بل اٹھی اور ارادہ کیا کہ خود ہی جا کر اس کی خیریت کی خبر پوچھ لے،

اس نے تو بیٹیوں کو جنم دے کر شاید ایسا گناہ کر دیا تھا کہ اس کی سزا اسے عمر بھر ملنا تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکائے اور کھڑی ہوگئی اسے چکر سے آنے لگے۔ اس نے پلنگ کی ٹیک کو سہارے کے لیے پکڑا، اگلا قدم اٹھایا تو مزید نقاہت محسوس ہونے لگی۔ اس سے قبل کہ وہ پلٹتی یا کسی اور چیز کو سہارے کے لیے پکڑتی، زور کا چکر آیا اور وہ لہرا کر گری...... جانے کب کوئی اس کمرے کی طرف آتا اور دیکھتا کہ فرش پر خون تیزی سے پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

جہانگیر کا اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ شہر منتقل ہونا ایسا واقعہ نہ تھا کہ شجاع کے کان نہ کھڑے ہو جاتے، اسے لگا کہ رابعہ نے جہانگیر کو سب کچھ بتا دیا ہوگا اسی لیے اس نے خاموشی سے شہر چلے جانے کا پروگرام بنا لیا...... من ہی من میں خوش بھی ہوا کہ وہ مزید آزاد ہو گیا ہے، ہر طرح سے من مانی کرنے کو...... کوئی اسے روکنے یا ٹوکنے والا نہ ہوگا مگر ساتھ ہی اسے اپنا بھائی بزدل اور بے غیرت بھی لگا کہ اپنی بے عزتی کو خاموشی سے پی گیا تھا۔ اسے تو لگا تھا کہ اس بات کو لے کر اس کا بھائی اس سے لڑ پڑے گا اور وہ اپنے بھائی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے گا مگر وہ اتنا جی دار کہاں کہ شجاع سے پنجہ لڑائے...... شجاع خود ہی اپنے آپ پر اترا رہا تھا۔

زمینوں کے معاملات کے لیے اسے شہر سے گاؤں آنا پڑتا تھا لیکن اتفاق سے کبھی اس کا سامنا شجاع سے نہیں ہوا تھا۔ شجاع کی سرگرمیاں اسی طرح جاری تھیں، اپنے انجام سے بے نیاز وہ ذلت اور رسوائی کی حد تک برائی کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ مراد علی اس پر کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے، بارہا اسے سمجھا بھی چکے تھے اور اس کی طرف سے لوگوں سے معافیاں مانگنے کے علاوہ وہ اپنے رب سے بھی اس کی لیے ہدایت مانگتے تھے، چاہتے تھے کہ کوئی ایسی عورت اس کی زندگی میں آ جائے جو اسے سرتاپا بدل دے، ان کے خیال میں شادی اس کا علاج تھی۔ انہیں شاید یہ معلوم نہ تھا کہ دوسروں کی عزت کو دو کوڑی کا سمجھنے والے کے لیے عورت کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس کی اصلاح کرنا اب کسی عورت کے بس کا کام نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کوئی ایسا جھٹکا لگے گا تو عقل آئے گی۔

شیر علی...... ان کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا مگر انہوں نے شجاع کے رنگ ڈھنگ دیکھنے کے بعد اسے اپنی خاص نگرانی میں رکھا تھا اور چاہتے تھے کہ وہ جہانگیر جیسا ذمے دار اور شریف ہو۔ اسی لیے وہ آئندہ کے لیے یہ سوچ رہے تھے کہ اسے بھی شہر بھجوا دیں گے، ابھی تو فوری ضرورت کے پیشِ نظر ایک چھوٹا مکان کرائے پر لیا گیا تھا مگر کوئی بڑا گھر خرید لیا جائے یا کرائے پر حاصل کر لیا جائے، یہ ان کا ارادہ تھا۔

عابدہ بیگم بھی رابعہ کے ساتھ ہی شہر میں تھیں، وہ لوٹ کر آتیں تو پھر شیر علی چلا جائے، خود بھی انہیں کبھی گھر میں تنہا رہنے کی عادت نہ تھی اور شجاع کا ہونا نہ ہونا برابر تھا کہ اس کا زیادہ تر وقت تو اپنے ڈیرے پر ہی گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ سوچتے تھے کہ شاید ان سے کوئی ایسی غلطی ہوئی ہو، کوئی کوتاہی یا ناانصافی...... یا پھر کسی کی حق تلفی، ورنہ ان کا بیٹا اور عادتوں میں نور علی کے بیٹوں پر جا پڑے۔

کبھی سوچتے کہ اللہ انہیں ایک بیٹی دے دیتا تو شاید شجاع کو عورت کی عزت کرنا آ جاتی...... وہ ان

سوچوں میں ہی گم تھے کہ کوئی انہیں بلانے آیا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہندو گھرانوں کی طرف سے پنچایت بلائی گئی ہے۔

”اچھا تم چلو، میں آتا ہوں!“ انہوں نے اپنے ملازموں کو گھوڑا تیار کرنے کو کہا اور خود اپنی تہ بند اور کُرتہ بدلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ویسے سب خیر تو ہے؟“ انہوں نے آنے والے سے پوچھا۔

”وہ بڑے سرکار...... ہندوؤں کی کوئی لڑکی بھاگ گئی ہے شاید۔“ آنے والے نے بتایا۔

☆☆☆

”کہاں ہے آپ کا بیٹا بی بی جی؟“ دیالو نے ان سے پوچھا، وہ جا کر اپنے گھر کی عورتوں کو بھی لے کر آئے تھے تاکہ بی بی جی دروازہ کھولیں اور وہ اپنے مقصد کی بات کر سکیں۔

”وہ شہر گیا ہے۔“ بی بی جی نے دبی دبی آواز میں کہا، وہ تو چاہتی ہی نہ تھیں کہ اس وقت بات ہو کیونکہ کلثوم یہ سب کچھ سن لیتی، وہ اسے حتی الامکان اس سے بےخبر رکھنا چاہتی تھیں۔

”کیا کرنے گیا ہے شہر...... اور کس کے پاس گیا ہے؟“ اس نے جرح کی۔

”جانے کس کے پاس گیا ہے، مجھے تو صبح کہہ کر گیا تھا کہ آج شام کو گھر نہیں لوٹوں گا، شہر جانا ہے۔“ ان کی آواز میں ہکلاہٹ تھی، یہ سن کر کہ ان کا بدترین خدشہ بھی یہ نہ تھا کہ عباس کسی ہندو لڑکی کو بھگا کر لے جا سکتا ہے، وہ تو اس بات کو بھی خرافات کا پلندہ سمجھتی تھیں، جو وہ گزشتہ چند دنوں سے سن رہی تھیں کہ عباس کا کسی لڑکی کے ساتھ چکر ہے اور وہ بھی ہندو...... انہیں اپنی تربیت پر مان تھا، اپنے بیٹے پر فخر تھا، کس طرح ان کا بیٹا ان کا مان توڑ سکتا تھا، ان کے فخر کو ملیا میٹ کر سکتا تھا۔ جن افواہوں کو وہ چند دن سے سن کر کان لپیٹ کر پڑی تھیں، وہ آج ایک بھیانک نتیجہ لے کر ان کے سامنے تھیں۔

”ہو سکتا ہے کہ آپ کی بیٹی کہیں نہ گئی ہو، یہیں کہیں ہو، اپنی کسی سہیلی کے گھر یا اپنے کسی رشتے دار کے گھر۔“ انہوں نے ایک موہوم سی امید کا سرا پکڑانا چاہا۔

”آپ کے اپنے گھر میں بھی بیٹی ہے بی بی جی!“ دیالو نے کہا۔ ”آپ بتائیں، کیا آپ کی بیٹی جاتی ہے کسی سکھی سہیلی کے گھر رات کے اس وقت تک کے لیے...... اور پھر ہم سارے گاؤں کی خاک چھان چکے ہیں، ہم تو چوہدری شجاع اور چوہدری بابر کے ڈیروں پر بھی پتا کروا چکے ہیں۔ سارا شک آپ کے بیٹے پر جاتا ہے، اس کے بارے میں مجھے کسی نے شکایت کی تھی، میں نے اسے بلا کر سمجھایا بھی تھا اور ڈرایا بھی تھا کہ مسلمان اور ہندو اس گاؤں میں صدیوں سے اکٹھے رہے ہیں، کوئی ایسی آگ نہ لگانا کہ سب کچھ جل کر تہس نہس ہو جائے۔“

”ایسا کیوں کرے گا عباس؟“ بی بی جی کی آواز کی لرزش چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ ”اور اگر اس نے ایسا کیا تو میں اسے اپنا دودھ بھی نہیں بخشوں گی، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے!“ یہ کہہ کر وہ اپنا چہرہ جھکا کر رونے لگیں۔ ”ضرور کسی نے دشمنی میں میرے بیٹے کا نام لیا ہے۔“

”کاجل نے بتایا ہے کہ دیا اور عباس کے بیچ۔“ رام لال کچھ کہتے کہتے رک گیا، شاید اسے احساس ہو گیا

تھا کہ کلثوم کی موجودگی میں اسے زیادہ کھل کر بات نہیں کرنی چاہیے۔

''مجھے تو یقین نہیں آتا، دیا تو میرے گھر آتی جاتی ہے، کلثوم کی سکھی ہے اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے بھی اندازہ ہو جاتا!'' بی بی جی کے لیے اب بھی یقین کرنا مشکل تھا۔

بعض باتیں ناقابلِ یقین ہوتی ہیں مگر بالآخر ان پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے، عباس کا واپس نہ آنا، بی بی جی کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ بات وہی تھی جس کا وہ یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔ دیا گھر سے صبح اپنی ماں کے کچھ زیورات لے کر گئی تھی اور برگد کے احاطے سے ہی پکھ اس طرح عباس کے بلاوے پر نکلی کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ جس بچے نے جا کر دیا کو اس کی ماں کی طرف سے پیغام دیا تھا، بعد ازاں پوچھ گچھ پر اس نے بتایا کہ اسے عباس نے ہی دیا کو پیغام دینے کو کہا تھا اور اس کے معاوضے کے طور پر اسے ایک آنہ بھی دیا تھا...... یہ سب حقائق کافی تھے اور بی بی جی تو ڈھے سی گئیں، انہوں نے چند دنوں سے بچوں کو پڑھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دوسروں کے بچوں کو ہدایت کی شمع تھمانے کی ذمے داری پوری کرتے کرتے وہ اپنے بیٹے کے بدلتے چلن بھی نہیں دیکھ سکی تھیں۔

☆☆☆

''باجی جی تہاڈے ہتھ کتنے پیارے ہیں۔'' جینا نے خوشامدی انداز میں مریم سے کہا تو مریم نے اسے گھورا۔

''تمہیں اپنا کام ٹہلانے کے لیے بہانے چاہیے ہوتے ہیں!'' مریم نے اسے ڈانٹا۔ ''اور ہاں میں سوچ رہی ہوں کہ میں گھر کی چابی تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گی، کبھی کبھار آ کر کھول کر صفائی کر دینا اور شام کو کوئی ایک بتی جلا دیا کرنا!''

''اتنی بڑی ذمے داری کا کام میں کس طرح کر سکتی ہوں باجی، میں کس طرح آپ کے گھر کی چابیاں رکھ لوں جی، کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہو گئی تو!'' اس نے لٹکا لٹکا کر بات کی۔

''میرے گھر میں ہے ہی کیا جو اِدھر سے اُدھر ہوگا۔'' مریم نے کہا۔ ''اور پھر تم اتنے سالوں سے میرے پاس آ رہی ہو، میری کبھی سوئی سلائی بھی یہاں سے وہاں نہیں ہوئی۔''

''آپ بھی تو باجی اتنا خیال رکھتی ہیں میرا، مجھے اپنی بہنوں کی طرح سمجھتی ہیں۔ سارا خاندان ہندوستان چلا گیا اور میں یہاں اکیلی رہ گئی لاوارثوں کی طرح...... آپ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، میرا اتنا خیال رکھتی ہیں، بن مانگے آپ اتنا کچھ دے دیتی ہیں!'' جینا، مریم کی ساری خوبیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔ ''آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تو گن بھی نہیں سکتی۔''

''فلمیں دیکھ دیکھ کر تم نے مکالمے یاد کر لیے ہیں!'' مریم ہنسی۔ ''اور گن تم اس لیے نہیں سکتیں کہ میرے لاکھ کہنے کے باوجود تم نے ایک لفظ پڑھ کر نہیں دیا، لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ دو تین گھنٹے استانی جی کے پاس رہتی ہے اور ان سے ایک لفظ پڑھنا نہیں سیکھ سکی!''

''صحیح کہتی ہیں جی آپ، پر کیا کروں۔ جی دماغ ہی اتنا ہے، جو کسر رہ گئی تھی وہ میکل نے مار مار کر پوری کر دی ہے، لگتا ہے دماغ اپنی جگہ سے کھسک ہی گیا ہے!'' وہ اپنے دوپٹے کا پلو منہ میں ڈال کر کھی کھی کر کے ہنسی۔

''اپنی حرکتوں سے ہی مار کھاتی ہو گی تم، ورنہ مائیکل تو اچھا خاصا لڑکا تھا!'' مریم نے کہا۔ مائیکل اس کے اسکول میں چوکیدار تھا، بڑا باتمیز اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ جینا نے ایک بار بھیک مانگنے کے لیے مریم کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، یہ اس کے گھر کا نہیں بلکہ اس کی اپنی قسمت کا در تھا۔

''تم بھیک کیوں مانگ رہی ہو، اچھی خاصی صحت مند ہو، کام کر کے بھی کما سکتی ہو!'' مریم نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''کون کام کرنے دیتا ہے جی؟'' اس نے تڑپ کر کہا تھا۔ ''کوئی عیسائی جان کر گھر میں گھسنے نہیں دیتا تو کوئی تر نوالہ سمجھ کر سیدھے سبھاؤ عزت پر ہاتھ ڈال دیتا ہے...... درندوں کی اس دنیا میں ڈھونڈنے سے عزت نہیں ملتی!''

''کام کرنا چاہتی ہو تو میرے گھر سے ہی شروع کر دو، یہاں نہ تمہیں اس لیے گھٹیا سمجھا جائے گا کہ تم عیسائی ہو اور نہ ہی کوئی درندہ ہے میرے گھر میں تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کے لیے۔'' مریم نے مسکرا کر کہا تھا اور یوں اس نے مریم کے گھر کے ساتھ ساتھ محلے کے دیگر گھروں کا کام بھی کرنا شروع کر دیا۔ مریم نے مائیکل سے اس کی شادی بھی کروا دی، وہ بھی ایک لاوارث لڑکا تھا مگر وقت اور لوگ ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے، ذرا سی رزق کی فراوانی آتی ہے تو انسان اور خصوصاً مرد غلط ملط عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں...... مائیکل بھی جانے کس طرح نشے کی عادت میں مبتلا ہو گیا تھا اور اب ضرورت پوری نہ ہونے پر پاگل ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

''چل اٹھ میرا لال، اب جگا اپنی بہنوں کو، انہیں بتا کہ استاد صاحب آنے والے ہیں!'' وہ اپنا بھاری بھرکم وجود سمیٹ کر اٹھ گئیں، دلی اسی طرح بستر پر لیٹا تھا۔ ''بہنیں؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''لڑکے تو کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی میری بہن نہیں...... وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اماں کی بیٹیاں بھی نہیں۔'' وہ سوچ رہا تھا، عمر کے ایسے مشکل دور میں تھا کہ جب لڑکے باہر کے ماحول سے اثر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

''تو پھر کون ہیں یہ بھانت بھانت کی لڑکیاں اور ان کے نام بھی کیسے عجیب ہیں، پتھروں اور نگینوں والے نام...... ان کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے، اب تو وہ مجھے اپنی بہنیں بھی نہیں لگتیں۔ سب لوگ جھوٹ کیوں بولیں گے، اماں کہتی ہیں کہ لوگ ان سے جلتے ہیں کہ ان کو اللہ نے ایک نہیں سات بیٹیاں دے رکھی ہیں...... ہوں؟...... لوگ بھلا ان سے اس لیے کیوں جلیں گے کہ ان کی سات بیٹیاں ہیں، کوئی کسی کے ہاں سات بیٹوں کی پیدائش پر جلے تو جلے، بھلا کوئی بیٹیاں ہونے پر بھی جلتا ہے؟'' جتنا وہ سوچتا جا رہا تھا، اتنا ہی الجھ رہا تھا، ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور کو تھامے ہوئے کہ جس کا سرا اسے نہیں مل رہا تھا، کچھ غلط تھا...... مگر کیا؟ طویل برآمدے کے وسط تک دھوپ آ چکی تھی اور برآمدے کے ستونوں کے سائے مغرب کی سمت لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے، سات ستون...... اس کی بہنوں کی طرح لگے اسے۔

''دلی پتر تو اٹھا نہیں، تجھے کہا تھا کہ جا کر بہنوں کو جگا!'' وہ پھر اس کی طرف آ گئی تھیں۔

''اماں خود ہی جگا لے جا کر، میرے ساتھ تو وہ چڑیلوں کی طرح لڑ پڑتی ہیں!'' اس نے لاڈ سے کہا۔

''یوں نہیں کہتے بیٹا...... بہنیں ہیں تیری!'' اماں نے کہا تو اسے لگا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا ہو۔

”دلی مجھے تجھ سے اتنی سستی کی امید نہیں تھی۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ خود ہی برآمدے کے آخری سرے کی طرف چل دیں، جہاں سے سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں، سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے آواز لگائی۔

”الماس، روبی، نیلم، یاقوت، زمرد، مرجان، فیروزہ۔“ اماں نے انہیں بالترتیب پکارا، اوپر سے کوئی آواز جواب میں نہ اٹھی تو ان کا پارہ گرم ہو گیا۔ ”کم بخت ماریاں..... اور ایک یہ ہے۔“ ایک ہی ہلے میں وہ سب کو رگڑ گئیں، دلی سمیت۔

”اٹھتا ہوں اماں..... اور جگاتا ہوں تیری لاڈلیوں کو بھی، ایک دن ہفتے میں ملتا ہے چھٹی کا، اس میں بھی مجھے سونے نہیں دیتی ہو۔“ وہ بیزاری سے کہتا ہوا اپنے بستر سے نکلا اور اوپر کو چلا، جہاں سات خوب صورت اور تھکے ماندے وجود گہری نیند میں تھے، اس نے بھی ان کو جگانے کا ایسا طریقہ رکھا تھا کہ وہ نہ صرف اٹھتی تھیں، بلکہ اس کے پیچھے بھاگ کر نیچے تک آتی تھیں، جہاں دلی کے لیے اس کی ماں اپنی آغوش وا کر لیتی تھی۔ اس نے اوپر جا کر نلکے سے تازہ پانی ایک لوٹے میں بھرا، اسی پانی سے اس نے گہری نیند والوں کو بیدار کرنا تھا۔

☆☆☆

معراج کے لیے تو رات کاٹنی مشکل ہو گئی تھی، اس رات وہ یادوں کے کتنے ہی سمندر عبور کر آئی تھی۔ اکبر علی کے ہاں دو بیٹیوں کی پیدائش نے اسے وہ دن یاد کروا دیا تھا، جب زرتاج تقریباً چھ ساڑھے چھ برس کی تھی اور ماہ تاج پانچ برس کی..... اس کے پھر ولادت متوقع تھی۔ پہلی بار تو اس نے دل سے دعا کی تھی کہ قائم علی کی خواہش پوری ہو مگر دوسری بار اسے بیٹے کا شوق تھا۔ ماہ تاج کی ولادت پر قائم نے اسے دلاسہ دیا۔ معراج مایوس تو ہوئی تھی لیکن اپنے رب سے کوئی گلہ نہ تھا، شکر گزار تھی کہ اس نے صحت مند اولادیں دی تھیں، یہ امید بھی تھی کہ اس کے گھر میں کوئی کمی نہیں، اسے بیٹا بھی ضرور دے گا۔

سال بھر کے بعد ہی ان کے ہاں بیٹے نے جنم لیا مگر وہ اپنے نصیب میں چند سانسیں ہی لکھوا کر لایا تھا..... اس کڑے وقت میں بھی قائم علی نے ان کو حوصلہ دیا تھا اور کہا تھا۔ ”معراج، یہ ہماری آزمائش ہے۔ ہمیں صبر کرنا چاہیے!“ وہ گھٹ گھٹ کر بہت روئی مگر جب پھر امید لگی تو اس نے اپنی عبادات کو تیز تر کر دیا، وظائف اور دعائیں..... جس در سے کوئی امید دلاتا، اُدھر ہی چل پڑتی۔

اسے وہ دن یاد آ رہا تھا، جس دن دائی صید بیگم کو بلوایا گیا تھا..... قائم علی آنگن میں ہی بیٹھا تھا، بچیاں محلے کی ایک خاتون کے ہاں بھجوا دی گئی تھیں، ایک کٹھن اور صبر آزما مرحلہ طے کر کے، معراج نے ایک بچے کو جنم دیا مگر اس کی تکلیف میں کمی نہ آئی، تب دائی نے اسے بتایا کہ اسے ابھی پھر اس مرحلے سے گزرنا تھا..... تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس نے ایک اور زندگی کو جنم دیا۔

”کیا ہوا ہے ماسی؟“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”جو بھی ہوا ہے، اچھا ہی ہوا ہے۔“ وہ اپنی مددگار کے ساتھ مل کر اسے سنبھالنے کے بعد بچوں کو دیکھ رہی تھیں، دونوں بچوں کو نہلا کر صاف کیا اور لپیٹ کر اس کے پاس لٹا دیا۔ ”دیکھو کیا ہے.....“

”یوں مجھے کیسے پتا چلے گا؟“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”اللہ کی رحمت ہے۔“ صید بیگم نے کہا تو وہ سسک اٹھی، اسے امید تھی کہ دو بچوں میں سے ایک تو بیٹا ہوگا

مگر ان کرا تنا دکھ ہوا کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

قائم علی صحن میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا، صید بیگم کمرے سے باہر نکلیں تو وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا، سوال اس کے چہرے پر تحریر تھا۔

”اللہ نے اپنی رحمت بھیجی ہے تمہارے گھر!“ صید بیگم کا لہجہ دھیما سا تھا۔

”بیٹی؟“ ان کا چہرہ چمکنے لگا، دائی نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

”ایک نہیں، اکٹھی دو۔“ اس کا کہنا تھا کہ قائم علی جوش میں آ گیا۔

”واہ میرے رب، تو نے مجھے اس قابل سمجھا، تو نے مجھے چار بیٹیاں دی ہیں!“ معراج نے کمرے کے اندر لیٹے ہوئے اپنے شوہر کی آواز سنی تھی۔

”یہ لو صید بیگم!“ دس دس روپے کے دو نوٹ اپنی جیب سے نکال کر اس نے دائی کی طرف بڑھائے۔

”دو بیٹیاں ہوئی ہیں سرکار۔“ دایہ سمجھی کہ اسے سننے اور سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے تو کبھی کسی کو بیٹی کی پیدائش پر یوں خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”اسی خوشی میں تو انعام دے رہا ہوں!“ انہوں نے اسے نوٹ تھمائے۔ اس نے تو اپنی اب تک کی زندگی میں کسی کو بیٹی کی پیدائش کو خوش خبری کہتے ہوئے نہیں سنا تھا..... اس کے ہاتھوں سے جب بھی کسی لڑکی کی ولادت ہوتی تھی تو اس کا اپنا دل بھی غم سے بھر جاتا تھا، خود اس کے شوہر نے اسے تین بیٹیوں کو پیدا کرنے کے جرم کی سزا طلاق دے کر دی تھی..... اور تو اور بڑے ملکوں کی حویلیوں میں بھی بیٹی کی ولادت کو غم کی خبر ہی سمجھا جاتا تھا اور خاندان کے قریبی لوگ باقاعدہ پرسہ دینے آتے تھے اور اسے عورت کا جرم سمجھا جاتا تھا۔

”کیا میں معراج کو دیکھنے کے لیے اندر جا سکتا ہوں؟“ وہ اندر کی طرف لپکے۔

”پہلے کیا تم نے کبھی معراج کو نہیں دیکھا۔“ اس نے جوشِ جذبات میں ٹھٹھول کیا۔ ”تم خوشی سے پھولے پڑ رہے ہو اور وہ اندر آنسو بہا رہی ہے۔“

”وہ کیوں آنسو بہا رہی ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”اسے تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے گھر میں اللہ کی اتنی رحمت ہو گئی ہے..... مجھے پہلے سے علم ہوتا تو میں ان کے پیارے پیارے سے نام سوچ کر رکھتا!“ صید بیگم کو لگا کہ وہ واقعی پاگل ہے..... معراج نے اپنے آنسو اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کیے۔

”ایک نام تم رکھو، ایک میں رکھوں گا!“ قائم علی نے معراج کے ماتھے پر بوسہ دیا، اسے معلوم تھا کہ وہ روئی تھی، اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ ہر عورت کی طرح اس کی خواہش تھی کہ ان کے ہاں بھی اولادِ نرینہ ہو، اللہ نے ایک دے کر بھی واپس لے لیا تھا اور اس پر صبر کرنا معراج کے لیے آسان نہ تھا۔ اسی لیے وہ حرفِ تسلی کہہ رہا تھا اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا، جسے کوئی بھی کم نہیں کر سکتا تھا۔

”میں نے تو نام سوچ لیا ہے، نین تارہ..... تم بتاؤ؟“

”دوسرا نام بھی آپ ہی رکھ لیں۔“ اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”اچھا!“ قائم علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”دوسری کا نام حسن آرا رکھ لیں گے..... اور ہاں اب بیٹیوں کے نام سب کے میں نے رکھ لیے ہیں، اپنے بیٹوں کے نام خود رکھنا۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور وہ آنسو

بھری آنکھوں سے منہ پھیر کر لیٹ گئی تھی۔
''اماں چائے!'' زرتاج کی آواز نے انہیں جانے کہاں سے واپس کھینچ لیا تھا۔ ''ساتھ کچھ کھائیں گی؟''
''ہاں، مجھے ساتھ پاپے دے دو!'' اس خوب صورت وقت کی یاد سے واپس لوٹنا انہیں کتنا ناگوار لگا تھا۔ ''شکر الحمدللہ!'' انہوں نے دل کی گہرائی سے کہا، یہی ان کے مرحوم شوہر نے سکھایا تھا۔ کیسا بھرا پرا آنگن تھا، ایک غم کی آندھی آئی اور سب کچھ اڑا کر لے گئی تھی، ان کے آنگن میں چہچہانے والی چڑیاں۔
زرتاج پاپے لے کر لوٹی تو وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں، اس نے تھالی چارپائی پر رکھی اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کے کندھے دبانے لگی۔ ''نہ رویا کریں اماں۔'' اسے بن کہے اپنے ماں کا غم معلوم تھا، یہی غم اس کا غم بھی تھا، اسی کو یاد کر کے کئی بار اس کے نین کٹورے بھی بھر جاتے تھے مگر اس وقت وہ خود رو کر ماں کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''اچھا چلیں، یہ لیں چائے پئیں اور درود شریف پڑھ کر دعا کریں سب کے لیے اور ابا کے لیے بھی!''
اس نے چائے کا مگ ان کے ہاتھ میں دیا۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ لیا۔
''الحمدللہ!'' کہا اور آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگیں۔
''اماں، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس مہینے آپ مجھے لونگ لے کر دیں گی!'' اس نے بات کا رخ موڑا۔
''لے دوں گی۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔ ''کسی دن لے کر چلوں گی تجھے، خود ہی پسند کر لینا!''
''میں آج عائشہ کے ساتھ جا کر لے آؤں گی اماں، آپ پیسے بعد میں دے دیں!'' اس نے اصرار کیا۔
''عائشہ کو رہنے دے، میں خود ہی تیرے ساتھ جاؤں گی!'' انہوں نے کہا۔
''میں عائشہ کے مشورے سے لینا چاہتی ہوں اماں، اس نے اگلے روز لیا تھا تو ساتھ مجھے لے کر گئی تھی!'' اس نے مزید اصرار کیا۔
''تو اسی روز اپنے لیے بھی پسند کر لیتیں!'' انہوں نے اس کی ضد سے اکتا کر کہا۔ ''جاؤ...... اور ہاں جلد لوٹ آنا!''
وہ خوشی سے اندر کی طرف بھاگی، اس کا ارادہ عائشہ کو ساتھ لے جانے کا ہرگز نہ تھا، وہ تو شاکر کو بچوں کے لیے تھوڑی سی مدہوشی کی دوا دینا چاہتی تھی تاکہ وہ جب اس بچی کو شہر لے کر جائے تو اسے وہ دوا دے دے، راستے میں اگر بچی روتی رہی تو لوگ خوامخواہ متوجہ ہو جاتے۔
چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر وہ گھر سے نکلی، پہلے عائشہ کے گھر کی طرف گئی تاکہ اسے کوئی اس طرف جاتا دیکھ لے، اس کا ارادہ یہی تھا کہ اماں کو بتائے گی کہ عائشہ گھر پر نہ تھی، اتفاق سے اس نے دور سے ہی عائشہ کو اپنے گھر سے نکل کر مخالف سمت جاتے دیکھ لیا تھا...... اب اسے اماں سے جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا، وہ مسکرائی۔ جا کر دروازہ کھٹکھٹا کر اس کی اماں سے پوچھ بھی لیا۔
تیز تیز قدموں سے وہ اس جانب چل پڑی، جہاں جانے کے ارادے سے وہ گھر سے نکلی تھی، دن کا وقت تھا، دکانوں والی گلی میں اور بھی لوگ تھے، وہ سیدھی شاکر کی دکان کی طرف بڑھی۔ مٹھی میں دبی پڑیا کو اور بھی مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا، دکان کا دروازہ دور سے اسے لگا کہ بند ہے مگر جب نزدیک پہنچی تو دروازے پہ

پڑا، بڑا سا کالے رنگ کا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

☆☆☆

''چل یار کنجوس کی اولاد تو تو ہے، پر خود زیادہ کنجوس نہ بن!'' سلیم نے سہیل کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''بات کنجوسی کی نہیں ہے اور تو فالتو میں میرے باپ تک نہ پہنچا کر'' سہیل نے غصے سے کہا تو سلیم ہنس دیا۔

''کیا بات ہے استاد تیری بھی، یہ لقب اپنے ابا کو تو نے خود ہی دیا ہے۔'' سلیم نے کہا۔ ''جیسے افضال اپنے ابا کو پستول کہتا ہے، ان کے غصے کی وجہ سے!''

''اور تو کیا کہتا ہے اپنے ابا کو؟'' سہیل نے پوچھا۔

''یار ابا کے معاملے میں میں کافی خوش قسمت ہوں کیونکہ میں نے اپنا ابا بہت سوچ سمجھ کر چنا تھا۔'' سلیم نے مزاحیہ انداز سے کہا تو ندیم کی ہنسی نکل گئی، سہیل نے منہ بھینچ کر اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔

''اچھا..... تو کتنا بڑا تھا تو، جب تو نے اپنا ابا چنا تھا؟'' سہیل نے اس کا بدلہ اتارنے کا سوچا۔

''اب ہوئی نا بات!'' اس نے سہیل کو گلے لگا لیا۔ ''مجھے تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں کتنا بڑا تھا لیکن تیرے معاملے میں ابھی بھی دیر نہیں ہوئی، تو چاہے تو ابھی بھی اپنے لیے نیا ابا چن سکتا ہے۔'' سلیم کا کہنا تھا کہ ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی، کس بات پر اتنا ہنسا جا رہا ہے؟'' افضال نے آ کر پوچھا تھا، قریب تھا کہ سلیم کوئی انکشاف کرتا کہ سہیل پر نظر پڑ گئی جو اسے اشارے سے منع کر رہا تھا۔

''کچھ نہیں یار، بس وہ کالج کی پکنک کا پروگرام بن رہا تھا، اسی سلسلے میں میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ کون کون جا رہا ہے۔'' سلیم نے اسے بتایا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ قلعۂ روہتاس کوئی فضول قسم کی جگہ ہوگی!'' ندیم نے کہا۔

''ہمیں اس سے کیا کہ کیسی جگہ ہے، ہم ہوں گے نا سارے سنگی بیلی، ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزاریں گے اور پھر یہ دورہ تفریحی ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی تو ہے۔'' سلیم نے دلیل پیش کی۔

''تفریحی یا معلوماتی ہونے کا تو علم نہیں مگر یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی سنگت سے لطف اندوز ہوں گے۔'' افضال نے کہا تھا۔

''ایک دوسرے کی سنگت سے تو ہم یہاں رہ کر بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔'' سہیل نے بےزاری سے کہا۔

''کنویں کے مینڈک ہی بن گئے ہو تم یار'' افضال نے اس سے کہا۔ ''اپنے روزمرہ کے معمول سے باہر نکل کر بھی کبھی کبھار دیکھنا چاہیے۔''

''امتحانات سر پر ہیں اور تم لوگوں کو تفریحات کی سوجھ رہی ہے؟'' سہیل نے کہا۔

''سارا سال اِدھر اُدھر وقت ضائع کرتے رہو گے اپنی فضول کی سرگرمیوں میں تو امتحان کے نزدیک آ کر اسی طرح فکرمند ہو گے نا!'' افضال نے کہا۔

''اصل مسئلہ یہی ہے!'' سلیم نے کہا۔ ''وہاں اس کی ایسی ویسی سرگرمیوں کے لیے کوئی ''شے'' نہیں ہو

گی۔''

''بڑی شے ہے میرا دوست۔'' افضال نے آنکھ مار کر کہا۔ ''اپنے مطلب کی شے یہ ہر جگہ ڈھونڈ لیتا ہے، تم اسے آزما کر تو دیکھو!''

''شرم کرو تم لوگ!'' سہیل نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ جیسے بڑے پارسا ہو۔''

''ہم وہی ہیں جو کچھ نظر آتے ہیں، تمہاری طرح نہیں کہ پڑھنے کو جی نہ چاہے اور بنے پھریں، میاں پڑھاکو!'' افضال نے اسے چھیڑا۔

اپنے دوستوں کے سامنے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دائی صید بیگم نے اسے کسی پیر بابا کا بتایا تھا کہ جن کے پاس جا کر کئی عورتوں کے من کی مراد یعنی بیٹے کی ولادت کی دعا قبول ہوئی تھی۔ معراج کو علم تھا کہ قائم علی کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ بہت ناراض ہوگا، اسی لیے اس نے دائی صید کو کہہ رکھا تھا کہ جب قائم علی اگلی بار شہر جائے گا تو وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی، سفر طویل تھا اور رات تک ان کا لوٹنا ممکن نہ تھا۔ معراج نے اپنی ایک ہمسائی سے اس بارے میں بات بھی کر لی تھی، اس کے ہاں بھی تین بیٹیاں تھیں اور گود کا بیٹا۔ اس کی بیٹیوں سے زرتاج اور ماہ تاج کی دوستی بھی تھی اور وہ معراج کی چھوٹی بیٹیوں کو بھی سنبھال سکتی تھی، اس کا شوہر قائم علی کے ساتھ ہی شہر جاتا تھا۔

اپنی بیٹیاں اور اپنے گھر کی چابیاں اپنی ہمسائی زینت کے حوالے کر کے وہ صید بیگم کے ساتھ اس روز روانہ ہوئی، جس روز قائم علی شہر گیا تھا، اس بار جاتے ہوئے وہ کہہ کر گیا تھا کہ ممکن ہے اسے زیادہ دن لگ جائیں۔ معراج کو اس کی طویل مصروفیت کی خوشی ہوئی تھی اس بار۔

جاتے ہوئے زینت کو تو معراج نے ساری تفصیل بتائی تھی کہ کہاں جا رہی تھی، البتہ اس سے یہ بھی کہا کہ ان کے اس راز کو وہ خود تک محدود رکھے۔ زرتاج نے ماں سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے، ایک بار تو اس نے سوچا کہ اسے بتائے مگر پھر یہ سوچ کر کہ آخر بچی ہے کہیں بھولے سے باپ کے سامنے بات کر بیٹھی تو اس کی شامت آ جائے گی۔ بیٹی سے بھی اس نے جھوٹ بولا کہ کسی مرگ پر جا رہی ہے اور شام تک لوٹ آئے گی۔

جاتے سمے اس نے زرتاج کو اپنی چھوٹی بہنوں کا خیال رکھنے اور زینت خالہ کو تنگ نہ کرنے کا سمجھایا، اسے اکیلے باہر نکلنے سے اور کھیلنے کے لیے زیادہ دور جانے سے منع کیا۔ اسے معلوم تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں جب مل کر کھیلنے کو نکلتی تھیں تو ریل کی پٹڑی کے پار کا علاقہ ان کا پسندیدہ علاقہ تھا۔

دل میں ایک ہی لگن تھی کہ پیر بابا سے تعویذ مل جائیں تو پھر اللہ اس پر کرم کرے گا۔ ''تعلیم بھی ذہنی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکی، یہ تو ان وقتوں کی بات ہے جب کوئی کوئی پڑھا لکھا ہوتا تھا، ابھی تک ہم ان فضولیات سے باہر نہیں نکل سکے، جب ہم کسی مشکل میں پڑتے ہیں تو ہمارا عقیدہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ زندگی کے عام حالات میں ہم اللہ کو اپنی شہ رگ سے قریب تر مانتے اور اسی سے مانگتے ہیں مگر جہاں ہمیں اللہ سے وہ نہیں ملتا جس کی ہمیں خواہش ہوتی ہے تو ہمارا کاسۂ گدائی ان دنیاوی خداؤں کے آگے دراز ہو جاتا ہے جنہوں نے ہماری انہی کمزوریوں کے بل پر اپنے کاروبار چمکا رکھے ہیں۔

روانگی کے وقت تک معراج کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا، وہ کبھی اپنی بچیوں کو یوں کسی کے پاس چھوڑ کر نہیں گئی تھی، زرتاج نویں برس میں قدم رکھ چکی تھی اور ماہ تاج سات برس کی اور گود کی دونوں اگرچہ ڈیڑھ برس کی ہونے کو آئی تھیں مگر دیکھنے میں سال سے بھی کم عمر کی لگتی تھیں۔ اب مسئلہ ہی ایسا آن پڑا تھا کہ انہیں ساتھ لے کر نہیں جاسکتی تھی، صدیہ بیگم نے بتایا تھا کہ سفر طویل بھی تھا اور مشکل بھی۔ اس نے کئی آیات اور دعائیں پڑھ کر ان پر پھونکیں اور زینت کو کچھ مزید ہدایات دے کر وہ روانہ ہوئی۔

☆☆☆

مرادعلی پنچایت میں پہنچے تو سب نے کھڑے ہو کر ان کو تعظیم دی، انہوں نے وہاں موجود سب لوگوں سے خود آگے بڑھ کر مصافحہ کیا خواہ کوئی ہندو تھا یا مسلمان۔ اسی پنچایت میں ان کے بھائی اور بھتیجے بھی بیٹھے تھے، ان کے چہروں پر انہیں خاصا اشتعال نظر آیا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ اس کی وجہ ان ہندوؤں کا ان کی ہمسائیگی میں ہونا تھا، جن کی لڑکی بھاگ گئی تھی، دوسرے محلے کے کسی لڑکے کے ساتھ۔ جو کچھ خود وہ باپ بیٹے کرتے پھرتے تھے ان کے لیے تو آج تک کسی کی پنچایت بلانے کی ہمت نہ ہوئی تھی مگر ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ مجرم کمزور ہو تو گرفت میں آجاتا ہے اور بارسوخ آدمی بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی صاف بچ نکلتا ہے۔

جب وہ بیٹھ چکے تو کارروائی شروع ہوئی۔ وہ خاموشی سے دونوں طرف کے دلائل سنتے رہے، ہندو اشتعال میں تھے اور ان کا اشتعال جائز بھی تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کافی ڈھونڈ چکے تھے مگر ان دونوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا، وہ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ سر اٹھا کر جی سکیں نہ یہ اس لیے ہوا تھا کہ ایک مسلمان نے ان کی ہندو لڑکی کو ورغلا لیا تھا، ہمیشہ سے ایسے واقعات میں لڑکیوں کو بے قصور سمجھنے کا رواج بھی قدیم ہے۔ ان سب نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ اپنے مجرم کو سزا دیے بغیر وہاں سے نہیں جاسکتے تھے۔

مرادعلی نے ہی ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے تھے کیونکہ اگر عباس غائب تھا تو اسے کسی طور سزا نہیں دی جا سکتی تھی، وہ ان کے مطالبے پر حیران تھے۔ دل میں انہیں یقین تھا کہ ہندوؤں نے اس کا کوئی نہ کوئی جوابی حل سوچ رکھا ہوگا۔

''عباس کی بہن کو ہمارے کسی لڑکے سے بیاہ دیں!'' دیالو نے کہا۔ ''میرے بیٹے سے ہی بیاہ دیں۔''

''ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟'' وہ اس کے مطالبے پر دل ہی دل میں لرز سے گئے، انہیں ہرگز منظور نہ تھا کہ عباس کے کیے کی سزا، عباس کی بہن کو دی جائے اور وہ بھی اسے کسی ہندو سے بیاہ کر۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟'' رام لال نے کہا۔ ''اگر مسلمان لڑکا ہماری لڑکی کو بھگا کر لے جاسکتا ہے تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''دیالو تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ لڑکی اپنی رضا سے عباس کے ساتھ گئی ہے، عباس اسے اغوا کر کے نہیں لے گیا اور اگر اس نے اغوا بھی کیا ہو تو اس میں اس کی بہن کا ہاتھ ہرگز نہیں ہے۔'' مرادعلی کا لہجہ زوردار تھا۔

''جانتی تھی وہ...... کلثوم بھی جانتی تھی، کاجل بھی جانتی تھی، یہ سب کچھ ان ساری لڑکیوں کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔'' دیالو نے کہا۔ ''ہم نے ساری پوچھ پڑتال کر لی ہے، بی بی جی کے سامنے ان کی لڑکی نے تسلیم کیا تھا کہ وہ جانتی تھی۔''

''مگر اس نے بتایا تھا کہ اسے اسی روز کاجل نے بتایا تھا، جس روز وہ بھاگ چکے تھے، البتہ کاجل کو شروع سے ہی اس بات کا علم تھا اور وہ ان دونوں کی معاونت بھی کر رہی تھی۔'' نمبردار نے بتایا، جو کہ تفتیشی کمیٹی کا حصہ تھا۔ ''وہ ایک معصوم اور چھوٹی سی لڑکی ہے جو کہ ان معاملات کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھتی اسی لیے اس نے تفتیشی ٹیم کے سامنے کوئی بات نہیں چھپائی۔''

''وہ معصوم نہیں بلکہ ایک جوان جہان لڑکی ہے اور ہماری بیٹیوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، ان کا اس کے گھر اور اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔'' دیالو نے غصے سے کہا۔

''ایک بہن کو اس کے بھائی کے جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی۔'' مرادعلی نے دبدبے سے کہا۔ ''آپ لوگوں کو جو ہرجانہ چاہیے وہ میں دینے کو تیار ہوں مگر اس معاملے کو اگر یہیں دفن کر دیا جائے تو بہتر ہے، آپ لوگ بھی گاؤں چھوڑ کر مت جائیں۔''

''ہمیں تم سے یہی امید تھی چوہدری مرادعلی، تم سے تو تمہارا بھائی اچھا ہے جس نے ہمارا ہر طرح سے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ معاملے کو اسی طرح حل کرے گا جس طرح ہم چاہیں گے، تم نے ایک مسلا بن کر سوچا ہے، یہ نہیں سوچا کہ ہمارے دلوں پر کیا بیت رہی ہے۔'' لال دین کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''ہم ہمیشہ سے یہاں بہن بھائیوں کی طرح رہے ہیں لال دین، میں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ کسی کی بیٹی کے ساتھ زیادتی ہو تو ان کا مجرم بچ نکلے، ہم سب کی بیٹیاں سانجھی ہیں۔'' مرادعلی نے رسان سے کہا۔

''تمہیں کیا معلوم کہ بیٹی کیا ہوتی ہے اور بیٹی کا دکھ کیا۔ نور علی کے ہاں بیٹیاں ہیں تو اسے ہمارے دکھ درد کا اندازہ ہے۔ اس نے ہمارے آنسو پونچھنے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں تمہارا وجود ہی پنچایت میں گوارا نہیں۔'' دیالو نے پھپک پھپک کر روتے ہوئے کہا۔ مرادعلی اٹھ کھڑے ہوئے، کچھ لوگوں نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہیں رکے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

''جب انہیں میرا یہاں ہونا ہی گوارا نہیں تو میں ان کی پنچایت کا کیا فیصلہ کروں گا اگر انہیں نور علی پر بھروسا ہے تو پھر اسی کو فیصلہ کرنے دیں جو کہ ان کو منظور بھی ہوگا۔ وہ ان کا ہمسایہ بھی ہے اور انہیں جانتا بھی ہے اور اس کے فیصلے کو وہ تسلیم کر لیں گے تو اچھی بات ہے ورنہ معاملہ مزید بگڑ سکتا ہے۔''

☆☆☆

''اس کم بخت گاڑی کو بھی یہیں خراب ہونا تھا۔'' افضال نے تاحد نظر کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جن میں کٹی ہوئی گندم پڑی تھی۔

''چلو تمہارا شوق تو پورا ہو گیا، پکنک کرنے کا!'' سہیل نے طنز کیا۔

''ابھی ٹھیک ہو جائے گی بس تو پھر چل پڑیں گے۔'' سلیم نے دلاسا دیا۔

''چھوڑ یار، اس سو سال پرانے ماڈل کی بس نے کیا ٹھیک ہونا ہے۔'' سہیل کے انداز میں بے انتہا بیزاری تھی۔ ''کوئی سایہ بھی دور دور تک نظر نہیں آرہا کہ سر جلنے سے بچ جائے!''

"چلو تھوڑی حرکت کرتے ہیں، کم از کم سائے تک تو پہنچیں ورنہ تمہارا سر گرم ہو گیا تو ہماری شامت کو آنے سے کون روک سکے گا!" افضال نے ہنس کر کہا۔

"بس والا کہہ رہا ہے کہ چار پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں بس کے ٹھیک ہونے میں۔" سلیم نے آکر "خوش خبری" سنائی تو سہیل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن...... نہ ہم لوٹ کر واپس جا سکتے ہیں نہ قلعے تک کسی اور طرح پہنچ سکتے ہیں!" سہیل نے کہا۔

"چلو یار، اتنی بھی سستی اچھی نہیں، یہاں سے تو نکلو، دیکھو سب لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے جا رہے ہیں، اسی کو ہر کوئی پکنک سمجھ رہا ہے، کہیں نہ کہیں سایہ ڈھونڈتے ہیں، جب تک بس ٹھیک نہیں ہوتی، ہم کھڑے یہاں تو نہیں سڑ سکتے۔" سلیم نے سہیل کو اشارہ کر کے دکھایا، واقعی بس میں سے نکل کر سبھی لوگ مختلف سمتوں میں چل پڑے تھے، تنگ سی یہ سڑک اسی طرف جا رہی تھی، جو باغ خزاں کی منزل تھی اور بس جانے کب ٹھیک ہوتی، یہی سوچ کر سب نے پیدل مارچ شروع کر دی تھی۔ سلیم اور افضال کے ساتھ سہیل بھی چہرے پر بیزاری کی تہ سجائے چل پڑا۔

پیدل چلنے کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے سست تھا، اسی لیے وہ اپنے قافلے سے بہت دور رہ گئے تھے، سہیل بار بار رک کر کوئی نہ کوئی پتھر دیکھ کر اس پر بیٹھ جاتا تھا، افضال اور سلیم کو غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، اپنے جگری دوست کو یوں تنہا چھوڑ کر بھی نہ جا سکتے تھے، جو صرف ان کے کہنے پر اس تفریحی اور معلوماتی دورے پر آیا تھا۔

پیاس سے ان کی بری حالت ہو رہی تھی، پانی کے کولر بھی بس میں رکھے تھے، کچھ لوگوں کے پاس اپنی بوتلیں اور تھرماس بھی تھے مگر وہ اپنے سارے گروپ سے میلوں پیچھے تھے۔

"کہیں سے پانی ڈھونڈو ورنہ میں مر جاؤں گا!" سہیل نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"وہ اس طرف کچھ سبزہ نظر تو آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرف چلتے ہیں، وہاں ممکن ہے کہ کوئی کنواں یا نل وغیرہ ہو یا پھر کسی کا ڈیرا ہو تو وہاں پانی ملنے کے امکانات ہیں۔" سلیم نے اپنے ہاتھ کا چھجا سا بنا کر فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار تیری آنکھیں ہیں کہ دوربین؟" افضال نے اس سمت دیکھا تو اسے وہ سرسبز قطعہ بہ مشکل نظر آیا تھا۔

"سہیل کی تو اس وقت تھکاوٹ اور پیاس نے مت مار رکھی ہے ورنہ اس جیسی نظر کسی کی نہیں، شکاری جیسی نظر ہے اس کی۔"

"ہرا ہرا تو فقط تیرے جیسے ساون کے اندھے کو ہی نظر آتا ہے، میری شکاری نظر صرف میلوں دور سے لڑکیوں کو ہی دیکھ سکتی ہے۔" سہیل نے اسے آنکھ ماری۔

"تو اٹھ تو سہی، خزاں کے اندھے...... ممکن ہے وہاں جا کر تیری "بھوک" کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے!" سلیم نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا، وہ کمزوری کی اداکاری کرتا ہوا اٹھا اور سستی سے چل پڑا۔

اماں اب اسے لاکھ سمجھاتیں مگر جو کیڑا اس کے دماغ میں اس کے ساتھیوں نے گھسیڑ دیا تھا، اسے اماں کی کوئی بات نہیں نکال سکتی تھی۔ اسے کبھی بھی ان میں کسی کے ساتھ اس طرح کی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی، جس طرح کی کشش بہن بھائیوں میں ہوتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی سوچنا شروع ہو گیا تھا کہ ان سب کی شکلیں ایک دوسرے سے جدا جدا کیوں تھیں، کسی کے بال سیدھے تھے اور کسی کے گھنگرالے۔ کسی کا رنگ سفید تھا تو کسی کا گندمی اور نیلم کا رنگ تو ان سب میں جدا تھا، سانولا سا۔

ہونے کو تو بہن بھائیوں کی شکلوں میں بھی فرق ہوتا ہے، کوئی ماں کی شکل لیتا ہے تو کوئی باپ کی۔ کوئی ننھیال پر چلا جاتا ہے تو کوئی ددھیال پر..... مگر اتنی بھی کیا رنگا رنگی کہ سات بہنوں اور ایک بھائی میں کسی کی شکل بھی آپس میں نہ ملتی ہو۔ اسے علم تھا کہ وہ اماں سے اس موضوع پر جتنی بھی بحث کرتا، جیت ہی نہیں سکتا تھا، اماں کے پاس اپنے حق میں دلائل ہر طرح کے موجود ہوتے تھے اور کچھ نہیں تو وہ غصے میں آ کر اسے ڈپٹ دیتیں تو اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

ان ساتوں کے بارے میں اس کا شک اپنی جگہ مگر ایک بات کا اسے یقین تھا کہ اس کی اماں اس کی اپنی اماں تھی، اس کی گود میں پناہ ملتی تو وہ خود کو دنیا کی ہر مشکل سے محفوظ پاتا تھا۔ کبھی کبھار یہ بھی سوچتا کہ جانے اماں گھر کا خرچہ کس طرح چلا رہی تھیں۔ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ ان کی زمینوں کی آمدن تھی مگر اسے کبھی بھی یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ زمینیں کہاں تھیں اور کتنی تھیں، ان کو کون سنبھالتا تھا اور اس کا حساب کتاب کون رکھتا تھا۔ جب بھی اس نے اماں سے اس کی تفصیل جاننا چاہی، وہ یہی کہتیں کہ اسے اس سے کیا، جب وہ اس قابل ہوگا تو وہ اسے زمین دیکھنے کو ضرور بھیجیں گی۔

اس کی سوچیں اپنی جگہ مگر اس کی اماں کے ذہن میں بھی یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ اب انہیں یہاں سے کہیں اور چلے جانا چاہیے، اس سے قبل کہ کوئی ڈُلی کے ذہن میں کوئی اور خناس بھر دے، انہیں تو اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں، بڑھاپے کا سہارا تو ان کے پاس سات بیٹیوں کی شکل میں موجود تھا مگر ان کی خانۂ خدا جانے کی خواہش کو سوائے ڈُلی کے اور کوئی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جوانی بھی جیسی تیسی گزر ری اور اب وہ اپنے پاس موجود خزانے کو بھی جس طرح سنبھالے ہوئے تھیں مگر یہ خواہش تو دل میں پنپتی تھی کہ مولا ایک دفعہ اپنے گھر کی زیارت ضرور کروا دے۔

☆☆☆

''وہ..... یہ دکان کیوں بند ہے آج؟'' اس نے ساتھ والے دکان دار سے پوچھا۔

''گیا ہوگا شاکر شہر، ہر تین چار ماہ کے بعد جاتا ہی ہے وہ تو۔'' کپڑے کی دکان والے نے بے پروائی سے کہا تو وہ خاموشی سے مڑ گئی۔

''کتنے دنوں میں لوٹ آتے ہیں شہر سے؟'' اس نے واپس جا کر سوال کیا۔

''دو ایک دن میں آ جائے گا، کیا کوئی زیور بننے کو دے رکھا ہے تم نے بیٹا؟'' اس نے جواب دے کر سوال کیا۔

''ہاں!'' وہ چونکی، جانے وہ کن خیالوں میں تھی کہ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس کی بے چینی اس کے

چہرے سے مترشح تھی۔ ''مگر کوئی بات نہیں، میں انتظار کرلوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھر کی طرف چلی۔

''کہاں رہ گئی تھی تو۔'' معراج کی کڑک دار آواز آئی۔ ''میں تو اب پریشان ہی ہو گئی تھی، حویلی سے دو بار بلاوا آ چکا ہے اور ویسے بھی گاؤں کے حالات کچھ اچھے نہیں، یوں گھر سے تنہا نکلتی ہو تو میں تمہارے لوٹنے تک پریشان رہتی ہوں۔''

''کیا ہوا ہے گاؤں کے حالات کو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جو بات میں نے پوچھی ہے، وہ بتا تو۔'' معراج نے اپنا سوال دُہرایا۔

''میں شاکر کی ہٹی تک گئی تھی، آج مجھے تیلی بنا کر دینی تھی اس نے۔'' اس نے کہا۔

''اتنے سویرے تجھے تیلی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''اس کے بعد حویلی بھی تو جانا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''میں نے پوچھا ہے کہ گاؤں کے حالات کو کیا ہوا ہے؟''

''چوہدری نور علی کے گرگے اپنے اور آس پاس کے دیہات میں چھاپے مار رہے ہیں تاکہ علم ہو سکے کہ ان کی پوتی کو کون اٹھا کر لے گیا ہے۔''

''انہیں اس کی کیا ضرورت پڑ گئی، وہ تو شکر کریں کہ جو کام انہیں رقم خرچ کر کے کروانا پڑتا، وہ خود بخود ہو گیا!'' اس نے ماں سے آنکھیں چرا کر کہا۔

''یوں ہی اول فول نہ بکا کر زرتاج تو...اور تو اور وہ ہمارے گھر بھی دیکھنے کو آئے تھے کہ کہیں ہم نے ہی تو۔'' معراج نے بتایا۔ ''گاؤں کے ہر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔''

''پھر تو اس نے اچھا ہی کیا۔'' اس نے زیرلب کہا مگر معراج کے کان بھی تیز تھے۔

''کیا کہا تو نے؟'' سراج نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ گاؤں کے لوگوں کو ان کی پوتی کو اغوا کر کے کیا لینا دینا ہے!'' اس نے فوراً بات بدلی۔ بسا اوقات تو اس کو خود بھی حیرت ہوتی کہ کیسے اس کے منہ سے بات کو سنبھالنے والا جملہ خود ہی نکل جاتا تھا۔

''اس درد کو ہم تو سمجھتے ہیں نا زرتاج۔ تجھے تو معلوم ہے کہ جس کی بیٹی گم ہو جائے، اس پر کیا بیتتی ہے۔'' معراج کے لہجے میں آنسوؤں کی کھنک تھی۔

''اب اس بات کو لے کر پریشان نہ ہوں، مل جائے گی ان کی بیٹی اگر ملنا ہوگی تو۔'' زرتاج نے بات کا رخ فوراً بدلا۔

''دیالو کی بیٹی بھی ابھی تک نہیں ملی۔'' معراج نے اسے بتایا۔

''وہ تو اچھی لڑکی نہیں تھی اماں، وہ اپنی مرضی سے بی بی جی کے بیٹے کے ساتھ گئی ہے۔ اس کو واپس آنا ہو گا تو خود ہی آ جائے گی، ڈھونڈے سے ملنے والی وہ نہیں۔'' زرتاج نے کہا۔

''تجھے کس نے بتائی ہیں یہ باتیں؟'' معراج حیران تھی۔

''عائشہ نے۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''اور آج کی خبر یہ ہے کہ ہندوؤں نے پنچایت بلائی تھی، جس میں انہوں نے چوہدری مراد علی کی بات ماننے سے انکار کردیا اور پھر چوہدری نور علی نے فیصلہ سنایا۔'' زرتاج خاموشی سے ماں کا منہ دیکھ رہی تھی، اسے یہ بات جاننے کا اشتیاق ہورہا تھا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ ''پہلے تو دیالو کا اصرار تھا کہ کلثوم کا رشتہ اس کے بیٹے کو دیا جائے، اس بات کی مخالفت چوہدری مراد علی نے کی، ممکن ہے کہ نور علی مان جاتا مگر پوری پنچایت اس بات پر اڑ گئی کہ کلثوم کو کسی ہندو سے نہیں بیاہا جائے گا مگر جسے بھی دیا کے باپ اور چچا نامزد کردیں۔''

''پھر۔'' معراج سانس لینے کو رکی تو زرتاج کا تجسس اسے بولنے پر مجبور کرگیا۔

''بس پھر دیالو نے کہا کہ اس کا نکاح ان کے نوکر گھوٹو کے ساتھ کردیا جائے۔'' معراج نے کہا تو زرتاج کی چیخ نکل گئی۔

''گھوٹو......!'' نام تو جانے اس کا کیا تھا مگر ہندوؤں کے گھروں میں ان کے کام کاج کرتا اور بھنگ گھوٹ گھوٹ کر پینے کے باعث اس کا نام گھوٹو پڑ گیا۔ چالیس کے اریب قریب اس کی عمر ہوگی، اسے اس گاؤں میں بھلا کون رشتہ دیتا جو اس کی شادی ہوتی۔ نہ اس کے آگے کا پتا تھا نہ پیچھے کا، بہت سال پہلے اس کی ماں جانے کہاں سے اسے گود میں لے کر آئی تھی اور تب سے پہلے وہ خود اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہندوؤں کے گھروں میں ہی کام کرتے اور وہیں پڑے رہتے۔

نشے کی عادت نے اس کی جسمانی ساخت کو بھی بگاڑ دیا تھا، رنگت جل کر سیاہ ہوگئی تھی اور کوئی اور لڑکی تو کیا، اس کی ماں بھی زندہ ہوتی تو ایک کے بعد دوسری نظر اس پر ڈالنا گوارا نہ کرتی۔

''تو کیا بی بی جی نے اس فیصلے کو مان لیا ہے؟'' زرتاج نے سوال کیا۔

''جب کسی بات کا فیصلہ پنچایت کرتی ہے تو وہ ماننا پڑتا ہے، اگرچہ ان کے گھر میں ماتم کا سا سماں ہے، کلثوم کل کی بچی ہے اور وہ مردود۔'' معراج کو بھی غصہ تھا۔

''کوئی کچھ نہیں کرسکتا اماں...... اس فیصلے کے خلاف کوئی تو احتجاج کرسکتا ہوگا؟'' زرتاج نے ماں سے سوال کیا۔

''کون کرے گا کچھ، گاؤں کے لوگوں نے بی بی جی کے پاس بچیوں کو بھیجنا چھوڑ دیا ہے، جب ان کی اپنی اولاد نے ان کے سفید چونڈے کا خیال نہیں کیا تو کسی اور کو ان کے ساتھ کیا ہمدردی ہوگی؟'' معراج کے لہجے میں دکھ تھا۔

''تو اس طرح کیا دیا واپس آجائے گی؟'' زرتاج نے پوچھا۔

''دیا تو وہ گیا وقت ہے جو شاید کبھی لوٹ کر نہ آئے، ہاں مگر کلثوم کی زندگی میں اپنی سہیلی اور اپنے بھائی کے ہاتھوں گھلنے والا زہر کبھی ختم نہ ہوگا۔ جانے کب تک وہ مر مر کر جیے گی، میں تو کہتی ہوں ہم لوگوں کے ہاں بیٹیوں کو جنم لینا ہی نہیں چاہیے۔'' معراج پھر جذباتی ہورہی تھی۔

''اماں آپ نے بتایا تھا کہ حویلی سے بلاوا آیا تھا۔'' زرتاج نے انہیں یاد دلایا۔

''ہاں، چل اٹھ اب تیاری کر۔''

☆☆☆

اچانک ہی اس بچی نے رونا شروع کردیا اور شاکر سے اسے چپ کرانا محال ہوگیا۔ ''یہ تو مجھے پھنسائے گی!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اسی وقت نکلنے کا ارادہ کیا، اپنی انگلی کو تھوڑا سا شہد لگا کر انگلی اس کے منہ میں دی تو وہ چسر چسر اسے چوسنے لگی اور خاموش بھی ہوگئی تھی۔ اس نے تھوڑا سا دودھ ہلکا گرم کیا اور اس میں روئی ڈبو ڈبو کر اس کے حلق میں ٹپکانے لگا۔

جیسے ہی وہ پُرسکون ہوکر سوئی، اس نے اپنا سارا سونا سمیٹا، کچھ اور ضروری سامان اور اپنا کپڑا لتا لیا اور بچی کو اسی طرح لپیٹ لپاٹ لیا جیسے کہ وہ پہلے تھی۔ سامان اس نے اتنا ہی اٹھایا تھا، جتنا کہ اٹھا کر وہ چل سکتا تھا۔ اس نے اس برساتی نالے کی طرف کا رخ کیا تھا، جہاں سے عموماً لوگ نہیں جاتے تھے اور سواری ملنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ کافی فاصلہ اس نے راتوں رات ہی طے کرلیا تھا۔

زرتاج تو اس بچی کو امانت کی طرح اس کے حوالے کرگئی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کتنی بڑی مصیبت مول...... لی تھی۔ اس بات کی کسی کو بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ ان کے ٹکڑے کروا کر اپنے کتوں کے آگے ڈال دیتے۔ ان کی سفاکی کے اس نے جو چرچے سن رکھے تھے اور وہ کبھی بھی ان کا شکار نہیں بننا چاہتا تھا۔

پیدل چل کر وہ وہاں پہنچا جہاں سے اسے تور کے تڑکے تانگہ مل سکتا تھا۔ وہ رکا، بچی ذرا سا کسمسائی تھی، اس نے اس کا لنگوٹ بدلا اور اپنے ساتھ لایا ہوا دودھ اسے پلایا، اس دفعہ اس نے ہلکی سی مقدار اپنی کھانسی کی دوا کی شامل کرلی تھی، جو اسے حکیم صاحب نے دی تھی اور اس کو پینے سے اسے ہلکی سی غنودگی آجاتی تھی۔ دوبارہ بچی کو بھی کسی قیمتی سامان کی طرح سمیٹا اور جاکر اس تانگے میں بیٹھ گیا جس میں اور سواریاں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا سامان سمیٹ کر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گیا، بچی اس کی چادر میں اس کی گود میں ہی تھی اور اسے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ سو رہی تھی، اس نے سکون کی سانس لی۔

تانگہ رکتے ہی اس نے کرایہ ادا کیا اور اڈے سے شہر جانے والی لاری پر سوار ہوگیا۔ کنڈیکٹر نے اس سے کہا کہ وہ اس کا سامان لاری کی چھت پر رکھ دیتا ہے مگر اس نے انکار کردیا اور اسی طرح سامان اپنی گود میں رکھ لیا جیسے کہ اس نے تانگے میں رکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے جانے کیا خیال آیا کہ اس نے کنڈیکٹر کو بلایا اور اپنے ساتھ والی خالی سیٹ کی ٹکٹ بھی خرید لی۔ یعنی اب اس کے ساتھ والی سیٹ خالی رہتی۔

لاری کھچا کھچ بھر چکی تھی اور اس کا ڈرائیور اپنی نشست پر آبیٹھا تھا اور مسلسل ہارن بجا کر لوگوں کو مطلع کر رہا تھا کہ وہ روانگی کے لیے تیار ہے۔ لاری کے روانہ ہوتے ہی کنڈیکٹر نے زور سے ہاتھ لاری کے بیرونی دروازے پر مارا اور چلا کر بولا۔ ''روک کے۔'' لاری روانہ ہونے کے چند ہی سیکنڈ کے بعد رک گئی تھی۔ ایک جوان سی عورت سوار ہوئی، اس کی سانس پھول رہی تھی اور اس کی وجہ سب کو نمایاں نظر آرہی تھی۔ وہ حاملہ تھی اور اس کا وقت بھی قریب ہی نظر آرہا تھا۔ لاری کو پکڑنے کی کوشش میں وہ غالباً تیز تیز قدموں سے چلتی آئی تھی، اسی لیے ہانپ رہی تھی، اس کے بیٹھنے کو کوئی نشست بھی خالی نہ تھی اس لیے وہ چھت پر لگے ڈنڈے کے ساتھ لٹکتے ہوئے بیلٹ نما پٹے کو پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ لاری پھر روانہ ہوگئی اور وہ اس کی ہر ہر حرکت کے ساتھ جھٹکے کھا رہی تھی۔

’’اگر یہ نشست خالی ہے تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟‘‘ اس نے بے چارگی سے شاکر سے پوچھا، وہ قدرے حیران ہوا کہ ایک عورت ہو کر وہ ایک مرد مسافر کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ اس نے سمٹ کر اسے بیٹھنے کو جگہ دی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے اس نشست کے لیے کنڈیکٹر کو خوامخواہ ادائیگی کی تھی۔ کنڈیکٹر نے تو جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

’’باؤ جی، یہ رہے آپ کے بقایا پیسے۔‘‘

’’کس بات کے پیسے؟‘‘ اس نے حیرت سے کہا۔

’’آپ نے اس نشست کے لیے ادائیگی کی تھی، اب چونکہ یہ نشست آپ کے قبضے میں نہیں ہے تو میں ان باجی سے اس کا کرایہ وصول کر لیتا ہوں۔‘‘

’’کوئی بات نہیں، کرایہ تو میں دے چکا ہوں!‘‘ اس کے منہ سے اچانک پھسلا۔ کنڈیکٹر احسان مندی سے اسے دیکھتا ہوا واپس مڑ گیا۔

’’میں آپ کی بہت ممنون ہوں!‘‘ اس نے شاکر کی طرف دیکھ کر کہا، شاکر کو اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنو واضح نظر آ رہے تھے۔

’’کوئی بات نہیں، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے!‘‘ اس نے کہا اور منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

’’آپ نے مجھے شرمندگی سے بچا لیا ہے۔‘‘ اس نے ہولے سے کہا۔ ’’میرے پاس کرایہ دینے کے لیے بھی رقم نہیں تھی، اگر کنڈیکٹر مجھ سے مانگ لیتا تو میں بھری بس میں سب کے سامنے شرمندہ ہو جاتی، کیا آپ یقین کریں گے کہ میں اس لاری کی طرف چلتے ہوئے آ رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ کاش کوئی فرشتہ اس گاڑی میں ہو جو مجھے اس شرمندگی سے بچا لے اور دیکھ لیں اللہ نے کیسے میری سن لی!‘‘

شاکر کو اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ شہر کی کوئی لڑکی تھی اور یہ کہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی اور خاصی باتونی بھی۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر شرمندہ ہوا کہ وہ اسے فرشتہ کہہ رہی تھی۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے لاری روکی تا کہ سارے مسافر اتر کر حوائج وغیرہ سے فارغ ہو جائیں اور کچھ کھا پی بھی لیں۔ مسافر ایک ایک کر کے اتر رہے تھے، جب ذرا سی حرکت اور شور سے بچی کے آرام میں مداخلت ہوئی اور اگلے ہی لمحے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی، شاکر اس صورتِ حال پر پریشان سا ہو گیا تھا، اسے مجبوراً چادر ہٹانا پڑی تا کہ بچی کی سانس نہ بند ہو جائے۔

’’ارے...... کتنی پیاری بچی ہے...... کس کی ہے؟‘‘ اس عورت نے سوال کیا تو وہ سٹپٹا گیا۔

’’وہ...... یہ میری ہے!‘‘ اسے اور کچھ نہ سوجھا۔

’’یہ تو بہت چھوٹی ہے، اس کی ماں کہاں ہے۔‘‘ اس نے بچی کو شاکر کے ہاتھوں سے لے لیا۔ ’’آپ اس کو اکیلے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟‘‘

’’اس کی ماں...... ہاں وہ اس کی پیدائش کے دوران مر گئی، میں اسے شہر لے کر جا رہا ہوں۔‘‘ وہ ٹھیک ٹھاک بوکھلا گیا تھا۔

’’تو آپ اسے شہر کس کے پاس لے کر جا رہے ہیں؟‘‘ اس نے شاکر کا دھواں دھواں چہرہ دیکھے بغیر کہا

تھا۔

’’معلوم نہیں۔‘‘ شاکر نے کہا۔

’’کیا مطلب معلوم نہیں؟‘‘ اس نے مڑ کر حیرت سے شاکر کو دیکھا۔

’’گاؤں میں میرا اور کوئی نہیں، میں اسے کہاں سنبھال سکتا ہوں، اسی لیے میں اسے شہر لے کر جا رہا تھا کہ شاید وہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی عورت مل جائے۔‘‘ شاکر نے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کتنے ہی جھوٹ بول ڈالے تھے، گھر سے نکلنے سے لے کر ابھی تک اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ شہر پہنچ کر اس بچی کا کیا کرے گا۔

’’آپ ہو آئیں باہر سے، کچھ کھا پی لیں اور میرے لیے بھی کچھ لے آئیں، بچی مجھے دے جائیں میں اس کو تب تک سنبھالتی ہوں۔‘‘ اس نے اس طرح اسے احکامات جاری کیے کہ شاکر کو ان کی تعمیل کیے بغیر چارا نہ تھا۔ اپنا سارا سونا اور زیورات اس نے اپنی شلوار کے اندر بنی پوشیدہ جیب میں رکھے تھے، باقی سامان میں سوائے کپڑوں کے کچھ نہ تھا، اس لیے وہ بے فکری سے بچی اس کے حوالے کر کے لاری سے اتر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، وہ ایک لفافے میں پکوڑے اور اپنے پاس موجود دوا والی خالی بوتل میں بچی کے لیے دودھ لے کر لوٹا اور بس میں سوار ہوا، اپنی نشست کی طرف بڑھا، نشست خالی تھی، جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ عورت گود میں اس بچی کو لیے بیٹھی تھی، جو اس کے پاس زرتاج کی امانت تھی اور اس کے لیے وہ اس کو جواب دہ تھا، اس کا دماغ نشست کو خالی دیکھ کر بھک سے اڑ گیا۔

’’میں زرتاج کو کیا جواب دوں گا؟‘‘ اس نے سوچا۔ ’’میں نے ایک انجان عورت پر بھروسا کیسے کر لیا، اس نے مجھے فرشتہ کہہ دیا اور میں اس کی لچھے دار باتوں میں آ گیا۔‘‘

☆☆☆

’’تھک گیا ہے میرا جانی؟‘‘ سلیم نے زمین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھتے ہوئے سہیل کے کندھے دبائے۔

’’ٹانگیں دبا اپنے جانی کی!‘‘ افضال ہنسا۔ ’’اتنا نازک مزاج ہے تو یار، لڑکیوں سے بھی گیا گزرا ہے تو!‘‘

’’مجھے عادت ہی نہیں چلنے کی۔‘‘ سہیل نے جمائی لے کر کہا۔

’’جانتے ہیں تیرے شاہانہ انداز بھی، بات تو تب تھی نا کہ تو گاڑی لے آتا، ہم یہاں آزادی سے گھومتے پھرتے اور اپنی مرضی سے جہاں جی چاہتا آتے اور جب جی چاہتا، لوٹ جاتے۔‘‘ سلیم بات کرتے کرتے رکا، اپنے ہاتھوں کا چھجا سا بنا کر دیکھا اور چلایا۔ ’’لڑکیاں!..‘‘

’’کہاں ہیں؟‘‘ سہیل جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’’دیکھا...... لڑکیوں کو دیکھ کر تو یہ قبر سے اٹھ کر بھی آ جائے گا!‘‘ افضال نے اس پر طنز کیا۔

’’واقعی لڑکیاں ہیں۔‘‘ سلیم نے دور دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تین چار ہیں۔‘‘

’’ہمیں صرف تین کی ضرورت ہے۔‘‘ افضال نے مذاق میں کہا تھا مگر سہیل تو اٹھ کر واقعی اسی طرف چل پڑا تھا۔

"باؤلے ہوئے ہو کیا، یہاں اس ویران سے علاقے میں تم کس طرح لڑکیوں سے فلرٹ کرو گے، مذاق اپنی جگہ مگر تم گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے۔" سلیم نے اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔

"بھگتو اب تم ہی اسے۔" افضال وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا، سایہ اچھا تھا اسے دھوپ میں سہیل کے ساتھ جانا گوارا نہ ہوا اور پھر اسے شہر کی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں، گاؤں سے اس کا تعلق تھا اور اسے گاؤں کی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس نے تو اپنی اماں سے صاف کہہ رکھا تھا کہ اس کا بیاہ کبھی بھی گاؤں میں کرنے کا نہ سوچے۔

سلیم سہیل کا ساتھ دینے کو اس کے ہمراہ روانہ ہو چکا تھا، اس کو ہلکی ہلکی نیند آ رہی تھی اور اسے یہ بھی علم تھا کہ سہیل اب ذرا اپنا چھیڑ چھاڑ کا منظر لمبا ہی کر کے آئے گا، ایک یہی شغل اسے پسند تھا اس کے لیے جگہ اور وقت کی کوئی قید نہ تھی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہیں اندازہ ہوا کہ وہ جگہ گاؤں سے کافی ہٹ کر تھی۔ سات آٹھ برس سے لے کر گیارہ بارہ سال تک کی چار لڑکیوں کا گروہ تھا، جن میں سے دو لڑکیوں نے چھوٹے بچے اٹھا رکھے تھے۔ انہیں وہاں دیکھ کر انہوں نے اپنا کھیل روک دیا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اجنبی لوگ تھے، اپنے گاؤں کے لوگوں کو وہ پہچانتی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے؟" سہیل نے پوچھا، اس کی نظریں گیارہ بارہ سالہ اس لڑکی پر جمی تھیں جس کی اٹھان ان سب میں اچھی تھی۔ جواب میں خاموشی تھی، ان لڑکیوں کی ماؤں نے ان کو تربیت ہی یہی دی تھی کہ اجنبیوں سے کلام نہ کریں۔

"واپس چلتے ہیں، یہ تمہارے مطلب کا مال نہیں۔" سلیم نے اسے چونکایا۔

"سارے مال مطلب کے ہی ہوتے ہیں۔" کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اسی لڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، وہ لڑکی ذرا سا سمٹ کر پرے ہو گئی۔

"دیکھا کیا ادا ہے گریز کی..... ان لڑکیوں کو ساری ادائیں آتی ہیں!" اس نے اس لڑکی کے گال کو چھوا تو اسے خطرے کا احساس ہوا، وہ پیچھے ہٹ گئی اور لال چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اسی نے ہمت کر کے سوال کیا اور ساتھ ہی اپنی علاقائی زبان میں کچھ بولی، اس کے انداز میں تحکم تھا۔ وہ اپنے گروہ میں عمر میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ سب کی سب بھاگ گئیں، اس طرح کہ جس طرح ہرنیاں قلانچیں بھرتی ہیں۔

"دفعہ کرو ان کو، چلو واپس چلتے ہیں۔" سلیم نے اس کا لال چہرہ دیکھ کر کہا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں ان سب کو۔" اس کی حالت اس بھیڑیے جیسی ہو رہی تھی، جس کے منہ سے کسی نے شکار چھین لیا ہو۔ سلیم کے روکتے روکتے بھی وہ ان کے پیچھے بھاگا تھا، جو اس سے پہلے چند قدم چل کر بھی ہانپ رہا تھا، اس کی وحشی جبلت اسے ان معصوم بچیوں کے تعاقب میں بھگائے لے جا رہی تھی، بڑی لڑکیاں تو جانے ساری کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ وہ بھی جنہوں نے بچے اٹھا رکھے تھے، اس کا ہیجان عروج پر پہنچ چکا تھا، اس کی وحشت کا نشانہ بننے کو ایک سات سالہ معصوم سی بچی، اس کے قابو میں آ گئی تھی۔ سلیم اسے روکتا ہی رہ گیا مگر اس

پر حیوانیت سوار تھی۔

☆☆☆

"مجھ سے بڑھ کر تو جینا ہی مردم شناس نکلی۔" اس نے ہی دل میں سوچا۔" میں نے دنیا کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھا اور وہ جسے میں بے وقوف سمجھتی تھی اس نے مجھے پہلے سے ہی اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کیا دنیا میں یہی ملتا ہے کسی پر اعتبار کا نتیجہ۔" جاوید بھائی، جنہیں وہ اپنے بھائیوں جیسا سمجھتی تھی اور ان کی اور سائرہ کی محبت میں وہ اتنی دور سے ان کو ملنے چلی آئی تھی۔ پہلے چند دن تو یوں گزرے کہ اسے وقت کی رفتار کا علم ہی نہیں ہوا تھا۔ سائرہ باجی کی طبیعت ناسازسی رہتی تھی اور رات دیر تک انہی کے کمرے میں محفل جمتی، جاوید بھائی اور بچے خوب رونق لگاتے۔

اسے آئے ہوئے پانچواں روز تھا، جب جاوید بھائی نے اپنی شرافت کا چولا اتارا۔ وہ ان کے اس بدلتے بہروپ پر حیران تھی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے جاوید بھائی، میں وہی ہوں جسے آپ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔"

"کسی کو کچھ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ اس کی طرف بڑھتے ہی چلے آ رہے تھے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری باجی اب مستقل مریضہ ہے اور میرے حقوق ادا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔"

"تو آپ دوسری شادی کر لیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"وہ تو کروں گا ہی تم سے، اسی لیے تو تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"شرم آنی چاہیے آپ کو جاوید بھائی!" اس کی آواز بھرا گئی، مان ٹوٹے تو اسی طرح ہوتا ہے۔

"بند کرو یہ بک بک جاوید بھائی والی...... اور سیدھے سیدھے میرا مطالبہ پورا کرو!" انہوں نے اسے حکم دیا۔

"آپ یہاں سے نکل جائیں ورنہ میں چیخ چیخ کر آپ کے بیوی بچے ہی نہیں بلکہ سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی!" اس نے اس ان کو خبردار کیا۔

"بکواس نہ کرو۔" انہوں نے اس کو اس کی چٹیا سے پکڑ لیا۔ "ایک لفظ بھی بولا تو میں سب کو بتا دوں گا کہ تو نے مجھے خود بلایا ہے۔ کون یقین کرے گا تیری بات پر، سب کو علم ہے کہ تو ہی ایسی ہو سکتی ہے، سائرہ بھی نہیں مانے گی تیری بات۔" انہوں نے اس کو جھٹکا دے کر چھوڑا۔ "اگر کوئی شک ہے تو چیخ اور بلا سب کو۔"

وہ دہل گئی، اندر تک دہل گئی۔ جاوید نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا، اس نے زور لگا کر خود کو چھڑوایا، اسے علم تھا کہ وہ ان سے بچ نہیں سکتی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جاوید بھائی۔" اس نے التجا کی۔ "مجھے چھوڑ دیں پلیز۔" اور کیا چاہیے ہوتا ہے ایک مرد کو، اپنے سامنے گھگیاتی ہوئی ایک عورت۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔" انہوں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ "اور اپنی طبیعت ذرا جلدی ٹھیک کرو!" انہوں نے ایسے حکم دیا جیسے اپنی طبیعت کو ٹھیک کرنا اس کے اختیار میں ہو۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا مگر پھر بھی وہ کئی گستاخیاں کر گئے، اس کے سامنے عمر بھر ایک مینار کی طرح ایستادہ رہنے والے اس کے

بھائیوں جیسے جاوید بھائی اپنی حرکتوں سے اس کے سامنے ذلت کی انتہاؤں تک گر گئے تھے۔ اس کے کمرے سے وہ نکلے تو وہ غسل خانے میں گھس گئی اور اپنے سارے جسم سے ان کے ناپاک لمس کی غلاظت کو اتارنے کی ناکام کوشش کرنے لگی کیونکہ یہ غلاظت اس کی روح تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا اعتبار ٹوٹا تھا، اس نے دھوکا کھایا تھا۔ وہاں سے جہاں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اگلے ہی روز جونہی وہ عفریت گھر سے نکلا، اس نے سائرہ سے اجازت لی اور واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ سائرہ اسے بار بار روکتی رہی مگر اسے اپنی عزت بچانا مقصود تھی۔

"اچھا پھر کل چلی جانا، تمہارے بھائی صاحب تمہیں خود اسٹیشن پر چھوڑ کر آئیں گے، یوں تمہیں جانے دیا تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے کہ میں نے تمہیں روکا نہیں۔" مریم نے سائرہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"سائرہ باجی۔ مجھے جانے دیں، آج ہی جانے دیں۔ میں جو کچھ آج بچا پائی ہوں، جانے کل نہ بچا سکوں۔ آپ کا گھر بھی برباد ہو جائے گا اور میں تو کہیں کی نہ رہوں گی!" مریم نے بالآخر اسے اشارتاً سمجھایا مگر سائرہ بچی نہ تھی۔ اسے گلے لگا کر رخصت کیا، اس سے بار بار معافی طلب کی ایک ایسے جرم کی جو اس نے کیا بھی نہ تھا۔

ریل میں بیٹھی وہ بار بار گزرے چند دنوں کے واقعات کو دہرا کر خود سے شرمسار تھی کہ اس کی بہنوں جیسی سائرہ کا اب اس سے رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ دنیا کے کسی خطے میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی ہے۔ جب اسے ضرورت پڑے گی تو وہ اس کو پکارے گی، وہ سب ختم ہوا۔

آنکھوں میں بار بار پانی اتر آتا تھا، اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ آنسو رشتوں کے دیے ہوئے تھے، کسی پچھتاوے یا احساسِ زیاں کے نہ تھے۔ ریل گاڑی کافی دیر سے کھڑی تھی، شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی یا پھر سگنل بند تھا۔ کوئی انتہائی گم نام چھوٹا سا اسٹیشن تھا، وہ اتری اور اس ایک کمرے کی انتظار گاہ کی طرف بڑھی جس کا نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ اسے غسل خانے جانا تھا، وضو کرنا تھا اور اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرنا تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن سے صدمہ کم ہو گیا تھا۔

غسل خانے کی حالت کافی خستہ تھی، اس نے دروازہ بند کیا تو اسے زمین پر ایک گٹھڑی سی پڑی نظر آئی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اسے علم ہوا کہ وہ گٹھڑی نہیں بلکہ کوئی بچہ تھا، اس نے اسے چھو کر دیکھا، بچہ یا تو بے ہوش تھا یا پھر مر چکا تھا۔ اس نے اس کے سینے پر سر رکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ زندہ تھا پھر اس نے دیکھا تو وہ لڑکی تھی۔

"شاید کسی کے گھر میں زیادہ بیٹیاں ہو گئی ہوں گی اس لیے۔" اس نے سوچا۔ اس بچی کو اٹھائے ہوئے وہ باہر نکلی تو دور دور تک کوئی نہ تھا، گاڑی کی بلند سیٹی بتا رہی تھی کہ گاڑی روانہ ہونے والی ہے، اس کا سامان اس میں نہ ہوتا تو وہ واپس نہ جاتی، پہلے معلوم کرتی کہ وہ بچی تھی کس کی۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس نے اس اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

اس کے ڈبے میں باقی لوگوں میں سے کوئی سو رہا تھا، کوئی اخبار پڑھ رہا تھا، اس نے بچی کو اپنی چادر کی اوٹ میں کر لیا تھا۔ گاڑی چل پڑی تھی، اس نے بے ہوش بچی کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بچی کا دل دھڑک

رہا تھا مگر اس کے وجود میں اور کوئی حرکت نہ تھی۔ وہ زیرِ لب اس کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ اپنے شہر [illegible]
گاڑی رکی تو اس نے اپنا مختصر سا سامان اور بچی کو اٹھایا اور کسی ڈاکٹر کو ڈھونڈنے چل دی۔

☆☆☆

گاڑی سے اتر کر وہ رفع حاجت کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہی تھی، گاڑی کے درجنوں مسافر اتر کر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، وہ کوئی ویران گوشہ تلاش کرنے لگی، اس کوشش میں وہ ریل گاڑی سے کافی دور آ گئی تھی، واپسی پر وہ تیز تیز قدموں سے ریل کی طرف جاتے جاتے اس گول سی پوٹلی نما کسی چیز کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی، اس کا ایک اندازہ تھا جو قریب جا کر درست ثابت ہوا۔ وہ بچہ ہی تھا۔

"کم بختیں، پیدا کر لیتی ہیں اور پھر چھوڑ دیتی ہیں یوں ان غریبوں کو کتے بلیوں کے کھانے کے لیے!" اس نے سب سے پہلے پڑتال کی اور مسکرائی۔ "اری بدبختو، کوئی ہم سے پوچھے قدر ان معصوم روحوں کی!" اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ لڑکی تھی، اگر لڑکا ہوتا تو شاید نہیں یقیناً وہ اس کو وہیں چھوڑ کر آگے کو نکلتی۔ اس کی مرضی کا مال تھا، لڑکا تو اس کے پاس تھا، جسے اس نے خود جنا تھا۔

کسی مجبوری کے تحت نہیں اور نہ ہی ناجائز اولاد بلکہ کسی پر اپنا دل ہار بیٹھی اور اپنی ماں کے کہنے کے باوجود اس سے نکاح کر لیا۔ وہ تو سمجھ بیٹھی تھی کہ جسے وہ دل دے بیٹھی ہے وہ بھی اس سے اسی طرح پیار کرتا ہوگا مگر وہ دنیا والوں کے ڈر سے اسے اس کا مقام تو نہیں دے سکا اور ایک دفعہ گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آیا تھا اور نہ ہی کبھی بیٹے کا مطالبہ کیا اور باقاعدگی سے دلی کا خرچہ بھی اسے پہنچ جاتا تھا۔ کافی عرصے تک اسے جب خرچہ نہیں ملا تو اس نے کسی کو بھیج کر معلوم کروایا تو علم ہوا کہ وہ اب اس دنیا میں نہ تھا، اس روز وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی گرہستن تھی اور بیوہ ہوگئی تھی۔ اس صدمے نے دوبارہ اسے اپنے پیشے کی طرف مائل کر دیا، اب تک تو اسے امید تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی لوٹ کر آئے گا مگر اس کی موت کی خبر نے اس کی امید کے سارے تاگے توڑ دیے تھے۔

اپنے پیشے ہی کے سلسلے میں اسے پشاور جانا پڑا تھا تو اپنے بچوں کو وہ اپنی ہمسائی کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اپنے "کام" کے سلسلوں کو وہ اپنے بیٹے کی نظر سے خاص طور پر اوجھل رکھنا چاہتی تھی، گئی تو پشاور مال دیکھنے تھی مگر وہ مال نہ ملا اور اب۔

"واہ مولا۔ تو نے دینا ہو تو بن مانگے اور بن مول بھی دے دیتا ہے۔" واپس اپنے ڈبے میں جاتی تو لوگوں کے سوالوں کا کیا جواب دیتی۔ اس لیے وہ ایک دوسرے ڈبے میں جا کر سوار ہوگئی! بچی کو ہولے ہولے تھپکا اور پھر ریل چلی تو اس کے ہلکورے سے وہ جلد ہی سو گئی۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ کہیں بچی بھوک سے بلبلا اٹھی تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس نے کسی کو رقم پکڑائی کہ ایک بوتل میں دودھ لا کر دے دے۔ تھوڑی دیر میں دودھ کی بوتل آ گئی۔

"تو کیا تم گھر سے بچی کی بوتل لے کر نہیں چلی تھیں؟" ایک بڑی بی نے پوچھا جو کافی دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں، انہیں اس عورت کے ڈھب نرالے نظر آئے تھے، دیکھنے میں تو وہ بڑی اماں کو بچاس کے پیٹے میں لگ رہی تھی اور گود میں چند ماہ کی بچی۔

"جی، وہ میری اماں کا انتقال ہوگیا ہے، جونہی خبر ملی تو گھر سے نکل پڑی۔" وہ ایک شاطر عورت تھی، پردوں پہ پانی کیسے پڑنے دیتی۔

"تو اماں کے انتقال پر کیا اس طرح کے کپڑے پہن کر جا رہی ہو تم؟" بڑی اماں تو چپکو ہی ہوگئی تھیں۔

"دراصل میں اپنی نند کی شادی کے لیے تیار ہوئی تھی۔" اس نے فوراً جواب گھڑا۔

"تو شوہر کہاں ہے تمہارا؟" اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ بڑی اماں کا گلا مروڑ دے مگر کئی لوگ ان کی گفتگو کی طرف متوجہ تھے۔

"اُن کی بہن کی شادی تھی بڑی اماں! کیا اسے چھوڑ کر آ جاتے۔" اس نے زچ ہو کر کہا تو بڑی اماں بھی منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔ اس نے شکر کی سانس لی۔

دودھ پی کر بچی نے جب دودھ پلانے والی کو دیکھا تو اسے نہ پہچانا اور وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی۔

"اماں! تائی۔۔ مائی۔" روتے ہوئے وہ عجیب و غریب آوازیں نکال رہی تھی۔ وہ تو اسے چند ماہ کی بچی سمجھے بیٹھی تھی اور وہ بچی اس کی توقع سے زیادہ باتیں کر رہی تھی۔ کافی کوشش کی مگر بچی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

غصے میں آ کر اس نے دہاڑ کر اسے چپ ہونے کو کہا تو بچی سہم گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ "دیکھتی نہیں ہے کہ میری ماں مری ہے۔ تیری ماں تو زندہ ہے تو کیوں یوں رو رو کر مجھے زچ کر رہی ہے؟" وہ مکاری سے مصنوعی آنسو بہانے لگی۔

"کیوں معصوم بچی کو ڈانٹ رہی ہو۔ لاؤ اِدھر، مجھے دو میں اس کو دم کر دوں، اس کے پیٹ میں درد ہوگا، جانے کس طرح کا دودھ تھا جو تم نے اس کو پلا دیا۔ اتنی سی بچی کو دودھ میں پانی ملا کر دینا چاہیے۔" انہی بڑی اماں نے اس سے بچی لی اور اس کو دم کرنے لگیں۔

"کتنے ماہ کی ہے؟" اس پر پھونک مار کر انہوں نے اسے اس کے حوالے کیا، بچی خاموش ہوگئی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے بچی کو تھام لیا۔ "جی نو ماہ کی ہے۔" اس نے اندازے سے کہا۔

"ماشاء اللہ باتیں تو کافی کرتی ہے، عموماً اتنی باتیں سال ڈیڑھ کا بچہ کرتا ہے۔" انہوں نے کہا تو یہ خاموش رہی کہ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

"بھاگو!" اس کا کہنا تھا کہ اس سمیت سب بھاگ پڑیں۔ کوئی کسی سمت اور کوئی کسی سمت۔ زرتاج اور روحی اس طرف بھاگی تھیں جہاں سے ریل گاڑی گزرتی تھی، اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی بچیاں انہیں بوجھ لگنے لگیں، انہیں یقین تھا کہ اسٹیشن کی طرف ان کا سامنا کسی نہ کسی سے ہوگا مگر وہاں پہنچ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں ہو کا عالم تھا۔ وہ انتظارگاہ کی طرف بھاگی، وہاں بھی اندر کوئی نہ تھا، اس وقت مسئلہ اپنی جان بچانے کا تھا کہ ان کے پیچھے بھیڑیے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

انتظارگاہ کے غسل خانے میں پہنچی تو اس کے ہاتھوں سے بچی چھوٹ کر گر گئی، وہ سمجھی کہ وہ ابھی گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے گی اور اسے تائی تائی کہہ کر پکارے گی مگر وہ گری اور اس کے حلق سے کوئی بھی آواز بلند نہیں

ہوئی۔ زرتاج کا بدن لرزنے لگا، وہ خوفزدہ ہوگئی تھی، بھاگی کہ باہر نکل کر روحی کو دیکھے کہ وہ کہاں تھی مگر روحی تو اس کی مخالف سمت میں بھاگی تھی۔ دیر تک اسے ڈھونڈنے اور پھر نہ پانے پر وہ مایوس ہو کر وہ ایک ٹیلے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی کہ شاید اسے ڈھونڈتا ہوا کوئی اِدھر نہ آنکلے۔

روحی نے تھک کر اسے جھاڑیوں کے ننھے سے سائے میں لپیٹ لپاٹ کر رکھا اور خود زرتاج کی تلاش میں نکلی۔ جلد ہی اسے زرتاج ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی ہو... سسکیاں لیتی ہوئی نظر آئی۔

''قمر باجی کہاں ہیں؟'' زرتاج نے روحی سے پوچھا تھا۔

''وہ اور ماہ تاج اس طرف بھاگی تھیں۔'' روحی نے مخالف سمت اشارہ کیا۔

''چلو ان کو ڈھونڈتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ماہ تاج تو اتنا نہیں بھاگ سکتی، کہیں تھک کر بیٹھی ہوگی۔''

جانے کتنا ہی وقت گزر گیا، دور سے انہیں ریل گاڑی بھی نظر آئی مگر وہ اس طرف نہیں جا رہی تھیں کہ انہیں قمر اور ماہ تاج کو ڈھونڈنا تھا اور انہیں ان لوگوں سے بھی خطرہ تھا جن کے ڈر سے وہ بھاگی تھیں۔ قمر اپنی جان اور عزت بچا کر بھاگی تھی اور جلد ہی اسے ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا تھا۔ وہ وہاں چھپی ہانپ رہی تھی، اپنی عمر کی وجہ سے صرف اسے ہی اندازہ تھا کہ ان کے عزائم کیا تھے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور اسے یہ اندازہ کرنا بھی دشوار لگ رہا تھا کہ گاؤں کس طرف ہے۔

''شاید اسی وجہ سے ہماری مائیں ہمیں اس طرف آنے کو منع کرتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ یہاں جنات کا ٹھکانا ہے مگر اصل میں اس جگہ میں کوئی نہ کوئی ایسا بھید ہے کہ کوئی اس طرف نہیں آتا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ بھاگتے وقت ماہ تاج نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا مگر وہ اس کی رفتار کا کہاں مقابلہ کرسکتی تھی، اسی لیے اس نے اسے اپنی مخالف سمت بھاگنے کو کہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ماہ تاج تو ایک ننھی سی بچی ہے، اصل خطرہ تو اس کی عزت کو تھا۔ اسے اس شہری کی نظروں میں اپنے لیے جو بھوک نظر آئی تھی اور اس کی جبلت کو محسوس ہوگئی تھی اسی لیے اس نے سب کو بھاگنے کو کہا تھا۔

خود ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ کر جب اس نے اردگرد نظر دوڑائی کہ باقیوں کو دیکھے تو دور سے اسے وہ منظر نظر آیا جسے دیکھ کر چشمِ فلک بھی شرمندہ تھی۔ ''ماہ تاج!'' اس کے حلق میں کئی سسکیاں دم توڑ گئیں۔ اس کی آواز نکلتی تو اسے بھی ڈھونڈ لیا جاتا۔ زور سے اسے چکر آیا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے گرتی چلی گئی، وہ اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔

جتنی دیر میں زرتاج اور روحی اسے ڈھونڈتی ہوئی پہنچیں اور اسے تھپتھپا تھپتھپا کر ہوش میں لائی تھیں تو سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ قائم علی کے گھر کا سکون، خوشی...... اس کی بیٹیاں...... اس کی پھولوں جیسی بیٹیاں پتی پتی ہو کر بکھر چکی تھیں۔

☆☆☆

''پاگل ہوئی ہو کیا یا کتے لگ گئے ہیں تمہارے پیچھے؟'' معراج نے ہانپتی کانپتی اور لرزتی ہوئی تینوں لڑکیوں کو یوں آتے دیکھا تو برس پڑیں۔ ''اور چھوٹیاں کہاں ہیں۔ کہاں تھیں تم لوگ، اتنی دیر سے میں آئی بیٹھی ہوں اور تم شہزادیوں کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔'' وہ غور سے ان لڑکیوں کے لٹھے جیسے سفید چہرے دیکھنے

لگیں۔ ''بول کیوں نہیں رہی ہو تم لوگ؟''

ان کا اتنا کہنا تھا کہ وہ تینوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

''کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، کہاں گئی تھیں کھیلنے؟'' زینت نے ان سے پوچھا، اسے شک ہوا کہ وہ ٹیلے کی طرف گئی ہوں گی اور کچھ ایسا ویسا دیکھ لیا ہوگا۔ ''کہیں ٹیلے کی طرف تو نہیں۔'' روحی کا ہلتا ہوا سر دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''کئی بار منع کیا ہے تم لوگوں کو کہ اس طرف مت جایا کرو مگر تم لوگ کسی کی بات اپنے پلے باندھو تو تب نا!'' معراج نے غصے سے کہا، زرتاج اسی طرح چیختی چلاتی ماں سے لپٹ گئی۔

''بہنوں کو کیا وہیں چھوڑ آئی ہو؟'' معراج نے پوچھا تو زرتاج نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چلو چل کر انہیں لے کر آتے ہیں۔'' اس نے چارپائی پر رکھی چادر اٹھا کر اوڑھی جو اس نے واپس آکر اتار کر رکھی تھی، زرتاج سسکنے لگی۔

''وہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔''

''کون؟'' معراج کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔

''جنہوں نے ماہ تاج کو۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''کس نے کہا ہے کچھ میری ماہ تاج کو اور نین تارا اور حسن آرا کہاں ہیں؟'' اس نے ان سے پھر پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس کا کہنا تھا کہ زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے گال پر لال نشان چھوڑتا گیا۔

''کس کو پتا ہوگا پھر؟'' کہتے ہوئے وہ باہر کو لپکی، زینت بھی اس کے ساتھ نکلی اور ساری لڑکیوں کو بھی ساتھ آنے کو کہا اور وہاں پہنچ کر اپنے جگر کے ٹکڑے کا حشر دیکھ کر معراج تو پاگل ہی ہوگئی، ایک کے ساتھ تو جو ہوا وہ ناقابلِ دید منظر تھا مگر جن دو کو ان بچیوں نے اپنی دانست میں چھپایا تھا وہ بھی وہاں نہ تھیں۔ شاید انہیں کتے یا جنگلی جانور وغیرہ کھا گئے تھے کچھ لوگوں کا یہی خیال تھا مگر کہیں خون کی بوند تک نہ تھی کہ اس بات کی تصدیق ہوسکتی۔

سینہ کوبی کرتی اور بین کر کر کے روتی ہوئی، قائم علی کی بیوی کو لوگوں نے یوں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تو ان کی عورتوں کو اچھی اچھی باتیں سکھاتی اور بہ آوازِ بلند رونے سے منع کرتی تھی مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر وہ جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ کسی کو شہر بھجوا کر قائم علی کو شہر سے فوراً بلوالیا گیا تھا، جس کے لیے اس المناک منظر کے ساتھ ساتھ سکتے کی حالت میں زرتاج اور صدمے کی وجہ سے موت کے منہ میں جاتی اس کی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شہر سے اس کے ساس اور سسر بھی آئے تھے۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر ان کا کلیجا کٹ رہا تھا۔

قائم علی نے ماہ تاج کی تکفین و تدفین کے انتظامات کی ذمے داری اپنے منشی کے حوالے کی اور خود فوراً مقدمہ درج کروانے کو دوڑا۔ کم از کم جن دو بچیوں کا کچھ پتا نہیں چل پا رہا تھا، ان کی کوئی خبر ملتی تو معراج موت کے منہ سے نکل آتی۔

☆☆☆

''یہ ٹھیک تو ہو جائے گی ڈاکٹر صاحب؟'' اس نے شاید دسویں بار یہ سوال کیا تھا۔

''اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے مگر کچھ وقت لگے گا..... مگر یہ گری کیسے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''کم از کم ابھی یہ آٹھ گھنٹے یا اس سے کچھ زائد وقت سے بے ہوش ہے۔''

''میری بہن کی بیٹی ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے ہاتھوں سے ریل میں چھوٹ کر گر گئی تھی، یہاں تک پہنچتے اتنا وقت لگ گیا۔'' اس نے کہانی بنائی جو اس نے راستے میں سوچی تھی۔

''مجھے تو کچھ عجیب سا معاملہ لگ رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا تو اس نے چند نوٹ نکال کر میز پر رکھے۔

''اسے بچا لیں ڈاکٹر صاحب، یہ میری بہن کی نشانی ہے!'' اس نے ڈاکٹر کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا، ڈاکٹر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر رقم اپنی جیب میں منتقل کی تھی، پیسے میں ہر دور میں بڑی طاقت رہی ہے۔

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں، نام کیا ہے بچی کا؟'' ڈاکٹر کا لہجہ فوراً بدل گیا تھا۔

''گڑیا۔'' وہ فوراً بولی۔

''گڑیا تو کوئی نام نہ ہوا؟'' ڈاکٹر لکھتے لکھتے رکا۔

''جی گڑیا تو ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں۔ اس کا نام ستارہ ہے!'' جانے کیسے اس کے ذہن میں جلدی سے یہ نام آیا تھا۔ شاید اس کی اپنی بیٹی ہوتی تو اس کا نام بھی وہ ستارہ ہی رکھتی۔ اسے یہ نام ہمیشہ سے پسند تھا مگر پچھلے چند گھنٹوں میں واقعات اس طرح اچانک رونما ہوئے تھے کہ وہ دماغی طور پر پریشان تھی اور اس کے ذہن میں کئی گھنٹوں تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ اسے اس بچی کو کسی نام سے پکارنا ہے۔

☆☆☆

''یہ کون ہے اماں؟'' دلی نے حیرت سے ماں سے پوچھا تھا۔

''تیری بہن ہے اور کون ہوگی؟'' اس نے کہا۔

''یہ کہاں سے آئی ہے؟'' عجیب سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

''اسپتال سے اور کہاں سے بھلا؟'' اس نے اسے ساتھ لگا لیا۔

''کہاں سے ملی یہ لال لال گالوں اور نیلی آنکھوں والی؟'' پڑوسن نے اس سے پوچھا تو اس نے فوراً اسے ڈانٹ دیا کہ وہ بیٹے کے سامنے ایسی بات نہ کرے۔

''اس کا نام کیا ہے اماں؟'' دلی نے پھر سوال کیا۔ وہ دلی کی طرف دیکھ کر الجھ سی گئی، اسے تو راستے میں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ دلی اس کا نام بھی پوچھ سکتا ہے۔ یہ تو اسے علم تھا کہ اسے مال لانا ہے اور دلی کو ہمیشہ کی طرح یہی بتانا ہے کہ وہ اس کی بہن تھی۔ اس سمیت اس کی سات بہنیں ہوگئی تھیں۔

''فیروزہ۔'' اپنی پڑوسن کے لال گالوں اور نیلی آنکھوں والی کہنے سے ہی اسے یہ نام سوجھا تھا۔

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ؟'' پڑوسن نے پھر تجسس سے پوچھا تو اس نے دلی کو باہر کھیلنے کے لیے بھیجا اور پڑوسن کو ایک نئی کہانی بیان کر دی۔

''پشاور میں کچھ بچیوں کی کھیپ آئی تھی، میرے علاوہ بھی اور لوگ تھے مگر سب بچیوں کی عمر دیکھ کر بدک گئے مگر میں تو اتنا لمبا سفر کر کے گئی تھی، یوں خالی ہاتھ کیسے نامراد لوٹ آتی۔ اس لیے اس معصوم کو سینے سے لگا کر لے آئی۔''

''اتنی لڑکیاں کیا کرو گی آپا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جب اپنی نہیں ہے تو پھر بڑھاپے کا کچھ سامان تو کرنا ہی ہوگا۔''

''اتنی ننھی سی جان کو پالو گی کیسے؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہم کون ہیں پالنے والے... پالنے والی ذات تو اس کی ہے اور پھر ہیں نا اس کی بڑی چھ بہنیں، دیکھنا سب مل کر اس کی کیسی تربیت کریں گی!'' اس نے پڑوسن کے دل پر گزرنے والی محرومی کی کیفیت سے بے خبر رہ کر کہا۔ ''یہ تو میرے پاس سب سے زیادہ اچھا مال ہوگا۔''

''شکل سے ہی پٹھانی لگتی ہے۔'' پڑوسن نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا اب زیادہ رالیں ٹپکانے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی اس بات کا زیادہ تذکرہ کرنے کی!'' اس نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''دیکھ ہمیں ایک دوسرے کے کاروباری رازوں کا خیال تو رکھنا چاہیے نا!''

پڑوسن خاموش ہوگئی، وہ اس کی ممنون احسان تو تھی کہ اسے خود اتنا تجربہ نہ تھا اور وہ اپنے مال کی پہچان اور اپنی بچیوں کی تربیت کے سارے گر اس سے سیکھتی تھی۔

یوں حسن آرا، ستارہ اور نین تارہ فیروزہ بن کر نئی جگہ پر پہنچ چکی تھیں، ان دونوں کی زندگیوں کے نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پولیس، کھوجی اور نمبردار سب اپنی اپنی جگہ سرگرم تھے، جگہ جگہ منادی کرا دی گئی تھی مگر ان دونوں بچیوں کا کوئی سراغ نہیں ملنا تھا نہ ملا۔ انہیں یہی شک تھا کہ وہ بچیاں اردگرد کے دیہات میں ہی کہیں ہوں گی، کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا کہ وہ وہاں سے سیکڑوں میل دور بھی جا سکتی تھیں۔

کوئی سراغ ان شہری بابوؤں کا بھی نہ ملا تھا کہ کون تھے، کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے۔ ان کے کھرے وغیرہ لوگوں کی آمد و رفت کے باعث ضائع ہو گئے تھے۔ ایسا گھناؤنا جرم کر کے جانے وہ زمین میں چلے گئے تھے یا انہیں آسمان نگل گیا تھا۔ قلعۂ روہتاس اس کے بالکل مخالف سمت میں تھا ورنہ پولیس والے یہ شک کرتے کہ اس روز وہاں پکنک پر آنے والے لوگوں میں سے کوئی بھول بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوگا۔

اور وہ جو اپنے جرم پر شرمندہ بھی نہ تھے، واپسی کی راہ پر ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار مار کر ہنس ہنس کر دہرے ہو رہے تھے۔

''بات سن!'' افضال کو بتانے کی ضرورت نہیں۔'' سہیل نے اسے کہا تھا، وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ بات ان دونوں کے درمیان راز ہی رہے ورنہ افضال تو سن کر خوب ہنستا کہ ان دونوں کے قابو صرف وہی آئی تھی۔ سات آٹھ سال کی بچی۔

واپس پہنچ کر انہوں نے گہری نیند میں سے افضال کو جگایا۔ ''کیا ہوا، مل گئیں تم لوگوں کو لڑکیاں؟'' افضال نے جمائی لی۔

''لڑکیاں کب تھیں... ہرنیاں تھیں۔'' سلیم نے کہا، اس نے ان کو تشبیہ تو بڑی ٹھیک دی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ کمزوری کی وجہ سے تم لوگوں کو لڑکیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا!'' اس

نے گھڑی میں وقت دیکھا" اب کیا ارادہ ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ واپس چلتے ہیں!" سہیل جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

"چلو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا، اب کی بار سہیل کی رفتار اتنی تیز تھی کہ افضال کو حیرت ہو رہی تھی، سلیم تو اس کی تیز رفتاری کا سبب جانتا تھا۔

"کیا بات ہے سہیل، تو کیوں اتنا تیز تیز بھاگ رہا ہے؟" افضال ہنسا۔ "کہیں کوئی مستی تو نہیں کر کے آیا کہ بھاگنے کی جلدی ہے۔" سہیل نے اس کے سوال کا جواب دینا تو کجا مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں افضال اس کی چوری اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی وجہ سے نہ پکڑ لے۔

جلد ہی انہیں اپنی بس آتی نظر آئی جو کہ قلعۂ روہتاس کی سمت جا رہی تھی، وہ اس میں سوار ہوئے اور اپنے گروپ کے باقی لوگوں سے جا ملے جو کہ اس وقت واپسی کے لیے تیار تھے اور بس کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انہیں بس میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا، ان کا گروپ کالج میں باقی سب سے الگ تھلگ ہی تھا۔ بس روانہ ہوئی تو سہیل سو گیا۔ سلیم کے اندر بے چینی سی بھری ہوئی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے گھناؤنے کام میں سہیل کے ساتھ شامل ہوا تھا۔

اس کے اپنے گھر میں چھوٹی بہنیں تھیں۔ "کوئی ان کے ساتھ ایسا کرے تو!" اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ "جانے وہ زندہ بھی ہوگی کہ نہیں۔" جو حشر انہوں نے کیا تھا، اس کے بعد... سلیم کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہنے لگے، جنہیں دوسروں کی نظر سے چھپانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ کھڑکی سے ٹکا دیا اور ان آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

بس میں باقی لوگ گانے گا رہے تھے، لطف اندوز ہو رہے تھے، سہ پہر کے بعد شام کا وقت ہونے لگا تھا اور بس تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی جبکہ سلیم کا دل پیچھے ہی پیچھے کی طرف کھنچ رہا تھا۔

☆☆☆

"میرا اس میں کیا قصور ہے اماں؟" اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو اپنی اوڑھنی سے پونچھا۔

"سارا قصور تو میرا ہے میری بیٹی جو میں نے اس کو جنم دیا، اسے پاک باز سمجھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کی عادتیں اچھی نہیں اور میں سمجھتی تھی کہ حافظ کرم اللہ کا اور میرا بیٹا بدکردار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے تو بٹا لگا دیا ہے، اپنے باپ کے نام پر، میرے نام پر۔ میری تربیت پر۔" وہ اسے ساتھ لگا کر سسکیوں سے رونے لگیں، ان کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر گاؤں سے کہیں بھاگ جاتیں۔ پنچایت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں مگر ان کے گھر پر کڑا پہرہ تھا، کوئی راہِ فرار نہ تھی۔

"میں مر جاؤں اماں تو اس سے کہیں بہتر ہے۔" اس نے ان سے لپٹ کر کہا۔

"میں بے بس ہوگئی میری بیٹی مگر تو کبھی معاف نہ کرنا۔ مجھے بھی معاف نہ کرنا اور عباس کو بھی نہیں۔ ہم تمہارے مجرم ہیں۔ اس نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔ دنیا کی کوئی ماں اولاد کے لیے بددعا نہیں کرتی مگر میرے دل سے اب اس کے لیے بددعائیں ہی نکل رہی ہیں۔ اس نے کہیں کا نہیں چھوڑا، نہ تجھے، نہ مجھے۔ اللہ کرے وہ کہیں بھی سکون نہ پائے۔" ایک ماں کے جلتے ہوئے دل سے بددعائیں نکل رہی تھیں۔

اس ماں کی بدنصیبی پر کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کی ایک اولاد کی وجہ سے اس کی دوسری اولاد کے نصیب میں جو تاریکی لکھی گئی تھی اس نے ان کے پتھر جیسے کلیجے کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنا تو وہ بیوہ ہونے پر نہیں روئی تھیں جتنا وہ کلثوم کے لیے اس فیصلے پر روئی تھیں۔ ان کی معصوم اور نازک سی بیٹی کے لیے۔

"جا دیالو، تجھے اللہ کہیں سکون نہ دے، تو نے میری بیٹی پر ظلم کیا۔" اسے بددعا دیتے دیتے وہ خاموش ہو گئیں، یک دم انہیں خیال آیا تھا کہ اگر وہ دیالو کو بددعائیں دے رہی ہیں تو دیالو بھی تو ان کے بیٹے کی وجہ سے انہیں بددعائیں دے رہا ہو گا۔ انہیں چپ لگ گئی تو کلثوم کو تشویش ہوئی، اس نے ماں کو دودھ گرم کر کے پینے کے لیے دیا۔

انہوں نے جانماز بچھائی اور اس پر کھڑی ہو گئیں، دودھ جوں کا توں رکھا تھا۔ کلثوم انہیں دیر تک مصلے پر کھڑا دیکھتی رہی، وہ مسلسل نوافل پڑھ رہی تھیں، انہوں نے خود اس سے کہا تھا کہ وہ انہیں بھی معاف نہ کرے۔ تھی تو وہ کم عمر مگر اسے علم تھا کہ اس کی ماں کس عذاب سے گزر رہی تھی، اس کی نیک نامی کو ان کا اپنا بیٹا دھبا لگا گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو جانتی تھی، انہوں نے کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا، بے شک وہ اس پر سختی کرتی تھیں مگر اسے احساس تھا کہ وہ سختی بے جا نہ تھی۔

اگر وہ اس پر سختی نہ کرتیں تو وہ بھی دیا کی طرح ہو جاتی، دن کو ہی چوری چھپے کاجل آئی تھی اور اس کے گلے لگ کر ڈھیروں ڈھیر آنسو بہا ڈالے تھے۔ اماں اس تمام وقت میں خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ کاجل نے بتایا تھا کہ دیا کی ماں کو بیٹی کے کرتوتوں کا علم تھا اور اس نے اپنی ماں کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے بات اس کے باپ تک پہنچائی تو وہ کنویں میں کود کر خودکشی کر لے گی۔

"کاش وہ کنویں میں کود جاتی!" کلثوم نے کہا تھا۔ "مجھے تو عمر بھر کے لیے یوں کسی اندھے کنویں میں گرنے کی سزا نہ ملتی۔"

"کیا مر جانا زندگی کے تمام مسائل کا حل ہوتا ہے؟" کاجل نے پوچھا تھا۔

"ہمارے مذہب میں حرام نہ ہوتا اور مجھے اماں کا خیال نہ ہوتا تو یقین کرو کہ میں مرنے کو ایسی زندگی پر ترجیح دیتی!" کلثوم نے کہا تو بی بی جی دہل گئیں، کاش وہ اپنی بیٹی کو اس ظالم دنیا سے دور لے جاتیں، وہ تو اسے صبر کی تلقین بھی نہیں کر سکتی تھیں، اس بات پر انہیں ہی صبر نہیں آ رہا تھا۔

"کلثوم تمہیں معلوم ہے کہ شیکھر کیا کہتا ہے؟" کاجل نے کہا تھا۔

"مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کہتا ہے!" اس نے سادگی سے کہا تھا۔

"وہ دیا کا بھائی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرے اور دیا دونوں کے عباس سے ناجائز تعلقات تھے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک کہتا ہو۔" اس نے خلا میں کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تمہیں بھی اس بات پر شک ہے کلثوم؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟" کلثوم کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔

"مجھے تم پر تو یقین تھا کلثوم، تم بھی میرے سارے گھر والوں کی طرح مجھے مجرم سمجھتی ہو۔"

"ہاں! ہو تم مجرم۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں اس روز جس دن میں نے تم سے پہلے دن پوچھا تھا تو میں لا لے کو

روک لیتی، اسے بتاتی کہ ایسا کرنا کتنی زندگیاں برباد کرسکتا ہے!'' کلثوم نے اس کی طرف نفرت بھری نگاہ ڈالی۔''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کاجل، نہ دیا کو...... مر کر بھی نہیں۔ تم دونوں نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے!'' وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''اس میں سب سے زیادہ قصور تمہارے لالے کا ہے۔'' کاجل نے غصے سے کہا تھا۔

''میں لالے کو بھی کبھی معاف نہیں کروں گی!'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا کلثوم، میں ہمیشہ دیا کی وجہ سے مجبور رہی، اس نے مجھے بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نے جو کالک ہمارے خاندان کے منہ پر ملی ہے اس کی وجہ سے ہم اس گاؤں میں رہنے کے قابل بھی نہیں رہے، اسی لیے ہم یہ گاؤں چھوڑ کر ہندوستان جا رہے ہیں۔'' کاجل نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

''جہاں چاہے تم لوگ جاؤ مگر تم ہمیشہ میری بددعاؤں کے حصار میں رہو گے، تمہیں ہندوستان جا کر بھی سکون نہ آئے گا، میرے دل سے تمہارے لیے ہمیشہ بددعا نکلے گی۔'' اس کی آنکھیں رو رو کر لال بوٹی جیسی ہو رہی تھیں۔

''جاتے جاتے ایک بار گلے تو مل لو سکھی!'' اس نے اپنے بازو وا کیے، کلثوم نے بے نیازی سے منہ موڑ لیا۔

''اسے کہیں بی بی جی ایک بار مجھے گلے لگا لے، یقین کریں بی بی جی، میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں دونوں کو سمجھاتی تھی مگر ان دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، اپنے گھر سے بھاگنے کے پروگرام کا اس نے مجھے بالکل نہیں بتایا تھا، ورنہ میں شور مچا دیتی۔''

''اتنا عرصہ تمہارے سامنے وہ عشق محبت کا کھیل کھیلتے رہے، تم سب کچھ جانتی تھیں مگر تم نے کسی کو بتانا گوارا نہیں کیا، اب تم خود کو بے قصور کہہ رہی ہو۔ سارا قصور تمہارا ہے لڑکی، اسی لیے میں تمہیں کبھی اپنے گھر میں نہیں گھسنے دیتی تھی اور وہ جو کتنی معصوم صورت لگتی تھی وہ اندر ہی اندر سے میری جڑیں کاٹ رہی تھی!'' بی بی جی اس وقت سے پہلی بار بولی تھیں۔ ان سے معافی ملنے سے ناامید ہو کر کاجل وہاں سے روتی ہوئی گئی تھی۔

ماں کی طرف دیکھتے دیکھتے جانے کون سے پہر اس کی آنکھ لگ گئی، خواب میں بھی اسے گھوٹو کا بھوت ڈراتا رہا تھا، اس کے ساتھ یہ کیا ہونے جا رہا تھا اسے یاد تھا کہ کبھی دیا کے گھر جانا ہوتا تو اسے دیکھ کر وہ ساری سہیلیاں خوف کھاتی تھیں۔ وہ تھا بھی اتنا ہی خوف ناک، جانے کتنے کتنے دن وہ نہاتا ہی نہیں تھا، اس کے کافی دور سے گزرنے سے بھی ناگواری بُو آتی تھی۔ وہ ایک کم عمر... کچی عمر کی لڑکی تھی، جس کے خوابوں میں ابھی تک لہریے دار دوپٹے آتے تھے، قوسِ قزح کے رنگ، ساون کی بارشیں اور جھولے... اور اس کو کیسی بھیانک حقیقت کا سامنا ہونے والا تھا۔

فجر کی اذان کی آواز کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تو اس کی نظر اماں پر پڑی جو کہ سجدہ کر رہی تھیں، اس کی آنکھیں پھر مند گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ سلام پھیر کر اماں اسے جگا لیں گی، ہر روز کا یہی معمول تھا، وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور پھر گہری نیند میں چلی گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی، اماں وہیں جانماز پر ہی کروٹ کے بل سو رہی تھیں، اس نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا، اسے معلوم تھا کہ وہ رات بھر مصلے پر رہی ہیں۔

وہ کسلمندی سے اٹھی، اپنا بستر تہہ کیا اور چارپائی وہیں رہنے دی تاکہ آواز پیدا نہ ہو اور اماں نہ جاگ جائیں۔ گھڑے سے پانی لے کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور بغیر آواز پیدا کیے لکڑیوں کا چولھا جلا کر اس پر چائے رکھی تاکہ چائے تیار ہو تو وہ اماں کو بھی جگا لے۔ چائے کا پانی جب تک ابلتا، اس نے اندر والے دونوں کمروں میں جھاڑو لگا لی، صحن اور برآمدے میں جھاڑو لگانے کے لیے اسے اماں کا انتظار کرنا تھا۔

دوبارہ ہاتھ دھو کر اس نے چائے دو مگوں میں ڈالی اور اندر کمرے سے پاپے بھی نکال کر لے آئی۔ چائے والے پانی میں ہی اس نے پہلے دو دیسی انڈے بھی ابالے تھے، اسے معلوم تھا کہ اماں کو صبح کی چائے کے ساتھ انڈے بہت پسند تھے لیکن انہوں نے اپنی پسند کو ہمیشہ عباس کی پسند کے سامنے بھلائے رکھا، وہ ہمیشہ انڈے عباس کے ناشتے کے لیے بچا کر رکھتی تھیں۔ عباس کا خیال آتے ہی اس کے حلق میں پھر تلخی سی گھل گئی تھی، اس کا ماں جایا تھا لیکن کتنی بددعائیں اس نے ماں کی بھی لی تھیں، جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا؟

اماں نے اسے رات کو کہا تھا کہ وہ انہیں کبھی معاف نہ کرے نہ ان کو اور نہ عباس کو مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی ماں رات بھر اسی کی خاطر مصلے پر کھڑی رہی تھی، اسی کے لیے حرفِ دعا بنی، اسی کی خوشیوں کی التجائیں اللہ کے حضور کرتے ہوئے۔ وہ انہیں کس جرم کی سزا میں معاف نہ کرتی، اس کا دل تو اتنا بڑا تھا کہ کاجل کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس بات پر روتی رہی تھی کہ کاجل کے معافی مانگنے پر اس نے سنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ واقعی سارا قصور تو لالے اور دیا کا تھا، کاجل کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی سہیلی کے جرم کی رازدار تھی اور اس کی دی ہوئی قسم کی پابند۔

''اماں تو میری جان ہیں، انہیں میں نے پریشان نہیں کرنا، جو بھی میرے ساتھ ہوگا وہ میرا نصیب ہوگا، جب میں نے کچھ غلط نہیں کیا تو میرا اللہ میرے ساتھ کچھ غلط کیوں کرے گا! ہاں میں لالے کو تب تک معاف نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ واپس نہ لوٹ کر آئے اور اماں سے ناک رگڑ کر معافی نہ مانگے گا، اس کا قصور تو ایسا ہے کہ اماں بھی اسے کبھی معاف نہ کریں لیکن اگر اماں نے معاف کر دیا تو میں بھی اسے معاف کر دوں گی۔''

انہی سوچوں میں غلطاں وہ انڈے چھیل کر پلیٹ میں رکھ کر برآمدے کی طرف چلی ہی تھی کہ ان کے گھر کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا، وہ بھاگی تاکہ فوراً دروازہ کھولے، اماں کی نیند خراب نہ ہو، یوں تو وہ انہیں جگانے ہی والی تھی۔

ایسے ہی ان کا دروازہ اس روز دھڑ دھڑایا گیا تھا، جس روز دیا اور عباس۔ اس نے آنکھوں میں اُمڈ کر آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا، دروازہ کھولا۔ عائشہ تھی۔

''کیا بات ہے عائشہ، سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اس کا دل کانپ رہا تھا۔

''نہیں، سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' عائشہ نے اس سے کہا، اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' کلثوم نے پوچھا تھا۔

''کاجل نے۔'' وہ رکی۔

"کیا، کیا کاجل نے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"اس نے رات کو کنویں میں چھلانگ لگا دی!" عائشہ نے جملہ مکمل کیا۔

"کیوں؟" کلثوم کی حیرت بھری آواز آئی۔

"پتا نہیں کلثوم...... سب سہیلیاں وہیں ہیں، اس کی لاش کنویں سے نکالی جا رہی ہے، مجھے سب نے کہا کہ جا کر تمہیں بتا کر بلا لاؤں!"

"لاش؟" کلثوم کی آواز لرزنے لگی۔ "تو کیا مر گئی وہ؟"

"تو اور کیا...... تمہیں بتا رہی ہوں کہ اس نے رات کو کنویں میں کود کر۔" عائشہ نے کہا۔

"اچھا میں اماں سے پوچھ کر آتی ہوں، تم یہیں رکو۔" کلثوم نے اس کی بات کاٹی اور واپس مڑی۔

اسی طرح کروٹ پر پڑی اماں کو ہلایا۔ "اماں!" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس نے پھر انہیں ہلایا۔ "اماں!" مگر کوئی جواب نہ پا کر وہ گھبرا گئی۔ "اماں۔" وہ زور سے چیخی تھی۔ اتنی زور سے کہ باہر سے عائشہ بھی بھاگ کر اندر آ گئی، ان دونوں نے مل کر ان کو ہلایا جلایا، ان کا جسم ٹھنڈا تھا۔

"بی بی جی کا جسم ٹھنڈا ہے کلثوم... مجھے لگتا ہے کہ انہیں کچھ ہو گیا ہے۔" عائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا مطلب، کیا ہو گیا ہے انہیں؟" اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے کہ یہ سانس بھی نہیں لے رہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم عائشہ۔ کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ اماں اب نہیں رہیں۔ وہ چلی گئی ہیں مجھے چھوڑ کر۔ مجھے اس بے رحم دنیا میں کس کے آسرے پر چھوڑ کر چلی گئی ہیں وہ؟" وہ چیخ رہی تھی۔

"تم روؤ نہیں، یہیں رکو، میں بلا کر لاتی ہوں سب کو۔" عائشہ کہہ کر باہر کو بھاگی اور اپنی بے بس اماں کا یخ ہاتھ تھامے، اسے اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس ہاتھ میں اب اس کے لیے شفقت نہیں رہی تھی، زندگی کی حرارت نہیں رہی تھی، وہ ان کے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی جو جانے کب سے ٹھنڈا ہو کر اسی طرح سجدے کی حالت میں ہی اکڑ گیا تھا۔

"اماں! کس کے آسرے پر چھوڑ گئی ہو اپنی بیٹی کو۔ مجھے تو اپنی ساری مشکلات میں آپ کی دعاؤں کا ہی آسرا نظر آتا تھا، اب میں کس سے اپنے دکھ کہوں گی۔ اماں میں لالے کو کہاں سے بلاؤں یہ بتانے کے لیے کہ اب اس کی دعائیں کرنے والی ماں نہیں رہی، میری اماں!" وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور جب تک لوگ پہنچتے وہ صدمے سے نڈھال ہو کر تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی نشستوں پر بھی دیکھا مگر وہ عورت اسے نظر نہ آئی، لاری میں کچھ برقع پوش عورتیں بیٹھی تھیں، ان کو وہ غور سے دیکھ رہا تھا مگر اسے کسی پر بھی شک نہ ہوا کہ یہ وہ ہو سکتی ہے۔ پھر اسے یہ بھی ڈر تھا وہ برقع پوش خواتین اٹھ کر اسے جوتے نہ مارنا شروع کر دیں......اس کا سامان وہیں موجود تھا مگر اس سامان میں ایسا تھا بھی کیا جسے وہ لے کر جاتی......اس کی سب سے قیمتی متاع تو وہ لے گئی تھی، اس نے اپنی کپڑوں کی گٹھری اٹھائی کہ اسے لے کر وہ لاری سے اتر جائے، اگر وہ یہیں اتر کر کسی طرف غائب ہوئی تھی تو اسے ڈھونڈنا اتنا مشکل نہ تھا، ایک تو اس کی حالت ایسی تھی، دوسرے اس نے بچی کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

مڑتے ہی وہ اسے لاری میں داخل ہوتی نظر آئی تو وہ سکون کی سانس لے کر اپنی نشست پر تقریباً گر سا گیا۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں آپ؟" اس نے لہجے میں خفگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں غائب ہوئی تھی یا آپ؟" اس نے بیٹھ کر اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پایا۔ "میں تو پریشان ہو کر اتر گئی کہ کہیں آپ جان بوجھ کر بچی کو میرے پاس چھوڑ کر خود بھاگ نہ گئے ہوں......"

"میں کیوں بھاگوں گا اپنی بچی کو کسی کے پاس چھوڑ کر......" شاکر نے بچی کو اس سے لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس کے دوسرے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی۔ "لائیں، مجھے دے دیں بچی!"

اس نے عجیب سی نظروں سے شاکر کی طرف دیکھا، وہ اس کی نظر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"میں پلا دیتی ہوں!" اس نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی، بچی کو ذرا سا سرا اونچا کر کے گود میں لٹایا اور روئی کی مدد سے دودھ اس کے حلق میں ٹپکانے لگی۔ "آپ نے اس کے لیے دودھ پلانے والی بوتل کیوں نہیں خریدی؟"

"مجھے کیا علم تھا کہ اسے یوں پیدا ہوتے ہی ماں سے محروم ہونا پڑے گا!" شاکر نے اپنے لہجے میں بے چارگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"جب آپ اس کو لے کر روانہ ہوئے تبھی کم از کم بوتل خرید لیتے......" وہ بچی کو دودھ پلاتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ شاکر کو اس کا تجسس اور مسلسل سوالات کوفت میں مبتلا کر رہے تھے۔ اگر وہ اس بچی کی ذمے داری سنبھالے ہوئے نہ ہوتی تو وہ اسے وہاں سے اٹھا دیتا یا خود کہیں اور جا کر بیٹھ جاتا، وہ مجبوری کا نام شکریہ کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

لاری اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رکی تو سبھی مسافر ایک ایک کر کے اترنے لگے، شاکر نے بھی بچی کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سامان کی گٹھری اٹھا کر باہر نکلا تو اسے لگا کہ وہ کسی بیابان میں کھڑا ہے کیونکہ اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس کی منزل کون سی ہے۔ اس سے پہلے بھی شاکر اس شہر میں آتا جاتا تو تھا مگر اس وقت حالات مختلف تھے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ وہ ننھی سی بچی ایک بھاری ذمے داری کا بوجھ محسوس ہو رہی تھی جو اس وقت اس نے اٹھا رکھی تھی۔ سامنے نظر پڑی تو وہ بجلی کے ایک کھمبے کے پاس کھڑی نظر آئی، شاکر بلا ارادہ ہی اس طرف چل پڑا۔

"کوئی لینے آئے گا آپ کو؟" اس نے سوال کیا۔

"اونہوں......" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔ "کسی کو علم ہی نہیں کہ میں آ رہی ہوں......"

"تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"تانگے کے انتظار میں!" اس نے کہا۔ "اور آپ اب کہاں جائیں گے؟"

"مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے......" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ میرے بھائی کے گھر چلیں......" اس نے شاکر کو پیش کش کی۔ شاکر نے اسے شکی نظر سے دیکھا، کہیں کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں......اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کافی چالاک تھی مگر اس کی اس پیش کش کے پس منظر میں کیا چالاکی پوشیدہ ہو سکتی تھی؟

"ممکن ہے کہ میری بھابی آپ کو کوئی ایسی عورت ڈھونڈ کر دے دیں جو کہ اس بچی کا خیال رکھ سکے!" اسے خاموش دیکھ کر اس نے اضافہ کیا تھا۔

"آپ کے گھر والے کیا سوچیں گے؟" شاکر نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"کچھ بھی نہیں سوچیں گے، آپ نے ان کا کیا لینا ہے......ساری پریشانیاں میری ذات سے وابستہ ہیں!" اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

"آپ کے گھر پر کون کون ہے؟" شاکر نے سوال کیا۔

"میرے بھائی کا گھر ہے اور یہاں وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے ایک بیٹے کا چند برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ بھابی اچھی ہیں، جب بھی آتی ہوں ہمیشہ اچھا سلوک ہی کرتی ہیں......" اس نے حسبِ عادت بغیر پوچھے اسے ضرورت سے زیادہ بتا دیا تھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی، شاکر کے پاس اس پیش کش کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ اب شام ہو چلی تھی۔

"آپ کو اپنے ساتھ آنے کی پیش کش کرنا بھی ایک طرح سے میری مجبوری ہی ہے......" راستے میں اس نے کہا۔ "ورنہ میں آپ کو نہ کہتی!"

"کیسی مجبوری؟" شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ میرے پاس تانگے کا کرایہ نہیں تھا......" وہ ہنس دی۔

"تو اپنے بھائی کے گھر پہنچ کر آپ کرایہ دے لیتیں......" شاکر نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"میرے بھائی کا گھر بہت سی گلیوں میں جا کر آتا ہے اور ان گلیوں میں تانگہ نہیں جا سکتا......" اس نے وضاحت کی، شاکر اسے بھی اپنے لیے غیبی مدد ہی سمجھا تھا، ورنہ وہ اس وقت کہاں جاتا۔ "ہر انسان دوسرے انسان سے غرض کے رشتے میں بندھا ہے۔" شاکر نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چھوٹے چوہدری صاحب اب بالکل ٹھیک ہیں......" رانی نے نگی کی اطلاع پر دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" رانی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ابے نے..... وہ گیا تھا کام پر تو وہاں مٹھائی بٹ رہی تھی اُن کی صحت یابی کی خوشی میں!''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے.....'' اس نے دل سے شکر ادا کیا۔

''چلیں گے کسی وقت، اس دن کے پیسے بھی نہیں لے کر آئے تھے ہم لوگ!'' نگی نے کہا۔

''اماں نے تو اس بات کو لے کر میری بہت بے عزتی کی تھی لیکن پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں خاص طور پر رقم مانگنے کے لیے وہاں جاؤں!'' رانی نے کہا۔

''تو ہم وہاں اسی لیے تو کام کرنے کے لیے گئے تھے کہ اس کے بدلے ہمیں رقم ملے گی.....'' نگی نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں علم ہے رانی کہ ہماری ماؤں کے لیے یہ رقم کتنی اہم ہوتی ہے، یہ رقم وہ بڑی مشکل سے بچا بچا کر، چوری چوری ہمارے جہیز کے لیے جوڑتی ہیں!''

''لیکن مجھے بڑی شرم آئے گی کہ میں وہاں جا کر چوہدری اکبر علی سے کہوں کہ ہم رقم لینے آئے ہیں!''

''ہمیں اپنی رقم لینے کے لیے چوہدری صاحب سے ملنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ہم ان کے منشی سے جا کر لے آئیں گے جو کہ سارا حساب کتاب رکھتا ہے!'' نگی نے کہا۔

''اس طرح تو ہم چوہدری صاحب سے نہیں مل سکیں گے.....'' رانی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''تو چوہدری صاحب سے ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہمیں؟'' نگی حیران ہوئی۔

''مجبوری ہے.....'' رانی کے منہ سے بے اختیاری میں نکلا۔

''مجبوری کیسی؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''دل کی مجبوری.....'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا رانی؟'' اس نے اسے گھورا۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا نگی، میں اپنے آپ میں نہیں رہی، میرا دل میرے بس میں رہا ہے نہ دماغ، بس یہی دل چاہتا ہے کہ وہ میرے سامنے ہوں اور میں انہیں دیکھتی رہوں..... کیا کسی کو دیکھنے کی خواہش کرنا بھی جرم ہے؟'' رانی کا لہجہ بے اختیاری لیے ہوئے تھا۔

''خالہ کو پتا چل نا تیرے دل کی مجبوری کا تو سو لتر مارے گی تجھے یا وہ تیرے ٹوٹے کر دے گی!'' نگی نے اسے ڈرایا۔

''اماں میرے ٹوٹے ٹوٹے کر دے گی نا نگی..... تو بھی میرے جسم کے ہر ٹوٹے کی یہی خواہش ہو گی کہ اسے چوہدری اکبر علی کی دید ملے.....''

''پاگل ہو گئی ہے تو رانی؟'' نگی نے اسے جھنجوڑا۔ ''ہوش کر، کیا بک بک کر رہی ہے!''

''نگی! اگر اللہ ہمیں غریب بناتا ہے تو ہمارے دلوں میں خواہشیں کیوں بڑی بڑی پیدا کر دیتا ہے؟'' یاس بھرا لہجہ، نگی کا دل کٹنے لگا، اسے علم تھا کہ ان جیسی لڑکیوں کے نصیب میں رشتے بھی ڈھنگ کے نہیں ہوتے۔ شادی کے نام پر بھی ان کا سودا ہی کیا جاتا ہے اور ان کو وہی بیاہ کر لے جا سکتا ہے جو اُن کے والدین پر نسل در نسل چلتے قرض کو کسی حد تک اتارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو انہیں بیاہ کر لے جائے گا، وہ اپنے ذمے چڑھنے والے قرض کے بدلے عمر بھر ان سے خراج وصول کرتا رہے گا، پہلے ماں باپ کے لیے کام کرتی ہیں تو

بیاہ کر شوہر کے ساتھ بھی انہیں عمر بھر کے لیے محنت مزدوری ہی کرنا ہوتی ہے۔

''چلے گی نا میرے ساتھ، صرف ایک بار نگی...... صرف ایک بار ان کو دیکھ لوں تو شاید......'' نگی نے ناخواستہ اقرار میں سر ہلایا۔

☆☆☆

''یہ کہاں سے اٹھا لائیں آپ باجی جی؟'' جینا نے اس ننھی سی جان کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ اسے اس بچی کو اسپتال میں رکھنا پڑا تھا، جب تک کہ وہ بالکل ٹھیک نہ ہو گئی۔ اس دوران وہ گھر پر چکر لگاتی رہی تھی مگر اس کا اور جینا کا آمنا سامنا نہیں ہو پایا تھا۔ کچھ مریم کی دانستہ کوشش اور کچھ وہ اپنے ذہن میں وہ کہانی مرتب کر رہی تھی، جو اسے سب کے سامنے پیش کرنا تھی۔

''اٹھا لائیں کا کیا مطلب؟'' مریم نے ابرو اچکا کر اس سے پوچھا۔

''وہ جی......'' جینا سٹپٹائی۔ ''میرا مطلب ہے جی کہ کس کی ہے؟''

''میری ہی سمجھو......'' مریم نے مختصراً کہا مگر جینا کے چہرے کے تاثرات تا حال سوالیہ تھے۔

''سائرہ آپی نے بلوایا تھا مجھے...... اور یہ امانت انہوں نے میرے سپرد کر دی ہے، کہتی ہیں کہ یہ تھی تمہارے لیے!'' اس نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی پیش کی۔

''اچھا باجی جی! کتنی اچھی، کتنی پیاری ہیں سائرہ باجی......'' جینا نے لہجے میں رشک کا تاثر پیدا کیا۔

''ہیں تم نے کہاں دیکھا انہیں؟'' مریم نے حیرت سے پوچھا۔

''بچی کو دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے باجی کہ وہ کتنی پیاری ہیں اور اس سے بڑھ کر کیا اچھائی ہو سکتی ہے کہ اپنی اولاد نشانی کے طور پر آپ کو دے دی، کون دیتا ہے کسی کو اپنا بچہ......'' جینا جذباتی ہو رہی تھی۔ ''پر باجی آپ نے تو مجھے جاتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کے بچے جوان ہیں......؟''

''ہاں باقی سب بڑے ہیں، یہ چند ماہ قبل پیدا ہوئی تھی، اس کے بعد سے وہ بیمار تھیں، میں گئی تو......'' کم بخت کا حافظہ کتنا تیز ہے، مریم نے دل میں سوچا۔

''اس کا نام کیا ہے باجی؟''

''ستارہ......'' مریم نے مختصراً کہا تھا۔

''ستارہ...... ستارہ اور سائرہ، ملتے نام ہیں باجی، ستارہ جاوید جی؟''

''نہیں، سائرہ باجی نے کہا تھا کہ اس کا انہوں نے اتنا ہی نام رکھا ہے، اس کے آگے جو میں لگانا چاہوں......'' مریم کو اس کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے الجھن ہونے لگی تھی۔

''تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''کوئی جلدی نہیں مجھے سوچنے کی، جب اسے سکول جانا ہوگا تب اس کی ضرورت پڑے گی۔ تم اٹھ کر کام کرو جو کہ ابھی ضروری ہے پھر میرے ساتھ مل کر اس کو نہلانا ہوگا، مجھے تو بچوں کو نہلانا بھی نہیں آتا......''

''اور میں تو جی جیسے ساری عمر بچے ہی نہلاتی رہی ہوں!'' وہ ہنسی۔ ''چلیں مل کر کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے!'' وہ صفائی کرنے میں جت گئی۔ دل میں وہ مریم کی قسمت پر ناز کر رہی تھی جسے سائرہ جیسی بہن ملی اور اس نے مریم کی خالی گود اپنی اولاد دے کر بھر دی۔

''کاش میری بھی کوئی ایسی بہن ہوتی!'' اس نے دل ہی دل میں رشک کیا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی، ابھی اسے مریم کے ساتھ مل کر اس ننھی سی بچی کو نہلانا بھی تھا اور پھر باہر جا کر کتنے ہی گھروں میں یہ خوش خبری لوگوں کو سنانا تھی...... اسے محلے کے ہر گھر میں جا کر لوگوں کو اطلاع کرنا تھی کہ مریم کی خالی گود کو اس کی بہن نے بھر دیا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو تم جینا...... اتنی دیر سے ایک ہی جگہ جھاڑو کیوں پھیرے جا رہی ہو؟'' مریم کے کہنے پر وہ چونکی تھی۔

''ہوں...... میں، وہ میں سوچ رہی تھی کہ آپ کتنی خوش قسمت ہیں...... میرے پاس تو کوئی ایسا نہیں جس سے مجھے یہ امید ہو کہ مجھے اپنے جگر کا ٹکڑا دے دے......''

''اسے بھی تم اپنا سمجھو، میں تو ملازمت کرتی ہوں، میری عدم موجودگی میں تم نے ہی اسے سنبھالنا ہے......'' مریم نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے چہرے سے خوشی کے جذبات چھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اسے اپنی گود میں اٹھا لے، سینے سے بھینچ لے۔

''جب باجی گھر پر نہیں ہوا کریں گی تو میں اسے خوب پیار کیا کروں گی!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر اچانک جانے کیا خیال آیا کہ وہ چونکی۔

''اسے سنبھالوں گی تو باقی گھروں میں کام کیسے کروں گی؟'' اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

''جب تک کوئی اور بندوبست نہیں ہو جاتا، میں تمہیں اضافی رقم دوں گی تا کہ باقی گھروں کا کام چھوڑنے کا تمہیں کوئی نقصان نہ ہو......'' مریم نے اسے تسلی دی تھی۔

☆☆☆

ایک بچی کی ہلاکت...... وہ بھی اتنے ظالمانہ طریقے سے اور دو کی گمشدگی نے معراج کو پاگل کر دیا تھا۔ جو منظر زرتاج نے ماہ تاج کی لاش کا دیکھا تھا، اسے وہ بھولتا ہی نہ تھا، راتوں کو خواب میں ان شہری جوانوں کے بھوت اسے ڈراتے اور وہ چیخ مار کر جاگ جاتی اور باقی رات باپ سے لپٹ کر جاگتے ہوئے گزرتی۔ قائم علی کے لیے زندگی کا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا تھا، اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیوی کو سنبھالے یا بیٹی کو۔

معراج اپنی دیوانگی میں بھی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی کہ اس کی بیٹیوں کے ساتھ اتنی قیامت بیت گئی اور اس کے دل کو خبر بھی نہ ہوئی، اسے بے چینی تک لاحق نہ ہوئی۔ وہ شاید اسی خوشی میں مگن تھی کہ پیر بابا نے اسے جلد بیٹے کی ولادت کی نوید سنائی تھی۔ اسے وہم بھی نہیں ہوا کہ بیٹے کے حصول کی خواہش میں اس سے اتنی بڑی غلطی ہو گئی کہ وہ اپنی تین بیٹیاں کھو بیٹھی، جو اس کے شوہر کی آنکھ کا تارہ تھیں۔

زرتاج نے باپ کو بتایا تھا کہ اماں کسی کی فوتگی پر گئی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں وہ سب سکھیاں کسی کو بتائے بغیر نکل گئیں۔ اسے بھی علم تھا کہ اگر معراج گھر پر ہوتی تو کبھی بھی یوں بچیوں کو باہر نہ جانے دیتی، کم از کم چھوٹی دونوں تو گھر پر ہوتیں...... انہیں تو معراج باہر نہیں بھیجتی تھی، اسے علم تھا کہ قائم علی کو بچیوں سے بہت پیار تھا۔ حیرت تو اس بات پر تھی کہ کتنے دن گزر گئے تھے مگر کسی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا، جانے ان بچیوں کو اور اس

کی ماہ تاج کے مجرموں کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے نگل لیا تھا۔

''اللہ کرے بے غیرتو! تمہیں زمین پناہ دے نہ آسمان!'' اس نے سر جھکا کر اپنی ٹھوڑی سے آنسو پونچھے، زرتاج اس کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی اور معراج دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی۔

''ابا......'' زرتاج کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

''ابا کی جان؟'' اس نے اس کے سر کو بوسہ دیا۔

''ابا، اماں کب ٹھیک ہوں گی؟'' اس نے سوال کیا جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

''ٹھیک ہو جائیں گی...... جلد، انشاءاللہ!'' اس نے بیٹی کو تسلی دی۔ ''میں جلد ہی اس کو لے کر شہر جاؤں گا۔''

معراج تو شہر گئی مگر قائم علی نہیں گیا...... جب اسے علم ہوا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس نے اتنی غفلت کا مظاہرہ کیا اور اس کے نتیجے میں اس کی اولاد پتی پتی بکھر گئی۔ معراج تو سمجھی بیٹھی تھی کہ وہ پیر بابا کے ہاں جا کر ہو بھی آئے گی اور اس کے شوہر کو علم نہ ہوگا۔ اگر حالات ایسے گمبھیر صورت اختیار نہ کرتے تو شاید ایسا ہی ہوتا مگر اس حادثے نے تو سارا منظر ہی بدل دیا تھا۔ یہ بات بھی چھپی نہ رہ سکی کہ اس نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''آپ اسے میری نظروں سے دور لے جائیں امی، یہ عورت نہیں ڈائن ہے جو اپنے بچوں کو خود ہی کھا گئی ہے!'' اس نے ساس کی منت کی تھی۔

''بیٹا اسے بھی سہارے اور دل جوئی کی ضرورت ہے اور تمہیں بھی......'' انہوں نے کہا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیسی ماں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آزمائش لکھی ہے اسے مل کر کاٹو، وہ اور زرتاج میرے ساتھ چلی جائیں گی تو یہاں تمہارا خیال کون کرے گا؟''

''زرتاج کو تو میں ہرگز نہیں بھیجنے والا......'' اس نے غصے سے کہا۔ ''آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے بھی اس کے حوالے کر دوں تاکہ اس کو بھی......'' وہ پھپک پھپک کر رونے لگا تھا۔

''میں تمہاری تکلیف کو سمجھتی ہوں بیٹا مگر کیوں اب اپنے گھر کا شیرازہ بکھیرتے ہو، ہمت کرو، خود کو بھی سنبھالو اور اپنے بال بچے کو بھی!'' انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

''بال بچہ میرا کون سا رہ گیا ہے امی جان...... اس نے سب کچھ برباد کر دیا ہے!''

''اللہ کرے گا تو بچیاں ضرور مل جائیں گی، تم اللہ پر بھروسا رکھو!'' انہیں معلوم تھا کہ ان کے الفاظ کتنے بودے تھے، ان کے اپنے دل کو بھی اپنے الفاظ کے سچ ہونے پر شک تھا۔

''میں خود پر بہت مشکل سے قابو پائے ہوئے ہوں، اسے دیکھتا ہوں تو وجود میں غصے سے ابال اٹھنے لگتے ہیں، آپ اسے لے جائیں ورنہ کچھ غلط ملط کہہ دوں گا میں اس کو......'' وہ درخواست کر رہا تھا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ زرتاج اس داغ کے ساتھ زندگی گزارے کہ اس کی ماں کو اس کے باپ نے طلاق دے دی تھی، اس لیے کہ وہ ماں کہلانے کے قابل ہی نہ تھی......''

''قائم علی......'' انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ''خاموش رہو خدا کے لیے، اس سے آگے کچھ مت کہنا!''

یوں معراج کو اس کی ماں اپنے ساتھ شہر لے گئیں اور زرتاج ماں کے ہوتے بھی سہمی سہمی رہنے لگی۔

☆☆☆

''کلثوم سوچ رہی تھی کہ اب شاید کسی کو اس پر ترس آ جائے گا اور اس کا گھوٹو کے ساتھ شادی کا فیصلہ تبدیل کر دیا جائے گا مگر کاجل کی خودکشی نے اس کے باپ اور چچا کے جذبات کو اور بھی اشتعال دلا دیا تھا اور تو اور دیالو کا بھائی شنکر، کاجل کا منگیتر...... اپنے گھر والوں کے سنبھالے سے بھی نہیں سنبھل رہا تھا۔

''دیاہ کرنے کی کیا ضرورت ہے اس کا کسی سے، میں ویسے ہی اسے اٹھا لاتا ہوں، دیکھتا ہوں کس مائی کے لال میں جرأت ہے مجھے روکنے کی!''

''کوئی نہیں تمہیں روکنے والا مگر تو کیوں اس کے ساتھ اپنا آپ بھی ناپاک کرے گا، وہ مسلی ہے اور تو......'' دیالو نے اسے سنبھالا۔ ''تو اس کے ساتھ کیا کر لے گا، کیا اس سے ہمارا بدلہ پورا ہو جائے گا، ارے پگلے ہم نے تو اسے ہر روز کی موت کی سزا دی ہے...... ہماری ایک ہی بار مر گئی ہے کنویں میں کود کر اور دوسری بھی ہمارے لیے مر گئی.. مگر وہ ہر روز مرے گی تو ذرا سوچ کہ گھوٹو کس طرح اسے گھوٹے گا...... اسے نشے کی بند بوتل ملے گی تو!'' دیالو نے مکاری سے آنکھ مار کر کہا۔

''چاچا...... میں اپنے خون کے ابال کو کس طرح ٹھنڈا کروں، مجھے قرار نہیں آئے گا اس طرح!'' اس کا لہجہ بپھرا ہوا تھا۔

''خود پر قابو رکھ پتر...... ہوش مندی ضروری ہے، ہم یہاں ایسا کچھ کریں گے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس سنیو لیے اور اس کی بہن کے ساتھ ہو جائیں گی......'' رام لال نے اسے کہا۔ ''ہم کسی کو کیا دوش دیں، ہماری تو اپنی بیٹی ہی ہماری پگڑیاں پیروں تلے رول کر چلی گئی، وہ کون سا بڑا سورما تھا، جو اسے اٹھا کر لے جاتا......''

دیالو کا سر بھی جھک گیا تھا، انہیں علم تھا کہ ان کی اپنی بیٹی کا بھی قصور تھا، لوگ چاہے ان کے منہ پر عباس کو برا کہیں پر پیٹھ پیچھے تو کہتے ہوں گے کہ اپنی بیٹی کو نہ سنبھال سکے، اس پر نظر نہ رکھی۔ اسی لیے تو وہ اب اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتے تھے اور اپنا سارا قیمتی مال و اسباب سمیٹ کر جانے کی تیاری کیے بیٹھے تھے کہ کاجل کے واقعے نے ان کی روانگی میں مزید تاخیر کر دی۔

مال مویشی اور گھر بار وہ چوہدری نور علی کے حوالے، امانتاً کر کے جا رہے تھے کہ وہ ان کو بیچ باچ کر ان کی رقم انہیں ہندوستان بھجوا دے۔ جانے سے پہلے سب سے اہم کام جو انہیں کر کے جانا تھا، وہ پنچایت کے فیصلے پر عمل درآمد تھا، جس کے لیے اگلے جمعے کی تاریخ قرار پائی تھی۔ کلثوم کی تنہائی کے خیال سے اپنے گھر کی خاص ملازمہ کو چوہدری نور علی نے اس کے گھر پر بھجوا رکھا تھا، اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ کہیں وہ غائب نہ ہو جائے یا کاجل کی طرح کنویں میں نہ کود جائے۔

اور کلثوم فقط اپنے اللہ سے امید لگائے بیٹھی تھی کہ شاید جمعے کا دن ہی طلوع نہ ہو۔

☆☆☆

''اماں یہ لڑکی کون ہے پیاری سی؟'' اکبر علی نے ماں کے پاس بیٹھے بیٹھے اچانک سوال کیا۔

''کون سی......'' انہوں نے جان بوجھ کر انجانے پن کی اداکاری کی۔

''وہ کالی چادر والی اماں؟'' اکبر علی نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''حیا کر......'' انہوں نے ڈپٹا۔ ''ابھی اگلے دن تمہاری ایک بیٹی مری ہے اور دوسری ابھی تک گم شدہ ہے اور تو دوسروں کی بیٹیوں کو تاڑتا رہتا ہے......''

''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے اماں، یونہی پوچھ لیا تھا، اپنے گاؤں کی جو نہیں لگ رہی!'' اس نے لاڈ سے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تیری صحت کیسی ہے، تو سنا!'' انہوں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا اور موضوع تبدیل کر دیا۔

''بس ذرا ناطاقتی سی رہتی ہے اماں، باقی سب ٹھیک ہے!''

''اللہ تجھے سلامت رکھے بیٹا، میں تو مر ہی جاتی جو تجھے کچھ ہو جاتا تو......'' ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، جس بیٹے کی محبت میں ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، اس کی اولاد کے پیدا ہونے یا مرنے کی انہیں خوشی تھی نہ کوئی غم......صرف اس لیے کہ وہ بدقسمت سب کی سب لڑکیاں تھیں۔ بیٹے کی اہمیت ان کی نظروں میں اس قدر زیادہ تھی کہ اپنی بیٹیوں میں سے بھی کوئی بچے کی پیدائش کے لیے آتی اور اس کے ہاں لڑکا ہوتا تو اسے چھلے تک رکھتیں اور سنبھالتیں اور جو کوئی بیٹی کو جنم دیتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے واپس سسرال ٹہلا دیتیں، یہ کہہ کر کہ جن کی پوتی ہے وہیں سنبھالیں، مجھے کیا پڑی ہے پرائی بیٹیاں سنبھالنے کی۔

''اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو کیا ہو جاتا اماں......تو کیوں مرتی، تیرا ہے نا اور شیر جوان......بابر!''

''تو تو ہے میرے لال، تیرے جیسا ہمارے خاندان تو کیا اس پورے علاقے میں کوئی نہیں ہے!'' بلاشبہ وہ ایسا ہی تھا، ایسا کڑیل اور گبرو جوان اور کون تھا اور پھر ماں کی نظر تو بدشکل اولاد کو بھی خوب صورت دیکھتی ہے۔

''اماں ایک کام کہا تھا آپ سے......'' اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہاں کیا کام تھا؟'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''مجھے تو کچھ یاد نہیں، پریشانی کم دیکھی ہے بیٹا جو کچھ یاد رہتا!''

''اماں وہ جس لڑکی نے میری جان بچائی تھی، کہا تھا کہ اسے کوئی اچھا سا جوڑا کپڑوں کا بھجوا دیں!'' اس نے انہیں یاد دلایا۔

''اے لو......'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''کیسی بھلکو ہوں میں، اچھا بھجوا دوں گی کسی وقت میں!''

''اماں اس نے میری جان بچائی ہے اور آپ بھول گئیں اسے ایک جوڑا بھجوانا......آپ کو تو چاہیے تھا کہ اس کے گھر خود جاتیں آپ شکریہ ادا کرتے......'' وہ ناراض ہوا۔

''ایسی کون سی بڑی بات ہے کہ تم روٹھ گئے ہو، بھجوا دوں گی جوڑا بھی اور کچھ اناج بھی......تم اس کی فکر نہ کرو۔ البتہ میرے جانے کی کیا ضرورت ہے، میں ان کمی کمینوں کو زیادہ منہ لگانے اور سر چڑھانے کے لائق نہیں سمجھتی......اب اسی کو دیکھ لو، بڑی اکڑ ہے اس میں لیکن میں بھی اس کی اکڑ توڑنے کا عہد کیے ہوئے ہوں!''

''کس کی بات کر رہی ہیں؟'' وہ کچھ نہ سمجھا تھا۔

''وہی جس کا تو پوچھ رہا تھا، یہ بڑے لالہ جی کے منشی قائم علی اور معراج دائی کی بیٹی......ذات کی دائی ہے اور اکڑ ہے اس کی چوہدرانیوں والی......'' انجانے میں یا دانستہ وہ ذکر چھیڑ کر اکبر علی سے اس کا تعارف کروا دیا تھا انہوں نے۔ اکبر علی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

اسے زیب تو دیتی ہے چوہدرانیوں جیسی اکڑ، ذات کی چاہے وہ دائی ہی کیوں نہ ہو!'' اکبر علی نے سوچا تھا۔

''اماں......'' وہ لاڈ سے ان کے نزدیک ہو کر بیٹھ گیا۔ ''آپ نے تو کہا تھا کہ اگر اب کے بار فاخرہ نے بیٹی پیدا کی تو آپ میرا دوسرا بیاہ......''

''ذرا چند دن صبر تو کر لے، دوسرا بیاہ بھی ہو جائے گا تیرا، لوگ کہیں گے کہ اس کے بیاہ کی پڑی ہے بیٹی کی فکر نہیں...... اور تیرے باوا کہاں ماننے والے ہیں، اپنے خاندان کی لڑکی پر یوں سوتن لانا کون سا آسان کام ہے۔ پھر تیری بہن کا رشتہ اس کے وٹے میں ہے، سب سے پہلے تو وہی واپس آئے گی چار بچے لے کر۔ پہلے ان سب باتوں کا خیال کرنا ہوگا پھر تجھے اس سے اجازت لینی پڑے گی، تب ہوگا تمہارا دوسرا بیاہ......'' انہوں نے اتنی آہستہ آواز میں کہا تھا کہ اردگرد کام کرنے والیوں میں سے کوئی سن نہ لے۔

''میری بہن نے دو لڑکے جنے ہیں، اس کو گھر بھجوانے کا اُن کے پاس کیا جواز ہے......'' اکبر نے غصے سے کہا۔ ''اور اگر بھجوا دیں گے تو بہن کی روٹیاں کیا بھاری ہیں ہم پر!''

''اچھا زیادہ اتاوَلا نہ ہو، پہلے چند دن گزر جانے دے، پھر ہم لڑکی ڈھونڈ کر ہی دھواں نکالیں گے، تب تک تو صبر کر......'' انہوں نے اسے لاڈ سے گھر کا۔

''لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے اماں؟'' اس نے زرتاج کو اپنی نظروں کے حصار میں لے کر کہا تھا۔

''تو اور تیرا بیاہ کیا کسی لڑکے سے ہوگا؟'' بے معنی اور فضول بات کرنا ہمیشہ سے ان کی عادت رہی تھی مگر جب ان کی نظر نے اکبر کی نظر کا تعاقب کیا تو ان کی آنکھوں میں مکاری سے چمک آ گئی۔

''دیکھتی ہوں کہ اب کس طرح نہیں میرے پاؤں دبائے گی!'' انہوں نے زیر لب کہا۔

☆☆☆

کالج کی اسمبلی کا وقت تھا، تلاوت اور دعا کے بعد پرنسپل صاحب نے اپنے معمول کے خطبے کا آغاز کیا۔

''آج میں ایک انتہائی افسوس ناک خبر سے ... آپ سب کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ......'' وہ رکے۔

''ہمارے کالج کے تیسرے سال کے طالب علم سلیم بھٹی نے جو کہ کالج سے منسلک ہاسٹل میں ہی رہتا تھا، کل رات خود کو پنکھے سے لٹکا کر خودکشی کر لی......'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ اسمبلی میں کھڑے لڑکوں کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''اس کی خودکشی کے اسباب کا کچھ علم نہیں ہو سکا، اس کے والدین کو اطلاع کر دی گئی ہے اور اس کی لاش جو کہ صبح دریافت ہوئی تھی، اسے اسپتال بھجوا دیا گیا ہے۔ سلیم ایک اچھا طالب علم تھا اور تعلیمی میدان میں اس نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے ہیں، اس کی خودکشی کی وجہ اس کی ذاتی زندگی یا اس کے گھریلو حالات بھی ہو سکتے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ اس کے والدین اس کی لاش لینے کے لیے آ رہے ہیں۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ پُرسکون رہیں، اس حادثے کی وجہ سے پولیس کی کارروائی بھی ہوگی، آپ سب سے تعاون کی درخواست ہے۔ اگر کسی کو اس حوالے سے کسی قسم کی معلومات ہوں، کسی سے اس نے کوئی بات کی ہو اس حوالے سے یا کسی کو یہ علم ہو کہ وہ کیوں پریشان تھا تو آپ مجھے بتائیں۔ کسی قسم کا اندازہ یا نامکمل معلومات کسی کو مت بتائیں اور نہ ہی کوئی غلط خبر پھیلائیں۔ پہلے تین پریڈ تک کوئی پڑھائی نہیں ہوگی، لیکن کوئی بھی گھر نہیں جا سکتا، چوتھے پریڈ سے معمول کی کلاسیں ہوں گی۔ جب سلیم کے والدین پہنچیں گے تو اس کی میت کالج لائی جائے گی تاکہ آپ سب بھی آخری دیدار کر لیں!''

قطاریں بنائے ہوئے سارے طالب علم ہر روز کی طرح قطاریں بنا کر ہی وہاں سے منتشر ہوئے، ان میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے قدم ہی نہیں اٹھ رہے تھے، وہ قطار سے نکل کر ایک طرف رکھی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے سہیل، تم کیوں وہاں بیٹھ گئے ہو؟'' ایک استاد نے پوچھا تھا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''سر! سلیم اس کا بہت قریبی دوست تھا، اس کا جگری......'' کسی نے کہا تھا۔

''اوہو...... میں تمہارا غم سمجھ سکتا ہوں!'' انہوں نے پاس آ کر اس کا کندھا تھپکا، وہ ان کا منہ دیکھ رہا تھا، اس کا غم کون سمجھ سکتا تھا...... کل ہی تو جب وہ گھر پہنچا تھا تو اس کی کتاب میں سے ایک نوٹ نکل کر اس وقت اس کے بستر پر گرا تھا جب وہ سونے کے لیے اپنی پڑھائی ختم کر کے کتابیں سمیٹ رہا تھا۔

''سہیل! مجھ سے اب اس سے زیادہ اپنے ضمیر کا بوجھ برداشت نہیں ہو رہا، چلو ہم کہیں چل کر اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں، شاید اس سے کچھ بوجھ ہلکا ہو، ورنہ میں کچھ کر لوں گا۔ اگر تم تیار ہو تو میں رات کو ہاسٹل میں تمہارا انتظار کروں گا، ورنہ......''

اور وہ گھر پہنچا تو اس کے گھر والے تیار تھے، انہیں اس کے ایک خالہ زاد کی منگنی کی تقریب میں جانا تھا، وہ لاکھ بہانے کرتا رہا کہ اسے پڑھنا ہے مگر اس کی شنوائی نہ ہوئی اور مجبوراً اسے ان کا ساتھ دینا پڑا تھا، ورنہ وہ وقت پر وہ رقعہ دیکھ لیتا تو رات کو ہاسٹل جا کر اسے سمجھاتا کہ اعتراف کی صورت میں انہیں اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا پڑ جاتا مگر اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے ضمیر کا بوجھ کتنا بڑھ گیا تھا اور وہ خوف کے اس درجے پر تھا جہاں زندگی ختم ہونے کا خوف بھی ختم ہو گیا تھا...... وہ اسے کس پھندے سے ڈرانے کی کوشش کرتا، جو اس نے خود اپنے گلے میں ڈال لیا تھا؟

اس وقت وہ بیٹھا لرز رہا تھا اور اس بات کا بوجھ اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا...... سلیم تو اس گھٹیا کام پر تیار نہ تھا، وہ تو اسے وہاں سے بھاگ چلنے کا کہہ رہا تھا، اسی نے اس کو مجبور کیا تھا تاکہ وہ بھی شریکِ جرم ہو تو اس کے خلاف کہیں منہ نہ کھولے۔ مگر وہ منہ کیا کھولتا، اس نے تو اپنے کیے کی سزا خود کو ہی دے دی تھی۔ سہیل کی آنکھوں سے آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے، اسے کیا معلوم تھا کہ سلیم اتنا باضمیر تھا...... وہ تو سمجھتا تھا کہ دوستی ہمیشہ ایک جیسے کردار کے لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔

☆☆☆

''میں نے اپنا گھر خود اجاڑا ہے...... مجھے اس کی جتنی بھی سزا ملے کم ہے!'' دھاڑیں مار مار کر روتی معراج ماں کے قابو میں ہی نہ آ تی تھی۔ باپ کے مرنے پر بھی وہ اتنا نہیں روئی تھی جتنا وہ چند دنوں میں رو چکی تھی، انہیں اندازہ تھا کہ معراج کو زرتاج اور قائم علی کی جدائی گوارا نہ تھی۔ وہ غم میں گھل گھل کر سوکھتی جا رہی تھی، ایک بار...... صرف ایک بار اسے معافی مل جائے، وہ ماں کے آگے ہاتھ باندھ باندھ کر روتی تو ان کا کلیجا کٹتا۔ مجبور کر کے انہوں نے نعیم کو بھیجا بھی تھا کہ قائم علی سے بات کرے مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ نعیم اس کا دوست تھا اور جانتا تھا کہ اس کا غصہ بجا تھا، اس لیے وہ لوٹ آیا تھا مگر اس سے ایک بات منوا آیا تھا کہ جب بھی

وہ کاروباری سلسلے میں شہر آیا کرے گا، خود بھلے وہاں نہ رہے مگر زرتاج کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ دیا کرے۔ انہیں اس وقت یہ بھی غنیمت لگا تھا۔

''تم نے یہ ہاتھ زرتاج کے سر پر رکھا ہوگا، اس میں مجھے زرتاج کی خوشبو آ رہی ہے!'' معراج بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آنکھوں سے لگا کر بلک بلک کر رو پڑی۔

''حوصلہ کرو موجی! تاجی آئے گی جلد ہی تم سے ملنے، میں وعدہ لے کر آیا ہوں قائم علی سے......''

''وہ ٹھیک تھے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ٹھیک تو وہ بھی نہیں ہے موجی مگر ہمیں اس کے دل کی کیفیت کو سمجھنا چاہیے!'' نعیم نے کہا۔ ''میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو شاید اسی طرح کے ردِعمل کا اظہار کرتا۔ ابھی تو اس نے حامی بھری ہے کہ زرتاج کو شہر لے آیا کرے گا اور جتنے دن وہ شہر ٹھہرے گا، زرتاج ہمارے گھر پر ہی رہے گی!''

''تو کیا وہ......'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''نہیں...... وہ مشکل سے زرتاج کے لیے مانا ہے۔ دعا کرو کہ باقی سب بھی ٹھیک ہو جائے، وقت خود بخود زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے، کچھ وقت گزرے گا تو ہو سکتا ہے......'' نعیم نے اسے ایک نئی آس کا سرا پکڑا دیا تھا۔ ''اللہ کو تو پوری قدرت ہے نا کہ وہ حالات کو کب تم لوگوں کے حق میں موڑ دے......''

''تم نے صحیح طرح کوشش ہی نہیں کی ہوگی!'' اس نے شکوہ کیا۔

''موجی تم جانتی ہو کہ وہ کتنا نرم دل انسان ہے اور کتنا پیارا...... کیا میں ایک ہی بات پر اصرار کر کے اسے زچ کرتا رہتا؟'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''کہا ہے کہ کچھ وقت گزرنے دو، اللہ کرے گا تو حالات میں بہتری آ جائے گی!''

''تب تک...... تب تک کیا میں جیتی رہوں گی؟'' اس نے خلا میں گھورا۔

''یہ کس طرح کی باتیں کر رہی ہو تم موجی!'' اس نے بہن کو ساتھ لگایا۔

''میں کیا کروں بھائی...... میں نے اپنا گھر خود ہی برباد کر دیا، میں خود ہی خطاوار ہوں، میں ہی مجرم ہوں اس کی مگر مجھے معافی کیسے ملے گی؟'' وہ ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

قائم علی، نعیم کی منت سماجت سے تو پسیجا ہی تھا، اسے یہ خیال بھی تھا کہ وہ کہاں کہاں بیٹی کو ساتھ لیے گھسیٹتا پھرے گا۔ جب سے معراج گئی تھی اس کا گھر سے نکلنا بالکل بند ہو گیا تھا، زرتاج کو کہاں چھوڑ کر جاتا...... اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا اب کسی کے پاس بیٹی چھوڑ کر جانے کو۔ اس کی اپنی صحت بھی متاثر ہونے لگی تھی، کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ کس کے لیے تھا یہ سب جھنجٹ، کام، کاروبار، زمینیں اور گھربار...... جب اسے باقی ساری عمر تنہا ہی گزارنا تھی، اپنی بیٹی کی خاطر تو اس کے لیے اتنے جھمیلے کی کیا ضرورت تھی؟

انہی سوچوں نے اس کے ذہن کے اندر نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، وہ اپنے کام کو سمیٹ سمٹا کر کسی اور طرف رخ کرنے کا سوچنے لگا مگر کہاں؟ جہاں یادیں ہوں نہ سوچیں...... شہر گیا تو زرتاج کو اس کی ننھیال چھوڑا اور اپنے کام میں مصروف رہا، شام ہوئی تو قدم اس کوچے کی طرف کھنچنے لگے، جہاں کی اسے ہمیشہ سے عادت تھی مگر دلِ ناداں کو سمجھایا اور اپنے رہنے کے لیے ٹھکانا ڈھونڈنے لگا۔ سرائے نما وہ چھوٹا سا ہوٹل بہت اعلیٰ درجے کا نہ سہی مگر آرام دہ اور صاف ستھرا تھا۔

اسی ہوٹل میں قیام کے دوران اس کی دوستی پرویز سے ہوئی، سکونِ قلب کے لیے پرویز نے اسے ایک ایسی جگہ پر پہنچا دیا، جہاں زندگی کے غم بھلانے کے لیے جسم کی راحت کو سب سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔ جہاں نغموں کی لے اور گھنگروؤں کی جھنکار تھوڑی دیر کے لیے ہر اذیت کو بھلا دیتی ہے، جہاں جسموں کی تھکان سمیٹ لی جاتی ہے، جہاں ٹوٹے ہوئے دلوں کی کرچیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنے آنچل کی چھاؤں فراہم کرنے والے وجود ہوتے ہیں۔ جہاں کا کاروبار چلتا ہی اس جیسے نوجوانوں سے ہے......

ان سے کہ جن کے پاس دولت ہے اور سکون نہیں...... اسے بھی وہاں جا کر اتنا سکون ملا کہ ہر بار شہر آ کر زرتاج کو ماں کے پاس چھوڑ کر دن بھر اپنا کام نمٹاتا اور شام ہوتے ہی وہاں جا پہنچتا جہاں اسے دولت کے عوض سکون بیچا جاتا تھا۔ جہاں، جہاں آرا کے بقول اس کی جواں سال بیٹی اس کے آنے تک اس کے انتظار میں، اپنے کمرے سے لے کر باہر کے دروازے تک سیکڑوں چکر لگا چکی ہوتی تھی۔ اس نے عورت کا یہ روپ پہلے کب دیکھا تھا۔

گھر میں بسنے والی عورت اور کوٹھے پر بیٹھی عورت میں یہی تو فرق ہوتا ہے، وہ نکاح کے بولوں میں بندھ کر سمجھتی ہے کہ وہ اس کا پابند ہوا، جہاں بھی جائے گا...... لوٹے گا تو اسی کے پاس آئے گا، اس لیے وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، اس کی خود سے غفلت اس کے شوہر کو کوٹھے پر لے کر جاتی ہے یا اس کی کوئی کوتاہی۔ قائم علی جیسے حالات کے ستائے ہوئے، ٹوٹے اور بکھرے ہوئے لوگ تو ان کا سب سے آسان شکار ہوتے ہیں۔ کوٹھے والی میں ایسے مرد کو سمیٹنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے اگر اس کی جیب میں مال بھی ہو تو...... وہ اس کی عاشق بن جاتی ہے اور اسے اس کے شرعی رشتوں اور ان کے تقاضوں سے دور کر دیتی ہے اور مرد کی حریص فطرت کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔

''آج آپ نے آنے میں اتنی دیر کر دی، ذرا کی ذرا آپ نہ آتے تو میں مر ہی جاتی!'' استقبالیہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی الماس اس کے ساتھ لپٹ ہی گئی تھی، اس نے اسے سینے سے لگا لیا کہ اس کی بے قراریوں کو قرار آ جائے۔

☆☆☆

رابعہ نے ایک پیارے سے گل گوتھنے کو جنم دیا تھا، گاؤں بھی اطلاع بھیج دی گئی تھی، اس خوشی میں گاؤں میں گڑ اور شہر سے منگوائے گئے لڈو بانٹے گئے تھے، شیر علی چھوٹا سا چاچا بن کر کتنا خوش تھا، دادی نے اس کا نام عمران علی رکھا اور وہ اپنے اتنے چاہنے والوں کی گودوں میں پروان چڑھنے لگا۔ دادی نے تو اس کے دو ماہ کے ہونے تک کا وقت مشکل سے گزارا تھا مگر ان دو مہینوں میں انہیں اس کے ساتھ اتنی وابستگی ہو گئی تھی کہ ان کا واپس جانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

رابعہ کی ماں بھی آ گئی تھیں اور چوہدری مراد علی بھی آ کر اپنا پہلا پوتا دیکھ گئے تھے، اسے دیکھ کر وہ کتنے نہال ہوئے تھے۔

"واقعی اصل سے بیاج پیارا ہوتا ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ اپنے بچوں سے انہیں پیار تھا مگر اسے دیکھ کر دل کی جو کیفیت ہوئی تھی، اس کو بیان کرنا بھی انہیں مشکل نظر آ رہا تھا۔ ان کا بس چلتا تو اسے اسی وقت ساتھ لے کر جاتے مگر اس صورت میں انہیں رابعہ کو بھی ساتھ لے کر جانا پڑتا اور کچھ عرصہ وہ اسے شجاع کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتے تھے۔ جس مشکل لمحے سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے سب سے سمجھدار اور اپنے معاون بیٹے کی دوری کا تلخ جام پیا تھا، سگی بیٹیوں جیسا پیار کرنے والی رابعہ کو اپنی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا اور تین ماہ سے عابدہ بیگم کے بغیر بھی رہ رہے تھے، ایک ذرا سے جذباتی بہاؤ میں آ کر وہ سب کچھ بھولنے جا رہے تھے۔

عمران علی اب دو ماہ کا ہو گیا تھا اور وہ اسے ایک بار پھر دیکھنے اور عابدہ بیگم کو ساتھ لے کر جانے کے لیے آئے تھے۔ عابدہ بیگم کا تو اصرار تھا کہ انہیں رابعہ، عمران اور جہانگیر کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہیے تاکہ بچے کا عقیقہ وغیرہ بھی کر لیں اور برادری کی دعوت کا اہتمام بھی ہو جائے۔ جانے کس طرح مگر چوہدری مراد علی نے انہیں سمجھا بجھا لیا تھا کہ کچھ دن کے بعد یہ سب کچھ ہو جائے گا۔

"مگر بچے کے عقیقے میں بلاوجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں....." انہوں نے تاویل پیش کی۔

"اس کا عقیقہ میں نے اس کی پیدائش کے سات دن بعد کر دیا تھا....." انہوں نے لاجواب کر دیا تھا۔

"مگر برادری کی دعوت؟"

"ذرا سا بڑا ہو جانے دو، اتنے سے بچے کو لے کر گاؤں آئے گی تو تمہیں علم ہے کہ بچہ بیمار پڑ گیا تو پھر علاج کے لیے شہر ہی بھاگیں گے....." انہوں نے ایسا نقشہ پیش کیا کہ عابدہ بیگم کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا۔

جاتے سمے وہ بار بار تاکید کر کے گئی تھیں کہ چھوٹے کا خیال رکھیں..... شیر علی کو بھی اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دینے کا کہہ کر وہ گاؤں روانہ ہوئیں، راستے میں بار بار ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر بھر آتیں تو وہ پرلی طرف منہ کر کے اپنی آنکھیں چپکے سے صاف کر لیتیں۔

"اتنا تو آپ اپنے میکے کا گھر چھوڑتے وقت نہیں روئی تھیں عابدہ بیگم....." انہوں نے ان کو چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔

"آپ اس کے پاس ہوتے نا دو مہینے کے لیے تو میں دیکھتی کس طرح آپ کا دل مانتا واپس اکیلے واپس آنے کو!" عابدہ بیگم نے ان سے اسے ساتھ نہ لانے کا شکوہ کیا۔

"آپ دو مہینے کی بات کرتی ہیں، میں تو دو دن اس کے ساتھ گزار کر بھی یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے میں اپنی کوئی اہم چیز شہر میں چھوڑے جا رہا ہوں..... سچ مانو تو میرا دل کرتا ہے کہ میں اس کے پاس رہوں ہر وقت....."

"تو پھر بلا لیں نا ان کو جلد واپس....." انہوں نے منت کی۔

"بلا لیں گے، لیکن چند دنوں کے لیے..... میں چاہتا ہوں کہ شیرو بھی شہر میں رہے اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے، گاؤں کے معاملات کو جہانگیر اور شجاع سنبھال لیں گے اور وہ دونوں چچا بھتیجا..... وہ پڑھ لکھ کر افسر بنیں یا

ڈاکٹر!" انہوں نے خلا میں کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔
مگر جب چند دن کے بعد دعوت کا پروگرام بنا کر شہر میں آدمی بھیجا کہ جہانگیر کو دعوت کی بابت بتا کر آئے تو جہانگیر نے اسے بتا کر بھیجا کہ رابعہ پھر دو جے جی سے تھی اور اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی...... اس خبر سے تو ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک پا رہے تھے۔
"چلو خیر ہے دعوت کون سا بھاگی جا رہی ہے!" انہوں نے عابدہ بیگم کو اطلاع کر کے ساتھ ہی تسلی بھی دی...... عابدہ بیگم بھی اس خبر سے خوش تھیں اور اللہ سے خیر مانگنے لگیں۔

☆☆☆

"بیٹا اٹھ کر نہا دھو لو...... آج نکاح ہے تمہارا!" رکھی نے کلثوم کو جگاتے ہوئے کہا اور وہ مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جیسے اس نے کوئی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔
"میرا نکاح؟"
"ہاں، آج جمعہ ہے نا! اٹھو شاباش......" وہ اسے جگا کر چلی گئی، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، یہ کیسے ہو گیا تھا کہ کوئی معجزہ ہوا تھا نہ کوئی دعا رنگ لائی تھی، اس نے کتنی التجائیں کی تھیں اللہ سے، کتنا گڑگڑائی تھی مگر اس کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔
"کاش گھوٹو کو ہی کچھ ہو جاتا...... کاش وہ مر جاتا!" اس کے معصوم ذہن میں مشکل حالات میں بھی اپنی زندگی کو ختم کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اسے زندگی سے پیار تھا، اسے اماں کی موت کے سوا اپنے ہوش میں زندگی نے کوئی دکھ نہیں دیا تھا...... عباس کی حرکت نے اس کی زندگی کو اس کے لیے سزا بنا دیا تھا مگر اسے عباس کا یوں چلے جانا اپنی زندگی کا دکھ نہیں محسوس ہوا تھا، وہ اسے اماں کا دکھ سمجھتی تھی۔
اس نے کسلمندی سے ایک بار پھر لیٹ جانے کا سوچا مگر نیند تو اس کی آنکھوں سے بھاگ گئی تھی، یہ سن کر ہی کہ جمعے کا دن ٹلا نہ تھا۔ اس دن کے حوالے سے کنواری لڑکیوں کی آنکھوں میں سپنے سجتے ہیں، سکھیوں کے شوخ فقرے اس دن کے حوالے سے دلوں میں خوب صورت محسوسات پیدا کر دیتے ہیں مگر اس کے دل میں کوئی محسوسات نہ تھے اور نہ ہی کسی سکھی کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ اسے تو یہ سوچ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ وہ گھوٹو کے وجود سے اٹھنے والی بدبو کو کس طرح نظر انداز کر پائے گی یا اس بدبو کو برداشت کس طرح کرے گی۔ اسے تو شادی کے مفہوم کا بھی علم نہ تھا اور نہ ہی اسے یہ اندازہ تھا کہ اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑے گا، گھوٹو کے ساتھ اس کا ساتھ کس نوعیت کا ہوگا، اسے کیا معلوم۔
"چل اٹھ اب نہا لے اچھی طرح......" رکھی نے دوبارہ آ کر اس سے کہا۔ "پھر ناشتا کر کے مجھے ذرا صاف بستر دے دے تاکہ میں چارپائیوں پر بچھا دوں...... مہمانوں کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ بھی بنانی ہے!" اس نے اٹھ کر اسے صاف چادریں نکالنے میں مدد کی اور خود نہانے کے لیے صحن کے ایک طرف بنے دو دیواروں والے احاطے کی طرف چلی، جس کی دو طرف چارپائیاں کھڑی کی گئی تھیں، یہ بندوبست عباس نے ہی کیا تھا، اسے عورتوں کا نہانے کے لیے گھر سے باہر جانا پسند نہ تھا، جس طرح کہ گاؤں کی دوسری عورتیں جاتی تھیں۔
وہ نہا کر آئی اور اپنے لمبے بال سلجھانے اور سکھانے لگی۔ رکھی نے صحن میں چارپائیاں بچھا کر ان پر صاف

ستھرے بستر لگا دیے تھے، پھر وہ اس کے پاس آئی۔ ''میں نے تیری ماں والا کمرا تیرے اور گھوٹو کے لیے تیار کر دیا ہے، اب تو اپنے بال سمیٹ کر ذرا ایک اور اچھا سا بستر دے دے تو بچھا دوں!''

''میرے اور گھوٹو کے لیے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر وہ کیوں...... وہ یہاں کیوں رہے گا؟''

''تو اور کہاں رہے گا......'' رکھی مسکرائی، اسے اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... اس بچی کے مقدر کا سوچ کر۔ ''تیری اور اس کی شادی ہوگی تو وہ یہیں رہے گا نا، تم دونوں میاں بیوی بن جاؤ گے!'' رکھی نے اسے سمجھانا شروع کیا اور جب تک اس کی بات ختم ہوتی، کلثوم کی آنکھیں حیرت سے تو پھٹی ہی تھیں، اس کا ننھا سا معصوم دل لرزنے لگا تھا۔

☆☆☆

گاؤں پہنچ کر ہی عابدہ بیگم کو گاؤں میں ہونے والے حالات کی بابت علم ہوا...... ہندوؤں کے گھرانوں میں ہونے والے واقعات پر تو ان کا دل ملول ہوا ہی تھا مگر اس کے بعد جو سزا کلثوم کو دی گئی تھی اس نے ان کا دل تڑپا دیا تھا۔ چوہدری نور علی کے گھر پر ٹوٹنے والی قیامت نے انہیں دہلا دیا، انہوں نے اسی وقت چادر اوڑھی اور ان کے گھر کی طرف چل دیں۔ کتنا بڑا سانحہ ہوا تھا، انہیں تو پہلے اسی لیے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ رابعہ کو اس حال میں اکیلے چھوڑ کر کس طرح آ تیں۔ راستے میں بھی چوہدری مراد علی نے کچھ نہیں بتایا تھا، البتہ گھر پہنچ کر انہیں علم ہو گیا تھا۔

اکبر علی کی شادی کے بعد پہلی بار وہ اس حویلی میں آئی تھیں...... اس حویلی سے ان کی کتنی یادیں وابستہ تھیں، یہاں وہ بیاہ کر آئی تھیں اور اصولاً تو بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ حویلی چوہدری مراد علی کو ہی ملنا تھی مگر چوہدری نور علی اور اس سے زیادہ شکیلہ بی بی کی ہٹ دھرمی نے انہی کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اور ان کے شوہر، دونوں ہی صلح جو طبیعت کے تھے اور ان کے نزدیک رشتوں کی اہمیت گھروں اور حویلیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔

اس حویلی کے در و دیوار سے اُن کی جوانی کی یادیں لپٹی ہوئی تھیں، ان کے بچوں کا بچپن، ان کے مرحوم ساس اور سسر کی یادیں تھیں، جن کی زندگی تک کسی کی مجال نہ تھی کہ علیحدہ رہنے کی بات کرتا۔ جوں ہی ان کی آنکھیں بند ہوئیں، شکیلہ کھلم کھلا ہر بات میں اپنی ناپسندیدگی اور اختلاف رائے کا اظہار کرتی۔ ان کی ساس مرحومہ نے آنے والے وقت کو اپنی پیش بین نظروں سے دیکھ لیا تھا اور اپنے دونوں بیٹوں کو اپنی زندگی میں ہی علیحدہ کرنے کا سوچا۔ انہوں نے عین انصاف کے مطابق بڑے بیٹے کو بڑی حویلی کا مالک قرار دیا اور دوسری حویلی جو دوسرے محلے میں واقع تھی، اس کا مالک نور علی کو بنایا۔

دوسری حویلی پنچایت، پولیس، ذیلدار وغیرہ کی آمد پر اور ان کے قیام وغیرہ کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس حویلی میں کمرے بھی کم تھے اور اس حویلی کی شان و شوکت سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔

''ہمارے چھ بچے ہیں اور ہمیں چھوٹی حویلی دی جا رہی ہے، جن کے صرف تین بچے ہیں انہیں اتنی بڑی حویلی!'' شکیلہ نے ساس کے سامنے تنک کر کہا تھا۔

''وہ بڑا بیٹا ہے اس لیے بڑی حویلی کا وارث ہے......'' ان کی ساس نے دلیل دی۔

''اماں اب بڑا یا چھوٹا ہونا کیا میرے اختیار میں ہے، مجھے تم پہلے پیدا کر لیتیں تو میں بڑا ہو جاتا......'' نور علی نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے الفاظ گستاخی کے زمرے میں آتے ہیں۔

''نور علی!'' انہوں نے غصے سے کہا۔ ''یہ کس لہجے میں تم ماں سے بات کر رہے ہو، میں جانتی ہوں یہ سب پٹی تمہاری اس بدزبان اور بدتمیز بیوی کی پڑھائی ہوئی ہے......''

''آپ ہی نے اسے بیاہ کر میرے سر منڈھا ہے، اپنی بدزبان اور بدتمیز بھتیجی کو، میں کون سا اسے بھگا کر لایا ہوں۔ اندھا نہیں ہوں میں...... بھگا کر لاتا تو اس طرح کا تحفہ؟'' وہ دونوں میاں بیوی بھی ایک دوسرے پر برابر کی چوٹ تھے۔

''بدقسمتی تھی میری جو میں تمہارے سنگ بیاہ کر اس جہنم میں آ گئی، اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں کسی ڈھنگ کے مرد کے ساتھ بھاگ جاتی......'' اس نے دوبدو جواب دیا۔ ''اور ہاں پھوپی! مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے اس سپوت کو پٹیاں پڑھانے کی، تمہارے اپنے سبق ہی کافی ہیں اس کو، کہ مجھے جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھتا یہ!''

بات کو تو جتنا بھی بڑھانا چاہتے بڑھ سکتی تھی مگر خود عابدہ اور پھر مراد نے ماں کو سمجھایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کہاں رہتا ہے، اصل بات تو سلوک اور اتفاق کی ہے جو رہا نہیں۔ یوں وہ نہ چاہ کر بھی بڑی حویلی نور علی کو دینے پر مجبور ہوئیں اور خود مراد علی کے ساتھ چھوٹی حویلی میں اٹھ آئیں...... مرتے دم تک انتہائی مجبوری کی حالت میں ذرا کی ذرا بڑی حویلی میں جاتیں اور واپس لوٹ آتیں۔ چھوٹی حویلی میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں سے وہ آخری سفر پر روانہ ہوئیں۔

چھوٹی حویلی کی بھی مرمت اور مزید تزئین و آرائش وقت کے ساتھ کی گئی تھی مگر پھر بھی بڑی حویلی کی شان کا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ عابدہ بیگم کے سلیقے اور حسنِ سلوک نے لوگوں کے دلوں میں چھوٹی حویلی کی قدر و منزلت اور عابدہ کو ہمیشہ بلند رکھا تھا۔ بڑی حویلی کی یاد بھی کبھار ان کے دل میں چٹکیاں تو لیتی مگر دونوں بھائیوں میں کم تعلقات اور ان کے کھنچے کھنچے رویوں کے باعث کبھی جانا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ اسی حویلی میں کھڑی اس کی خستہ حالی کو دیکھ رہی تھیں۔

کوئی کمی نہ تھی مگر کمی تھی تو سلیقے کی، جو اس حویلی کے مکینوں میں ناپید تھا...... شکیلہ اور عابدہ کی ساس نے اس حویلی کو کس شوق اور شان سے رکھا تھا، وہ سب جانتے تھے مگر جب سے اس کی ملکیت تبدیل ہوئی تو اس کا حلیہ ہی بدل گیا...... رنگ و روغن تھا تو وہ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا، ایک ایک در و دیوار توجہ کا طالب...... فرش جگہ جگہ سے خراب ہو چکے تھے، صحن میں بنی کیاریاں اجاڑ...... برآمدوں کے خوب صورت منقش ستون، جن پر خوب صورت پھولوں کی بیلیں بل کھاتی اوپر چھت کی طرف جاتی تھیں، وہ برآمدے کاٹھ کباڑ سے اٹے پڑے تھے۔ اس کاٹھ کباڑ میں بھی کتنا ہی قیمتی سامان موجود تھا، جو مرمت طلب تو تھا مگر اسے بیکار جان کر یوں پھینک دیا گیا تھا۔

گاؤں میں کسی جگہ اتفاقاً ملاقات ہو جاتی تو دونوں دیورانی اور جیٹھانی ایک دوسرے سے گلے ملتیں، ایک دوسرے کی خیریت بھی دریافت کرتیں مگر ایک دوسرے کے گھر جانا نہیں ہوتا تھا۔ عابدہ بیگم نے خود کو

ماضی کے طلسم سے نکالا اور اس طرف بڑھنے لگیں جس طرف ملازمہ ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔

"اِدھر کہاں لے کر آ رہی ہے ان کو......" انہوں نے شکیلہ بیگم کی پاٹ دار آواز سنی تھی۔ "اس کم بخت سے کہو کہ اسے اسی کے کمرے میں لے جائے جس کے پاس اسے افسوس کرنا ہے......" ایک دفعہ تو ان کا دل چاہا کہ انہی قدموں پر لوٹ جائیں مگر یوں لوٹ جانے میں انہی کی بے عزتی تھی۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سامنے ہی برآمدے میں دیور صاحب فقط دھوتی پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے، اور ایک نوجوان ملازمہ ان کی کمر پر غالباً تیل کی مالش کر رہی تھی، وہ آگے بڑھنے سے جھجک گئیں، نور علی کی نظر بھی ان پر پڑ گئی تھی، وہ ذرا سا چونکے۔

"مجھے فاخرہ کے کمرے میں لے چلو بیٹا!" انہوں نے ملازمہ سے کہا، وہ بھی شکیلہ بی بی کے ارشاد کو سن چکی تھی اور کشمکش میں ہی تھی کہ ان کو لے کر وہاں پہنچے گی تو اسے کس بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"آ ئیں......" وہ فوراً مڑی تھی، انہوں نے اس کی تقلید کی اور اس نے انہیں اس دروازے کے سامنے لا کھڑا کیا، جو کبھی ان کے کمرے کا دروازہ ہوتا تھا۔

☆☆☆

"کیا کیا میرے یار...... یہ تو نے کیا کیا......" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اس کے پیچھے سلیم کا منہ دیکھنے والوں کی لمبی قطار تھی مگر وہ سب خاموشی سے اس کے اٹھ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ جو تعلق سلیم کے ساتھ سہیل کا تھا، وہ کسی اور کا نہ تھا۔ دیر تک رکنے کے بعد، اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا، تب وہ چلا اور جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

اس کے تصور میں سلیم کا ہنستا کھلکھلاتا ہوا چہرہ آ رہا تھا، وہ چہرہ جو اب مسخ ہو چکا تھا، وہ چہرہ جسے اب تہ خاک چلے جانا تھا۔ اس کا ذہین دوست...... ہر سال بہترین طالب علم کا انعام حاصل کرنے والا، تقریری مقابلوں اور کھیلوں میں بھی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے والا، کیسے اتنی سی بات پر اپنی زندگی ختم کر بیٹھا۔ سہیل کے لیے تو وہ بات اتنی سی ہی تھی، جس بات کو لے کر سلیم نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔

"تمہارا نام ہی سہیل ہے بیٹا؟" اس نے سر اٹھا کر ایک شفیق چہرے کو دیکھا، سلیم کے باپ کا چہرہ...... اس شخص کا چہرہ جس نے اپنا جوان بیٹا کھو دیا تھا، وہ اپنے جوان بیٹے کی میت لینے آیا تھا...... اس کی ماں یقیناً گھر پر اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی ہو گی۔

"جی انکل......" وہ اٹھا اور کہہ کر بے اختیار ان کے گلے سے لگ گیا، انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

"تم اس کے ساتھ ہی رہتے تھے ہاسٹل میں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں انکل، میں یہیں رہتا ہوں اسی شہر میں، گھر پر رہتا ہوں...... لیکن میرے اور سلیم کے سارے مضامین ایک سے تھے، اس لیے ہماری دوستی گہری تھی، وہ میرا بھائی تھا انکل...... صرف دوست نہیں! میرا تو اور کوئی بھائی نہیں ہے انکل، وہی میرا بھائی تھا......" وہ پھر بہ آواز بلند رونے لگا۔

"سلیم کا بھی اور کوئی بھائی نہیں ہے بیٹا...... وہ بھی میرا ایک ہی بیٹا تھا، تمہارا ذکر سن رکھا تھا میں نے اس سے!" انہوں نے اس سے کہا پھر اس کے ساتھ ہی بینچ پر بیٹھ گئے۔ "اس نے تم سے کبھی کسی پریشانی کا ذکر کیا تھا بیٹا؟"

"نہیں انکل...... ہرگز نہیں!" جھوٹ بولنے کے معاملے میں وہ پکا تھا۔ "اسے کس بات کی پریشانی ہوتی، پریشان تو ہم جیسے نالائق طالب علم ہوتے ہیں جو سارا سال پڑھتے نہیں اور......"

"ابھی تو کچھ روز پہلے ہی وہ گھر آیا تھا، خوش تھا، بہنوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا، انہیں پڑھاتا...... کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جو اس کو اس طرح اچانک اس حد تک پریشان کر دے......" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "میرے ساتھ بیٹھ کر میرے کاروبار کے بارے میں پوچھتا تھا اور مجھے کہنے لگا کہ وہ بی اے کر کے میرے ساتھ میرے کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا...... صرف ایک سال کی تو بات ہے...! اس نے مجھ سے کہا تھا، میں گھر لوٹ آؤں گا!" ان کی آواز بھرا گئی۔

"میرا اور اس کا تین سال کا ہر وقت کا ساتھ تھا انکل...... آپ کے ساتھ تو اس کا ساتھ کہیں زیادہ اور کہیں پرانا ہے......" سہیل نے ان کو تسلی دی۔ "میں آپ کے دکھ کا کس طرح ازالہ کروں انکل، سوائے اس کے کہ آپ سے کہوں کہ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں، آپ چاہیں تو مجھے سلیم کے نام سے ہی پکار لیں......" وہ اتنے جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"تم میں سے مجھے اپنے سلیم کی ہی تو خوشبو آ رہی ہے بیٹا، اللہ تمہیں سلامت رکھے...... کتنے اچھے ہو تم!" انہیں بھلا کیا اندازہ ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو ہی سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

☆☆☆

لہو کی ایک بوند بھی نہ تھی اس کے جسم میں جیسے...... انہوں نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر پہلی نظر ڈالی اور کانپ اٹھیں، کیسا خوف ناک چہرہ لگ رہا تھا اس کا۔ نحیف اس قدر کہ انہیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ بھی نہ سکی اور اس حالت میں وہ کیسے بے یار و مددگار پڑی تھی۔ غم بھی انسان کو کیسے توڑ کر رکھ دیتا ہے، انہوں نے سوچا اور اس کی طرف بڑھیں۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا؟" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے قریب آ کر انہیں انتہائی ناگوار بو کا احساس ہوا تھا مگر انہوں نے سانس روک کر برداشت کیا، چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔

"ٹھیک ہوں!" کہتے ہی اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر کئی آنسوؤں کی قطاریں اس کے کانوں کی طرف چلتی گئیں...... "آپ تائی جی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا...... تمہاری شادی کے بعد بھی ملاقات ہی نہیں ہوئی!" انہوں نے کہا۔ "بہت دکھ ہوا بیٹا تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا سن کر......"

"بس جو اللہ کی مرضی......" اس نے آہستگی سے کہا تو وہ دل ہی دل میں حیران ہوئیں کیونکہ معراج کی زبانی انہوں نے اس کی بد اخلاقی کے چرچے سن رکھے تھے مگر وقت بڑے بڑوں کو توڑ دیتا ہے۔ زندگی میں ہونے والے اس حادثے نے شاید اس کا سارا کروفر ختم کر دیا ہو۔

"بڑی بیٹیاں کہاں ہیں تمہاری؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ اپنی نانی کے گھر ہیں...... آ جائیں گی جب میری طبیعت سنبھلے گی!" اس نے بتایا۔ "میں گر گئی تھی،

جس کے باعث بہت زیادہ خون ضایع ہو گیا تھا..... معراج دائی نے تو کہا ہے کہ مجھے شہر بھجوانا چاہیے مگر گھر میں کوئی نہیں مانتا، شاید کسی کو میری ضرورت ہی نہیں ہے، میرا کسی کی زندگی میں کیا مقام؟'' اس کے کہنے پر انہیں بہت تکلیف ہوئی۔

''یوں نہ کہو بیٹی، بے پروائی ہے ورنہ اور کسی کو ہو نہ ہو، تمہاری اپنی بیٹیوں کو تو تمہاری ضرورت ہے نا!'' انہوں نے اسے سمجھایا۔ ''اگر یہاں سے کوئی تمہیں شہر نہیں لے کر جاتا تو مجھے بتاؤ، میں تمہیں شہر لے جاؤں گی۔ وہاں رابعہ اور جہانگیر ہیں، اپنا گھر ہے......''

''آپ تو جانتی ہیں کہ آپ کے ساتھ کون جانے دے گا، سب لوگ شاید اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ میں مر جاؤں اور وہ اکبر علی کا دوسرا بیاہ کریں!'' وہ سسکی۔ اس سے قبل معراج بھی انہیں بتا چکی تھی کہ شکیلہ بیگم نے فاخرہ کو دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر اب کی بار اس نے بیٹی کو جنم دیا تو وہ اسے فارغ کر کے اکبر علی کی دوسری شادی کر دیں گی۔ ان کے فاخرہ سے سلوک کی وجہ سے اور کچھ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے خاندان اور خاندان سے باہر بھی ابھی تک ان کے باقی دونوں بیٹوں بابر اور ظفر کے رشتے بھی نہیں طے ہو سکے تھے۔

''اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے...... تم اٹھو خود ہی ہمت کرو، نہاؤ دھوؤ اور اپنے اللہ سے خیر مانگو، وہ کرم کرے گا!'' انہوں نے اسے یقین دلایا۔ ''میں بڑے چوہدری صاحب سے بات کروں گی، وہ نور علی کو سمجھائیں گے!'' اسے سمجھا بجھا کر، تسلی تشفی دے کر وہ گھر آئیں اور مراد علی سے بات بھی کی، انہیں بتایا کہ وہ بے چاری مر جائے گی اگر اسے شہر نہ بھجوایا گیا تو۔

''ہمیں کسی کے گھر سے کیا لینا دینا......'' مراد علی نے بے پروائی سے کہا تھا۔

''وہ کوئی نہیں ہے، آپ کا اپنا خون ہے، بھائی ہے آپ کا اور اس کی بہو ہماری بہو کی طرح ہی ہے!''

''صرف تم اس انداز سے سوچتی ہو، ورنہ انہوں نے تو جہانگیر کے ہاں بیٹے کی ولادت پر بھجوانے والی مٹھائی اور اس کے عقیقے کا گوشت بھی لوٹا دیا تھا!'' انہوں نے انکشاف کیا تو بھی وہ پرسکون رہیں۔

''آپ کو معلوم ہے کہ وہ کتنا بڑا بے وقوف ہے، اپنے بھتیجے کے بیاہ پر بھی نہیں آیا تھا مگر آپ کا چھوٹا بھائی ہے، اسے سمجھانا آپ کا فرض ہے اور پھر یہ معاملہ کسی خوشی کے موقعے کا نہیں کہ ہم ناراضی بنالیں، کسی بچی کی زندگی کا معاملہ ہے، تین بیٹیاں ہیں اس کی......'' عابدہ بیگم نے پھر زور دیا۔

''میں کل ہی بات کرتا ہوں نور علی سے......'' انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ نور علی ان کی بات کو اہمیت دینے والا نہیں ہے اور بالخصوص کلثوم والے معاملے کے بعد تو ان کا دل اور بھی برا ہوا تھا مگر کسی بچی کی زندگی کا معاملہ تھا تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے مگر وہ صبح کبھی طلوع ہی نہیں ہوئی، فجر کے وقت جب وہ جاگے تو گاؤں میں منادی ہو رہی تھی، وہ رکے اور کان لگا کر سننے لگے، عابدہ بیگم بھی جاگ گئی تھیں اور ان کے پاس ہی کھڑی تھیں جب منادی والے کی آواز واضح ہوئی، نور علی کی بہو کا رات کو انتقال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اکبر علی کو معلوم تھا کہ اس نے کہا ہے پھر بھی اماں اتنا دل نہیں نکال سکتیں کہ ایک جوڑا اس غریب لڑکی کو بھجوا دیتیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ خود اس لڑکی کے گھر جا کر اس کا اور اس کے والدین کا شکریہ ادا کرے گا،

لڑکی بھی تو اس نے نہیں دیکھی تھی، یہ تجسس بھی تھا کہ وہ لڑکی شکل صورت کی کیسی تھی۔ اپنے کھیتوں پر بھی وہ کافی دن کے بعد گیا تھا، بچی کی گم شدگی نہ حل ہونے والا معما بن گئی تھی اور اس ایک بات کو لے کر فاخرہ کی حالت بگڑتی جارہی تھی، اسے اس کو دیکھ دیکھ کر اور بھی کوفت ہوتی۔

اس کے کمرے میں پڑی ہوئی وہ ڈھانچہ نما عورت...... اس کی دلچسپی اس میں ختم ہوچکی تھی، وہ کب اپنی ماں کی طرح چاہتا تھا کہ وہ بستر سے اٹھے۔ آہستہ آہستہ وہ موت کی طرف بڑھ رہی تھی، معراج بی بی نے بارہا کہا تھا کہ اسے شہر نہ لے جایا گیا تو...... اور یہی تو وہ ماں بیٹا چاہتے تھے کیونکہ باپ کو منانا کون سا آسان کام تھا۔ اس وقت بھی وہ انہیں خیالوں میں گم تھا، منشی کے آتے ہی اس کا خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی چوہدری صاحب؟''

''بہتر ہے، بس ذرا کمزوری سی محسوس ہورہی ہے!'' اس نے کہا۔

''اللہ نے آپ کی جان بچائی ہے، آگے بھی وہ کرم کرے گا'' منشی نے کہا۔

''اس زندگی کے لیے تو میں کسی کا احسان مند ہوں منشی......'' اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''فقط اللہ کا احسان ہے، اسی نے آپ کو بچایا ہے، ورنہ کوئی حکیم یا ڈاکٹر کیا کرسکتا ہے؟'' منشی نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں حکیم یا ڈاکٹر کی بات نہیں کررہا......'' اکبر علی نے کہا منشی نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ ''میں تو ان لڑکیوں کی بات کررہا ہوں جنہوں نے سانپ کو دیکھ کر شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کیا اور میری جان بچ گئی......'' اکبر علی نے دانستہ کسی ایک لڑکی کا نہیں کہا تھا اور نہ ہی یہ کہا تھا کہ وہ لڑکی جس نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

''جانے کون لڑکیاں ہوں گی......'' منشی نے بے پروائی سے کہا تھا۔

''مجھے ان لڑکیوں کا اتا پتا چاہیے......'' اس نے زور دے کر کہا۔

''چھوڑیں سرکار...... ہوں گی کوئی کمی کمینوں کی بیٹیاں یا پھر بھٹہ مزدوروں کی......'' منشی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے یہ جتلا دیا تھا کہ اسے چھوٹے لوگوں کی اتنی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''منشی...... میں نے جو کہا ہے، وہ کرو!'' اس کے لہجے میں انتباہ تھا۔

''جو حکم سرکار......'' اس نے سر جھکا کر کہا اور مڑ کر واپس چلا گیا؟ اکبر علی بیٹھا خلا میں کچھ دیکھ رہا تھا، اگر سر نیچے کرکے زمین پر دیکھتا تو اسے نظر آتا کہ ان کی نظر میں کیڑے مکوڑوں جیسے حقیر لوگ...... جو ان کے کھیتوں میں کام کررہے تھے، ان ہی میں سے ایک لڑکی، اپنا کام بھول بھال کر فاصلے پر بیٹھے ہوئے بھی ان کو اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا رہی تھی۔

☆☆☆

کئی گلیاں گھوم پھر کر وہ ایک گلی میں داخل ہوئے تو اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ وہ آخری گلی تھی، اسی گلی میں اس کے بھائی کا گھر تھا۔ اس گلی میں آکر اس کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی جیسے دوڑ میں دوڑنے والے کھلاڑی اختتام کے قریب پہنچ کر یک دم تیز ہوجاتے ہیں۔ اس کی حالت سے ہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ چل چل کر تھک چکی ہے۔ گلی میں زیادہ تر مکانات چھوٹے چھوٹے تھے۔ آگے جاکر نسبتاً بڑے مکانات کا

سلسلہ شروع ہوگیا تھا، انہی میں سے ایک گھر کے سامنے وہ رکی اور دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ نیلے رنگ کی کھڑکیوں اور دروازوں والا یہ گھر اپنے مکینوں کی خوشحالی کا ثبوت دے رہا تھا۔

''آپ کے بھائی کیا کرتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنا کاروبار ہے ان کا کپڑے کا...... بڑے بازار میں کئی دکانیں ہیں ان کی!'' اس نے فخر سے بتایا، اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے گھر کو دیکھ کر مرعوب ہوگیا ہے۔

''ناہید تم......؟'' دروازہ کھولنے والے نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''بھائی صاحب......'' وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' انہوں نے اسے الگ کیا۔ ''اور یہ کون ہے؟'' انہوں نے شاکر کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''یہ میرے ساتھ آئے ہیں، یہ......'' وہ رکی، اس نے تو ابھی تک نہ اس کو اپنا نام بتایا تھا نہ اس کا نام پوچھا تھا۔

''جی، شاکر نام ہے میرا......'' شاکر نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا، ناہید کے بھائی نے ذرا سا جھجک کر مصافحہ کیا۔

''جی مجھے سعید کہتے ہیں......'' اس نے کہا۔ ''مگر آپ کو اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں...... کیا آپ انور کے کوئی رشتے دار ہیں؟''

''بھائی صاحب...... انہیں کیا معلوم انور کون ہے، آپ اندر تو چلیں، سب معلوم ہوجائے گا، ہم اتنے تھکے ہوئے ہیں......'' وہ اندر کی طرف چلی تو سعید نے دروازہ بند کیا اور شاکر کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر آگے چل پڑا۔ صحن سے گزر کر برآمدے میں جس طرف ناہید گئی تھی اس کی مخالف سمت میں اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا، وہ بیٹھک تھی۔

''بیٹھیے......'' اسے بٹھا کر وہ خود باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر میں شربت کا گلاس لے کر آگیا، ناہید بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی اور اس کے پیچھے ایک اور نفیس سی خاتون۔

''یہ بھابی ہیں میری......'' ناہید نے تعارف کروایا۔ ''اور بھابی یہ ہیں وہ شاکر صاحب جن کا میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے!'' اس نے وہیں ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

''بہت دکھ ہوا......'' بھابی نے مختصراً کہا۔ ''میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ کی کیفیت اس وقت کیا ہوگی!''

''کچھ ہمیں بھی تو علم ہو......؟'' سعید نے دخل اندازی کی۔

''بھائی صاحب، یہ شاکر ہیں، مجھے بس میں ملے تھے بلکہ میرا کرایہ بھی انہوں نے ہی دیا تھا اور پھر یہاں تک کا بھی۔ ان کی بیوی کل ہی اس بچی کی ولادت کے دوران فوت ہوگئی اور گاؤں میں ان کا اور کوئی نہیں تھا تو انہوں نے سوچا کہ شہر جاکر دیکھتے ہیں...... میرے لیے تو یہ مشکل وقت میں فرشتہ ثابت ہوئے ہیں!'' وہ حسب عادت بولنے لگی۔

''اوہ...... بڑا افسوس ہوا، تو کیا یہ تمہارے گاؤں کے ہیں؟'' سعید نے پوچھا۔

''ارے نہیں...... یہ تو جانے کس گاؤں کے ہیں!'' بے پروائی سے ناہید نے کہا تو سعید کو اس کی بے

وقوفی پر غصہ آیا، جانے کس طرح اس نے کسی اجنبی پر بھروسا کر لیا اور اسے گھر تک بھی لے آئی تھی۔
"تو اب کیا ہوگا؟" سعید نے سوال اٹھایا۔
"آج کی رات تو انہیں یہیں رکنے دیں بھائی صاحب، کل بھابی کہیں سے کسی نہ کسی کا پتا کروا لیں گی جو ان کی بیٹی کی دیکھ بھال کر سکے....." اس نے یوں بات کی جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو۔ سعید کے چہرے پر تذبذب تھا مگر اس کی بیوی مطمئن تھی۔
"میں کھانے کا دیکھتی ہوں، ناہید تم آرام کرو، سعید آپ شاکر صاحب کے ساتھ بیٹھیں....." اس نے اسی اطمینان سے کہا۔ "کھانے کے بعد یہیں شاکر صاحب کو بستر ڈال دیتے ہیں، رات گزرے تو صبح دیکھتے ہیں کہ کیا ہوگا!"

سعید کو اپنی بیوی کی فراست پر یقین تھا، اس نے یہ سب کہا تھا تو کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔ یوں بھی شام کے اس وقت وہ گھر آئے مہمان کو کہاں دھکا دیتے، اس نے مشکل وقت میں ان کی بہن کی مدد کی تھی تو ان کا بھی فرض تھا کہ اس کی مدد کرتے مگر ناہید کے پاس کرایہ دینے کے لیے رقم کیوں نہ تھی، دل ہی دل میں انہوں نے سوچا مگر فوری طور پر کسی اجنبی کے سامنے وہ کیوں کر پوچھ سکتا تھا جبکہ اس کی بیوی سلمٰی سمجھ گئی تھی کہ ناہید پھر شوہر سے لڑ بھڑ کر گھر سے نکلی ہوگی۔
کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوئے، سلمٰی نے بچی کے دودھ کے لیے بوتل بھی باقی سودوں کے ساتھ منگوالی تھی اور سلانے سے پہلے بچی کو اچھی طرح صاف ستھرا کر کے اس کے باپ کے حوالے کیا۔ دستر خوان پر ہی ناہید نے شاکر سے اپنے بھتیجے بھتیجیوں کا تعارف کروایا۔ ہاجرہ اور زلیخا اس کی بھتیجیاں تھیں..... دونوں اسکول میں پڑھتی تھیں، دسویں اور آٹھویں جماعتوں میں فرید اور ولید بالترتیب تیسری اور دوسری جماعت میں.....
"بھابی کے سب سے بڑے بیٹے کا کچھ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت واجد اور ولید بھی نہیں تھے اور میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی!" اس نے حسب عادت تفصیل سے بتایا تو سعید کو پھر کچھ یاد آ گیا۔
"تم اکیلی کیوں آئی ہو ناہید، انور کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"مر گیا انور میرے لیے....." اس نے غصے سے کہا۔ "میں اکیلی اس لیے آئی ہوں کہ اب مجھے اکیلے ہی رہنا ہے، اس نے مجھے بیس لوگوں کے سامنے تین طلاقیں دی ہیں اور دھکے دے دے کر گھر سے نکالا ہے..... اسی اپنی بھرجائی کے کہنے میں آ کر....." وہ اچانک ہی رونے لگی، سعید کی کنپٹیوں میں لہو ابلنے لگا اور سلمٰی ہونقوں کی طرح خاموش بیٹھی رہ گئی اور شاکر اس صورتِ حال میں خود کو وہاں ایک فالتو چیز کی طرح سمجھ رہا تھا۔
"آپ سوئیں چل کر شاکر صاحب....." سلمٰی نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا تھا۔
"جی!" مختصر سا جواب دے کر شاکر اٹھ کھڑا ہوا اور اسی بیٹھک کی طرف چل پڑا جہاں اس نے تھوڑی دیر پہلے سعید کے ساتھ مل کر بستر بچھایا تھا۔ بچی سو چکی تھی، اس نے لیٹ کر دائیں طرف کروٹ بدل لی۔ "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں..... اس کے ساتھ اس کے بھائی کے گھر تک آ گیا ہوں اور اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا، اس کا نام بھی نہیں....."

سہیل امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سخت گیر باپ سے پھر ڈانٹ کھانا پڑی تھی جنہوں نے کبھی اس کے ساتھ شفقت سے بات نہیں کی تھی اور اس کا یہی رویہ اسے ایک منفی شخصیت میں ڈھالنے میں بنیاد ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا مگر والدین کے درمیان شخصیاتی تضادات نے اسے ایک الجھی ہوئی شخصیت بنا دیا تھا۔ اگر اسے گھر سے توجہ اور محبت ملتی، جو کہ اس کا حق تھا تو وہ ایک مثبت فرد کے طور پر پروان چڑھتا، اس پیار اور محبت کو وہ عمر بھر ترستا رہا اور خود کو دوسروں کی نظروں میں ممتاز کرنے کے لیے اس نے منفی سرگرمیاں اپنا لیں۔

''کاش میرے والدین اسی روز ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے جب انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ مختلف عادات و خصائل کے حامل ہیں اور ان کا ساتھ چلنا ممکن نہیں......'' اسے کیا معلوم کہ ایسے مقامات بارہا آئے تھے اور دونوں کی علیحدگی کے فیصلے میں حائل ہونے والی رکاوٹ اسی کا وجود تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس کی وجہ سے تو وہ دونوں اب تک ساتھ نبھاتے چلے آ رہے تھے مگر دونوں کو ہی یہ احساس نہیں تھا کہ اسی کو سب سے زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی تربیت کون کرتا، اسے اخلاقیات کون سکھاتا، اسے اچھے اور برے میں تمیز کون سکھاتا۔

وہ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گنواروں کی طرح لڑتے، گالی گلوچ ہوتی، کردار کشی، الزام تراشی اور پھر کتنے ہی دن کی قطع تعلقی...... کسی نے اس کی ذہنی پرورش کا نہیں سوچا تھا، مذہبی تعلیمات سے وہ کوسوں دور تھا، اس لیے کہ کسی نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہی نہ تھا۔ وہ دونوں دریا کے دو کناروں کی طرح بہ حالت مجبوری ساتھ ساتھ تو چل رہے تھے مگر اس طرح کہ انہیں ایک دوسرے کی خبر بھی نہ ہوتی اور اس سارے سلسلے میں سہیل کا وجود گھر میں پس رہا تھا تو اس نے گھر سے باہر اپنی مصروفیات ڈھونڈ لیں۔

کالج سے نکل کر وہ لڑکیوں کے کالجوں کے باہر اپنی سائیکل لے کر کھڑا ہو جاتا، آتی جاتی لڑکیوں پر آوازیں کستا، کسی کو چھیڑ دیتا...... کوئی نظر انداز کر کے نکل جاتی، کوئی مسکرا کر چل دیتی اور کوئی جوتا اتارنے کی دھمکی دیتی تو یہ بھاگ نکلتا۔ مگر انہی اداروں میں ایسی لڑکیاں بھی پڑھنے کی غرض سے آتی تھیں جو اسی کی طرح اپنے حالات کی ستائی ہوئی ہوتیں یا پھر وہ لڑکوں سے دوستی کو مشغلے کے طور پر اپنا لیتیں۔ لڑکپن سے ہی وہ اس طرح کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا اور اگر اس کے والدین اسے غور سے دیکھتے تو اس کے پہننے اوڑھنے اور اس کی بات چیت سے انہیں اس کے چال چلن کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو جاتا۔

باپ کو یہ بتانا کہ وہ فیل ہو گیا ہے اتنا آسان نہ تھا، وہ اس کی کالج کی فیس ہر بار ادا کرتے وقت اس پر احسان جتانا نہ بھولتے۔ اسے ڈانٹتے وقت اس کے ساتھ اس کی ماں کو رگیدنا ایک ایسا فرض تھا جسے وہ باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ایک ایک پائی اسے ترلے منتوں کے بعد دیتے۔ اپنی ذات پر سیکڑوں روپے بھی خرچ کر دیتے مگر بیوی اور بیٹے کے لیے ان کے دل میں گنجائش نہ تھی۔

سہیل کی امی بھی ملازمت پیشہ تھیں اس لیے سہیل اپنے مالی مطالبات انہی سے منواتا تھا۔ وہ سہیل کے معاملے میں بہت شفیق تھیں، وہی زبان جو اپنے شوہر کے لیے انگارے اگلتی تھی اسی زبان سے سہیل کے لیے محبت بھرے کلمات بھی ادا ہوتے تھے۔ سہیل ماں کی شفقت اور محبت کا بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کی اتنی اچھی ماں...... اچھی بیوی کیوں نہ تھی۔ شاید اس کے باپ میں کوئی ایسی کمزوری تھی جو کہ اس کی ماں کو پسند نہ تھی۔ ان کا کنجوس ہونا تو سہیل کو بھی کھٹکتا تھا مگر اس کے علاوہ ان میں کیا کمزوریاں تھیں۔

ماں کی آنکھ کا تارہ تھا مگر پھر بھی ان سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔ اگر پوچھ بھی لیتا تو وہ کیا بتاتیں! مردوں کی بعض عادات عورتوں کے لیے ناپسندیدہ ہوتی ہیں، اس حد تک کہ ان کا دل ہی ان کے ساتھ رہنے کو نہیں چاہتا مگر کوئی نہ کوئی مجبوری انہیں اس تعلق کو گھسیٹتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اپنی بیوی کے سوا جس مرد کو دنیا کی ہر عورت اچھی لگتی ہو اور وہ ہر بات میں اپنی بیوی کا مقابلہ دوسری عورتوں سے کرے خواہ وہ سڑک کے کنارے کھڑی کوئی عورت ہو یا ناچنے گانے والی...... جس مرد کی نظر سے کوئی محفوظ نہ ہو اور دسترس میں بھی کوئی مظلوم آ جائے۔

کس طرح بھول سکتی تھیں وہ...... کیسے فراموش کر دیتیں وہ سب، جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ تو انہیں اپنا کر سمجھی تھیں کہ انہوں نے دو جہاں پا لیے تھے مگر انہیں کیا علم تھا کہ اسلم کے دل میں ہوس کے پنجے کس گہرائی تک گڑے تھے۔

☆☆☆

گاؤں کی عورتوں کے بیچ میں ایک پیڑھے سے موڑھے پر وہ سر نہوڑائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ اپنی انگلیوں پر لٹکتی ہوئی تسبیح رولے جا رہی تھیں۔ عورتیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں، جس کی اپنی سگی ساس اس کی موت پر نہ رو رہی ہو...... جس کا شوہر مردان خانے میں بالکل اس طرح بیٹھا ہو جیسے وہ کسی اور کی موت کا گھر ہو...... جس کے مرنے پر اس کی ماں بین کر رہی ہو، بہنیں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہوں، اس کی بیٹیاں بلک بلک کر ماں کی لاش سے لپٹ لپٹ جا رہی ہوں......

کس قدر خاموشی سے، کتنی تمکنت کے ساتھ عابدہ بیگم اس کی موت پر دل ہی دل میں نوحہ کناں تھیں کہ آنکھوں سے آنسو تسبیح کے موتیوں کے مانند لڑھکتے ہی آ رہے تھے۔ وہ کسی کو کیا کہتیں، کسی سے کیا شکوہ کرتیں، اس کی حالت دیکھ کر تو وہ کل ہی کتنی پریشان ہوئی تھیں۔ انہیں اس کے چہرے پر موت کی سی زردی نظر آئی تھی، مگر وہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ اگر نور علی اجازت دے تو وہ اس کو شہر لے جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ ان کو اجازت کس طرح دے گا، جس کے پاس خود گاڑی تھی اور اپنی تکلیف اور ضرورت کے وقت وہ فوراً شہر کو چل پڑتے تھے۔

''شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ...سب بیٹھے اس کی موت کا انتظار کر رہے تھے...... انسانوں اور گدھوں میں کوئی تو فرق ہونا چاہیے......'' انہوں نے سوچا۔ تھوڑی دیر اور بیٹھیں، جب تک کہ میت کو گھر سے اٹھا نہ لیا گیا۔ گھر سے میت کا نکلنا تھا، مرد تو جنازے کے لیے روانہ ہو گئے اور کھانوں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ انہوں نے اٹھ کر فاخرہ کی ماں کو گلے لگا کر تسلی دی، اپنی دیورانی کی طرف گئیں تو اس نے انہیں جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

''ایسے روٹی کے وقت پر کیسے کوئی اٹھ کر جا سکتا ہے۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ تکلف صرف اپنی سبکی نہ ہونے کی وجہ سے تھا، کوئی یہ نہ کہے کہ چوہدری نور علی کی بہو کے مرنے پر کوئی کھانا کھائے بغیر چلا گیا۔

''کوئی خوشی کا موقع ہے نہ میں کہیں دور سے آئی ہوں شکیلہ۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔ ''فاخرہ کے میکے والے دوسرے گاؤں سے آئے ہیں، ان کے لیے کھانے کا انتظام وغیرہ تو مناسب لگتا ہے، ہمارے لیے نہیں۔''

''ہمارے ہاں کا کھانا تم نے اپنے اوپر یونہی حرام کر رکھا ہے عابدہ آپا۔'' اس نے جتلایا۔ ''آپ تو اکبر علی کی شادی کا کھانا بھی کھائے بغیر چلی گئی تھیں۔''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے شکیلہ...... اور تمہیں علم ہے کہ اس موقع پر ہم آ بھی گئے تھے مگر تم لوگوں کا رویہ نامناسب تھا اسی لیے۔'' انہوں نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا، جتنی بھی وضاحتیں دیتے جاؤ، بات کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے شکیلہ سے مصافحہ کیا کیونکہ ان کے پاس جانے پر بھی وہ اپنی نشست سے اٹھی تک نہ تھی، حالانکہ وہ عمر اور مرتبے دونوں میں اس سے بڑی تھیں۔ مگر انہیں اس بات کی توقع بھی نہ تھی، اس نے عمر بھر کسی کا احترام کیا تھا، نہ کسی سے کروایا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھار تو اس کا دل چاہتا کہ وہ مر ہی جائے...... یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ نکاح کے لیے اس کے سامنے پکارا گیا تو اسے علم ہوا کہ جس کو سارا عالم گھوٹو کے نام سے جانتا تھا، اسے اس کے ماں باپ نے بھی کسی نام سے پکارا تھا، جہانداد......

زندگی اسے عذاب کی طرح لگنے لگی تھی، کاش وہ اس سے کسی طرح چھٹکارا پا سکتی، کاش اس نے کاجل کی طرح کا کوئی فیصلہ کر لیا ہوتا تو یوں گھٹ گھٹ کر نہ جی رہی ہوتی۔ کوئی ذریعہ آمدن کا نہ تھا، وہاں ہندوؤں کے گھروں میں ان کے مال مویشی کو سنبھال لیتا تھا تو اس کے بدلے اسے روٹی مل جاتی تھی مگر ان کے جانے کے بعد اب وہ کلثوم کے در پر ہی آ پڑا تھا، کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا...... اس کا بس چلتا تو اسے ہر روز لوگوں کے گھر بھیک مانگنے کو بھیج دیتا، اس کی تو نشے کی لت نہ پوری ہوتی جس کی وجہ سے وہ کلثوم کو جب جی چاہتا دھنک کر رکھ دیتا۔

جسے اماں یوں گھر میں چھپا چھپا کر رکھتیں کہ کسی کی میلی نظر اس پر نہ پڑے اور جس کا لالہ اتنا سخت مزاج تھا اس کے معاملے میں کہ اس کے ڈر سے وہ کبھی اکیلی کنویں سے پانی تک نہ لینے جاتی تھی، جسے زمانے کی اونچ نیچ کا علم ہی نہیں ہوا تھا کہ کھانے اور اوڑھنے پہننے کا کوئی تعلق کام کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنے گھر کی پناہ گاہ میسر تھی، ماں کی تربیت اور ماں اور بھائی کا پیار...... اس کی ماں کی پورا گاؤں عزت کرتا تھا اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس پر بری نظر ڈالے یا اسے کچھ کہے۔

ماں کی یاد اور بھائی کے عطا کردہ دکھ نے اسے اذیت میں مبتلا کر دیا، وہ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر روتی رہتی، سسکتی رہتی۔ اسے جہانداد نے ہی کہا کہ وہ چوہدری نور علی کے گھر کام کاج کے لیے جایا کرے تاکہ گھر کی دال روٹی چلے، وہ کر بھی یہی سکتا تھا کہ اسے کوئی کام ڈھونڈ دے، اس میں عقل اتنی کہاں تھی کہ وہ خود کوئی کام کرے۔ وہ اس کی ہدایت پر خاموشی سے عمل کرنے لگی، فریاد کا اسے حق تھا نہ شعور......

دن رات اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تو شکیلہ بی بی کو ہی شک پڑا اور انہوں نے اس کو معراج بی بی کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ دو جی سے تھی۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر اس کی کوفت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خود تو مصیبت میں تھی ہی، کہاں چاہتی تھی کہ وہ اس شخص کی اولاد پیدا کرے جس کے ساتھ سے ہی اسے گھن آتی تھی مگر اس کی شادی کا منطقی نتیجہ تو یہ تھا ہی۔

’’تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر؟‘‘ ایک دوسری ملازمہ نے اس سے پوچھا تھا۔

’’میں خود کون سا بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں جو کوئی اور آ جائے گا اس گھر میں اپنے حصے کے عذاب بھگتنے۔‘‘ اس نے بیزاری سے کہا تھا۔

’’یوں نہ کہو...... آنے والا تو اپنا مقدر خود لے کر آتا ہے، کیا پتا اس کے وسیلے سے تمہارے مقدر میں کوئی بہتری لکھی ہو۔‘‘ اس نے اسے سمجھایا۔

’’ہونہہ! بہتری...... میں نے تو اپنے نصیب میں اب کوئی بہتری آنے کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔‘‘ اس نے مایوسی سے کہا تھا۔

’’کھوماں۔‘‘ اس ایک لفظ سے اسے شدید نفرت تھی مگر جس دن سے شادی کے بعد گھوٹو نے اسے اس نام سے پکارا تھا، اس کے بعد جیسے یہی اس کی پہچان بن گیا تھا، کلثوم کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی اور وہ...... جس کا نام بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اسے کلثوم نے ہی تکریم دی کہ اسے جہانداد کے نام سے بلانا شروع کیا تو لوگوں کو بھی اس کے نام کا علم ہوا۔ کوئی گھوٹو کے بارے میں بات کرتا تو کلثوم یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو...... اس کے پیچھے کارفرما مقصد یہی تھا کہ کوئی اسے گھوٹو کی بیوی نہ کہے۔

’’میں جاؤں گی شام کو معراج خالہ کی طرف۔‘‘ اس نے اتنا کہہ کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

کسی کو دکھ پہنچا کر کب کسی نے سکون پایا ہے...... ایسا ہی ہے کہ انسان ببول بو کر یہ توقع کرے کہ اس پر گلاب اگنا شروع ہو جائیں۔ اسے ساتھ لے کر بھاگ بھاگ کر بھی عباس کو سکون نہیں مل رہا تھا، پکڑے جانے کا خوف اس قدر تھا کہ ہر روز وہ ٹھکانے بدلتا، ایک سے دوسرے شہر جا جا کر بھی اسے سکون مل رہا تھا نہ کام...... سب سے پہلے تو اس نے دیا کو برقع لے کر دیا تھا، کچھ زیورات وہ گھر سے لے کر آئی تھی، جو کہ پروگرام کے مطابق اس روز وہ صبح ہی ساتھ لے کر گئی تھی۔ ان زیورات کو انہوں نے کسی مشکل وقت کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔

دیا نے شہر کی مسجد میں جا کر قبولِ اسلام کیا اور اس کا اسلامی نام زہرہ رکھا گیا، اس کے بعد عباس نے اس کے ساتھ نکاح کیا تا کہ اگر کہیں پکڑے گئے تو کم از کم ان کا تعلق اتنا مضبوط ہو کہ کوئی ان پر قانونی کارروائی نہ کر سکے۔

ہر شہر میں چار دن گزارتے ہی خوف کا عفریت انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتا اور وہ پھر نئے شہر کو چل پڑتے۔ وقت اتنا گزر چکا تھا کہ اب ان کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا، البتہ گاؤں واپس جا کر معافی مانگنے کے ارادے پر ابھی عمل درآمد کا وقت نہ تھا، وہ اسے بتاتا کہ بی بی جی اسے معاف کر دیں گی کیونکہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور کلثوم تو اس بات پر بہت خوش ہو گی کہ دیا اب زہرہ ہے اور اس کی بھابی ہے، اس بات سے بے خبر کہ اس کے جنون نے اس کے پیاروں کے ساتھ کیا کیا تھا، ماں زندگی کی قید سے نجات پا گئی تھی اور بہن زندگی کی ایک ایسی قید کا شکار ہو گئی تھی کہ جس سے رہائی کی صورت کا اسے اور کوئی چارا نظر نہ آتا تھا۔

سال بھر تک بھاگتے رہنے کے بعد بالآخر انہوں نے شہر میں اپنا ٹھکانا کر لیا تھا، چھوٹا سا مکان کرایے پر لے کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ زہرہ پردے کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی، اکٹھے بھی وہ بہت کم باہر نکلتے ماسوائے

مجبوری کے...... وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ شاید عمر بھر کے لیے یہ احتیاط کرنا تھی۔

عاشقی اور معشوقی میں تو آنکھوں پر ایسی پٹی بندھ جاتی ہے کہ کسی کی کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر پول تب کھلتے ہیں جب انسان زندگی اکٹھے گزارنا شروع کرتے ہیں، زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے سے تمام تر تلخیاں عاشقی اور معشوقی کو بھلا دیتی ہیں اور عاشقوں کی خوبیاں بھی خامیوں کی صورت نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ سپنوں کے محل دھڑام سے گر جاتے ہیں، عباس اور دیا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، زندگی کے تلخ حقائق نے جلد ہی ان دونوں پر واضح کر دیا تھا کہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا......

☆☆☆

آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا، اماں گھر پر نہ تھیں، وہ اکیلی تھی۔ جب سے اوپر تلے گاؤں میں عجیب و غریب واقعات ہوئے تھے اماں نے اسے پڑوس میں بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز اسے ساتھ والے گاؤں جانا تھا اس لیے اس نے زرتاج سے کہا تھا کہ گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند رکھے اور کسی کے آنے پر بھی نہ کھولے، جب تک وہ واپس نہ آئے۔ وہ اپنی چادر پر کڑھائی کا کام لے کر بیٹھ گئی، ہانڈی بنا چکی تھی اس لیے فراغت میں وہ اس طرح کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کر لیتی تھی۔

اسے لگا جیسے چھت پر کوئی کودا ہو، اس نے کام روکا اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔ شاید کوئی بچہ وغیرہ پتنگ کے پیچھے کودا ہو، اس نے سوچا مگر اسی طرح چپکی بیٹھی رہی، چند ساعتیں گزریں تو ایک اور شخص کے کودنے کی آواز آئی، آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کودنے والے بچے نہیں تھے۔ کہیں شاکر ہی نہ شہر سے لوٹا ہو...... اس نے سوچا مگر اسے یوں چھت سے کود کر آنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ ایک نہیں دو لوگ ہیں۔ شاکر کو گئے ہوئے جانے کتنا عرصہ ہو گیا تھا اور جانے وہ لوٹ کر کیوں نہیں آیا تھا۔

گاؤں میں لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں مگر کسی کو اس پر کسی غلط کام کا شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ تھا ہی ایسا نیک فطرت۔ لوگ باگ یہی کہتے تھے کہ جانے اسے کسی نے لوٹ کر مار دیا ہو گا یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو گا۔ اس طرح کی بات سن کر اس کے دل کی کتنی ہی دھڑکنیں منتشر ہو جاتیں، اماں بھی اسے یہی کہتی کہ اگر وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہوتا تو کسی نہ کسی طرح اپنے بارے میں کوئی اطلاع تو بھجواتا۔ اس نے شاکر سے محبت کی تھی، اسے مستقبل میں اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھا تھا، وہ بھی اسے چاہتا تھا اور چپکے چپکے نظروں سے اسے محبت کے پیغامات دیتا تھا۔

چھت پر چلتے قدموں کی آواز نے اسے حال میں لا کھڑا کیا۔

وہ قدم سیڑھیوں سے اتر رہے تھے، اس نے پیش بندی کے طور پر کمرے کے دروازے کی کنڈا بھی لگا دی تھی اور وہ خود اس کمرے میں محصور ہو گئی تھی، فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ کتنا بڑا گھر تھا کہ انہیں اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کہاں تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، وہ چپکی بیٹھی رہی، دستک کی آواز مدھم تھی شاید آواز بلند ہوتی تو ہمسائے متوجہ ہو جاتے۔ اس نے سانس روک لی۔

’’بجائے خود کو اندر محصور کرنے کے میں اس وقت باہر نکل جاتی جب وہ لوگ چھت پر کودے تھے تو شاید میں شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کر لیتی......‘‘ اس نے سوچا۔

اب تو جس طرح اس نے خود کو مجبور کر لیا تھا سوائے انتظار اور دعا کے کوئی چارا نہ تھا۔ وہ دروازے سے کمر لگائے کھڑی تھی۔ ”کاش اماں آ جائیں یا کوئی اور!“ اس نے ہاتھ بلند کر کے دعا کی پھر وہ درود شریف پڑھنے لگی، اماں کہتی تھیں کہ درود شریف پڑھ کر کی جانے والی دعا رد نہیں ہوتی، اس نے زیر لب ورد کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

”بگے! دروازے کو ہلکا سا زور لگا کر اندازہ کرو کہ کتنا مضبوط ہے۔“ باہر سے آنے والی آواز سن کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

”فیضی استاد...... کنڈی لگی ہوئی ہے، وہ اندر ہی ہے، اس نے خود کو اندر بند کر لیا ہے۔“ بگے نے کہا تھا۔

”کیا کرنا ہے پھر، دروازہ توڑنا ہے یا پھر اسے کہیں کہ دروازہ کھولے؟“

”تم جس طرح کہو استاد، میں تو تیار ہوں اپنا کام کرنے کو۔“

”بگے تمہیں یاد ہے نا کہ حکم کیا ہے...... اسے تکلیف نہ ہو اور نہ ہی زیادہ شور مچے۔“ فیضی نے کہا تھا۔

زرتاج نے آہستگی سے رخ بدلا اور کوشش کرنے لگی کہ ان کو دیکھے، اسے صرف ذرا سی درز ملی اور اس میں سے اسے ایک شخص کی کالی پگڑی نظر آئی اور اس میں سے کہیں کہیں باہر نکلتے ہوئے گھنگرالے بال۔

”دروازہ کھولیں بی بی۔“ اسی نے دروازے کے قریب آ کر کہا تھا، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی...... باہر سے وہ بھی دروازے کی کسی درز سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ ڈر گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے اندر اندھیرا ہونے کے باعث کچھ نظر نہیں آئے گا، دروازہ بھی بند تھا اور بادل بھی تھے۔

”کون ہو تم؟“ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

”جو بھی ہیں، عزت سے آپ کو لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے کہا تھا۔

”کسی کے گھر کی چھت پھلانگ کر کسی کو لے کر جانا کیا عزت کے زمرے میں آتا ہے؟“ اس نے غصے سے کہا۔ ”تمہیں بھیجا کس نے ہے؟“

”یہ بتانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے بی بی۔“ بات تو وہ عزت کے ساتھ ہی کر رہا تھا۔

”جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں بھیجا کس نے ہے، میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“ اس نے مصمم لہجے میں کہا۔

”بی بی آپ ضد کر کے ہمیں زبردستی پر مجبور نہ کریں۔“ اس نے کہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ انہیں زبردستی کرنے کی اجازت نہیں تھی... پھر وہ کس طرح لے کر جاتے اسے؟ اس نے سوچا اور کوئی جواب نہ پایا۔

”اللہ میرے مولا! تو ہی مدد فرما۔“ اور اللہ نے اس کا یقین قائم رکھا اور بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔

”یہ کون آ گیا استاد؟“ بگے کی آواز آئی۔ ”اس کی ماں تو ہو نہیں سکتی، اس کے آنے کی تو شام تک کوئی امید نہیں۔“ انہوں نے ساری خبر رکھی تھی۔ دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا، زرتاج دعا کر رہی تھی کہ آنے والا مایوس ہو کر نہ لوٹ جائے، یقیناً کوئی ضرورت مند تھا۔

”اللہ کرے کوئی اتنا مجبور ہو کہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہی رہے۔“ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مداخلت ان کے منصوبے کا حصہ نہ تھی۔ ”زرتاج! گھر پر ہی ہو نا تم بیٹا؟ کوئی تمہارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“ پڑوسن کی بلند آواز نے اس کا حوصلہ اور بھی بڑھا دیا مگر وہ دروازہ نہیں کھول رہی تھی کہ آنے والوں کے پاس کوئی بے ہوشی کی دوا ہوئی تو اسے سونگھا دیں گے۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا تو ہمسائی کی طرف سے چارپائی گھسیٹنے کی آواز نے انہیں سٹپٹا دیا اور وہ بھاگے۔ اس طرح وہ تیزی سے غائب ہوئے کہ جب تک ہمسائی کے چارپائی پر چڑھ کر دیوار سے اسے پکارنے کی آواز آئی اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، تب تک وہ غائب ہو چکے تھے۔

”کیا ہو گیا زرتاج، کیا کر رہی تھیں تم؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”آپ سیدھے راستے سے یہاں آئیں خالہ جلدی۔“ اس نے کہا اور جا کر بیرونی دروازہ کھولا، آنے والی کا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ ”کلثوم! کیسی ہو تم، کتنے عرصے کے بعد دیکھ رہی ہوں تمہیں، خوش تو ہو نا تم؟“

”خوش؟“ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

”میری گڑیا...... میری جان۔“ وہ اسے گدگدا رہی تھی، اسکول سے آنے کے بعد وہ اس کی کل وقتی مصروفیت تھی۔ اسے نہلانا، اسے کھلانا پلانا اس کی دوا دارو کا خیال رکھنا، وہ یہ سب اسی طرح کرتی تھی جیسے اس نے اسے جنم دیا ہو۔ اس کی صحت بھی اب بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، شروع میں تو وہ کئی بار تائی اور مائی کہہ کر روتی تو مریم کی یہی سمجھ آتا تھا کہ وہ اپنی ماں اور تائی کو یاد کرتی ہے مگر جب جینا نے سوال کیا تو اسے فوراً جواب سوجھ گیا تھا کہ یہ سائرہ باجی کی بیٹیوں کے پیار کے نام تھے اور اتنے عام تھے کہ اسے تو ان کے اصل ناموں کا علم بھی نہ تھا۔

اس کی ترستی ہوئی ممتا کو قرار آ گیا تھا اور وہ اتنی مصروف ہو گئی تھی اس کے ساتھ کہ اسے کوئی گلہ شکوہ کسی سے نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھار سوچ آتی کہ دوبارہ اس جگہ پر جائے اور دیکھے کہ کہیں اس کے والدین اسے تلاش نہ کر رہے ہوں، کسی کے جگر کے ٹکڑے سے وہ اپنی ممتا کو ایسے تو نہیں سیراب کر رہی کہ کوئی ماں تڑپ رہی ہو۔ مگر اب اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزار کر وہ اس کی عادی سی ہو چلی تھی، اب اس میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ اسے کھو دیتی۔

جینا صبح سے لے کر اس کے اسکول سے واپس آنے تک اس بچی کے ساتھ ہی رہتی اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب جینا اپنی پیاس بجھاتی، اس کا خیال کرتی، اسے پیار کرتی۔ گڑیا اسے ماسی کہہ کر پکارتی تو وہ اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتی۔ بن دیکھے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سائرہ باجی کتنی مشفق ہوں گی کہ جن کی بیٹی اتنی پیار کرنے والی ہے، اتنی سی عمر میں بھی جینا اسے کوئی چیز دیتی تو وہ اس سے لپٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی۔

مریم کا تو اس کی محبت میں یہ حال تھا کہ وہ ذرا سا کھانستی بھی تو وہ متفکر ہو جاتی، گھر میں اس نے ہر قسم کی دوائے کر رکھ چھوڑی تھی کہ کبھی وقت بے وقت اس کی طبیعت خراب ہو تو اسے دوا لینے کے لیے باہر نہ جانا پڑے۔ اس کے لیے طرح طرح کے کھلونے جھنجنے وغیرہ لاتی اور خوب صورت پھولوں والے پرنٹ کے کپڑے خرید کر اس کے لیے فراکیں سلواتی اور اسے پہنے دیکھ کر نہال ہوتی۔

گڑیا بھی شروع شروع میں رونا شروع کرتی تو روتی ہی چلی جاتی، بتا تو نہیں سکتی تھی مگر انجان چہروں کو دیکھ کر منہ بسورتی...... مریم تو چٹا چٹ اس کی بلائیں لیتی، وہ سمجھتی تھی کہ کم عمر ہی مگر بچی اپنے قریبی رشتوں کو

پہچانتی ہو گی اسی لیے وہ اسے اور جینا کو دیکھ کر کبھی کبھار رو پڑتی تھی مگر بچہ تو اسی سے واقف ہو جاتا ہے جس سے اسے پیار ملے۔ چند ماہ کا عرصہ لگا اور جینا کا بار بار کا کہتے رہنا تھا کہ اس نے ایک روز مریم کے گھر داخل ہوتے ہی اس کی طرف بازو وا کیے، مریم نے اسے فوراً اٹھا کر اسے پیار کیا۔ ''اموں'' اس کا کہنا تھا کہ مریم اس پر فدا ہو گئی، اسی وقت اس کے سر کے اوپر سے ایک روپیہ وار کر جینا کو دیا کہ وہ جاتے ہوئے مسجد کے چندے والے ڈبے میں ڈال جائے۔

''اموں'' اس نے پھر کہا۔

''میری گڑیا'' مریم نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''میئی گویا'' اس نے مریم کی نقل اتاری تو وہ اور جینا بے اختیار ہنس دیں۔

☆☆☆

موجی کی بے چین ممتا کو زرتاج کو مل کر چین آ گیا تھا مگر یہ ملاقات اسے یوں لگا کہ چٹکیوں میں ختم ہو گئی تھی۔ چار دن کے بعد قائم علی اسے لینے آ گیا تھا، اس سے ملا بھی نہیں اور بیٹی کو لے کر چلا گیا۔ موجی اس کے جانے کے بعد دھاڑیں مار مار کر روئی۔ ''کیوں کر رہا ہے وہ ایسے، کیوں مجھے اتنی لمبی سزا دے رہا ہے اماں؟''
اس کی ماں اس سے بڑھ کر پریشان تھی، بیٹی کا غم دیکھا نہ جاتا تھا۔ بیٹے اور بہوئیں اچھی تھیں مگر وہ کتنا عرصہ بیٹی کو گھر بٹھا سکتی تھیں، ان کی بیٹی کی جوانی اور حسن ماند پڑتا جا رہا تھا۔

مانا کہ قائم علی کی ناراضی بجا تھی مگر یہ سب کچھ ہونا مقدر میں تھا، موجی کی غفلت ضرور تھی مگر کیا اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے نہیں کھوئے تھے، اس نے کچھ کو کھویا تھا اور جو بچ گئے تھے انہیں ملنے سے قاصر تھی۔ انہوں نے موجی کو زبردستی نماز کی طرف لگایا، اسے کوئی نماز چھوڑنے نہ دیتیں، اس کے بعد اسے محلے میں ایک بزرگ خاتون کے پاس بھیجنا شروع کیا تھا جو بچیوں کو دین کی تعلیم دیتی تھیں۔ وہ اگرچہ بچی نہ تھی مگر ان کا خیال تھا کہ موجی کو سکون ملے گا، دین کی باتیں سنے گی تو دھیان اپنی پریشانیوں کی طرف سے ہٹے گا۔

پہلے پہل تو موجی نے اسے صرف یہ سوچ کر سننا شروع کیا کہ ماں کا اصرار تھا، جو کچھ وہ سن رہی ہوتی تھی اس پر عمل کرنے کا اس کا ارادہ نہیں ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ میں آنے لگا کہ وہ کیا کہتی تھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ ہر مشکل کا حل اللہ سے لو لگانے میں ہے اور درود شریف پڑھ کر مانگی گئی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس نے قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور نماز کی پابندی کی، ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی اور اللہ سے لو لگالی۔

آزمائش کا دور طویل تو تھا اور صبر آزما بھی مگر جن اندھیروں میں نام خدا اجالا کرتا ہے ان کی تاریکی خوف زدہ نہیں کرتی۔ اس نے اس آزمائش کو اپنے مقدر کا حصہ جان کر اس پر صبر کیا، علیم اور وسیم یکے بعد دیگرے دبئی اور لندن چلے گئے اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کی بیویاں علیحدہ گھروں میں منتقل ہو گئیں کہ یہ گھر اب انہیں چھوٹا پڑنے لگا تھا، ظاہر ہے سب کے بچے تھے۔ اس گھر میں مزید اضافہ کرنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد نعیم نے ہی گھر اور بھائیوں کو سنبھالا اور بیاہا تھا۔

اس کی بیوی اس کی اور ان کی ماں کی بہت تابعدار تھی، موجی سے بھی اس کا پیار تھا اور اب جب موجی اس

پریشانی میں وہاں رہ رہی تھی تو وہ اس کا اور بھی خیال رکھتی تھی اس کی سب سے بڑی حسرت کہ زرتاج پڑھ جائے، اسے پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی، وہ اس کے پاس ہوتی تو کسی بھی طرح اسے اسکول بھجوایا کرتی مگر اب جب زرتاج آتی تو پوچھنے پر علم ہوتا کہ قائم علی اسے اسکول بھی نہیں بھیجتا تھا۔ جتنے دن بھی زرتاج اس کے پاس رہتی وہ باقاعدگی سے اسے پڑھاتی اور جاتے وقت اسے کتابیں اور نئے اسباق دے کر بھیجتی۔ زرتاج کو بھی شوق تھا، تین سال میں اس نے اسے پانچویں جماعت کا امتحان دلوایا تھا، اس وقت وہ چودہ برس کی ہونے والی تھی۔

اس بار قائم علی، زرتاج کو لینے آیا تو اس نے معراج سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نعیم نے اسے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دن بھی اس نے اس کو سوچے بنا نہیں گزارا تھا، اسے دیکھنے کے لیے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتی تھی جب وہ زرتاج کو لینے کے لیے آتا تھا..... اب تین سال کے بعد اس نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، وہ کشمکش میں تھی۔ تاہم اس نے اسے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مجھے تم سے امی جان کی وفات کا افسوس بھی کرنا تھا اور کچھ پوچھنا بھی تھا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا، موجی کی سوالیہ نظریں اٹھیں، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی نظر جھک گئی۔

''کیا تمہیں مجھ سے طلاق چاہیے؟'' وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے کوئی شوہر بیوی سے یہ پوچھے کہ کیا تمہیں خرچ کے لیے کچھ رقم چاہیے۔

☆☆☆

''الماس! میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے طور طریقے چند دنوں سے ٹھیک نہیں ہیں، کام پر تمہارا دھیان ہے، نہ تم باقاعدگی سے ریاض کر رہی ہو۔'' جہاں آرا نے اسے ڈپٹا۔ ''طوائف کا کام اپنے وجود سے تھکے ماندوں اور دکھ کے ماروں کو سکون دینا ہے نہ کہ ان کا دکھ خود سمیٹ کر بے سکون ہونا۔ ہمارے پاس یہ لوگ چند گھڑیوں کے سکون کے لیے آتے ہیں اور ہمیں اس وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ یہاں آنے والا کوئی گاہک مستقل نہیں ہوتا، اس لیے کسی سے ربط اور وابستگی بھی مستقل نہیں ہو سکتی۔ اپنے کام پر دھیان دو، باقی لڑکیاں بھی تمہیں دیکھ کر اپنے کام پر دھیان نہیں دیتیں۔''

''پر وہ اس طرح کا گاہک نہیں ہے اماں...'' اس نے بے بسی سے کہا تھا۔ ''وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے!''

''الماس۔'' وہ گرجیں۔ ''اس کے بعد یہ نہ ہو کہ میں اس کا یہاں آنا بند کر دوں۔ خود بھی اپنی اوقات میں رہنا سیکھو اور اسے بھی اس کی جگہ پر رکھو۔''

''اب اگر اس کی جگہ ہی میرے دل میں بن گئی ہے اماں تو میں کیا کروں؟'' اس نے ماں کے سامنے دل کھولا۔ ''میں اسے چاہنے لگی ہوں اماں، اس کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا اماں، مجھے صرف وہ اچھا لگتا ہے، وہ میرے دل میں دھڑکتا ہے اماں۔'' جہاں آرا تو دھک سے رہ گئیں، انہیں علم تھا کہ کسی طوائف پر جب عشق سوار ہو جاتا ہے تو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتا، اسے بے چین کر دیتا ہے اور اپنے پیشے سے متنفر..... مگر وہ کس طرح برداشت کر سکتی تھیں کہ ان کے کوٹھے کا خاص ہیرا یوں لٹ جائے، بیٹی کو پیار سے سمجھانا پڑے گا، انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''ابھی تمہاری عمران باتوں کی نہیں، ابھی تم جوان ہو، تم میں ہمت ہے، ابھی سے گھر بسا کر بیٹھ جاؤ گی تو آگے کیا ہوگا۔ چند برس اور..... اسے اپنی مٹھی میں رکھو پھر جو کچھ تم چاہو گی اسے دیکھ لیں گے۔'' انہوں نے رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میرا تو من اچاٹ ہوگیا ہے اپنے کام سے اماں، وہ مجھے عزت دینا چاہتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں ذلت بھرا یہ کام کرتی رہوں۔'' اس نے تنگ کر کہا تھا، جہاں آرا کو اپنی دنیا لٹتی نظر آرہی تھی۔ جانتی تھیں کہ اسے کتنا ہی سمجھا لیں، وہ اگر اڑ گئی تو اسے باز رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ بحث کرنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا۔

''چلو اٹھو اور استاد صاحب آئے ہیں، ریاض کرو۔'' ان کے کہنے پر اس نے بیزاری سے منہ بنایا۔ اگر جہاں آرا نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرنے کا سوچا تھا تو کچھ ایسی ہی سوچ الماس کو بھی آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماں کو کس طرح منایا جا سکتا ہے..... اس کے لیے کچھ ٹھوس حقائق سامنے آنے تک ماں کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

☆☆☆

''اس حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ناہید۔'' سلمٰی نے کہا۔

''جو بھی ہوتا ہو، نہیں واقع ہوتی تو میں خود عدالت سے طلاق لے لوں گی مگر واپس اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''میاں بیوی میں سو ناچاقیاں ہو جاتی ہیں، ہمارے درمیان بھی ہو جاتی ہیں..... تو کیا ہر بات پر طلاق کا مطالبہ کرنا شروع کر دیں؟'' سلمٰی نے اسے سمجھایا۔

''آپ بھی میری جگہ ہوتیں بھابی تو یقین کریں آپ بھی یہ سب کچھ نہ برداشت کر پاتیں..... میں نے بہت کوشش کی، میں اپنی ساس کی ہر اچھی بری بات کو خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی، یہ سوچ کر کہ وہ میری بزرگ ہیں، جیٹھ تو ہے ہی مٹی کا مادھو، اگر اسی میں دم ہوتا تو اس گھر میں حالات میرے لیے ناقابلِ برداشت نہ ہوتے۔''

''عورت ہی برداشت کرتی اور جھکتی آئی ہے، اب کچھ ہی دن میں تمہارے اپنے ہاں اولاد ہونے والی ہے اور اس کی خاطر ہی تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔'' سلمٰی نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اپنی اولاد کو تو میں اس چکلے میں آنکھ بھی نہ کھولنے دوں۔'' اس نے پرے ہٹ کر کہا۔

''ناہید..... تمہارے شوہر کا گھر ہے، کچھ خیال کرو کہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو!''

''آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں بھابی..... وہ شوہر تو تھا میرا مگر اب اس نے مجھے طلاق دی دی ہے، اپنی اس کلموہی بھاوج کی وجہ سے..... جسے اپنے شوہر سے زیادہ انور سے پیار ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''اس میں اتنا ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے، بڑی بھاوج ماں کی طرح ہوتی ہے اور اسے اگر دیور سے پیار ہے تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔'' انہوں نے اسے پھر سمجھایا۔ ''تمہارے بھیا انور سے بات کرنے گئے ہیں اور اسے سمجھائیں گے، تم ابھی یہیں رہو، اب تو تمہیں ویسے بھی یہاں آنا ہی تھا، بچہ تو اپنے ننھیال میں ہی پیدا ہوگا نا۔''

''اور آپ سمجھتی ہیں کہ وہ سمجھ جائے گا، اس کی بھاوج اسے سعید بھائی کی بات پر کان دھرنے دے گی؟''

”سب ٹھیک ہو جائے گا ناہید، تم اللہ سے اچھا گمان رکھو تو اچھا ہی ہوگا، انشاء اللہ۔“

”میرا اس سے علیحدہ ہو جانا ہی اچھا ہے بھابی۔“ اس نے کہا تو سلمٰی کو لگا کہ وہ پتھر کی دیوار سے سر پھوڑ رہی ہے۔

”ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے ناہید؟“ سلمٰی نے چڑ کر کہا۔

”کیا آپ مان سکتی ہیں کہ انور اور اس کی بھاوج کا آپس میں غلط نوعیت کا تعلق ہے۔“ اس نے لہجے میں رازداری پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”شرم کرو ناہید۔“ وہ بپھریں۔ ”تم یہ بھی بھول رہی ہو کہ کتنا بڑا بہتان لگا رہی ہو تم کسی پر...... ذرا سا جھگڑا کیا ہوا، تم ہر بات کو منفی انداز سے دیکھنے لگیں، تمہاری طبیعت ہمیشہ سے جلد بازی والی اور غصیلی رہی ہے مگر شادی کے بعد تو عورت میں متانت آ ہی جاتی ہے۔ ایسی بے بنیاد بات کو تم نے اپنی نظر سے ہی کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔“ سلمٰی نے اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ دیا۔

”میرا یقین کریں بھابی، میں جھوٹ نہیں بول رہی...... میں نے خود اپنی نظروں سے۔“ وہ رکی۔ ”اور میں نے اپنی ساس کو بتایا تو وہ...... وہ کہنے لگیں کہ وہ جانتی ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتیں کیونکہ بڑا بیٹا سیدھا سا ہے وہی کسی قابل نہیں تو وہ کیا کریں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ سلمٰی نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ بے شک جا کر خود اس کی ماں سے پوچھ آئیں۔“ ناہید نے انہیں مزید یقین دلانے کو کہا۔

”لو بھلا میں جاؤں گی تو وہ مجھے بتائیں گی کہ ایسی کوئی بات ہے؟“ اس نے پاچھا۔

”آپ ان سے چاہے نہ پوچھیں، سارا محلہ اس بات کو جانتا ہے، آپ باہر کسی سے بھی پوچھ لیں۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“ وہ بولیں۔ ”میں جا کر کسی سے کیوں تفتیش کرتی پھروں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا کیا غلط ملط خبریں پھیلاتے ہیں۔“

”میں غلط ملط بات نہیں کر رہی بھابی۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”بس اب تم آرام کرو، میں شاکر کی بچی کو بھی دیکھ لوں۔“ وہ اٹھیں۔ ”اس کے لیے کسی دیکھ بھال والی کا بندوبست بھی کرنا ہے۔“

”کہاں گیا ہے شاکر؟“ اس نے پوچھا۔

”صبح تمہارے بھائی صاحب کے ساتھ ہی نکلا ہے، شاید اسے کوئی کام وام ڈھونڈ کر دیں گے۔ ویسے بھی انہیں تو انور کے پاس جانا تھا، شاکر کو اسی لیے ساتھ لے گئے ہوں گے کہ وہ گھر پر کیا کرے گا۔“ طبیعت نے بتایا۔

”چلو اب اٹھو تم سستی جھاڑو اور نہا لو۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھابی، شاید تھکاوٹ ہو گئی ہے، کمر میں بہت درد ہے...... ذرا ٹھہر کر نہا لوں گی!“

”تم بھی نا...... سستی کی پوٹ ہو، کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہو۔“

”نہیں بھابی، سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ کراہی۔ ”اور اس کے علاوہ۔“ اس کی بات مکمل ہوتے ہی سلمٰی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔

☆☆☆

”ہاں مجھے طلاق چاہیے۔“ موجی نے متانت سے کہا تھا، قائم علی کو یہ موجی اس موجی سے مختلف لگی تھی جسے وہ جانتا تھا، جسے اس نے بلبلاتے اور تڑپتے ہوئے اس کی ماں کے ہاں چھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کو محرومیوں کا مجموعہ بنانے میں تقدیر کے ساتھ ساتھ قائم علی کا ہاتھ بھی تھا۔

”مگر کیوں؟“ اس نے مختصراً سوال کیا۔

”میں آزادی چاہتی ہوں اگر آپ کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق ہے تو یہی حق ہمارا مذہب مجھے بھی دیتا ہے، میں نے جو جرم کیا ہے اس کی کافی سزا پا لی ہے، اب مجھے پوری زندگی تو سزا کی صورت نہیں گزارنی ہے۔“ اس نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔ قائم نے تو ایسا ہونے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا...... بھلا موجی کیا کرے گی اس سے علیحدہ ہو کر...... وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ وہ اس کے نام پر بیٹھ کر زندگی گزار دے گی۔

”اور اگر میں انکار کر دوں تو؟“ اس نے سوال کیا۔

”تو میرے پاس متبادل راستہ ہے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”میں عدالت میں آپ سے خلع کے لیے درخواست دے سکتی ہوں۔“ موجی نے سر کو اسی طرح جھکا رکھا تھا جیسے وہ اپنے جرم کی سزا سننے کے انتظار میں ہو مگر اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ یہ اعتماد انہی آپا جی کا دیا ہوا تھا، جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح کی زندگی گزارنا اس کی پریشانیوں میں مزید اضافے کا باعث ہوگا، بہتر ہے کہ وہ ایسے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے جو اس کی بھول کو معاف کرنے کو تیار ہی نہیں۔

”مگر میں اس کے بغیر رہ سکتی ہوں، نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کا تصور کر سکتی ہوں۔“ اس نے ان کے سامنے اپنی قائم علی سے محبت کا اعتراف کیا تھا۔

”محبت تو ہمیں بہت سی چیزوں سے ہوتی ہے معراج۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔ ”مگر ہر چیز ہمارے نصیب میں نہیں ہوتی، کسی چیز کا ہماری زندگی سے چلے جانا مقدر میں ہو تو ہم اس کے بغیر مر نہیں جاتے۔ تم نے تو اپنی چار بیٹیاں کھوئی ہیں، تمہیں اللہ نے بہت خاص بنایا ہے کہ تم زندہ ہو ورنہ عام برداشت کی عورت اتنے صدمے سے مر جاتی یا گھبرا کر خودکشی کر لیتی۔“

”میں نے بھی بہت دفعہ خودکشی کا سوچا تھا مگر میں نے خود دیکھا ہے کہ انسان کے لیے اللہ کا بہترین تحفہ زندگی ہے، میں نے لوگوں کو ایک ایک سانس کے لیے ترستے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے مر جانے والوں کے لواحقین کو ماتم کرتے، سینہ کوبی کرتے، بین کرتے اور زندہ درگور ہوتے بھی دیکھا ہے اور پھر زرتاج سے مہینے میں ایک بار چند دن کے لیے ملنا میرے لیے اتنا خوشی کا وقت ہوتا ہے کہ باقی دن انتظار میں گزر جاتے ہیں۔“ وہ سسکی تھی۔

”دیکھو بیٹی۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ وہ طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جانے لگا ہے، جانے وہاں اس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے، وہ تمہارے جیسی نیک عورت کے قابل رہا بھی ہے کہ نہیں...... تم اس سے طلاق کا مطالبہ کرو...... وہ نہ آمادہ ہو تو اسے خلع کی دھمکی دو، اگر اس میں نیکی کی رمق ہے تو وہ تمہاری طرف لوٹ آئے گا، ورنہ تمہیں آزاد کر دے تو تم اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔“ ان کی بات موجی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ماں کی زندگی تک تو اسے اس گھر میں کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر

اب اسے لگنے لگا تھا کہ اس کا وجود اس گھر میں فالتو تھا۔

''ٹھیک ہے آپا جی، میں اس سے بات کرتی ہوں۔'' اور وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی، نعیم کے ذریعے اس نے قائم علی کو کہلا دیا تھا کہ اسے طلاق چاہیے۔ پہلے پہل تو نعیم اس کی بات سن کر حیران ہوا مگر جب اس نے موجی کی حالت دیکھی اور قائم علی کے طور طریقے، جو اسے اس کے کسی قریبی دوست نے بتائے تھے، اسی نے موجی کو بھی بتایا تھا کہ قائم علی کی کیا سرگرمیاں ہیں۔

''تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے موجی؟'' نعیم نے پوچھا تھا۔ ''بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔'' نعیم کو تو بہن کا کوئی بوجھ نہ تھا مگر اسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر پریشان رہتا تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ قائم علی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ موجی کو واپس لے جائے گا مگر اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی اس کے کوئی آثار نہ تھے اور اس کی وجہ تو یہی تھی نا کہ اسے پیسے کے عوض عورتیں میسر تھیں، اسے کیا کمی تھی۔ چار دن کے لیے زرتاج کو ان کے ہاں چھوڑ کر اس کا وقت وہیں گزرتا تھا۔ اس دکھ نے اس کی ماں کی جان لے لی تھی اور اب موجی خود گھل رہی تھی۔

''اچھا ہے موجی نے خود ہی یہ فیصلہ کیا ہے، کچھ عرصہ گزرے گا تو میں اسے سمجھا بجھا کر کسی جگہ اس کی شادی کروا دوں گا۔ اس کا گھر بھی بس جائے گا اور بال بچے ہوں گے تو اسے اپنا دکھ بھولنے میں آسانی ہوگی۔'' نعیم نے سوچا تھا۔

''ٹھیک ہے، زرتاج کو لینے آئے گا تو میں اسے تمہارا پیغام دے دوں گا۔''

موجی نے تو کسی اور کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا مگر آپا جی نے اسے سمجھایا تھا۔ ''بلاوجہ تجرد کی زندگی گزارنا بھی گناہ ہے۔ اگر اللہ نے تمہارے لیے کسی اور کو مقدر بنا دیا ہے تو خود بخود تمہارے سامنے وہ سارے حالات بنتے چلے جائیں گے۔'' اس نے اللہ کی رضا کے آگے، آپا جی کے سمجھانے پر سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

''تم تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہو۔'' وہ کلثوم سے لپٹ گئی تھی۔ پڑوس والی خالہ بھی آ گئی تھیں اور سختی سے اس سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ سے وہ ہرگز گھر پر اکیلی نہ رہے...... زرتاج نے دانستہ ان کے سامنے آنے والوں کے نام نہیں لیے تھے، وہ جانتی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھے کسی طاقت ور کے کارندے تھے اور یوں کسی کا منہ پھاڑ کر نام لے یا کسی پر شک ظاہر کرے گی تو مشکل میں پڑ سکتی ہے۔ ہاں البتہ اماں آئے تو اسے حرف بہ حرف بتانے کا سوچ رکھا تھا اس نے۔

پڑوسن تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی مگر اسے کہہ گئی تھی کہ وہ اس کی ماں کے آنے تک بار بار چکر لگاتی رہے گی۔ ''کہو تو پپو کو بھجوا دوں، یہیں بیٹھتا ہے جب تک تمہاری اماں نہیں آتیں؟''

''نہیں خالہ ٹھیک ہے، ابھی تو کلثوم آئی ہے، یہ کچھ دیر بیٹھے گی اور تم خود چکر لگاتی رہو۔'' اس نے پپو کے آنے کو ٹالا۔ اتنا انچلا بچہ تو شاید ہی کوئی ہوگا اور اسے گھر پر بلا کر اپنی شامت کو دعوت دینے والی بات تھی۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی اور زرتاج نے بیرونی دروازے کا کھٹکا لگا دیا۔

''شکر ہے کہ تمہیں میری یاد بھی آئی۔'' زرتاج اسے پھر لپٹ گئی تھی۔ ''کیسی ہو؟''

''بس ٹھیک ہی ہوں۔'' اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

''تمہارے انداز سے تو لگ رہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔'' وہ مسکرائی۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو......'' اس نے کہا۔ ''چوہدرانی جی نے کہا تھا کہ میں تمہاری اماں کو دکھاؤں، بس طبیعت ذرا گری گری سی رہتی ہے۔'' اور زرتاج اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر حیران تھی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''ان کا مطلب ہے کہ تم...... یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم...... میرا مطلب ہے کہ گھوٹو تو اتنا گندا ہے۔'' زرتاج معصومیت میں ایک غلط بات کہہ کر پچھتانے لگی۔

''وہ تو ہے زرتاج...... مگر میری شادی ہوئی ہے اس سے۔'' اس کے لہجے میں کیا تھا کہ زرتاج کے دل میں کوئی پھانس سی چبھی۔ ''کیا میں اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے ہاتھ بھی نہ لگائے...... کاش میں اسے کہہ سکتی۔'' اس نے سینے کی گہرائی سے کھینچ کر لمبی سانس لی۔

''چوہدرانی جی کا اندازہ ٹھیک ہے۔'' زرتاج نے اسے چیک کر کے کہا تھا۔ ''کیا تم یہ بچہ پیدا کرنا چاہتی ہو یا۔''

''اس غریب کو پیدا نہ کرنے والی میں کون ہوں، کون سا یہ میری ناجائز اولاد ہے۔'' کلثوم نے کہا۔ ''اور اسے پیدا نہ کروں گی تو کیا قتل کر دوں گی اور اسے نہ پیدا کروں گی تو کیا اس کے بعد کوئی نہیں آنے والا؟'' وہ سسکنے لگی۔

''ارے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' زرتاج ہکلائی۔ ''میں سمجھی کہ تم اس مقصد کے لیے آئی ہوگی اور اگر ایسی بات ہوتی تو میں خود تمہیں سمجھاتی۔''

''جہانداد سے بیاہ ہوا ہے میرا زرتاج، دنیا کی نظر میں شوہر ہے میرا، اسے میرے اوپر کلی اختیار ہے۔ میں اس کے ساتھ کیسے رہتی ہوں، کس طرح برداشت کرتی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔'' رو رو کر اس کا چہرہ تر ہو گیا تھا، اتنے دنوں کے بعد اسے کسی سہیلی سے دل کی بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ''مگر میں اپنی اولاد کو کس طرح مارنے کا سوچ سکتی ہوں، اس کا کیا قصور...... اسے کس ناکردہ جرم کی سزا دوں۔ جن کے جرم تھے، ان کی سزائیں بھی میں بھگت رہی ہوں...... کبھی تو میرا اللہ مجھ پر رحم کرے گا ناں!''

''اس طرح کی حالت میں اچھی اچھی باتیں سوچا کرو، یوں پریشان نہ ہوا کرو۔'' زرتاج نے اسے تسلی دی۔ ''جب دل چاہے میرے پاس چلی آیا کرو!''

''میرے پاس کہاں وقت ہوتا ہے کہ ادھر اُدھر گھومتی پھروں، سارا دن کام کاج میں گزرتا ہے۔''

''کتنا بڑا گھر ہے تمہارا جو کام کاج میں وقت گزرتا ہے اور دو بندوں کا کام ہوتا بھی کتنا ہے؟'' زرتاج نے ہنس کر پوچھا۔

''میں چوہدری نور علی کی حویلی میں کام کرتی ہوں زرتاج، اپنی روزی کمانے کے لیے کیونکہ جہانداد کچھ بھی نہیں کرتا اور اس کے نشے کی لت بھی تو پوری کرنا ہوتی ہے۔'' اس نے کہا تو زرتاج کو غصہ آ گیا۔

''وہ کام کیوں نہیں کر سکتا۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''اسے ہڈحرامی کی عادت تھی تو شادی کے بعد ہی تم اسے مجبور کرتیں، خود کام کرنے سے انکار کر دیتیں۔ تم نے بھی کیا ہے ایسا کام جو تم کر رہی ہو، اتنے نیک لوگوں کی اولاد کے ساتھ... کچھ انہوں نے کیا اس کے بعد بھی انہیں سکون نہیں آیا کہ اسے اپنی حویلی کی چاکر بنا ڈالا۔ تم اب اس کے بعد کام کرنے سے انکار کر دو کلثوم، کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اسے سیدھا کروا دیتی۔'' زرتاج کا پیچ و تاب کھانا بالکل قدرتی تھا۔

کس کے اختیار میں کیا کرنا تھا، وہ کلثوم بھی جانتی تھی۔ اسے علم تھا کہ اس کی بری عادتوں کو چھڑوانا ممکن نہ تھا مگر زرتاج کے سمجھانے کا اس پر کچھ تو اثر ہوا تھا۔ خاموشی سے سر جھکا کر وہ ساری بات سن رہی تھی، اپنے آنے والے بچے کی خاطر اسے کوئی نہ کوئی حکمتِ عملی وضع کرنا تھی کیونکہ بچے کی آمد کے بعد وہ کس طرح چوہدریوں کے گھر کا کام جاری رکھ سکتی تھی، بچے کو ساتھ لے کر حویلی جاتی یا اسے گلی محلے میں رُلنے کے لیے چھوڑ جاتی۔

''میں تمہاری بات تو سمجھ گئی ہوں مگر مجھے اپنی کامیابی کی قطعی کوئی امید نہیں ہے۔''

''چلو تم اس پر عمل درآمد تو شروع کرو، عورتیں تو بڑے بڑے سورماؤں کو مات کر لیتی ہیں۔'' زرتاج نے کہا۔

''سورما ہی تو نہیں ہے وہ زرتاج۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''سورما ہوتا تو میں یوں بے قدری سے نہ رُل رہی ہوتی!''

''صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' زرتاج نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''وہی تو کر رہی ہوں اور میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔'' اس نے آہ بھری۔ معراج بی بی کے گھر لوٹتے ہی اس نے اجازت چاہی اور چل دی، گھر میں جانے کتنے ہی کام اور جہانداد کی شکل میں عفریت اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

اسے کہاں عادت تھی یوں گھٹ گھٹ کر جینے کی، آزاد فضاؤں میں پل کر جوان ہوئی، ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ سارا مرادنگر اس کے لیے اپنے گھر جیسا تھا اور اب دو کمروں کے گھر میں گھٹے سے ماحول میں وہ کتنے عرصے سے ''محصور'' تھی۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی، عباس کام پر جاتا تو دروازہ کھولنے پر پابندی...... عباس کی محبت میں وہ کتنی ہی محبتوں کو پیر سے ٹھوکر مار کر ماں باپ کو عمر بھر کے لیے گھاؤ دے آئی تھی۔

واپس جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، اسے علم تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ ماں باپ سے رحم کی توقع عبث تھی، ماں تو اسے بارہا کہہ چکی تھی کہ جس دن اس کے باپ کو علم ہوگا، وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا...... مگر اس نے وہ دن آنے ہی نہ دیا تھا۔ جب سے کاجل نے اس کی ماں کو بتایا تھا اس کے بعد سے اس نے ہی عباس کو جلد از جلد اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کو کہا تھا کیونکہ اسے اپنی ماں پر شک تھا کہ وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے، کسی بھی وقت اس کے باپ کو بتا سکتی تھی...... اس وقت عباس کے عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، کسی اور کی بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

اب اسے یاد آتا تھا کہ کویتا نے بھی اسے اس کے گھر سے بھاگنے کے ارادے سے منع کیا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ شیکھر سے بات کر کے اسے منا لے گی، شیکھر اس کا بھائی، اسے بھائی کی یاد اُمڈ کر آئی، جانے وہ کیسا ہوگا۔ اب تو یقیناً اس کی اور کاجل کی شادی ہوگئی ہوگی، ہوسکتا ہے کہ کوئی بال بچہ بھی ہونے والا ہو...... اس نے اپنی حالت کا سوچ کر اندازہ لگایا۔ کاجل دوہٹی بن کر کتنی پیاری لگتی ہوگی...... اس نے سوچا، اماں نے کیسا خوب صورت لال جوڑا اس کے ماموں سے لکھنؤ سے منگوایا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ لال جوڑا کلثوم کو پہننے کو ملا تھا، جس کی شادی ان کے گھر کے ملازم گھوٹو سے ہوئی تھی۔ اسے کیسے علم ہوتا کہ اس کی سکھی کاجل کی چتا کی راکھ کو گنگا جل کے بجائے گندی نالی میں بہنا نصیب ہوا تھا۔

اسے کیا خبر کہ اسے اتنا پیار کرنے والے ماں باپ اور بھائی پر اس کے اس اقدام کے بعد کیا بیتی، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہے تھے، نہ سر اٹھا کر مرادنگر کی گلیوں میں چلنے کے لائق۔ وہ تو اپنی دنیا میں مست تھی اور اس امید پر دن گن رہی تھی کہ جب اس کا بچہ پیدا ہوگا تو عباس اسے لے کر گاؤں جائے گا۔ اپنے بچے کے لیے وہ جو بھی نام سوچتی وہ ہندوؤں کا ہی ہوتا تھا...... وہ بھی نام کی ہی مسلمان ہوئی تھی۔ بھلا جو کوئی کسی انسان کی محبت میں اپنا مذہب تبدیل کرے اس کی نظر میں مذہب کی کیا اہمیت۔

حافظ کرم اللہ اور بی بی جی جیسے نیک جوڑے کی اولاد...... عباس نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنے مذہب پر بھی بٹا لگایا تھا۔ پنج وقتہ نمازی...... اب اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ نماز کا وقت ہوتا کس وقت ہے۔ محنت مزدوری اس کی ضرورت بن گئی تھی، فکرِ معاش نے اسے نماز روزے سے بھی دور کر دیا تھا۔ جب اسے ہی یہ سب کچھ بھول گیا تھا تو وہ زہرہ کو کیا سکھاتا۔ محلے میں بھی وہ کسی سے نہیں مل سکتی تھی کہ کوئی اس کا اور عباس کا آگا پیچھا پوچھ بیٹھتا تو......

ایک دور دراز کے سرکاری اسپتال میں عباس اسے لے کر جاتا تھا تاکہ نزدیکی اسپتال جانے سے محلے میں کسی سے واقفیت نہ بنانی پڑ جائے۔ عباس نے اس پر اتنی پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ تنگ پڑ گئی تھی، کئی بار سوچتی کہ جب عباس گھر سے نکلے تو اسے باہر نکلنے میں کیا ممانعت ہے۔ دل میں عباس کا خوف تو تھا ہی کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے، اس سے زیادہ ڈر یہ تھا کہ اس کے گھر والے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک نہ آن پہنچیں۔

بیٹی کی پیدائش تک وہ گھر کا کام بھی خود کرتی رہی تھی کیونکہ عباس کو کسی کا ان کے گھر آنا بھی گوارا نہ تھا مگر جب اس پر اسپتال جانے کا وقت آیا تو وہی ہمسائے کام آئے تھے جن کو کبھی انہوں نے سلام تک نہیں کیا تھا۔

عباس شام کو کام سے لوٹا تو اس کا استقبال بستر پر پڑی زہرہ اور اس ننھی سی معصوم آواز نے کیا تھا۔ وہ سمجھا کہ ولادت گھر پر ہی ہوگئی ہے، فوراً بچے کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا ہے؟'' زہرہ کے جواب سے اس کا دل ذرا سا مرجھا گیا۔

''کس کو بلایا تھا مدد کے لیے؟''

''ہمسایوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا، تمہیں کہاں سے بلاتی...... نہ کسی سے مدد لیتی تو مر جاتی میں تو!'' اس نے صفائی دی تو وہ خاموش ہوگیا۔

''کچھ پکایا ہے؟'' اس نے بھوک سے بے چین ہو کر پوچھا۔

''ہمسائی ہی کچھ پکا کر گئی ہے، روٹیاں لانی پڑیں گی اور میرے لیے یخنی گرم کر کے دے دینا۔'' زہرہ کے کہنے پر وہ خاموشی سے روٹیاں لینے کے لیے باہر نکل گیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی بیٹی کو اٹھانا تو درکنار، نزدیک آ کر دیکھا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

سہیل کے باپ نے اسے سخت سست کہا تھا، نہ صرف اسے بلکہ اس کی ماں کو بھی کئی طرح سے باتیں سنائی تھیں کہ اس کی بے پروائی کی وجہ اس کی ماں ہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اولاد کی تربیت میں سختی زیادہ ہونی چاہیے اور مراعات کم، انہیں کچھ بھی چاہیے ہو تو ان کی فرمائش بغیر کسی وجہ کے پوری نہیں کر دینی چاہیے۔ انہیں کوئی نہ کوئی ہدف دینا چاہیے کہ ان کی مطلوبہ فرمائش اسی صورت میں پوری ہوگی جب وہ خود کو اس کا اہل ثابت کریں گے۔

ان کا منفی رویہ ہی تھا کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی سہیل اور وہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر نظر آتے تھے۔ سہیل کے بعد کوئی اور اولاد بھی نہیں ہوئی تھی، ایک وہی دنیا میں آ گیا تھا، اسی کا پچھتاوا تھا کہ وہ نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے کے پابند نہ ہوتے۔ نسرین عرف نینا، لاکھ کوشش کرتیں، اسلم کی نظر بازی کی عادت نہ چھڑوا سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ گھر سے باہر نکلتیں تو انہیں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کے علاوہ دنیا کی ہر عورت اور لڑکی نظر آتی، اسے دیکھنا اور گھورنا ان کا فرض تھا اور کھلے لفظوں میں اس کی چال ڈھال، اداؤں اور جسمانی ساخت پر تبصرے نینا کو بہت ناگوار گزرتے تھے۔

”جوان اولاد سے بات کرنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں .... اور آپ ہمیشہ اس کے سامنے مجھے غلط کہہ دیتے ہیں، کبھی میں نے بھی اسے کہا کہ آپ غلط ہیں یا اس کے ذہن میں آپ کے خلاف کوئی سوچ ڈالی ہو۔“ نینا نے نرمی سے کہا۔

”تم نے جو کچھ اس کے ذہن میں میرے خلاف ڈال رکھا ہے، میں سب جانتا ہوں۔ سب سمجھتا ہوں، میرے سامنے تم کچھ کہو نہ کہو مگر میں اس کے انداز دیکھ کر ہی سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لیے کیا سوچ رکھتا ہے۔“ اسلم نے غصے سے کہا۔ ”اس کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے بنا کسی شرط کے اسی لیے یہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا...... اب کے یہ فیل ہوا تو میں اس کی ٹانگیں بھی توڑ دوں گا اور گھر سے باہر بھی نکال دوں گا اسے، جائے اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرے۔“

نینا نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی مگر دل ہی دل میں سوچا کہ بعد میں اسے کہے گی کہ اسے ہاتھوں سے نہ ہی نکالے تو بہتر ہے۔ جس اولاد کی خاطر انہوں نے اپنی عمروں کے بہترین سال آپس میں مجبوراً ساتھ رہ کر بسر کیے ہیں، اگر اس کے ساتھ یہی سلوک روا رکھنا تھا تو چھوڑ دیا ہوتا اسے اپنے مقدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے اور دونوں اپنی اپنی زندگیوں کو اپنے انداز اور اپنے ڈھب سے گزارتے۔ مگر ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا اور ہر بار یہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مصداق ثابت ہوتا تھا۔

اسلم ایک بدنیت آدمی تھا اور بیوی کے معاملے میں بدزبان بھی۔ نینا کو صرف یہ ڈر تھا کہ سہیل کے فیل ہونے کی وجہ اس کی کوئی اور سرگرمی نہ ہو۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ عادتوں میں سہیل، اسلم پر نہ جا پڑے۔ مگر چاہنے سے بھلا ہونی کو کون روک سکا ہے۔ جس بات سے وہ خوف زدہ تھی، وہ ہو چکی تھی۔ عمر کے جس دور میں سہیل تھا، اس میں اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے، جو حرکتیں وہ وقتی لطف اٹھانے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، ان حرکتوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگیاں تہس نہس ہو جاتی ہیں۔

”سن رہے ہو تم؟“ اسلم نے دھاڑ کر پوچھا۔

”کیا ابو؟“ اس نے یوں بے پروائی سے کہا جیسے اس کا باپ اتنی دیر سے دیواروں سے باتیں کر رہا ہو۔

”تمہاری ماں کا سر..... خبیث ہو تم پورے۔“ انہوں نے حسبِ عادت اسے بری طرح جھاڑا اور سہیل نے حسبِ عادت ان کی ڈانٹ کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔

☆☆☆

”ہاں یہ رہے تمہارے اس دن کے پیسے۔“ منشی نے ان کا حساب چیک کر کے رقم ان کے ہاتھوں میں تھمائی۔ ”اور ہاں کس کس کی بیٹیاں ہو تم لوگ؟“

”جی، میں بالے ترکھان کی اور یہ دینو ماچھی کی۔“ نگی نے اپنا اور رانی کا تعارف کروایا۔

”کیا نام ہے تمہارا لڑکی؟“ منشی نے اپنی عینک کے پار سے رانی کو گھوری ماری۔

”جی میرا نام رانی ہے اور اس کا نگی۔“ اس نے تھوک نگل کر کہا۔

”میں نے تم سے فقط تمہارا نام پوچھا ہے۔“ اس نے اسے پھر گھر کا۔ ”کس گاؤں کی ہو؟“

”جی گاؤں سے باہر جو بھٹہ ہے اینٹیں بنانے کا..... اس کے پاس ہی ہماری جھگیاں ہیں۔“ اس نے سہم کر جواب دیا۔

”اور تم لڑکی، کیا نام ہے تمہارا؟“ انہوں نے نگی کی طرف گھور کر دیکھا۔

”جی نگی..... میرا مطلب ہے نگینہ۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”ابا کا نام دین محمد ہے جی!“

”میں نے کوئی تمہارا نکاح پڑھانے کے لیے تو تفصیل نہیں مانگی جو تم مجھے اپنے ابے کا نام بھی بتا رہی ہو۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”ایک تو ان نیچ لوگوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے کہ اپنی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی عادت ہوتی ہے۔“ وہ بڑبڑایا مگر انہیں سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا گل افشانی کر رہا تھا۔

”اب ہم جائیں جی؟“ نگی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا کرنا ہے تم نے اگر جانا نہیں ہے تو۔“ اس نے کہا تو وہ دونوں مڑیں اور چل دیں۔

”منشی صاحب۔“ رانی نے دو قدم چل کر ہی کچھ سوچا اور رک گئی۔

”اب کیا یاد آیا ہے، کیا کوئی اور رقم باقی رہ گئی ہے تیری؟“

”نہیں نہیں..... وہ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ چوہدری صاحب کب آئیں گے؟“ اس نے جھجک کر پوچھا۔

”کیوں؟“ چتون چڑھا کر منشی نے پوچھا تھا۔

”یونہی، بس ان سے ملنا تھا۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”جو بھی بات کرنی ہے، مجھ سے کہو، چوہدری صاحب یوں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو ملنا شروع کر دیں تو اور کوئی کام نہ کریں پھر تو۔“ اس نے اکڑ کر کہا۔

”جی کام تو کوئی نہیں تھا..... بس یونہی۔“ اس نے بہ مشکل کہا، منشی کا انداز ہی اتنا بے عزت کر دینے والا تھا۔

”چل اب رانی، دیر ہو رہی ہے۔“ نگی نے اسے گھسیٹا، منشی کے ہتک آمیز انداز نے اسے خاصا مایوس کیا تھا۔

”مجھے اس سے بات تو کرنے دیتیں تم، کیوں گھسیٹ لائی ہو تم؟“ رانی نے احتجاج کیا۔

”اگر تم نہ سمجھنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے رانی مگر میں اس سے زیادہ بے عزتی منشی کے ہاتھوں اپنی برداشت نہیں کر سکتی۔ دیکھ نہیں رہی تھیں تم کہ وہ کیسے گھور رہا تھا اور اس کی گفتگو..... کوئی تمیز ہی نہیں ہے اسے کہ لڑکیوں سے بات کیسے کرتے ہیں۔“ نگی روہانسی ہو رہی تھی۔ ”تو اگر پاگل ہوگئی ہے رانی تو جو تیرا من چاہتا ہے تو کر..... مگر میں اس کے بعد تیرے ساتھ نہیں آنے والی بے عزتی کروانے کے لیے، ہاں بتائے دیتی ہوں!“

انہیں دور جاتے دیکھ کر منشی سوچ رہا تھا کہ جانے ان غریبوں کے گھروں میں ایسے ہیرے اور لعل کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں، روکھی سوکھی کھا کر اور آدھا سال فاقے کر کے بھی ان کے چہروں پر کیسے تازگی نظر آتی ہے، دھوپ میں کام کر کے ان کی رنگت جلنے کے بجائے کشمیری سیبوں جیسی لال کیسے ہوتی ہے؟ ان کا دور رہنا ہی بہتر ہے، اپنے ماں باپ کے گھروں میں تو یہ چھپی بیٹھی رہتی ہیں مگر جس دن حالات انہیں گھروں سے باہر نکالتے ہیں،

یہ کسی نہ کسی کی نظر میں آ جاتی ہیں۔ گھروں سے کمانے کو نکلتی ہیں کہ ماں باپ عزت سے انہیں رخصت کر دیں اور اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہیں۔ اسی لیے بچیو، اسی لیے میں تم سے غصے سے بات کر رہا تھا کہ تم دوبارہ اِدھر کا رخ نہ کرو کہیں چوہدری اکبر علی یا اس کے بھائیوں...... اور تو اور ان کے باپ کی بھی نظر تم پر پڑ گئی تو تم بچ نہ سکو گی۔"

"ٹھیک ہے، دفع رہ تو، مر کہیں جا کر...... مجھے نہیں چاہیے تیرے جیسی سہیلی۔" رانی نے غصے سے کہا۔

"تجھے میری خوشی کا خیال ہے نہ مجبوری کا احساس۔"

"رانی...... دیکھ۔"

"بس دیکھ لیا تیرا پیار رانی نے، اب جو بھی کرنا ہوگا میں خود ہی کر لوں گی۔ چوہدری صاحب سے ملنے کے لیے رانی کو منشی سے دس بار بھی بے عزتی کروانی پڑی تو کروا لے گی۔" یہ کہہ کر نگی کا ہاتھ جھٹک کر وہ مخالف سمت کی پگڈنڈی پر چل دی، نگی اسے خود سے دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ رانی سمجھنے سمجھانے کی حد سے باہر جا چکی ہے۔

☆☆☆

جس طرح قائم علی کی بیٹیوں کا کچھ اتا پتا نہ تھا...... اسی طرح سلیم کی خودکشی کا واقعہ بھی ایک معمہ ہی رہا تھا۔ کالج سے پولیس کو کوئی سراغ ملا تھا نہ اس کے دوستوں میں سے ہی کوئی تسلی بخش جواب دے سکا تھا۔ اس کے ساتھی طالب علموں کے لیے تو اس حادثے کو بھلانا مشکل تھا ہی مگر اس واقعے کے جو اثرات سہیل پر ہوئے تھے، انہوں نے اس کی تعلیمی کارکردگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ پرنسپل صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلایا تھا۔

"مجھے حیرت ہے سہیل کہ تم ایک اوسط قسم کے طالب علم سہی مگر اب کی بار جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ نا قابلِ یقین ہے، مجھے تمہارے اساتذہ نے بتایا ہے کہ زیادہ تر پرچے تم نے خالی ہی ممتحن کے حوالے کر دیے ہیں۔"

پرنسپل نے اس سے کہا تو وہ یوں ان کا منہ دیکھنے لگا جیسے انہوں نے کوئی انکشاف کیا ہو۔

"خالی۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "خالی پرچے دے دیے؟"

"تو کیا میں مذاق کر رہا ہوں تم سے سہیل؟" پرنسپل صاحب نے غصے سے اسے کہا۔ "میں تمہارے والد صاحب کو بلا کر شکایت کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ اتنے غصیلے آدمی ہیں کہ ہر بار ان کا آنا یہاں پر تماشا کھڑا کر دیتا ہے، اس لیے میں نے تم سے بات کرنے کا سوچا اور اگر تم چاہتے ہو تو میں انہیں بلا لیتا ہوں؟"

"نہیں سر...... ایسا نہ کریں، میں خود نہیں سمجھ پا رہا کہ ایسا کیسے ہوا، میں کیسے خالی پرچے دے سکتا ہوں، میں نے بہت اچھی تیاری کی تھی۔" وہ گڑگڑایا۔

"میں سمجھتا ہوں سہیل کہ سلیم کی خودکشی نے تمہارے ذہن پر خاصے برے اثرات مرتب کیے ہیں، وہ تمہاری پڑھائی میں مدد بھی کرتا تھا، اور اس کے نوٹس سے تم تیاری کرتے تھے۔" پرنسپل نے کہا۔

"سر میں نے افضال اور ندیم سے نوٹس لے لیے تھے اور سلیم کے نوٹس بھی میرے پاس ہی تھے، میں نے بہت محنت کی تھی سر، میرے ابا نے مجھے الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ میں فیل ہوا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ آپ دوبارہ میرا امتحان لے لیں، مجھ سے زبانی سب کچھ سن لیں بے شک۔" اس نے گھگیا کر کہا۔

"یہی بات تو مجھے مخمصے میں ڈال رہی ہے، تیرھویں جماعت کا طالب علم اتنا غیر ذمے دار اور غیر حاضر دماغ تو نہیں ہو سکتا کہ پرچے پر اپنے نام اور رول نمبر کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھے اور وہ بھی کہ وہ پورے تین گھنٹے تک امتحانی ہال میں بیٹھا بھی رہے۔"

"سر میرا یقین کریں، مجھے پورا یقین تھا کہ میں پاس ہو جاؤں گا، مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا سر...... مجھے ایک اور موقع دیں سر!"

"مجھے افسوس ہے سہیل کہ تمہارا پورا ایک سال اور محنت ضائع گئی مگر ہم اپنے کالج کے قواعد و قوانین ایک ایک طالب علم کے لیے تبدیل نہیں کر سکتے۔ مجھے امید ہے اس بار تم محنت کرو گے اور اپنا امتحان پاس کر لو گے۔" انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو...... اور ہاں اگر تم نے پہلے ششماہی امتحان تک اپنی کارکردگی میں بہتری نہ دکھائی تو مجبوراً تمہارا نام کالج سے کاٹ دیا جائے گا۔" اس نے رک کر ان کی بات سنی اور اسے سمجھ کر اس کی سانس رک گئی۔

اگر یہ بات پرنسپل صاحب اس کے باپ سے کہتے تو وہ کسی بات کا لحاظ نہ کرتے اور یہاں سے اسے جوتے مارتے ہوئے گھر تک لے کر جاتے۔

☆☆☆

ناہید نے بیٹی کو جنم دیا تھا، گھر پر بچوں کے پاس ہی اس نے شاکر کی بیٹی کو چھوڑا تھا اور اپنی ہمسائی کو بچوں کے پاس ہی رہنے کو کہا، تب تک، جب تک شاکر یا سعید میں سے کوئی لوٹ کر نہ آ جائے۔ اس نے ہمسائی کو بتایا تھا کہ شاکر ان کا دور پار کا رشتے دار ہے اور اس کی بیوی اس بچی کی پیدائش کے دوران ہی انتقال کر گئی تھی اس لیے وہ اسے لے کر شہر آ گیا تھا۔ ہمسائی سلمیٰ کو اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے پاس اس بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شاکر ہی پہلے لوٹا تھا، اس کے بعد ہمسائی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ہاجرہ نے شاکر سے چائے یا روٹی کا پوچھا، بھوک تو اسے تھی مگر اس نے سوچا بچی کو کیا تکلیف دے۔

"بیٹا چائے بنا دو اور اگر ساتھ کوئی بسکٹ وغیرہ ہیں... ورنہ میں جا کر دکان سے لے آتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے ماما جی، میں چائے بناتی ہوں۔" وہ اٹھی تو شاکر بچی کو لٹا کر بسکٹ لینے چلا گیا بسکٹ کے دو تین ڈبے اس نے لیے اور پھر جانے کیا سوچ کر اس نے بچوں کے لیے ٹافیاں بھی لے لیں۔

"آپ نے یہ تکلف کیوں کیا ماما جی؟" ہاجرہ بہت سمجھدار بچی تھی۔

"ماما جی بھی کہتی ہو اور کہتی ہو کہ تکلف بھی کیا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے...... اس کا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نام تو ابھی رکھا ہی نہیں۔" وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں میں لوٹ کر گاؤں جائے گا اور زرتاج سے پوچھے گا کہ اس بچی کا نام کیا رکھنا تھا اسے...... اور وہ تھی کس کی بچی۔

"اب تو یہ سات دن کی ہو گئی ہے، اس کا نام رکھ لینا چاہیے۔" ہاجرہ کے کہنے پر اسے خیال آیا کہ کب تک وہ بچی بے نام رہے گی، کوئی نہ کوئی نام عارضی طور پر رکھ لے اور اگر زرتاج کو پسند نہ آیا تو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

"تم بتاؤ، تمہیں کون سا نام اچھا لگتا ہے؟" شاکر نے اس سے پوچھا۔

"مجھے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "آج امی گھر آئیں گی تو انہیں کہیں گے کہ اس کا کوئی نام رکھیں، انہیں بہت سے ناموں کا پتا ہوگا، ہم سب بہن بھائیوں کے نام انہوں نے رکھے ہیں۔" چائے پینے کے دوران ہی سعید بھی لوٹ آیا تھا، بچوں نے اسے بتایا کہ ماموں ان کے لیے ٹافیاں لائے تھے۔ سعید نے اسے آئندہ کے لیے

ایسے تکلفات سے منع کیا تھا۔ چائے پی کر اس نے کہا کہ وہ اسپتال جاتا ہے شاید اس کی ضرورت ہو وہاں۔

''دکان پسند آئی تمھیں؟'' سعید نے اس سے پوچھا تھا۔ شاکر نے اس سے کہا تھا کہ وہ کوئی دکان کھولنا چاہتا ہے، ابھی تک اس نے اپنے کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ اپنا سارا سونا بھی اس نے اسی طرح اپنے پاس سنبھالا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں تو رہ رہا تھا مگر ابھی تک انہیں اتنا نہیں جانتا تھا کہ انہیں اپنے بارے میں سب سچ بتا دیتا۔

''اچھی ہے، ذرا بڑی ہے اور کرایہ بھی زیادہ ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''کرایے کے لیے تو میں بات کرلوں گا مگر بڑی دکان تو اچھی ہے، جو بھی کاروبار تم شروع کرو گے اسے انشاءاللہ آگے بڑھنا ہی ہے، بعد میں دکان تبدیل کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی بڑی دکان لے لو۔'' سعید نے تجویز دی۔

''میں وہاں سے ہو کر آپ کی دکان پر جا بیٹھا تھا، میں نے ان کو بتایا کہ میں آپ کا دور پار کا سسرالی رشتے دار ہوں، تھوڑی دیر وہاں بیٹھا تھا، میں نے سوچا کہ آپ نہیں ہیں تو مالک کی غیر حاضری میں بے پروائی نہ کریں۔''

''بہت مہربانی، تم نے ایسا سوچا اور اتنا خیال کیا۔'' سعید نے احسان مندی سے کہا۔

''میں نے کتنے دن آپ کا نمک کھایا ہے، جانے کب میرے لیے کوئی بندوبست ہو، کب گھر ملے یا کوئی کرایے کا کمرہ اور میں وہاں منتقل ہوں گا، تب تک تو آپ لوگوں کے گھر پر ہی ہوں...... آپ ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' شاکر نے کہا۔

''ہر کوئی اپنے نصیب کا کھاتا ہے، ایسی بات کر کے تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔'' سعید نے کہا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

''آپ جس کام سے گئے تھے، اس کا کیا بنا؟'' شاکر نے اس سے پوچھا۔

''کوئی امید نظر نہیں آتی۔'' سعید نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ ''دیکھو شاید بچی کی ولادت کا سن کر اس کا دل موم ہو جائے!''

☆☆☆

''کیا اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑی ہو، اٹھو مجھے چائے بنا کر دو اور اپنے کام پر جاؤ۔'' جہانداد نے غصیلے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، خود ہی چائے بناؤ اور مجھے بھی بنا کر دو۔'' اس نے سستی سے کہا۔ ''اور کام پر بھی نہیں جا سکتی میں، منع کیا ہے!''

''کس نے منع کیا ہے تمھیں، کیا چوہدرانی جی نے منع کیا ہے؟'' وہ چلایا۔ ''کیا ہوگا نا تم نے کوئی لفڑا...... یا کوئی چوری چکاری کی ہے۔'' وہ خود ہی قیاسے لگا رہا تھا۔

''مجھے چوری کی عادت ہے نہ لفڑے کی اور نہ ہی چوہدرانی صاحبہ نے منع کیا ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تو پھر کس مائی کے لال نے تجھے روکا ہے کام پر جانے سے؟''

''بتایا ہے تمھیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور معراج خالہ نے منع کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ پھوپی لگتی ہے تیری کہ تجھے منع کرے...... اور ملی کہاں تجھے، وہ تو دوسرے محلے میں رہتی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں گئی تھی اس کے پاس، کہیں راستے میں نہیں ملی تھی وہ۔''

''تو گئی تھی؟'' اس نے آنکھیں چندھیا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کس لیے گئی تھی تو وہاں پر؟''

''چوہدرانی جی نے بھیجا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا، جانتی تھی کہ اس کے آگے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

''انہوں نے کس کام سے بھیجا تجھے وہاں...... ابھی تو ان کی بہو مری ہے اور باقی بیٹے تو ابھی کنوارے ہیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کہیں خود ہی تو چوہدرانی پر جوانی پلٹ کر نہیں آگئی۔'' اس نے آنکھ مار کر کہا۔

''جا کر پوچھ لے اُن سے۔'' کلثوم نے کہا تو وہ بدکا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا کہ میں جا کر ان سے پوچھوں اور تو بھی سن لے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔ ''خبردار جو جا کر ان سے یہ اول فول بکی تو۔''

''جب تجھے پتا ہے کہ یہ اول فول ہے تو کون کہتا ہے کہ ایسی باتیں کیا کر۔'' ہونہہ کہہ کر اس نے سر کو جھٹکا۔

''سارے نخرے نکال دوں گا میں تیرے۔'' اس نے اسے ڈانٹا۔ ''سیدھی طرح اٹھ اور اٹھ کر چائے بنا کر مجھے بھی دے اور خود بھی پی کر کام پر دفع ہو۔''

''بتا دیا ہے میں نے تمھیں، کہ میں نہ کام پر جا سکتی ہوں نہ اٹھ کر چائے بنا سکتی ہوں، مجھے منع کیا ہے معراج خالہ نے۔'' اس نے پھر دُہرایا۔

''کیوں منع کیا ہے اس نے تجھے؟'' وہ ذرا سا دبک گیا۔

''کیونکہ میں...'' وہ رکی۔ ''کیونکہ میں ماں بننے والی ہوں۔'' کہہ کر وہ شرما گئی۔

''دماغ ٹھیک ہے تیرا...... کس کی ماں بننے والی ہے تو اور کس طرح؟'' وہ گرجا۔

''ماں کس طرح بنتے ہیں۔'' اس نے اس کا چہرہ دیکھا جو غضب سے لال ہو رہا تھا۔

''جس طرح بھی بنتے ہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ تو ماں بنے...... بس بہت ہوگئی بک بک، ختم کر اس قصے کو!''

''یہ قصہ نہیں ہے جسے ختم کر دیا جائے، بچہ ہے، اولاد ہے ہماری۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے اولاد کی، میرا کون سا تر کہ پڑا ہے جس کے لیے میں اولاد پیدا کرواؤں تم سے؟'' اس نے کہا تو وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

''انسان شادی اولاد کے لیے ہی تو کرتا ہے، اگر تمہیں اولاد پیدا نہیں کرنا تھا تو پھر شادی کیوں کی تھی مجھ سے؟''

''شادی میں نے نہیں کی تھی تم سے، زبردستی تمہیں میرے سر مڑھ دیا گیا تھا۔'' اس نے انکشاف کیا شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کلثوم سے شادی کر کے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔

''اللہ جانتا ہے کہ کسے کس کے سر مڑھ دیا گیا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔

''مجھے تو بس اتنا کہا تھا رام لال نے کہ میں تمہاری زندگی کو سزا بنا دوں۔'' اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا اس لیے وہ نئے انکشاف کر رہا تھا۔ ''تمہارے بھائی نے میرے مالکوں کی زندگی کو عذاب بنا دیا تو انہوں نے بدلہ لینے کے لیے اپنے دشمن کی بہن کو چنا اور اسے میرے حوالے کر دیا۔''

''جیسے اس سزا کا لالے کو علم ہے اور اسے کوئی فرق پڑ رہا ہے۔'' کلثوم نے کہا۔

''بہت بدزبانی کرنے لگی ہے تو۔'' وہ اٹھا اور اس سے قبل کہ وہ اس کی طرف بڑھتا، وہ تیزی سے باہر کو لپکی، دروازہ کھولا اور اس کے نتھنوں بیچ کھڑی ہو گئی۔

”ایک قدم بھی اس سے آگے بڑھایا تو میں سارے محلے کو اکٹھا کرلوں گی اور انہیں بتاؤں گی کہ تم مجھے مار رہے ہو۔“ وہ حیرت سے شیرنی بنی اس عورت کو دیکھ رہا تھا، جس نے بارہا اس سے مار کھائی تھی اور کبھی اُف تک نہ کی تھی۔

”دروازہ بند کرو اور مجھے دھمکیاں دینے کا انجام جانتی ہے نا کہ کیا ہوسکتا ہے؟“ اس نے اسے دھمکایا۔

”کیا کرلو گے تم میرا؟“ اس نے جواباً اسے کہا۔ ”اب تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ!“

”اگر میں نے تمہیں طلاق دے دی تو تم کہیں کی نہ رہو گی۔“ اس نے کہا۔

”طلاق دو گے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی، ہونہہ! میں تو اب کہیں کی نہیں ہوں...... ہاں البتہ طلاق دے کر تم کہیں کے نہ رہو گے، نہ کوئی گھر ہوگا نہ گھاٹ۔ بھیک مانگتے پھرو گے!“

”میں سب سے کہوں گا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔“ اس نے اس کی دھمکی سے ڈر کر اسے الٹا ڈرانا چاہا۔

”یہ کہہ کر بھی دیکھ لو...... لوگوں کو یقین آجائے گا کہ تم مرد ہی نہیں ہو۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے کہا تھا۔

”اچھا بڑا دم ہے تجھ میں۔“ وہ نزدیک آیا کہ اس کو بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر لائے اور اسے اتنا دھنکے کہ اس کے اندر بچے پیدا کرنے کا شوق ہی دم توڑ جائے۔ ”چل اب اندر آ اور آکر مجھے چائے بنا کر دے۔“ اس نے فوراً اپنا لہجہ بدل لیا۔ اسے ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانا اچھی طرح آتا تھا، ایک یہی بات تو اس نے ہندوؤں کے گھروں کی چاکری کرتے ہوئے سیکھی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں چائے بنا دیتی ہوں تمہیں مگر کام پر نہیں جاؤں گی...... تم خود کام کرو، ساری دنیا کے مرد ہی کام کرتے ہیں۔“ اس نے دروازہ بند کیا اور صلح جو لہجے میں بولی۔ ”اگر تم کام پر نہیں جاؤ گے تو میں چوہدرانی جی سے کہہ دوں گی۔“ اس نے ٹھیک تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

”میں کیا کام کرسکتا ہوں؟“ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”میں کتنا کمزور اور بیمار ہوں تمہیں تو علم ہے!“

”تم کمزور ہو نہ بیمار...... نشے کی لت نے تمہیں مستقل مریض بنا دیا ہے۔“ اس نے سمجھایا۔ ”نشہ کوئی اچھی عادت تو نہیں، اگر تم چاہو تو اسے چھوڑ کر بالکل تندرست ہوسکتے ہو۔“

”میں کیسے ٹھیک ہوسکتا ہوں۔“ اس نے کہا، دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ٹھیک ہو کر کرنا بھی کیا ہے۔

”اللہ کرے گا تو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ جہاندادا اپنے ذہن میں کیا منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی بات اس کے شوہر کے دل کو لگ رہی تھی۔ ”تو پھر جاؤ گے نا تم آج سے کام پر؟“

”آج تم چلی جاؤ آخری دفعہ، میں کل سے کام پر جاؤں گا، آج دیکھتا ہوں کہ میں کیا کام کرسکتا ہوں۔“ اس کے کہنے پر جیسے اسے یقین آگیا۔

”ٹھیک ہے...... لیکن کل یہ بہانہ نہ کرنا۔“

”کل...... وعدہ ہے کہ کل یہ بہانہ نہیں کروں گا۔“ اس نے کہا، مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”کل تمہاری زندگی میں آئے گی تو نا!“ اس نے سوچا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کلثوم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس پر عمل کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

کی ماں شکیلہ بیگم، ان بچیوں کے قتل کا حکم ملازماؤں کو صادر کرتی ہے۔ معراج، چوہدری مراد علی کے مرحوم منشی قائم علی کی بیوہ۔ منشی قائم علی چند برس پہلے اپنے گاؤں خوشحال نگر سے اسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ اپنے گاؤں سے وہ تجارت کے لیے شہر جاتا تھا، وہیں اس کی ملاقات موجی یعنی معراج سے ہوئی تو وہ دل ہار بیٹھی اور وہ اس سے شادی پر آمادہ ہوگئی۔ پھر ایک حادثے نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ معراج جس نے نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی، گاؤں میں عورتوں کے لیے ڈسپنسری بنائی اور اپنے تجربے سے ان کی مدد کرنے لگی۔ زرتاج سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ماہ تاج کسی درندے کی زیادتی کا شکار ہوگئی اور چھوٹی دو جو کہ جڑواں تھیں، گم ہو گئیں۔ بچیوں کی گمشدگی کو معراج کی غفلت جان کر قائم علی نے اس کو شہر بھیج دیا۔ قائم علی سکون کی تلاش میں ایک کوٹھے پر جا پہنچا۔ ماہ تاج سے زیادتی کرنے والا سہیل ایک آوارہ اور بدکردار نوجوان ہے جو ماں باپ کے باہمی اختلافات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نے اپنے ساتھ زبردستی اپنے دوست سلیم کو شریک جرم کر لیا۔ وہ اس گناہ پر خود کو معاف نہیں کر سکا اور خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور وہ ہر وقت خوفزدہ رہتا ہے۔ اس کی ماں نسرین عرف نینا بیٹے کی حالت سے پریشان ہے۔ سہیل کا باپ اسلم کردار کا کمزور آدمی ہے۔ قائم علی کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک، جہاں آرا نامی طوائف کے ہاتھ لگتی ہے جس کے پاس اس سے قبل ہر عمر کی چھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔ الماس سب سے بڑی ہے اور اس کا نام فیروزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں آرا کا اپنا سگا بیٹا، دلاور ہے، جسے عرف عام میں دلی کہتے ہیں۔ جہاں آرا اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے۔ مریم ایک استانی ہے، جس کا آگا پیچھا اس کے محلے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی ایک دور پار کی رشتہ دار سائرہ ہے جس کے ہاں وہ پشاور جاتی ہے تو واپسی پر ایک گمنام، چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے لیٹرین میں ایک بچی اسے بے ہوش ملتی ہے، یہی قائم علی کی دوسری بیٹی ہے۔ اپنی ملازمہ جینا کو وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی کزن سائرہ نے اسے یہ بیٹی دے دی ہے۔ یوں قائم علی کی بیٹیاں، حسن آرا، ستارہ بن کر مریم کے گھر میں اور تین تارا، فیروزہ بن کر جہاں آرا کے گھر میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ زرتاج جب چوہدرانی شکیلہ کا حکم سنتی ہے تو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں خبر آتی ہے کہ چوہدری اکبر علی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پیدا ہونے والی بچیوں میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے اور اکبر علی کی بیوی فاخرہ کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ زرتاج بے اختیاری میں اس بچی کو اٹھا کر شاکر کے پاس جاتی ہے۔ شاکر گاؤں کا نوجوان سنار ہے اور اس کی بات زرتاج سے تقریباً طے ہے۔ زرتاج شاکر سے کہتی ہے کہ اس بچی کو چھپا لے۔ زرتاج کے علم میں لائے بغیر وہ فوراً تڑکے اس بچی اور اپنا سارا سونا وغیرہ لے کر گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں بس میں اس کی ملاقات ناہید نامی ایک نوجوان خاتون سے ہوتی ہے۔ اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس شہر جا رہی ہے۔ بس میں وہ بچی کو سنبھال لیتی ہے اور جب شاکر بس سے اتر کر کچھ لینے کو باہر جاتا ہے تو واپسی پر وہ لڑکی غائب ہوتی ہے۔ بی بی جی گاؤں کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کا بیٹا عباس اور بیٹی کلثوم...... دو ہی اولادیں ہیں۔ عباس ہندو گھرانے کی ایک لڑکی سے دوستی قائم کر لیتا ہے۔ عباس، دیا کو لے کر بھاگ جاتا ہے تو پنچایت کے فیصلے کلثوم کی شادی ہندوؤں کے نوکر گھوتو سے کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی رات کلثوم کی سہیلی کا جل خودکشی کر لیتی ہے کیونکہ وہ دیا کے بھائی شیکھر کی منگیتر ہے اور گھر والوں کو شک ہے کہ کاجل دیا کی شریک راز تھی، حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی رات کی سحر کو بی بی جی فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ایسی سجدے میں گئیں کہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ کلثوم بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ سہیل کے قتل ہونے پر اس کا باپ اسے برا بھلا کہتا ہے۔ فاخرہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیا نے اسلام قبول کر کے عباس سے شادی کر لی۔ اس کا نام زہرہ ہے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ شجاع کے آدمی معراج کے گھر میں گھس کر زرتاج کو لے جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ موجی، قائم علی سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے اور دوسری طرف الماس قائم سے شادی پر زور دیتی ہے۔ ناہید کو اس کا شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ کلثوم ماں بننے والی ہے لیکن گھوتو اپنی جہاندا نہیں چاہتا کیونکہ اگر کلثوم ماں بن گئی تو اس کو کام کرنا پڑے گا۔ اکبر علی کی ملاقات رانی سے ڈیرے پر ہوتی ہے اور وہ اس کو دوبارہ آنے کے لیے کہتا ہے۔ رانی تنگی سے کہتی ہے تو تنگی جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ (اب آگے پڑھیں)

”کیا عباس کو خوشی نہیں ہوئی کہ بیٹی ہوئی ہے......“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”کبھی عباس نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ اسے بیٹے کا شوق ہے۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ بچہ ہوگا تو وہ بی بی جی کے پاس جائے گا، بچے کو دیکھ کر اُن کا دل موم ہو جائے گا...... تو کیا بچے سے اس کی مراد لڑکا ہوتا تھا؟ ممکن ہے کہ وہ تھکا ہوا ہو یا باہر سے کسی پریشانی کا سامنا کر کے آیا ہو۔“ اس نے خود کو تسلی دینے کے لیے ایک اندازہ لگایا۔

عباس روٹی لے کر آیا اور ہمسائی کا بنایا ہوا سالن ٹھنڈا ہی پلیٹ میں ڈال کر زہرہ کے لیے یخنی گرم کرنے کے لیے چولھے پر رکھ دی۔ ایک ٹرے میں اس نے اپنا کھانا رکھا، یخنی لے کر وہیں آ گیا جہاں زہرہ بچی کو گود میں لیے بیٹھی تھی، اس نے یخنی اس کے آگے رکھتے ہوئے سرسری سی نظر بچی پر بھی ڈالی۔

”بیٹی کو نہیں دیکھو گے عباس؟“ اس نے کہا۔

”دیکھا ہے!“

”کیسی ہے؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پیاری ہے...... جیسے سارے بچے ہوتے ہیں!“

”تمہاری طرح ہے یا میری طرح؟“

”بھئی نہ میں نے تمہیں اس عمر میں دیکھا ہے نہ خود کو...... مجھے کیا پتا، کس پر ہے!“ وہ ہنسا تھا۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی باپ بن کر؟“

”میں نے ایسا کیا کہا ہے؟“ وہ حیران ہوا۔

”تم باپ بن کر خوش نہیں ہوئے یا بیٹی کے باپ بن کر نا خوش ہو؟“ اس نے انوکھا سوال کیا تھا۔

”تم عجیب باتیں کر رہی ہو......“ اس نے ٹالا۔ ”یخنی پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے!“

”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے عباس!“

”عورتوں کی سوچ جانے بعض اوقات اتنی فضول اور چھوٹی کیوں ہوتی ہے!“ وہ جھنجلایا۔

”مجھے اور عورتوں کا تو علم نہیں مگر میرے سوال کا جواب دو عباس!“

”میں خوش ہوں زہرہ! یقین کرو میں خوش ہوں۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا۔

”اگر تم خوش ہو تو تم خوش نظر کیوں نہیں آتے؟“ اس نے سوال کیا۔

”پتا نہیں کیوں زہرہ...... میں ڈر سا گیا ہوں!“

”کیوں، کیا ہوا...... کیا کسی کو دیکھ لیا ہے تم نے؟“ پکڑے جانے کا خوف ان کا پیچھا چھوڑتا ہی نہ تھا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے......“

”تو پھر کس بات کا ڈر ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”پتا نہیں زہرہ، میں نے اپنی بیٹی کو دیکھا اور میں ڈر گیا!“

”بیٹی کو دیکھ کر ڈر گئے...... مگر کیوں؟“

”بس یونہی ذہن میں خیال آیا کہ اگر میری بیٹی بھی میرے ساتھ وہی کرے جو تم نے......“ وہ رکا۔

”اماں کہتی تھیں کہ بیٹی ماں کی اور بیٹا باپ کی خصلت لے کر پیدا ہوتا ہے!“

”صرف میں ہی بری ٹھہری عباس..... ذرا سوچو تو اگر ہمارا بیٹا ہوتا اور وہ تمہاری خصلت لے کر پیدا ہوتا، کسی کی معصوم بیٹی کو ورغلا کر اپنے گھر والوں سے بغاوت پر آمادہ کرتا اور اسے بھگا کر لے جاتا تو؟“ اس نے اس کے تھپڑ کے جواب میں وہ تھپڑ مارا تھا جس نے اس کے بولنے کی صلاحیت کو وقتی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔

☆☆☆

”کس کی اتنی جرأت کہ وہ میرے گھر پر نقب لگانے کو آئے، میں بات کروں گی مراد علی اور نور علی دونوں سے!“ معراج نے کہا۔

”اور اگر چور اُن کے گھر میں ہی ہوا تو؟“ زرتاج نے نکتہ بجھایا۔

”اگر چور اُن میں سے کسی کے گھر میں ہوا تو میں پنچایت بلاؤں گی، یہاں کسی غریب کی عزت محفوظ ہے کہ نہیں؟“ انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

”آہستہ بولیں اماں، محلے والوں کو تو یوں بھی باتیں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے.....“ اس نے ماں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”اور جو فیصلے پنچایت کرتی ہے وہ ہم سے کیا ڈھکے چھپے ہیں، دیکھا نہیں بیچاری کلثوم کے ساتھ کیا ہوا ہے.....“

”کلثوم کی ماں زندہ رہتی تو دنیا دیکھتی کہ کیسے وہ پنچایت کے فیصلے کے خلاف ڈٹ جاتی.....“ انہوں نے کہا۔ ”زرتاج جب تک تیری ماں زندہ ہے کوئی تجھ پر بری نظر تو ڈال کر دکھائے!“

”اماں دنیا میں جینے کا حق صرف طاقتوروں کو ہے، ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے اگر ہماری قسمت میں کچھ برا لکھا ہوگا تو اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ سارے چوہدری ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں، اگر خیر مانگنی ہے تو اپنے اللہ سے مانگو کہ وہ ہمیں مزید کسی آزمائش سے بچائے۔“

”بس فیصلہ کر لیا ہے میں نے کہ اس کے بعد تجھے کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑ کر جاؤں گی، چاہے کہیں بھی جانا ہو!“

”ٹھیک ہے، بس اب آپ بے فکر ہو جائیں.....“ اس نے ماں کا کندھا دبا کر انہیں تسلی دی تھی۔

”یہ شاکر جانے کہاں رہ گیا ہے، اب کی بار تو کتنے ہی دن ہو گئے ہیں، شاید مہینہ بھر ہونے کو آیا ہے!“

”شاکر بیچ میں کہاں سے آ گیا؟“ وہ ہنسی۔

”بس اسے آنے دے، میں نہیں کسی بھی چیز کا انتظار کرنے والی.....“ انہوں نے عزم سے کہا۔ ”جس دن وہ آئے گا، اس سے اگلے دن میں تجھے اس کے سنگ رخصت کر دوں گی!“

”اسی دن کیوں نہیں اماں؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”اگر تو اتنی اتاؤلی ہو رہی ہے تو اسی دن کر دوں گی!“ ماں کے مصنوعی غصے پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ تصور میں وہ دن آنے لگا تھا، جب وہ رخصت ہو کر شاکر کے ہاں جائے گی۔ اس سے شاکر کی بے چینیاں بھی نہ چھپی تھیں مگر اماں نے خود ہی تو اس کے سامنے گھر میں دو کمرے بنانے کی بیخ ڈال دی تھی۔ انہیں تو ایک کمرا ہی کافی تھا اور جوں جوں خاندان بڑھتا، گھر میں کمروں کا اضافہ بھی ہو جاتا تھا۔

”روٹی ڈال دے، مجھے بھوک لگ رہی ہے، آتے ہی پریشانی نے بھوک بھی اڑا ڈالی.....“ کچھ سوچ کر مسکراتی زرتاج کے سپنوں کے محل کو اماں کی آواز نے گرا دیا تھا۔

☆☆☆

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔

”وہی کہہ رہی ہوں جو کہ حقیقت ہے، یہ تو ہونا ہی تھا!“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے.....“ اسے شک تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔

”عورت اور مرد کے مابین تعلقات کا یہ قدرتی نتیجہ ہے، اس میں اتنی ناقابلِ یقین کیا بات ہے؟“ اس نے ابرو اچکا کر کہا۔

”مگر میں تو ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا.....“ وہ ہکلایا۔ اس سے جو کچھ سرزد ہو گیا تھا، وہ ناقابلِ یقین بھی تھا اور باعثِ شرمندگی بھی۔ ”کیا اس کا کچھ ہو نہیں سکتا؟“

”صاحب! یہ تو بڑی ہی عجیب بات کی آپ نے... اگر اس تعلق کا بوجھ اٹھانا آپ کے لیے مشکل تھا تو نہ آتے آپ یہاں اور نہ ہم سے محبت اور انسیت کا اظہار کرتے..... اس میں ہمارا کیا قصور ہے کہ ہم اپنی زندگی داؤ پر لگا دیں؟“ اس کے لہجے میں غرور تھا۔

”مگر میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا.....“ اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

”آپ نے کیا متحمل ہونا ہے.....“ وہ ہنسی۔ ”یہ بوجھ تو ہم نے اٹھانا ہے، مرد کا کیا ہے، وہ تو سب کچھ کر کے بھی آزاد پھرتا ہے.....“

”تو پھر کیا چاہتی ہو تم؟“

”میری ماں کا اس عرصے میں کتنا نقصان ہو جائے گا، اس کا کچھ اندازہ کریں، میری خاطر اس کوٹھے پر آنے والوں کا ہجوم گھٹ جائے گا!“ اس نے ادا سے اپنے بال اس کے شانوں پر ڈالے۔ ”اور ایک عورت کی کیا مانگ ہو سکتی ہے، اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے کہ وہ اسے اپنا نام دے دے..... میرے بچے کو جائز اولاد بنا دیں، اپنی اور میری!“

”مجھے کیسے یقین ہو کہ یہ بچہ میرا ہی ہے؟“ اس نے نکتہ اٹھایا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے چتون چڑھائے۔

”ابھی تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ اس کوٹھے پر ہجوم تمہاری وجہ سے ہوتا ہے تو کیا معلوم اس ہجوم میں سے یہ کسی اور کا بھی تو ہو سکتا ہے.....؟“

”صاحب.....“ وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے مجھے، بکاؤ مال؟“ واپس مڑ کر وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ”یہ دل صرف آپ کو دیا ہے، جو کچھ آپ ہیں اور کوئی بھی نہیں..... میرا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں، وہ لوگ صرف میری آواز اور ایک جھلک دیکھنے کے دیوانے ہوتے ہیں اور میں..... میں آپ کی دیوانی!“ اس نے لگاوٹ سے کہا مگر قائم کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔

ایک طرف معراج نے طلاق کا مطالبہ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ مسئلہ ہو گیا۔ لے دے کے اس سارے معاملے میں متاثر ہوئی تو وہ زرتاج تھی، اس کی بیٹی، جس سے اسے بہت پیار تھا، اس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ ”اب اگر میں معراج کو طلاق دیتا ہوں تو اس صورت میں زرتاج کو معراج یا مجھ میں سے کسی

ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اگر وہ معراج کے پاس چلی جائے گی تو میں اس سے کس طرح مل پاؤں گا۔ اگر میرے الماس سے تعلق کی خبر زرتاج تک پہنچی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ اس بچے کو میں کس طرح اپنا نام دے سکتا ہوں...... کیا میں الماس سے شادی کر لوں مگر کیسے...... کیسے نبھاؤں گا میں اس شادی کو! وہ تو عجیب سی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، نہ تو یہ چاہتا تھا کہ زرتاج کی ماں طلاق یافتہ کہلائے اور نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ کوئی یہ کہے کہ زرتاج کے باپ نے ایک طوائف سے تعلق کے نتیجے میں ناجائز اولاد پیدا کی ہے، نہ ہی وہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ کہیں کہ زرتاج کے باپ نے کسی طوائف سے بیاہ کیا۔ ''آج تو شاید ان چیزوں یا باتوں کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن آنے والے وقت میں جب زرتاج بیاہے جانے کے قابل ہوگی تو یہ سوالات اس سے بار بار پوچھے جائیں گے۔ اگر میں معراج کو طلاق دوں اور زرتاج کو اس کی تحویل میں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ معراج کہیں عقدِ ثانی کرے گی تو سوتیلا باپ زرتاج کو کس نظر سے دیکھے گا۔'' ان سب باتوں نے اسے نیم پاگل سا کر دیا تھا، اس پر مستزاد الماس کا شادی کا مطالبہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، اس کی ماں بھی اس شادی اور اس بچے کو پیدا کرنے کی مخالف تھی مگر الماس کے سر پر سوار بھوت کو اتارنا مشکل تھا۔

☆☆☆

''زرتاج اگر تو تیار ہو جا تو چلتے ہیں، رابعہ بی بی شہر سے عید کرنے کے لیے آئی ہوئی ہیں، چل کر اُن کا بچہ بھی دیکھ لیتے ہیں، کوئی کام کاج ہو تو وہ بھی پوچھ لیتے ہیں اور بڑی چوہدرانی کو مبارک باد بھی تو دینی ہے......''

معراج نے اس سے کہا تو اس نے منہ بسورا، وہ اپنی چادر پر آخری آخری پھول کاڑھ رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد مکمل ہو جائے۔ ''جانے کس وقت شاکر آ جائے......'' وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔

''اماں آج آپ اکیلی چلی جائیں......''

''پاگل ہوئی ہے کیا...... پھر تجھے اکیلے چھوڑ کر نہیں جانے والی میں...... اور وہ جو رابعہ بی بی پوچھیں گی کہ تم کہاں ہو، کیوں نہیں آئیں تو کیا کہوں گی میں اُن سے؟'' معراج بی بی نے ناراضی سے کہا۔

''ٹھہر کر چلتے ہیں اماں پھر۔'' اس نے حامی بھری۔

''تھوڑی دیر میں شام ہو جائے گی اور اس وقت جائیں گے تو کھانے کا وقت ہو جائے گا!'' معراج نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ بڑی چوہدرانی کسی کو کھانے کے وقت کھانا کھائے بغیر نہیں لوٹاتیں۔''

''اماں......'' وہ جز بز تو ہوئی مگر اٹھ بیٹھی۔ اس کی ماں کے جو اصول تھے وہ بھی انہی کی تقلید کرتی تھی اور بلا مقصد کسی کے گھر اس وقت نہیں جاتی تھی کہ جب کھانے کا وقت ہوتا کہ انہیں کہیں کھانا نہ کھانا پڑے اور لوگ یہ سمجھیں کہ لالچی ہیں جو عین کھانے کے وقت آ ٹپکتی ہیں۔ یوں بھی اخلاقیات کا تقاضا تو یہی ہوتا ہے کہ کسی کے گھر اس وقت نہ ٹپکا جائے، ممکن ہے کہ کسی کے پاس پیش کرنے کو اپنی ضرورت سے زائد کھانا بھی نہ ہو اور اسے بھی احساسِ کمتری ہو۔

دل تو اس کا چاہ رہا تھا کہ وہ اس چادر کے پھول مکمل کر لیتی تو اسے اوڑھ کر جاتی مگر اماں اسے اب اس سے زائد رعایت دینے کو تیار نہ تھیں۔ اس نے چادر کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا، سوئیاں دھاگے وغیرہ بھی احتیاط سے اٹھا کر سنبھالے اور تیار ہونے کو چل دی۔ دھلا ہوا جوڑا پہنا، آنکھوں میں سرمے کی ایک ایک سلائی

لگا کر بالوں کی چٹیا بنا کر وہ تیار تھی۔ اتنی سے تیاری سے ہی وہ اتنی خوب صورت لگنا شروع ہو گئی تھی کہ عام لڑکی ہار سنگھار کر کے بھی نہیں لگتی۔

بڑی سی چادروں میں خود کو لپیٹے، دونوں ماں بیٹیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی حویلی پہنچیں۔ حویلی کے باہر ہی معراج کسی سے بات کرنے کو رک گئی اور اس نے زرتاج کو اشارہ کیا کہ وہ گلی میں نہ کھڑی ہو بلکہ اندر چلی جائے، اس نے ماں کے حکم کی تعمیل کی اور چل دی۔ دروازے سے داخل ہوتے ہوئے وہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، وہ جو کوئی بھی تھا، بہت جلدی میں تھا، اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی، کالی پگڑی والے اس شخص کو وہ اتنی آسانی سے کیسے بھول سکتی تھی...... بلاشبہ وہی تھا جسے اس کے ساتھی فیضی کہہ کر بلا رہے تھے۔

وہ سیدھی رابعہ کے کمرے کی طرف چلی، عابدہ بیگم بھی وہیں تھیں۔ اس نے دونوں کو سلام کیا اور قلقاریاں مارتے عمران کو اُن کی گود سے اٹھا لیا۔ ''بہت پیارا ہے ماشاءاللہ......'' اس نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ ''آپ ٹھیک ہیں آپی؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ......؟'' وہ مسکرائی۔

''آپ کی صحت تو شہر جا کر بہت اچھی ہو گئی ہے!'' زرتاج نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ شہر کی آب و ہوا آپ کو راس آ گئی ہے، میں تو جب بھی شہر جاتی ہوں بیمار ہو جاتی ہوں اور دل بھی نہیں لگتا۔''

''مجھے تو شہر بالکل پسند نہیں آیا، مجبوری سے رہ رہی ہوں...... اور صحت تو......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی، زرتاج نے استفہامیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر سے خوش خبری کی وجہ سے ہے!''

''ابھی تو یہ بہت چھوٹا ہے آپا......'' زرتاج کے منہ سے نکل گیا۔

''مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ تمہاری اماں سے ڈانٹ پڑے گی مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم بھی اب استاد ہو چکی ہو!'' وہ ہنسی۔

''میں کب استاد ہو سکتی ہوں، ابھی تو سیکھنے کے مراحل ہیں البتہ اس خیال سے کہا کہ عورت کی صحت اور ادھیڑ عمری کی بہت سی تکالیف سے بچنے کے لیے بچوں کی پیدائش میں وقفہ ضروری ہے!'' اس نے سمجھداری سے کہا۔

''ارے میں تو خود کہتی تھی کہ ذرا وقفہ ہوتا، اس غریب کو پیٹ بھر کر ماں کا دودھ پینا نصیب ہوتا مگر جو اللہ کی رضا!'' عابدہ بیگم نے بھی کہا۔ ''اچھا تم دونوں بیٹھو، میں ذرا باقی کام دیکھ لوں۔ اور ہاں زرتاج، یہ معراج بی بی کہاں رہ گئیں؟''

''اماں باہر ہی کسی کے پاس کھڑی ہیں......'' اس نے ہولے سے کہا۔ عابدہ بیگم باہر نکل گئیں۔

''اور تم سناؤ، گاؤں کی کوئی نئی تازہ......'' رابعہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''گاؤں کی ساری نئی تازہ تو آپ نے سن ہی لی ہوں گی اب تک!'' اس نے مسکرا کر کہا، یکدم وہ خاموش ہوئی اور بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے زرتاج، کوئی بھی بات ہے تو کہو، اس طرف کوئی نہیں آتا!''

''آپ سے کچھ پوچھنا تھا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں، ہاں بے فکری سے پوچھو......''

"آپ کے ہاں یہ فیضی کون ہے؟" اس نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

"فیضی...... وہ ہمارا ملازم ہے، شجاع کے ڈیرے پہ ہوتا ہے......" رابعہ نے بتایا۔ "مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو، کچھ کہا اس نے تم سے یا کسی نے کوئی بات کی ہے؟"

"نہیں بس یونہی پوچھ رہی تھی......" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"کچھ تو ہے زرتاج کہ جس کی پردہ داری ہے......" رابعہ کو تجسس ہوا۔

"کوئی ایسی خاص بات نہیں، بس یونہی ہی پوچھا ہے!" زرتاج نے ٹالنا چاہا مگر وہ رابعہ ہی کیا جو اس کی جان چھوڑ دیتی، بار بار اصرار کر رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ زرتاج سے کچھ اگلواتی، معراج بی بی آ گئیں اور انھوں نے اندر آتے ہی بلند آواز سے مبارک باد دے کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ زرتاج نے سکھ کی سانس لی کہ اس کے منہ سے بات نکلی تھی تو جان چھڑانا محال ہو رہا تھا اور رابعہ دل ہی دل میں جز بز ہوئی کہ معراج بی بی کچھ دیر اور نہ آتیں تو وہ زرتاج سے وہ بات اگلوا لیتی جو وہ چھپا رہی تھی۔

☆☆☆☆

ناہید اور اس کی بیٹی، دونوں ہی بہت کمزور تھیں، ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ناہید کو خون کی کمی بھی تھی اور بچی پیدائشی طور پر یرقان میں مبتلا، اس لیے ان دونوں کو کچھ دن کے لیے اسپتال میں رکھنا پڑا۔ بچی کمزور تھی اور اسے دودھ پینے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ اسپتال میں ہی ایک آیا نے بتایا کہ کوئی بچہ مل جائے جو کہ اتنا بڑا ہو کہ دودھ ٹھیک ٹھاک پی سکتا ہو اور اسے ناہید دودھ پلائے تو ناہید کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور بچی بھی دودھ پینا شروع کر دے گی۔ سلمٰی نے اسی آیا کی مٹھی میں ایک نوٹ دبایا اور اسے کہا کہ اسپتال میں ہی اسے اگر کوئی ایسا بچہ مل جائے تو اسے ذرا کی ذرا لے آئے۔ شام تک آیا واپس نہ لوٹی، ناہید کی تکلیف حد سے بڑھ گئی۔ ڈھونڈتی ڈھانڈتی سلمٰی جب آیا کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔

"کافی لوگوں سے پوچھا ہے باجی...... مگر کوئی اپنا بچہ دینے کو تیار ہی نہیں، انہیں لگتا ہے کہ کسی کا دودھ پی کر اُن کا بچہ بیمار نہ ہو جائے......" آیا نے بتایا۔

"لو بھلا، بچہ کیوں بیمار ہو گا؟" سلمٰی حیران ہوئی۔

"میں اور آپ بھی اُن کی جگہ ہوتے باجی تو شاید یہی سوچتے!" آیا نے کہا۔

"مگر اب کیا ہو گا، ناہید کی تکلیف تو ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔" سلمٰی کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں، جب سب لوگ سو جائیں گے تو کسی کا بچہ اٹھا کر لے آؤں گی!" آیا نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"اس طرح تو یہ چوری ہوئی اور پکڑ لیے جانے کا خوف بھی رہے گا......" سلمٰی کو یہ تجویز پسند نہیں آئی تھی۔

"تو پھر اپنے خاندان، گلی، محلے یا آس پڑوس میں کہیں پتا کرواؤ!" آیا نے تجویز دی تو سلمٰی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ تب سلمٰی نے سعید سے کہا کہ وہ گھر جا کر شاکرہ سے بات کرے اور اگر وہ مان جائے تو شاکرہ کی بچی کو لے آئے۔ سعید متذبذب تھا، سلمٰی نے اسے اصرار کر کے بھیجا اور واپسی پر شاکرہ اور وہ بچی کو لے کر آ گیا۔ سعید بچی کو خود تو نہیں لا سکتا تھا اسی لیے شاکرہ ہمراہ آیا تھا اور اسے اس بات پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔

وہ بچی جس کا ابھی کوئی نام تھا نہ پتا...... اسے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی فراوانی سے تحفے کی صورت میں اتنا دودھ ملا تھا۔ اس کا پیٹ بھر گیا، ناہید کی تکلیف دور ہوئی اور ناہید کی تو زائدہ کی مشکل بھی حل ہو گئی۔

☆☆☆

کلثوم کو کام پر بھیج کر اس کا سازشی ذہن منصوبہ بندی کرنے لگا کہ کس طرح وہ اس نئی مصیبت سے جان چھڑوائے۔ اچھی بھلی اسے مفت کی نوکرانی مل گئی تھی، جو نہ صرف اس کا کام کاج کرتی تھی بلکہ اس کا مفت میں روٹیاں توڑنے کا شغل بھی پورا ہو جاتا تھا۔ نشے کی عادت پوری کرنے کے لیے تو وہ چوہدریوں کی جوتیاں سیدھی کر کے بخشش بنا لیتا اور اس سے اپنی لت پوری کر لیتا تھا مگر پکی پکائی روٹی، آرام دہ بستر اور بیوی کا سکون...... یہ سب تو اسے مفت میں ہی ملا تھا۔ سر جھکائے دن بھر وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی تھی، چوہدریوں کے گھر کے کام کر کے آنے کے بعد اپنے گھر کا کام بھی وہ دل جمعی سے کرتی تھی۔

اب اس کی باتوں سے اسے بغاوت کی بو آ رہی تھی، وہ چاہ رہی تھی کہ اب اس کا شوہر کام کرے اور وہ گھر پر آرام کرے، بچے پیدا کرے۔ کام کرنے کے نام سے ہی اسے موت پڑتی تھی اور اگر یہ بستر پر پڑ گئی تو مجبوراً اسے کام کرنا پڑے گا۔ نہ یہ بچے کا مٹنا ہو، نہ یہ بستر پر پڑے اور نہ ہی اس کی زندگی مشکل ہو...... کہیں سے کچھ ایسا مل جائے کہ یہ بچہ دنیا میں آنے سے بہت پہلے ہی ختم ہو جائے!"

"اگر میں اسے طلاق دے دوں تو......" اس نے حقے کا گہرا سا کش لگایا۔ "اس صورت میں تو میں ہی ٹھکانے سے محروم ہو جاؤں گا۔" اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔ "ٹھکانے کا کیا ہے، کہیں بھی پڑ کر سو جاؤں گا، کم از کم مجھ پر کوئی بوجھ تو نہ ہو گا......" اس نے خود ہی جواب سوچ لیا۔ "مگر روٹی کہاں سے کھاؤں گا؟" اگلا خیال اس سے بڑھ کر پریشان کُن تھا۔ "میرا خیال ہے کہ خالی خولی طلاق کی دھمکی سے بھی کام بن جائے گا......" اس نے خود کو تسلی دی۔

"بچے کا وجود نہ ہو گا تو سب کچھ اسی طرح ٹھیک چلتا رہے گا......" اس نے سوچا۔ "مجھے اس بچے کا کچھ کرنا ہو گا، جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں اور میرے لیے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔" یہی سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، اپنے گاؤں کی دائی تو اس طرح کے کام کرتی ہی نہ تھی، اس کے لیے اسے کس کے پاس جانا ہو گا، اسے معلوم تھا، اپنے کام کے لیے تو اسے پہلی بار اس کا خیال آیا تھا مگر دوسروں کے اس طرح کی خدمات اس نے اپنی زندگی میں بہت دفعہ کی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ دوا کی پانچ خوراکیں اس کا کام کرنے کو کافی ہوں گی!

☆☆☆☆

ایک بار ذرا سا پاؤں پھسلے تو انسان کنویں میں جا گرتا ہے اور پھر سو چھلانگیں لگائے تو باہر نہیں نکل سکتا...... یہی معاملہ قائم علی کے ساتھ ہوا تھا، وہ جس کنویں میں گر گیا تھا اس میں سے نکلنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے سکون کی تلاش میں جہاں پناہ ڈھونڈی تھی، وہاں اس کے لیے عذاب تیار تھا۔ اس سے کتنا بڑا گناہ سرزرد ہو گیا تھا، وہ وہاں جانے سے کترانے لگا مگر اسے یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ اس کی اولاد ایک طوائف کے بطن سے جنم لے گی۔ اگرچہ اس کے دل میں شک کا ناگ کلبلاتا رہتا تھا مگر الماس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ اسے قائم علی کے سوا آج تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

قائم علی کو خود پر شرمساری محسوس ہوتی کہ وہ اس حد تک گر گیا تھا...... اگر وہ الماس سے نکاح کر بھی لیتا تو کیا وہ بچہ جائز کہلاتا؟ یہ سوال اسے پریشان کرتا، وہ ایسا انسان تو نہ تھا تو پھر کیوں اس دلدل میں گر گیا۔ اس کا ذہن الماس سے شادی کرنے کو نہیں مانتا تھا اور اس کا اصرار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جہاں آرا بھی بیٹی کو سمجھا سمجھا کر تھک ہار چکی تھیں کہ اس بچے کو ختم کر دے جو اس کے پیشے کی راہ میں رکاوٹ ہے اور شادی کا خیال دل سے نکال دے۔

"اگر تم زیادہ مجبور کرو گی اماں تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی، سن لو میری بات اور جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کر کے بھی دکھاؤں گی!" اس نے صاف الفاظ میں ماں سے کہہ دیا۔ "اور اگر تم مجھے شادی کی اجازت نہیں دو گی تو بھی میں کہیں چلی جاؤں گی...... تم پچھتاؤ گی ماں اس وقت کو!"

"یہ جادو جب چڑھتا ہے تو اسی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے......" جہاں آرا نے کہا۔ "جب یہ غبار اترے گا تو میں بتا رہی ہوں کہ تم بہت پچھتاؤ گی۔"

"بس اماں اور کچھ ہو نہ ہو میرے پاس اپنے بڑھاپے کے لیے کوئی آسرا تو ہوگا......" اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "تم نے بھی تو مجھے تیار کر رکھا ہے نا۔ آخر اپنے بڑھاپے کے سہارے کے لیے!"

"بدبخت میں نے تیری طرح گلے میں شادی کا طوق نہیں ڈالا تھا، یہ طوق طوائف کو جچتا ہے نہ قائم رہتا ہے!" جہاں آرا نے اس کے لتے لیے، اس کے یوں کہنے سے اسے غصہ آ گیا۔

"رہے گا قائم اماں، رکھنا چاہو تو سب قائم رہتا ہے اور نہ رکھنا چاہو تو......"

"بک بک کیے جائے گی مسلسل...... سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گی!" جہاں آرا نے آہستہ آہستہ اپنے لہجے کے غصے پر قابو پایا کہ اسے سمجھانے میں غصہ کیا تو وہ بالکل ہی الف ہو جائے گی۔ "تیرے بڑھاپے کے آسرے کو ہی یہ ساری لڑکیاں بھانت بھانت کی اکٹھی کی ہیں میں نے، ساری تجھے ہی بڑا سمجھتی ہیں......"

"بس رہنے دے اماں تو ان لڑکیوں کو......" اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔ "میں اپنی اولاد پیدا کروں گی!" اس کا لہجہ اٹل تھا، جہاں آرا کے پاس سر پکڑ کر بیٹھنے کے سوا چارا کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں...... ہر وقت خیالوں میں اسی پیکر کو دیکھتی اور اس سے ملنے کو تڑپتی، ملنے کو بھی نہیں، ایک جھلک دیکھنے کو۔ اب وہ اچانک سامنے آ گیا تو وہ پوری کی پوری لرز رہی تھی۔

"سلام چوہدری صاحب!" اس نے ہمت کر کے کہا تھا۔

"وعلیکم...... " اس نے جواب دیا۔ "کون ہو تم؟" وہ بھی اس کے ان چھوٹے حسن کو دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"مم...... میں، وہ میں رانی ہوں جی!" وہ ہکلا کر بولی۔

"کس کی بیٹی ہو اور یہاں کس لیے آئی ہو؟" اکبر نے پوچھا۔

"میں جی اقبال ترکھان کی بیٹی ہوں!" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"کس گاؤں کی ہو......؟" اس نے پھر پوچھا۔

"جی ہم مہاجر ہیں...... ابھی تھوڑا عرصہ پہلے ہی اس گاؤں میں آئے ہیں، بھٹے پر کام کرتے ہیں اور کبھی کبھار کھیتوں میں بھی!" اس نے بتایا۔

"کس کے کھیتوں پر کام کرتی ہو؟" اکبر علی نے فوراً پوچھا۔

"آپ کے کھیتوں پر جی...... اس روز آپ کو سانپ نے ڈسا تو میں وہیں پر تھی، میں نے ہی چیخ چیخ کر سب کو بلایا تھا اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اِدھر کیا کر رہی ہو؟" یہ جگہ گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھی اور اسی طرف اکبر اور اس کے بھائیوں کے ڈیرے تھے۔

"وہ میں......" وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کہے۔ "میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی، آپ کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی!"

"اوہ! بہت شکریہ تمہارا......" اکبر علی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور پریشانی میں چیخ چیخ کر سب کو خبردار کیا تھا۔ "تم وہی ہو جس نے میری جان بچائی تھی؟"

"جان بچانے والا تو اللہ ہے، میں کون جی! ہم تو آپ کے خادم ہیں......"

"لیکن اللہ نے کوئی نہ کوئی وسیلہ تو بنانا ہوتا ہے اور میری زندگی تو اللہ کے بعد تمہاری دی ہوئی ہے، میں اس کے لیے تمہارا ممنون ہوں......" اکبر علی نے کہا۔

"نہیں نہیں...... چوہدری صاحب!" اس نے فوراً کہا۔ "یوں نہ کہیں، ہم چھوٹے لوگ ہیں جی، ہم آپ کے احسان مند ہیں، آپ کا دیا کھاتے ہیں......"

"بھئی میں نے تو کتنے دن سے منشی صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ تمہارا پتا کروائے۔ میں خود تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا بلکہ تمہیں شکریے کا کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا......" اس نے چارا پھینکنا شروع کیا۔

"سب کچھ آپ ہی کا تو دیا ہوا ہے، تحفے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے چوہدری صاحب مل گئے تھے، نگی نے تو اس کے ساتھ آنے سے صاف انکار کر دیا تھا، ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ وہ ہوتی تو اس طرف آنے کو ہرگز نہ مانتی۔ اس روز اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس طرف آ گئی تھی، راستے بھر وہ دعائیں مانگتی ہوئی آئی تھی کہ چوہدری اکبر علی اسے مل جائیں۔

"تحفہ دینا تو احسان مندی کا اظہار ہوتا ہے اور تمہیں اس سے محروم نہ کرو......" اس نے لجاجت سے کہا۔

"میں اس قابل کہاں سرکار......" اسے لگا کہ اس کے پاؤں زمین سے بلند ہو گئے ہیں اور وہ دوسروں سے کہیں اونچی ہو گئی ہے۔ "آپ نے کہہ دیا، بجھیں ہو گیا!"

"تو کیا تم سمجھ رہی ہو کہ ہم یونہی جھوٹی بات کر رہے ہیں یا ہماری سکت نہیں کہ تمہیں تحفہ دے سکیں؟" اکبر علی کے لہجے میں برہمی تھی۔

"نہیں سرکار...... میری اتنی مجال کہاں کہ ایسی بات سوچوں!"

"تو بس پھر ہمیں اپنے گھر کا پتا بتاؤ، ہم وہاں تحفے لے کر آئیں گے تمہارے لیے......"

"میرے گھر پر؟" اس نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "نہیں سرکار، وہاں آپ کیا آئیں گے، وہ تو آپ کے لائق ہی نہیں!"

"تو پھر تم حویلی آ جانا، ہم سے اپنا تحفہ وصول کرنے!" اکبر علی نے کہا۔

''حویلی؟'' وہ سوچ میں گم ہوگئی۔
''کیوں، کیا مسئلہ ہے حویلی آنے میں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''میں تو آج بھی چوری چھپے آئی ہوں سرکار..... حویلی جانے کے لیے اماں سے کیا کہہ کر اجازت لوں گی؟'' اس نے اپنے دماغ میں آنے والا خیال اسے بتادیا۔
''کچھ نہ کچھ تو حل ہوگا نا، کیا تم یہاں آسکتی ہو دوبارہ؟'' اکبر علی نے جھنجلا کر پوچھا۔
''ہے تو بہت دور اور آج بھی مشکل سے آئی ہوں مگر آپ کا حکم ہو سرکار تو آجاؤں گی!'' اس نے لاچاری سے کہا، وہ اس سے ناراض ہوجائے، اسے کب گوارا تھا۔
''تو پھر کب انتظار کروں تمہارا؟'' اس نے لگاوٹ سے کہا۔
''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، میں جب بھی موقع ملا تو آجاؤں گی!'' اکبر علی نے چارا ڈال دیا تھا اور اب اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا، اسے اپنے شکار کو پھانسنے کا بھی ہنر تھا اور کب شکار کو قابو کرنا ہے، یہ مہارت بھی تھی۔ اپنی نظروں کی پیاس بجھا کر لوٹ کر جانے والی رانی واپس جاتے وقت مڑ مڑ کر اکبر علی کو دیکھ رہی تھی، جو اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

☆☆☆

حویلی میں اس روز عمران کی پیدائش کی خوشی میں تقریب کا سا سماں تھا، مٹھائیاں بٹ رہی تھیں، چوہدری نور علی کے گھر کے لوگوں کے سوا سارا گاؤں امڈ آیا تھا۔ لوگ مبارک بادوں کے پیغامات کے ساتھ ساتھ مختلف سوغاتیں لا رہے تھے اور جواب میں انہیں تحفے، تحائف اور مٹھائیاں وغیرہ دے کر لوٹایا جا رہا تھا۔ رابعہ کے میکے والے بھی بے شمار تحائف کے ساتھ آئے تھے۔ اپنے ننھیال اور ددھیال کا پہلا پہلا بچہ تھا اس لیے دونوں طرف کی خوشی دیدنی تھی۔

ننھا سا عمران ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا، گھر کی ملازمائیں بھی اس سے لاڈ کر کر کے نہ تھک رہی تھیں، وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ وہ تھکاوٹ سے بیمار پڑ گیا۔ روئے ہی جا رہا تھا، چپ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی نے کوئی مشورہ دیا کسی نے کوئی مگر عابدہ بیگم نے پیغام بھیج کر معراج دائی کو بلوا بھیجا۔ وہ نہ صرف زچہ بلکہ بچوں کے امراض کا علم بھی رکھتی تھیں۔ پیغام ملتے ہی معراج دوڑی ہوئی آئیں زرتاج بھی ان کے ہمراہ تھی، جونہی زرتاج پر نظر پڑی رابعہ کو پھر الجھن ہونے لگی۔ معراج نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا تھا اور اسے سنبھال رہی تھیں بچہ اس کی گود میں جاتے ہی چپ ہوگیا۔

رابعہ کو یاد آیا کہ دوپہر کو جب زرتاج اور معراج آئی تھیں تو اس وقت زرتاج نے کوئی ادھوری سی بات کی تھی، اس نے فیضی کا پوچھا تو رابعہ کو لگا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ اب اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ فارغ ہوتی اور تنہا تو اس سے پوچھ سکتی تھی کہ اس نے اس سے فیضی کا کیوں پوچھا تھا۔ رابعہ جانتی تھی کہ فیضی، شجاع کا خاص الخاص آدمی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے کوئی بدتمیزی کی ہو، شجاع کا سر چڑھا ملازم تھا، کچھ بھی کر سکتا تھا...... لیکن رابعہ اس حق میں نہ تھی کہ اگر اس نے زرتاج سے کوئی بدتمیزی کی ہے تو اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

جونہی عمران سویا، معراج نے اسے رابعہ کے حوالے کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ عابدہ بیگم بھلا اس

وقت جبکہ کھانے کی دیگیں تیار ہو چکی تھیں اور کچھ ہی دیر میں کھانا پیش کیا جانے والا تھا، انہیں کب جانے دیتیں۔ انہوں نے اصرار کر کے انہیں روک لیا۔ معراج تو کمرے سے خود بھی باہر نکل گئیں اور سب سے بھی کہا کہ وہ عمران کو تھوڑی دیر سکون سے سو لینے دیں۔ ساری عورتوں نے کمرا خالی کر دیا، زرتاج بھی اپنی چادر اوڑھتے ہوئے باہر نکلنے لگی تو رابعہ کی آواز تے اس کے قدم پکڑ لیے رابعہ نے اسے کہا کہ وہ اس کے کندھے دبا دے۔

زرتاج کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا کہ چھوٹی چوہدرانی کے دماغ میں کیا بات مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹکی ہوئی ہے، جس کو دریافت کرنے کو وہ اتنی بے چین ہے کہ کچھ دن انتظار بھی نہیں کر سکتی۔ یوں بھی رابعہ کو چند ہی دن میں واپس چلے جانا تھا اور اس طرح کی بے چینی لے کر وہ شہر کس طرح جا سکتی تھی۔ زرتاج نے اپنی چادر تہہ کر کے رکھی اور رابعہ کے عقب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے ہولے ہولے دبانے لگی۔
''زرتاج تم سے کوئی بات پوچھنا تھی؟'' رابعہ نے سوال کیا۔
''جی پوچھیں!'' زرتاج کا لہجہ مؤدب تھا۔
''زرتاج دن کو تم نے مجھ سے فیضی کے بارے میں کیوں پوچھا تھا؟''
''یونہی......'' زرتاج نے کہا۔ ''مجھے لگا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے!''
''کہاں دیکھا ہے تم نے اسے، وہ تو گھر پر کم ہی آتا ہے؟'' رابعہ نے پوچھا۔
''جانے کہاں دیکھا ہے......اور آپ کے گھر پر تو میں بھی کم کم ہی آئی ہوں، یہاں کیسے دیکھوں گی!''

زرتاج نے کہا، وہ حیرت سے رابعہ کا منہ دیکھ رہی تھی کہ کچھ بھی نہ جانتے ہوئے وہ اس معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی تھی۔

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو......'' رابعہ نے کہا۔ ''اصل میں یہ شجاع کا خاص آدمی ہے اور انتہائی خطرناک بھی، یونہی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اس نے اپنی طاقت کے نشے میں تم سے کوئی بدتمیزی نہ کر دی ہو......''

''شجاع......؟'' زرتاج نے سوالیہ انداز میں کہا اور رابعہ کا منہ دیکھا۔

''جہانگیر سے چھوٹا چوہدری...... میرا دیور!'' اس نے بتایا۔

''تو کیا یہ اُن کا خاص آدمی ہے؟'' اس کے لہجے میں خوف کی پرچھائی تھی۔ ''پھر تو میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کو اصل بات بتا دینی چاہیے......''

☆☆☆

''امی، ہم اس کا کیا نام رکھیں گے؟'' ہاجرہ نے گود میں لی ہوئی ناہید کی نومولود بیٹی کو دیکھ کر پوچھا۔

''پھپھو سے پوچھو، وہی اس کا نام رکھیں گی!'' سلمٰی نے مسکرا کر کہا تھا۔

''پھپھو کی تو مت ہی ماری گئی ہے......'' ناہید نے کہا۔۔۔ ''آپ ہی رکھ دیں کوئی نام!''

''سب ٹھیک ہو جائے گا ناہید، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو!'' سلمٰی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

اس وقت ناہید گود میں شاکر کی بیٹی کو لیے بیٹھی تھی، جسے اس نے ایک بار دودھ پلایا تو پھر چھڑوایا نہیں کیونکہ اس کی اپنی بچی اتنی کمزور تھی کہ دودھ اس کی ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ بچی اتنا کم پیتی تھی کہ اگر شاکر کی بیٹی دودھ نہ پی رہی ہوتی تو اسے مزید تکلیف کا سامنا ہوتا۔

''پھر بھی پھپھو، آپ نے کوئی نہ کوئی نام تو سوچا ہوگا؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''واقعی، میں نے کوئی نام نہیں سوچا تھا......'' ناہید نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''تو پھپھو کیا آپ نے بیٹے کا نام سوچا تھا؟'' ہاجرہ نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں چندا...... میں نے کوئی نام نہیں سوچا تھا۔''

''امی ابھی تو ماموں شاکر کی بیٹی کا کوئی نام بھی نہیں رکھا کسی نے!'' ہاجرہ نے اُن کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلائی۔

''چلو آج ابو اور شاکر ماموں گھر لوٹ کر آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔'' سلمٰی نے بچیوں کو تسلی دی۔ وہ دونوں تو اپنے گھر میں ان نئی گڑیاؤں کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ لڑکے تو اپنے کھیلوں میں مگن رہنے والے تھے، یہ لڑکیاں ہی تھیں جو اسکول سے گھر اور اس کے بعد سارا وقت گھر پر ہی گزارتیں، انہیں اللہ نے کھیلنے کے لیے کھلونے بھیج دیے تھے۔

''امی ہم اس کا نام سیمار کھ لیتے ہیں......'' زلیخا نے کہا۔ ''مجھے یہ نام بہت اچھا لگتا ہے!''

''کس کا؟'' سلمٰی نے ہنس کر پوچھا۔

''دونوں میں سے کسی ایک کا......''

''چلو آج کچھ نہ کچھ فیصلہ کر ہی لیں، یوں بھی کافی دن ہو گئے ہیں ان دونوں کو کاکی اور ننکی کہتے ہوئے، ایسا نہ ہو کہ ان کے نام رکھ بھی لیے جائیں تو انہیں کاکی اور ننکی کے ناموں سے نجات ہی نہ ملے۔'' ناہید نے کہا۔

''ہاں، آج تو ہم کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہیں گے!'' سلمٰی نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''ویسے مجھے تو ربیعہ نام بھی بہت اچھا لگتا ہے......''

''واقعی بہت پیارا نام ہے!'' ناہید نے کہا۔

''چلو نام تو دونوں فائنل ہو گئے، اب شام کو دونوں مردوں سے بھی پوچھ لیں گے اور اگر انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا تو پھر پرچیاں نکال کر حتمی فیصلہ کر لیں گے کہ کون سا نام کس کا ہے......''

''ٹھیک ہے امی!'' ہاجرہ اور زلیخا نے اِک آواز ہو کر کہا تھا۔

ہاجرہ اور زلیخا کے بہلانے کو تو وہ کچھ نہ کچھ ان کی گفتگو میں حصہ لیتی رہی تھی مگر وہ خود کو بھی طفل تسلیاں دے رہی تھی اور ناہید کو بھی...... وہ ان دونوں بچیوں کو دیکھتی تو اس کا دل کٹ کٹ جاتا اور وہ سوچتی کہ ان بے چاریوں کے نصیب کیسے ہیں۔ ایک کی ماں چل بسی تھی اور دوسرے کے باپ کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ خود بھی دکھ آشنا تھی، سلیم کی جواں موت کا دکھ اس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا تھا۔

ایک بیٹے اور دو بیٹیوں پر مشتمل ان کا مکمل خاندان تھا، پھر جانے کس کی نظر کھا گئی ان کے آشیانے کو کہ ان کے بیٹے نے حرام موت سے خود کو ہمکنار کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے دکھ میں مبتلا کر دیا۔ وہ اس کی موت کا دکھ فرید اور ولید کو پا کر بھی نہیں بھول پائی تھیں۔ دونوں میاں بیوی اکثر تنہائی میں اس دکھ کو چھو لیتے اور ایک دوسرے سے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے مگر کوئی جواب نہ پاتے۔

اسی لیے اس نے شاکر کی بیٹی کو دیکھ کر منہ برا بنایا تھا نہ اس کی آمد پر ناگواری کا اظہار کیا تھا، اگر وہ کسی کے دکھ کا درماں کر سکتی تو اسے ہی سکون ملتا۔ اسی لیے اس نے آہستہ آہستہ اس بچی کی ذمے داری خود اٹھالی تھی اور ناہید کے ہاں بیٹی کی ولادت کے دوران ہونے والے مسئلے کی وجہ سے اس معصوم کو ماں کے وجود کی حرارت نصیب ہوگئی تھی۔

پہلی بار انور سے مل کر آنے کے بعد تو سعید بہت مایوس تھے کہ اس کے گھر میں اس کی بھاوج کا سکہ چلتا تھا اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ قطعی ناہید کو واپس نہیں لانا چاہتے۔ پھر بھی موقع پا کر سعید نے انور پر واضح کر دیا تھا کہ اس حالت میں طلاق موثر نہیں ہوتی جبکہ انور کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے مولوی صاحب سے معلوم کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ طلاق موثر ہو جاتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ تاہم اس مسئلے کو اختلافی جان کر زیادہ بحث نہیں کی گئی اور سعید نے انور کو سوچنے کا کہا تھا۔

ناہید کے گھر آنے کے بعد سعید نے دوبارہ انور کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو سلمٰی نے لاکھ دعائیں اس کے ہمراہ کیں کہ وہ خیر کی خبر لے کر لوٹے، دن بھر وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہی شام ڈھلے وہ لوٹا تو چپ چپ سا تھا۔ شاکر کی موجودگی کے باعث وہ کچھ نہ پوچھ سکی مگر بے چینی اس کی رگوں میں لہو کے سنگ گردش کر رہی تھی۔ صبر سے وہ رات کا انتظار کرنے لگی اور جب بچوں کو لٹا کر بچی کو سلا کر شاکر کے حوالے کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی تو سعید بستر پر ہی بیٹھا تھا۔

''کیا رہا؟'' اس نے اس کے قریب بیٹھ کر بے تابی سے سوال کیا تو سعید کی آنکھوں کے گوشے جھلملانے لگے، سلمٰی پریشان ہوگئی۔ ''کچھ تو بتائیں آخر بات کیا ہوئی ہے؟''

''کوئی امید نہیں رہی......'' اس نے ایک بھاری سا لفافہ سلمٰی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے پہلے سے طلاق نامہ تیار کروا رکھا تھا!'' سعید نے جی کڑا کے کہا تو سلمٰی کا دل دھڑ دھڑانے لگا۔

''آپ نے بتایا اسے کہ اس کی بیٹی پیدا ہوئی ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑنا تھا، وہ میرے سامنے ہی نہیں آیا اور اس کی بھاوج نے مجھے شربت دیا تو ساتھ ہی ٹرے میں رکھ کر یہ لفافہ بھی رکھ کر دیا، میں تو حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا!''

''پھر؟'' اس نے فوراً سوال کیا اس سے سعید کا سانس لینے کو رکنا بھی برداشت نہ ہوا۔

''کہنے لگی، انور کہیں گیا ہے اور یہ لفافہ اس نے ڈاک سے بھجوانا تھا اب تم آ گئے ہو تو خود ہی لیتے جاؤ!'' سعید نے کتنی تکلیف سے اتنی سی بات کی تھی۔ ''میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہنے لگی، طلاق نامہ ہے، بسانا ہی نہیں ناہید کو......'' اس کی آواز بھرانے لگی، سلمٰی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئی، اس کی دل جوئی کرنے کو۔

''ہمت سے کام لیں آپ......اگر آپ اس طرح کریں گے تو ناہید کو کون سنبھالے گا؟''

''میری بہن کا کوئی قصور تو بتاتے......'' اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔

''ہم ایک دفعہ جا کر خود انور سے بات کریں گے، اس کی بھاوج تو یوں ہی بدزبان سی عورت ہے، اس سے تو بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے......'' سلمٰی نے اسے دلاسا دیا۔

''میں شربت پیے بغیر اٹھا اور باہر نکلا، جانے کیوں میں نے اس گھر کے دروازے سے باہر نکلتے وقت مڑ کر دیکھ لیا......'' سعید نے بتایا۔ ''مڑ کر دیکھنے سے تو انسان پتھر کا ہو جاتا ہے نا، قصے کہانیوں میں؟''

''کیا مطلب؟'' سلمٰی سمجھی کہ پریشانی میں اس کا شوہر بہکی بہکی باتیں کرنا شروع ہو گیا ہے۔

''نہ میں مڑ کر دیکھتا، نہ میں پتھر کا ہوتا......'' سعید کے آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔ ''وہ بدبخت بیٹھک کے ساتھ والے کمرے کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا، مجھے باہر نکلتے دیکھ کر وہ سمجھا کہ اب اسے مزید چھپنے کی ضرورت نہیں......'' سلمٰی نے اسے تسلی دی مگر اس کا اپنا دل یہ سب سن کر کٹ رہا تھا۔ ناہید اس کی بہت لاڈلی نند تھی اور سلمٰی کے لیے اس کا وجود بالکل بہنوں کی طرح تھا۔ ناہید نے بھی اس کی خدمت کی تھی، اچھے برے وقتوں میں اسے سنبھالا دیا تھا، اس کے بچوں کو ماں کی طرح سنبھالا تھا۔ اس کے دکھ پر اسے دل سے تکلیف تھی، اسے ناہید اپنی ہاجرہ اور زلیخا جیسی ہی لگتی تھی، اس کے ساتھ اس طرح کا حادثہ ہونا ان سب کے لیے تکلیف دہ تھا......مگر اس نے ابھی تک ناہید سے یہ بات چھپا رکھی تھی اور سعید کو بھی منع کر دیا تھا۔

ناہید کو اپنے بھائی کے چہرے پر پریشانی تو نظر آ رہی تھی...مگر یہ بھی اچھا تھا کہ اسے یہ علم ہی نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس کے شوہر کے پاس جھولی پھیلا کر اپنی بہن کی خوشیوں کی بھیک مانگنے گیا تھا اور خالی دامن بھی نہیں لوٹا تھا، اپنے ساتھ اپنی بہن کی شادی شدہ زندگی کے خاتمے کا بھیانک انجام لے کر آیا تھا۔

☆☆☆

''خالہ، میری طبیعت سویرے سویرے بہت خراب رہتی ہے، اس کا کوئی علاج بتائیں......'' جہاں نداد کو بادلِ ناخواستہ ناشتا دے کر گھر سے نکلی تو سوچا کہ معراج سے پوچھتی جائے گی اور اگر کوئی دوا ہوئی تو لے لے گی تاکہ کل صبح پھر اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو تو لے لے گی۔

''اللہ تعالیٰ عورت کو جب اتنے بڑے مرتبے پر فائز کر رہا ہوتا ہے اور جنت اس کے قدموں تلے لا رہا ہوتا ہے تو اس پر بھی لازم ہے کہ تھوڑی بہت تکلیف کو ہنس کر جھیل لے اور اس کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے اس مرتبے کے قابل سمجھا......'' معراج بی بی نے حسبِ عادت اسے تفصیل سے سمجھایا۔

''مگر سویرے سویرے اٹھ کر گھر کا کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے خالہ!'' اس نے بتایا۔

''اگر کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تو نہ کیا کرو کام، ذرا طبیعت سنبھل جائے تو کام کر لیا کرو!''

''مگر میرا دل عجیب عجیب چیزیں کھانے کا چاہتا ہے......''

''بعض عورتیں اس حالت میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر فضول عادتیں اپنا لیتی ہیں مثلاً مٹی چاٹنا، کوئلے کھانا اور املی وغیرہ...... یہ سب چیزیں آنے والے بچے کے لیے نقصان دہ ہیں!''

''توبہ ہے خالہ، اس طرح کی چیزیں کیسے کوئی کھا سکتا ہے؟'' اسے تو یہ سب سن کر ہی کراہت آئی تھی۔

''ارے بیٹا، میں کون سا اپنے پاس سے بات بنا رہی ہوں، جو دیکھا اور سنا ہے، وہی بتا رہی ہوں!'' معراج بی بی نے برا منایا۔

''نہیں خالہ، میں یہ تو نہیں کہہ رہی، میں تو یہ سوچ کر ہی متلی محسوس کر رہی ہوں کہ اس طرح کی چیز کیسے کھا

سکتا ہے کوئی؟'' اس نے فوراً گھبرا کر وضاحت کی۔

''اماں آپ نے تو اس بے چاری کو ڈرا ہی دیا ہے......'' زرتاج نے دخل اندازی کی۔ ''اچھا تو بتا کلثوم، جب تو نے گھوٹو......'' اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ ''میرا مطلب ہے جہانداد کو علم ہوا کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ خوش تو ہوا ہوگا؟''

''خوش......'' اس نے سینے کی گہرائی سے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ''وہ تو اس بات پر غصے میں آ گیا اور کہنے لگا کہ اس کو ختم کرواؤ......''

''دماغ ٹھیک ہے اس کا؟'' معراج بی بی کو غصہ آنا لازم تھا۔ ''شکر نہیں کرتا کہ ایسی چاند جیسی بیوی ملی اور پھر اس بد بخت کو منہ بھی لگاتی ہے، گھر بیٹھے روٹیاں توڑنے کا چسکا بھی پورا کرتا ہے اور نشے کی عادت بھی، اس کے باوجود اگر اسے اللہ تعالیٰ اولاد دے رہا ہے تو ناشکری کرتا ہے وہ!''

''میں نے اس سے کہا کہ میں کام نہیں کر سکتی تو اس نے کہا کہ پھر اس سے نجات حاصل کرلو......''

''تم نے اس سے کہا نہیں کہ کام کرنا اور کما کر کھلانا مرد کا کام ہے؟'' زرتاج نے بپھر کر کہا۔

''کہا تھا......اور اسی بات پر تو اس کو اتنا غصہ آیا، اسے بھلا کب کام کرنے کی عادت ہے!'' کلثوم نے مایوسی سے کہا۔ ''اس لیے میں نے تو یہی سوچا ہے کہ اسے کام کرنے کا نہ کہوں، خود ہی کام کرلوں جب تک ہمت ہے۔ آخر جس جی نے آنا ہے اس کی بھی تو کئی ضرورتیں ہوں گی، جہانداد تو اس قابل نہیں ہے کہ......''

''کس قدر گھٹیا اور ناقدرا انسان ہے، میرا تو دل چاہتا ہے کہ میرے سامنے آئے تو میں اس کو جوتے ماروں، لاؤ کبھی اس کو میرے سامنے......''

''رہنے بھی دیں اماں، آپ کیوں اتنے غصے میں آ رہی ہیں......'' زرتاج نے اماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''پھر کلثوم مان گیا وہ؟'' اسے کلثوم سے معلومات لینے کا شوق ہو رہا تھا حالانکہ اس کی عادت نہ تھی یوں کن سوئیاں لینے کی۔

''ہاں پھر چپ تو کر گیا تھا!'' کلثوم نے کہا۔ ''میں نے مقابلہ بھی تو خوب دوبدو کیا تھا......''

''وہ باز آنے والا نہیں ہے، اسے جو لت پڑی ہے وہ کہاں چھوٹنے والی ہے......'' معراج نے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ سوچ کر ہی چپ کیا ہوگا وہ اور کان دھر کر بات سنو میری، ایسا ناکارہ آدمی اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، ذرا احتیاط ہی رہنا۔''

''اب آپ اسے ڈرا دیں اماں، پہلے ہی بے چاری پریشان ہے!'' معراج بی بی نے اسے دوا کی پڑیا پکڑائی اور ہدایت کی کہ رات کو سونے سے پہلے پانی میں ملا کر پی لیا کرے اور طبیعت سنبھل جائے تو اس کا استعمال چھوڑ دے۔

''اور ہاں ذرا ہوش سے اور سنبھل کر رہنا، کہیں وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے!'' معراج دائی اسے نصیحت کرنا نہ بھولی تھیں اور وہ حویلی کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سوچ رہی تھی کہ وہ اتنی خدمت کرتی ہے جہانداد کی، اسے کما کر بھی کھلاتی ہے اور اب اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہے تو پھر وہ اسے کیوں نقصان پہنچائے گا، اگر اسے شکایت ہو بھی تو اس سے ہو، اس کے لیے بچے کو ختم کرنے کی کوشش کیوں

کرے گا وہ؟

☆☆☆

''کاش میں نے زرتاج کو مجبور نہ کیا ہوتا اور وہ مجھے نہ بتاتی تو مجھے اس حالت میں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔'' رابعہ یہی سوچ سوچ کر خود کو نڈھال کیے ہوئے تھی کہ شجاع کی سرگرمیاں روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھیں اور اس کی بری نظر سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ گاؤں کی کوئی بھی نوجوان اور جوان لڑکی اس کا شکار ہو سکتی تھی اور ان کے خاندان کے لیے مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ کہاں باؤجی اور جہانگیر کی شرافت اور نیک فطرت کے گن گانے والے لوگ اور کہاں شجاع کی بدنظروں سے اپنی بیٹیوں کو بچانے کے لیے کوشاں......

''اگر اس طوفان کو نہ روکا گیا تو یہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔'' زرتاج کے خاندان کی بابت وہ جانتی تھی کہ وہ کہیں سے ہجرت کر کے گاؤں...... پہنچے تھے تو ان پر کسمپرسی کا عالم تھا، باؤجی نے اس خاندان کو پناہ دی، آسرا دیا اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دی تھی، ان کو اپنے پاس منشی کے طور پر ملازم بھی رکھ لیا، قائم علی بہت ایماندار منشی ثابت ہوئے تھے۔ اتنے کہ ان کے ہوتے ہوئے باؤجی اور جہانگیر کو کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان کا گاؤں کا کام بھی سنبھالتے تھے اور شہر میں کاروبار کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

معراج بی بی ایک خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھیں، اپنے شوہر کی زندگی تک کوئی کام نہ کیا تھا اور نہ ہی گاؤں کے گھروں میں زیادہ آنا جانا تھا۔ زرتاج کو تو جیسے گاؤں میں کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ معراج بی بی اسے چھپا کر رکھتی تھیں مبادہ......کسی کی نظر بھی اس پر نہ پڑے۔ قائم علی کا جانا تھا کہ ان کے حالات ویسے نہ رہے، چوہدری مراد علی نے تو کہا کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں، گھر بیٹھے ہر ماہ ان کو مخصوص رقم مل جایا کرے گی اور اناج وغیرہ اس کے علاوہ...... مگر معراج بی بی کو یہ لگا کہ انہیں بھیک دی جا رہی ہے، حالانکہ منشی قائم علی کی خدمات اس خاندان کے لیے اتنی تھیں کہ اس کا صلہ اس کی موت کے بعد بھی ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تب معراج نے اس ہنر کو آزمانے کا سوچا جو کہ اس کے پاس تھا۔ کچھ رقم قرض کے طور پر چوہدری مراد علی سے لی اور شہر سے اپنی ضرورت کا سامان منگوا کر اس نے کام شروع کر دیا۔ اپنی تعلیم اور تربیت کے دوران اس نے سیکڑوں زچگیاں کروائی تھیں، جن میں سے کئی پیچیدہ نوعیت کی ہوتی تھیں۔ اسے تجربہ بھی تھا اور یوں بھی اسپتالوں میں نام ڈاکٹروں کا ہوتا ہے مگر کام تو سارا نرسیں ہی کرتی ہیں۔

اس کے ہاتھ میں اللہ نے شفا بھی رکھی تھی اور اب اسے کتنے ہی برس ہو گئے تھے یہ کام کرتے ہوئے، یہی ہنر اس نے آگے زرتاج میں منتقل کیا تھا اور ساتھ ساتھ اسے پرائیویٹ طور پر تعلیم بھی دلوا رہی تھی۔ اس کے حالات موافق رہتے تو وہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بناتی مگر قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔ زرتاج ابھی ذرتی بھی تھی اور اس نے کوئی کام ماں کے بغیر کیا بھی نہ تھا مگر معراج کو اعتماد تھا کہ اگر کوئی ایسی صورتِ حال اچانک آن پڑی تو اس کی بیٹی اس کا کام سنبھال لے گی۔ اب تو اسے بس اس کی شادی کی خواہش تھی۔ تھی تو وہ اتنی پیاری کہ اس سے شادی کے کئی امیدوار ہوتے مگر معراج بی بی اپنی بیٹی کو ایک مضبوط مستقبل دینا چاہتی تھی۔ اسے اس گاؤں میں آوارہ مزاجوں کے ٹولوں کا بھی علم تھا اور ان سے بچانے کی کوشش میں رہتی۔ شاکر اسے اچھا لگا تھا کہ اکیلا تھا اور ان کی بیٹی کے قابل بھی تھا، اس کے ساتھ سے زرتاج کو مضبوط مالی

ضمانت بھی حاصل ہوتی۔ یہ سب باتیں رابعہ کے سامنے خود معراج بی بی نے بتائی تھیں۔ وہی معراج بی بی جسے کسی نے کبھی بولتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا، جب اپنی مجبوری سے گھر سے نکلی تو بولنا اس کی عادت بن گئی۔ شاید اس طرح وہ اس غم کو بھلانے کی کوشش کرتی تھیں جو ان کا اور زرتاج کا ایسا راز تھا، جس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ کبھی کبھار دونوں ماں بیٹیاں اس کو روتیں تو کئی راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی معراج کی۔

☆☆☆

''لعنت ہے تم لوگوں پر......'' وہ غصے میں منہ سے کف نکالتے ہوئے بات کر رہا تھا۔ ''تین مردود گئے تھے اور اس ایک چڑیا ہی کو نہ لا سکے، مجھے تو لگتا ہے کہ تم زنخے ہو سارے کے سارے......''

''سرکار......'' فیضی گھگیایا تھا۔ ''بیچ آبادی کے دروازہ توڑ سکتے تھے نہ اسے زبردستی اٹھا کر لا سکتے تھے، ورنہ سارا گاؤں اکٹھا ہو جاتا اور ہمیں وہاں سے جان بچا کر نکلنا بھی مشکل ہو جاتا!''

''بس اپنی جان کی پڑی ہے تمہیں...... بزدل کہیں کا!'' اس نے زمین پر تھوکا۔

''سرکار میری جان تو آپ کے قدموں پر نثار......'' فیضی نے سر جھکا کر مودب انداز سے کہا۔ ''میرے سرکار کے نام پر حرف نہ آئے۔ سارا گاؤں جانتا ہے سرکار کہ فیضی آپ کی چوکھٹ کا کتا ہے، آپ کے قدموں میں بیٹھنے والا اور آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والا......''

''بس بند کرو یہ بک بک اور خوشامد...... کتا تو دوسرے کتے کے منہ سے بھی ہڈی چھین کر لے آتا ہے اور مالک کے حکم کی تابعداری کرتا ہے!'' شجاع نے ہنکارا ابھرا اور تمسخر سے اسے کہا۔

''میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھ لوں گا سرکار......'' فیضی نے کہا۔ ''ورنہ سمجھیے گا کہ فیضی آپ کا کتا کہلانے کے بھی قابل نہیں!''

''رہنے دے فیضی...... نہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر۔ بعض اوقات انسان ایسے کتوں کو بھی پال لیتا ہے جن سے اسے کوئی فائدہ نہ ہو......'' شجاع نے اس کی اتنی بے عزتی کر لی تھی کہ کوئی اور ہوتا تو ایسی نوکری پر لات مار کر دفع ہو جاتا مگر فیضی بھی ایسا کر سکتا تھا کہ اس کے بغیر شجاع کا گزارہ نہ تھا۔ فیضی کو اپنی اوقات کا بھی علم تھا اور اپنی حیثیت کا بھی اور وہ جانتا تھا کہ جب شجاع کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو وہ اس کی زبانی اور مالی تلافی کر دے گا اور فیضی اپنی ہتک عزت بھول جائے گا۔

☆☆☆

اپنے سینے میں دکھ چھپائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے، سلمیٰ اس طرح سے ناہید کی دل جوئی کرنے میں مصروف رہتی کہ ناہید کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔ سعید کا خیال تھا کہ انہیں ناہید کو بتا دینا چاہیے چونکہ شرعی مسئلہ تھا اس لیے ناہید کا جاننا بہت اہم تھا کہ اسے طلاق ہو چکی تھی۔ سعید نے کچھ لوگوں سے پوچھا تھا تو ہر دو کی رائے متضاد تھیں، کچھ کا کہنا تھا کہ چونکہ وضع حمل سے قبل اس نے طلاق دے دی تھی اس لیے بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی عدت ختم ہو گئی جبکہ دوسرے مکتب کا کہنا تھا کہ طلاق کی عدت کی مدت اس وقت سے شمار کی جائے گی جب اس نے بعد میں طلاق دی ہے اور اگر اس مدت سے لے کر دوسرے فریق کی طرف سے رجوع کی کوشش نہ کی گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

وہ تو سمجھ رہے تھے کہ جوں ہی ناہید کو بتائیں گے وہ غم اور غصے سے پھٹ پڑے گی مگر وہ پُرسکون رہی اور اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ اسے دوبارہ طلاق نہ بھجواتا تو وہ خود خلع کے لیے کوشش کرتی۔ الٹا وہ تو سعید سے اس بات پر ناراض ہوئی کہ وہ وہاں بے عزتی کروانے کیوں گیا تھا۔ ابھی تو سعید نے اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ گھر میں موجود ہو کر بھی اس سے چھپا ہوا تھا اور اس سے ملا نہ تھا اور وہ بھی نہ بھائی کو بتا سکتی تھی کہ وہ اور اس کی بھاوج کیا تھے اور ان کے آپس میں کیا تعلقات تھے کہ پورا محلّہ باتیں کرتا تھا۔

''اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے کوئی بہتری ہوگی ناہید!'' سلمٰی نے اسے تسلی دی۔ ''اور تمہارے بھائی کو تو جانا ہی تھا اس بچی کی خاطر کہ اسے باپ کی محرومی میں عمر نہ گزارنا پڑے۔ تم ہماری بیٹی جیسی ہو اور بیٹی کا گھر بچانے کی تو دنیا میں سارے والدین کوشش کرتے ہیں......'' سلمٰی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بس اب تم پریشان نہ ہو، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے!'' سلمٰی کی شفقت پا کر تو وہ بہت مطمئن تھی، اسے سلمٰی سے بڑی بہنوں اور ماں جیسی محبت ملتی تھی۔ اس وقت تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس بات پر پریشان ہوگی مگر رات کی تنہائی میں وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی...... کیا نصیب ہوتے ہیں عورت کے بھی کہ اسے ایک عورت ہی برباد کر دیتی ہے، اسے انور سے کبھی محبت ملی تھی نہ اس سے محبت ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہ تھے مگر یہ دل میں کیا کسک جاگ اٹھی تھی کہ آنسو بھل بھل کر کے آنکھوں میں آ گئے تھے۔ وہ اس معصوم بچی کی قسمت پر رو رہی تھی، جس کے باپ نے اس سے ملنے، اسے دیکھنے کی تمنا کرنا تو درکنار، اس کی پیدائش کی خبر کو شاید ڈھنگ سے سنا بھی نہیں تھا۔

اپنی بیٹی کی قسمت پر آنسو بہاتے بہاتے، اس کی سوچوں میں شاکر کی بیٹی بھی در آئی، جسے وہ ماں بن کر دودھ پلا رہی تھی۔ اس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے ماں سے محرومی لکھ دی تھی...... اسی روز ان دونوں بچیوں کے نام رکھے گئے تھے...... سیما، ماں سے محروم اور ربیعہ باپ سے......

☆☆☆

''بڑی خوش نظر آ رہی ہو رانی؟'' اگرچہ رانی اس کے ساتھ روکھا سا سلوک کر رہی تھی مگر وہ اس کے ساتھ کھیتوں پر کام کرنے کو آئی تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ بے دھیانی میں بات بے بات مسکراتی، یہ تو کوئی اور ہی رانی تھی، نگی کو کیا معلوم کہ اس نے اپنا سفر کن راہوں پر شروع کر رکھا ہے۔

''کیوں، خوش ہونا کوئی گناہ ہے کیا؟'' اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''ارے میری پیاری سکھی، کیوں غصے میں تپ گئی ہو؟'' وہ ہنسی۔ ''کچھ تو ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو......''

''اچھا، چھپا رہی ہوں تو کر لو تم جو کچھ کرنا ہے......'' اس نے اترا کر کہا۔

''چلو نہ بتاؤ، اگر تم نہیں بتانا چاہتی ہو تو......'' اس نے برا منایا۔ ''خود ہی جب پیٹ میں درد ہوگا تو مجھے بتانے کی بے چینی ہوگی!'' نگی نے کہہ کر منہ موڑا اور اپنے کام میں لگ گئی، رانی نے بھی کندھے جھٹک کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا مگر دونوں کا دھیان کام میں نہیں تھا۔ نگی جانتی تھی کہ دنیا بھر سے بیزار رہنے والی رانی اگر خوش ہے تو ضرور اس کے پیچھے کوئی راز ہے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھیں، ان کی دانت کاٹے کی دوستی تھی، بچپن سے ساتھ تھا اور بن کہے ایک دوسرے کی بات بھی سمجھ جاتیں۔

''بوجھو تو جانیں......'' رانی بھی اس بھید کو زیادہ دیر کے لیے اپنے پیٹ میں نہیں چھپا سکتی تھی، جلد یا بدیر خود ہی پھوٹ پڑتی مگر تب تک نگی انتظار کرتی رہ جاتی؟

رانی نے بھی سوچا کہ پہلی بار تو نگی نے جانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب کی بار وہ زبردستی اسے ساتھ لے کر جائے گی تاکہ اسے دکھا سکے کہ جسے دیکھنے کو اس کی آنکھیں ترستی تھیں، وہ کیسا بھلا انسان تھا اور کتنی قدر کرتا تھا اس کے احسان کی...... اتنی کہ اس سے کہا۔ ''یہ زندگی اللہ کے بعد تمہارے احسان کی وجہ سے ہے!'' ابھی وہ نگی کو اتنی باریک تفصیل نہیں بتانا چاہتی تھی مگر اشارہ دینے کو بھی بے قرار تھی۔

''میں کیا بوجھوں، کوئی اشارہ تو دے......'' وہ چڑ کر بولی۔

''تم اندازہ لگاؤ، میں بتاؤں گی کہ یہ ٹھیک ہے کہ نہیں......!'' وہ ہنسی، اس کی ہنسی آج ابل ابل کر باہر آ رہی تھی۔

''کوئی رشتہ آیا ہے تمہارا؟'' اس نے پہلا قیافہ لگایا۔

''اونہوں!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی اور اندازہ؟''

''مجھے کام کرنے دے رانی، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ اندازے لگاتی پھروں اور نہ ہی میرا دماغ پہیلیوں میں زیادہ کام کرتا ہے......'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''اچھا چل تجھے اشارہ دیتی ہوں۔'' رانی نے نگی کے غصے سے بھی حظ اٹھایا۔ ''میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر کے آئی ہوں دو دن پہلے......''

''کیا، کہاں، کیسے......؟'' نگی نے یکدم کئی سوال داغے۔

''ایک ایک کر کے سوال پوچھ......'' رانی نے مسکرا کر کہا۔ ''تو بتا میں کس چیز کے لیے مری جا رہی تھی؟''

''تو ملی ہے، چوہدری اکبر علی کو رانی؟'' وہ چیخی۔ ''کہاں اور کیسے؟''

''یونہی راہ چلتے......'' وہ اصل بات چھپا گئی۔

''پھر؟'' اب نگی کے لہجے میں تجسس تھا۔ ''تو نے بتایا اس کو کہ تو کس طرح اسے دیکھنے کو مر رہی تھی؟''

''عقل کو ہاتھ مار نگی! یہ بھی کوئی بات ہے کسی سے کہنے کی؟'' اس نے اسے ڈانٹا۔

''تو پھر...... کیا ہوا ملاقات میں؟''

''اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں، میں نے بتایا...... اور پھر یہ بھی بتایا کہ میں نے ہی اس دن چیخ چیخ کر لوگوں کو اس کی جان بچانے کے لیے بلایا تھا......''

''پھر تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے نوٹ انعام میں دے دیے ہوں گے؟'' نگی نے طنز کیا۔

''نہیں، ایسا گھٹیا بھی نہیں ہے وہ......'' رانی نے اپنا غصہ قابو میں رکھا۔ ''ہاں البتہ یہ کہا کہ وہ مجھے اس روز سے ڈھونڈ رہا تھا اور......'' وہ رکی تو نگی کی سوالیہ نظروں نے اسے بات مکمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ ''اور پھر بلایا ہے مجھے انعام دینے کے لیے......'' وہ اترائی۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا، اب تم حویلی جاؤ گی انعام کے لالچ میں؟''

”اونہوں...... حویلی نہیں، جمعے کو اس نے اپنے ڈیرے پر بلایا ہے اور اس دن میں اکیلے نہیں جاؤں گی، میرے ساتھ جائے گی، میری پیاری سی نگی!“

”ہرگز نہیں......“ نگی کو جیسے کسی چیز نے ڈس لیا تھا۔ ”نہ میں جاؤں گی تمہارے ساتھ اور نہ تمہیں اکیلے جانے دوں گی، باز آجا رانی...... نہ شکار ہو جانا اس چکر میں، تم نہیں جانتیں کہ چوہدری نور علی کے بیٹوں کی گاؤں ...... میں کیا شہرت ہے......“

”لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے، مارے حسد کے باتیں پھیلانے کی......“ رانی نے کہا تو نگی اسے دیکھ کر رہ گئی، اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ہرگز نہیں جانے دے گی اور اگر اس نے ضد کی تو وہ اس کی اماں کو بتا دے گی تاکہ وہ اسے روک لے۔ اپنی سہیلی کو وہ کیونکر کسی گڑھے میں گرتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔

☆☆☆☆

سہیل کتاب کھولتا تو اس پر سلیم کا معصوم چہرہ ابھر آتا، وہ معصوم چہرہ جس کی معصومیت اس نے پامال کر دی اور وہ اپنے ضمیر پر اس بھیانک جرم کا بوجھ نہ اٹھا سکا۔ وہ اس کی ہر شرارت میں شریک رہتا تھا مگر اپنی جماعت میں کارکردگی کے حساب سے سب سے اوپر تھا، سہیل خود حیران ہوتا کہ وہ کس وقت اتنا پڑھ لیتا ہے کہ پہلی پوزیشن ہر بار اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ سلیم ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھا، سال کے آخر میں امتحانوں کے نزدیک جا کر رٹے لگانے کے بجائے وہ سال بھر ہر روز کا سبق دُہرانے اور اسے سمجھنے کا عادی تھا۔

اپنے کورس کی کتابوں کے علاوہ وہ انہی موضوعات پر کتابیں پڑھتا اور ان میں سے اپنے جوابات کے لیے حوالے ڈھونڈتا اور پرچے میں جواب میں ایسے ایسے حوالے لکھتا کہ جو اس کے استادوں نے بھی نہ بتائے ہوتے تھے۔ جماعت میں بھی وہ استاد سے کچھ بھی پوچھنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا تھا، پوری توجہ سے لیکچر سنتا اور ہاسٹل پہنچ کر یونی فارم تبدیل کرتا، کھانا کھاتا اور اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر اٹھ کر اس روز کے لیکچر کے اہم نکات کو اپنی کتابوں پر تحریر کر لیتا۔ اس کی کتاب دیکھنے پر اس طرح لگتی تھی جیسے دو دفعہ اس کی طباعت ہوئی ہو، کوئی دوسرا اس کو پڑھ بھی نہیں سکتا تھا، البتہ سلیم خود اسے سہولت سے پڑھ لیتا تھا۔

آہ...... کتنا پیارا سلیم...... جو اپنے خاندان اور دوستوں کو کبھی مدھم نہ ہونے والا صدمہ دے گیا، اس کے ماں باپ کا تو نقصان ہوا ہی اس کے ساتھی طالب علم اسے نہیں بھول پائے تھے اور اساتذہ اب تک اس کا ذکر بار بار کرتے تھے، انہیں اس جیسا طالب علم ہی کبھی ایسے نہیں ملا تھا استاد کو بھی اسی طالب علم کو پڑھانے کا مزہ آتا ہے جو صحیح معنوں میں علم کا پیاسا ہو، استاد کی بات کو سمجھے، جہاں سمجھ میں نہ آئے وہاں پوچھے اور سمجھ کر اپنے انداز میں بیان کرے۔

”سلیم سعید بھٹی، ایک ہی تھا......“ اس روز بھی ایک لیکچر کے دوران ان کے انگریزی کے لیکچرار نے کہا تو جماعت میں ہوتے ہوئے بھی سہیل کہیں گم ہو گیا۔ اس کے بعد استاد نے کیا کہا اسے کچھ علم نہ تھا اور گھر پہنچ کر اس نے فائنل امتحان کی تیاری کے لیے کتاب کھولی تو وہ کتاب کے صفحات پر موجود تھا، مسکراتا ہوا۔

”تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ وہ انجانے میں ہی بلند آواز میں چلایا تھا، اس کے کمرے کے باہر سے گزرتی اس کی ماں حیران ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہوئیں، وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔

”کیا بات ہے بیٹا، کس مضمون سے اتنے تنگ ہو تم؟“ وہ اس کے پاس کھڑی تھیں۔ ”لاؤ میں سمجھاتی ہوں، جو کچھ تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا...... پڑھائی سے یوں جان نہیں چھڑاتے بیٹا!“ اور وہ ہونقوں کی طرح اپنی ماں کا منہ دیکھ رہا تھا۔ ”چلو شاباش میرا بیٹا بہت اچھا ہے، بہت لائق اور محنتی......“

☆☆☆

”باجی مریم...... مشکل نہیں لگتا آپ کو یوں سارا دن اسکول میں ملازمت کرنا، گھر آ کر بچی کو دیکھنا...... آپ کو تو جو پہلے تھوڑا بہت وقت آرام کرنے کو مل جاتا تھا، اب وہ بھی نہیں رہا!“ جینا نے پوچھا تو مریم مسکرائی۔

”واقعی، ہے تو ایسا ہی مگر...... یقین کرو کہ کبھی تھکاوٹ یا بے آرامی کا احساس ہی نہیں ہوتا!“ مریم نے ایمانداری سے کہا۔

”خوش قسمت ہیں آپ کہ آپ کی بہن نے آپ کو یہ بچی دے دی اور یہ بچی اس سے بڑھ کر خوش قسمت ہے کہ جسے اللہ نے آپ جیسی ماں عطا کر دی......“ جینا نے کہا۔ ”اپنے گھر میں تو شاید اس بچی کو اتنی توجہ اور اتنا پیار نہ مل سکتا، سائرہ کے تو آپ نے بتایا تھا کہ اور بھی بچے ہیں!“

”ہاں سائرہ باجی کے اور بچے تو ہیں لیکن اس بچی کے وجود کو میں اپنے لیے خوش قسمتی کا باعث سمجھتی ہوں!“ مریم نے گود میں سوئی ہوئی گڑیا کا ماتھا چوما۔ ”اس کے آ جانے سے مجھے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر آنا شروع ہو گیا ہے، پہلے تو میں سوچتی تھی کہ میری زندگی کا مقصد کیا تھا، کس کے لیے میں کماتی تھی اور کس کے لیے یہ میرا گھر بار تھا...... اب یہ آ گئی ہے تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے اسی کے لیے پیدا کیا تھا شاید......“

”صحیح کہہ رہی ہیں باجی!“ جینا نے حسبِ عادت کر کہا۔ ”بچہ تو اللہ کی نعمت ہوتا ہے اور اس کے ہونے سے زندگی کا لطف آتا ہے۔ پیدا کرنے والے سے پالنے والے کا حق زیادہ کہا جاتا ہے، اسی لیے کہ پیدا کرنے والی تو ایک ہی بار تکلیف اٹھاتی ہے مگر پالنے والے عمر بھر......“

”لاکھ دفعہ کہا ہے جینا کہ جب یہ سو رہی ہوتی ہے تو اس وقت ذرا کم بات کیا کرو اور اگر کرنا بھی ہو تو آہستہ سے مگر تمہیں اس بات کی سمجھ آئے بھی تو کیوں کر......“ مریم کو بچی کے جاگ کر رونے پر غصہ آ رہا تھا، وہ اسے اپنے کندھے کے ساتھ لگائے تھپک رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ گنگنا رہی تھی، یوں جیسے اسی نے اس کو پیدا بھی کیا ہو۔

”امی کی پیاری پیاری سی گڑیا...... سو جا، سو جا!“

”لائیں مجھے دیں، میں اس کو سلاتی ہوں......“ جینا نے ہاتھ بڑھایا، اس کے ہاتھ میں جاتے ہی بچی چپ ہو گئی۔

”تم نے تو لگتا ہے کہ اس پر کچھ جادو کر دیا ہے...... ایک دم سے چپ ہو گئی ہے!“ مریم مسکرائی۔

”سارا دن میرے پاس ہی ہوتی ہے، اس لیے میرے ہاتھوں کی عادی ہے......“

”چلو سنبھالو پھر اس کو ذرا دیر کے لیے، میں اس کی دودھ کی بوتلیں ابال لوں تو پھر تم چلی جانا!“ مریم اٹھی۔ ”آج تو تمہیں دیر بھی ہو گئی ہو گی......“

”کوئی بات نہیں باجی جی، میرے کون سا چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر رو رہے ہیں!“ جینا نے باچھیں

پھیلا کر کہا۔

☆☆☆☆

''تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی، اتنے دن تم شہر آنے کا انتظار کرتی رہیں؟'' جہانگیر اتنے غصے میں آ گئے کہ اس سے قبل رابعہ نے کبھی نہ دیکھا تھا، ننھے عمران کو وہ گود میں لیے بیٹھی تھی کیونکہ جب سے وہ گاؤں سے لوٹی تھی اسے گود کی عادت ہو گئی تھی اور دودھ چھڑوانے کی وجہ سے وہ چڑچڑا بھی ہو گیا، باپ کے یوں غصے میں بولنے سے وہ نیند سے جاگ گیا۔ اس نے اسے تھپکا تاکہ وہ سو جائے۔

''وہاں بتا دیتی آپ کو تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا؟'' اس نے نرمی سے سوال کیا، غصے میں آ کر وہ جہانگیر کے غصے کو مزید ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔

''یہاں بتا رہی ہو تو اس میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اب کی بار اس کا لہجہ دھیما تھا، بچے کے رونے سے اسے احساس ہوا... کہ وہ زیادہ ہی بلند آواز سے بولا تھا۔ ''وہاں کم از کم میں بابو جی سے تو بات کر سکتا تھا اور انہیں کہہ سکتا تھا کہ اس پر نظر رکھیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسا غلط کام وہ کرے اور اس کے نتیجے میں ہمارے خاندان کے نام پر دھبا لگے......'' اس کے کہنے پر رابعہ اس کی طرف دیکھ کر ہی رہ گئی، اسے یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کس حد تک بڑھا ہوا تھا اور اس کی دسترس سے اس کے گھر کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔

''بابو جی بے چارے اسے کیا کہہ سکتے ہیں، آپ بڑے بھائی ہیں، آپ کا کام ہے کہ اسے سمجھائیں!'' رابعہ نے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''چند دنوں تک جاؤں گا تو اسے بٹھا کر سمجھاؤں گا بلکہ میرے ذہن میں تو آ رہا ہے کہ اگر میں اسے شہر لے آؤں؟'' جہانگیر کا لہجہ استفسارانہ تھا۔ ''یہاں آ کر شاید وہ گاؤں کے ماحول سے مختلف ماحول میں رہے گا تو اس کے اندر بھی تبدیلی آ جائے......''

''شجاع کو شہر......'' وہ ہکلائی۔ ''شجاع شہر آ کر کیا کرے گا؟''

''کیا بات ہے رابعہ......'' جہانگیر نے حیرت سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھا۔ ''میں تمہیں اتنا تنگ دل تو نہیں سمجھتا تھا کہ تمہارے لیے اپنے گھر میں ایک آدمی کا وجود بوجھ ہو جائے گا...... اور وہ آدمی بھی کوئی اور نہیں، میرا سگا بھائی...... مجھے افسوس ہے رابعہ، میں تو سمجھتا تھا کہ تم شجاع اور شیر علی کو اپنے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہو......''

رابعہ کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے، وہ اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ تو انہیں بھائی سمجھتی تھی مگر ان کے بھائی کی نیت میں فتور تھا، اسی کی سزا کے طور پر انہیں گاؤں سے شہر بھجوا دیا گیا تھا تاکہ وہ محفوظ رہے، اب وہ شہر آ جائے گا تو وہ کہاں جائے گی...... دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھا، اجنبی سا چہرہ، اسے وہ چہرہ کسی ایسے شخص کا لگا جسے وہ جانتی بھی نہ تھی اور نہ وہ وہ اسے جانتا تھا جیسے، کوئی ایسا شخص جس کے چہرے پر اس کے لیے محبت کی پرچھائی بھی نہ تھی۔

شام کو کلثوم لوٹی تو کام کاج کرنے کے باعث نڈھال سی ہو رہی تھی، دن بھر اس کی کیفیت متلی والی رہی تھی اگرچہ چوہدرانی نے کہا بھی کہ وہ کام چھوڑ دے اور آرام کرے یا گھر لوٹ جائے۔ اسے عادت ہی نہ تھی کہ وہ یوں کام کیے بغیر ان کے ہاں سے روٹی لے کر واپس جائے، اس کی غیرت کو یہ کب گوارا تھا...... وہ تھکی ٹوٹی بھی ہولے ہولے کام کرتی رہی اور شام کو لوٹی تو دل میں اس بات پر خوش تھی کہ جس طرح جہانداد نے وعدہ کیا ہے وہ کل سے اسی طرح کام پر جائے گا، اسی لیے اسے اس روز کی تھکن گوارا تھی۔

"کیا لائی ہو آج کھانے کے لیے؟" جہانداد نے اتنی نرمی سے پوچھا کہ وہ حیران ہی رہ گئی۔

"ابھی دیتی ہوں کھانا، ذرا سی دیر آرام کر لوں......" اس نے چارپائی پر لیٹ کر ٹیک لگائی۔

"تم لیٹ جاؤ، میں خود ہی کھا لیتا ہوں......" اس نے تو جیسے کلثوم کو حیران کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

"گھور کیوں رہی ہو، کیا میرے ماتھے پر سینگ نکل آئے ہیں؟" وہ ہشیاری سے ہنسا۔ کلثوم واقعی اسے اسی طرح گھور رہی تھی جیسے اس کے سر پر سینگ ہی نکل آئے ہوں۔ وہ اٹھا اور اس کا لایا ہوا کھانا گرم کرنے لگا، کھانا لے کر وہ اس کی چارپائی پر آ بیٹھا۔

"اٹھو تم بھی تھوڑا سا کھا لو......" اسے بھوک تو تھی مگر اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہ تھی۔

"تم کھاؤ، میں تھوڑی دیر میں کھاتی ہوں!" اس نے سوچا کہ معراج بی بی کی دی ہوئی تھوڑی سی دوا لے کر کھائے گی۔ "مجھے تھوڑا سا اچار اور روٹی دے دینا، اپنا کھانا کھانے کے بعد......"

"اچار اس وقت کھاؤ گی تو وہ بچے کے لیے نقصان دہ ہوگا......" اس نے اسے یوں کہا جیسے اسے اس بچے کی بہت خوشی ہو۔ "ٹھہرو! میں تمہارے لیے دوا لے کر آیا ہوں، وہ لے لو گی تو طبیعت سنبھل جائے گی......"

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دوا کی تین پڑیاں نکالیں۔ "بڑی قابل دائی ہے، علی پور کی...... اسی سے لے کر آیا ہوں، تین خوراکیں ہیں، انہیں گرم دودھ میں ڈال کر تین پہر پی لینا، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا!" مسئلہ تو وہ اپنا حل کرنے کے لیے یہ دوا لایا تھا اور اسے بہلاوا دے رہا تھا جیسے اسے کلثوم کی بڑی فکر ہو مگر کلثوم کم عمر اور معصوم تو تھی، بے وقوف نہ تھی، کچھ اندازہ اسے حویلی جانے سے اور ملازماؤں کی رازداری کی باتیں سننے سے ہو گیا تھا اور پھر ماں بننے کی خبر نے اسے ایک نئی طاقت اور سوچ عطا کر دی تھی۔

"مجھے دے دو دوا......" کلثوم نے اسے محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ اسے اس کی نیت پر شک ہے۔ "میں تھوڑی دیر میں لے لوں گی!"

"ارے تم سے تو اٹھا بھی نہیں جا رہا......" اس نے دوا کی پڑیاں اپنی جیب میں واپس رکھ لیں۔ "ٹھہرو، میں تمہارے لیے خود ہی دودھ گرم کر کے لے آتا ہوں اور دوا اپنی نگرانی میں پلاتا ہوں!" وہ اٹھا تو کلثوم کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یقیناً وہ یہ دوا کسی خاص مقصد سے لایا تھا۔ معراج بی بی نے تو اسے بتایا تھا کہ وہ گرم چیزیں نہ کھائے پیے اور یہ کون سی دائی تھی جو اسے دوا گرم دودھ کے ساتھ کھانے کا مشورہ دے رہی تھی...... اور پھر جب گاؤں میں ایسی دائی موجود تھی جس کو ارد گرد کے سات دیہات کے لوگ سب سے قابل سمجھتے تھے تو پھر جہانداد کیوں دس کوس کے فاصلے سے وہ دوا لے کر آیا تھا...... وہ جتنا سوچتی جا رہی تھی، اتنا ہی اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اب تو وہ پاس بیٹھ کر زبردستی پلائے گا بھی اور اگر وہ انکار کر دے تو کہیں اس کا گلا ہی غصے میں آ کر نہ دبا

دے...... وہ سوچ رہی تھی اور جب تک جہانداد دودھ لے کر پہنچتا، اسے ترکیب سوجھ چکی تھی۔

"میں ذرا کلی کر آؤں......" اس کے آتے ہی وہ اٹھی اور صحن کے کونے میں بنے ہوئے غسل خانہ نما احاطے میں چلی گئی، اس کی طبیعت مالش کر رہی تھی۔ دانستہ طور پر اس نے کافی دیر غسل خانے میں لگائی تاکہ دودھ بھی ذرا ٹھنڈا ہو جائے...... دل ہی دل میں اسے جتنی قرآنی دعائیں اور آیتیں یاد تھیں وہ پڑھتی رہی، اپنے گلے میں اس نے انگلی ماری تاکہ اسے الٹی آ جائے، ابھی تک تو اس نے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ اس کی طبیعت اور بھی متلانے والی ہو گئی، واپس آئی تو جہانداد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"چلو شاباش...... اب ذرا چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ لو تاکہ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے......" اس نے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کلثوم کو لگا کہ اس نے زہر کا پیالہ ہاتھ میں تھام رکھا ہو، اس نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگی۔ شوہر کا یہ التفات اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، اس نے کبھی اس سے نرمی اور شفقت سے بات کی تھی نہ بغیر گالی کے اور اب وہ بے وقوف مصنوعی محبت جتا کر اس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، وہ محبت جسے کلثوم ہمیشہ ترستی رہی تھی، وہ تو کیا کوئی انجان شخص بھی دیکھتا تو جان جاتا کہ وہ سراسر ڈراما کر رہا تھا۔ اس نے گلاس اپنے منہ کے ساتھ لگایا، انتہائی ناگوار سی بو تھی، اس نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔

"کیسی دوا ہے یہ؟ اس میں تو عجیب سی بو ہے......"

"دوا تو اسی طرح ہوتی ہے نا...... میں نے تمہیں کون سا گلاب کا شربت دیا ہے، دوا ہے نا!" جہانداد نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تھوڑی سی چینی ڈال دو اس میں......" اس نے پھر وقت کو ٹالنا چاہا۔

"چینی ڈالی ہے میں نے......" جہانداد کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی خفگی لیے ہوئے تھا۔ "دوا پیتے ہوئے اتنے نخرے کرو گی تو ٹھیک کیسے ہو گی!" اس نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک بڑا سا گھونٹ بھرا، ایسا کرتے ہوئے اسے جہانداد کے چہرے پر جو مکروہ مسکراہٹ نظر آئی اس نے اس کا رہا سہا شک بھی ختم کر دیا۔

"شاباش!" اس نے اس دودھ کو حلق سے بھی نہ اتارا اور واپس اگل دیا، پیٹ پکڑ کر دوہری ہو گئی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گلاس بھی چھوٹ کر نیچے گر گیا، سارا دودھ صحن کے فرش پر پھیل گیا۔

وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے صحن کے نل تک پہنچی اور زور زور سے ابکائیاں لینے لگی، کچھ ہوتا پیٹ میں تو نکلتا، ابکائیاں لے لے کر وہ نڈھال ہو گئی اور وہیں فرش پر ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گئی۔ جہانداد کو طیش تو بہت آیا مگر اس وقت غصے کا اظہار کر کے وہ بنا بنایا کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک پڑیا تو وہ دوبارہ خرید سکتا تھا، اسے ڈانٹ کر شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کلثوم کامیاب رہی تھی، اس نے جہانداد کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے اس کی سازش کا علم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نگی کو تو اس رات نیند ہی نہیں آ رہی تھی...... اسے اپنی سہیلی کی بے وقوفی اور اپنے جنون میں اس حد تک چلے جانے کا تو اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ اور رانی دونوں جانتی تھیں کہ اس گاؤں کے چوہدریوں کے کردار کے بارے میں لوگ کیسی باتیں کرتے ہیں مگر رانی تو جانے کن اندھی راہوں کی مسافر بن گئی تھی کہ اسے علم ہی نہ تھا کہ وہ کس کنوئیں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رانی کی ماں گھر پر رہنے والی عورت...... اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ گھروں سے باہر مجبوری کی حالت میں نکلنے والی لڑکیوں کے لیے کیسے کیسے عفریت منہ کھولے منتظر ہوتے ہیں۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ رانی کی ماں کو سب کچھ بتا کر اسے کہے گی کہ وہ اس کے اندھیروں کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لے۔ اسے معلوم تھا کہ ان خوب صورت چہروں کی نقابوں کے پیچھے کیسے کیسے بھیانک روپ چھپے ہیں اور اسے بھی کیسے اندازہ ہوتا اگر اس روز وہ غلطی سے اکیلی گھر سے نکل کر گاؤں کی طرف نہ جاتی۔

ویرانی سی ویرانی تھی اس روز گاؤں کی گلیوں میں، دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، جانے کیا وجہ تھی...... وہ گاؤں سے آدھا میل دور تھی، جب اس کے عقب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز قریب آئی اور پھر رک گئی، اس نے قدرتی ردِعمل کے طور پر مڑ کر دیکھا...... وہ جو کوئی بھی تھا خوب صورت تو تھا مگر اس کے منہ سے اسے لگا کہ رال ٹپک رہی ہو۔ اتنی دوپہر میں، ایک اکیلی لڑکی، آس پاس کوئی نہ ہو...... اس کے لیے تو شکار کا بہترین موقع تھا۔ نگی کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو وہ ایک بے بس ہرنی کی طرح اندر سے کانپنے لگی مگر اس نے اپنی کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی تاکہ وہ گزر جائے۔

"ہٹ کیوں گئے سوہنیو؟" اس نے مکروہ سی ہنسی ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"کس سے بات کر رہے ہو تم؟" اس نے مڑ کر دیکھ کر یوں اداکاری کی جیسے اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہو اور وہ اس سے بات کر رہا ہو۔

"تمہارے سوا اور کس سے بات کروں گا؟" اس نے اسی دل لگی سے کہا۔

"کیوں، تم میرے بھائی ہو جو مجھ سے بات کرو گے؟" نگی نے چتون چڑھا کر کہا، وہ کمزور پڑ کر بے بس نہیں ہونا چاہتی تھی اور یوں بھی اسے کچھ نہ کچھ بہادری تو دکھانا تھی ورنہ وہ اسے آسانی سے ہضم کر لیتا۔

"واہ بھئی واہ......" وہ بولا۔ "بڑی اکڑ ہے تجھ میں، جانتی نہیں کہ تو کس سے بات کر رہی ہے، چوہدری شجاع کے نام سے تو ارد گرد کے دس دیہات میں درختوں کے پتے بھی کانپتے ہیں، لوگ تو ڈرتے ہیں میرے نام سے اور تو......"

"میں صرف کتوں سے ڈرتی ہوں!" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "بندہ کوئی ایسا آج تک نہیں ہے جس سے مجھے ڈر لگا ہو......"

"بڑی زبان چلتی ہے تیری......" اس نے دانت پیسے۔ "تیری اکڑ توڑنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!"

"مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو پھر اپنے ہاتھ نہ تڑوا بیٹھنا!" اس نے اللہ کے آسرے پر اسے تڑی دی۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تو میرے ہاتھ کس طرح توڑتی ہے......" اس نے گھوڑے سے اتر کر اسے ایک طرف کھڑا کیا اور خود اس کی طرف بڑھا، خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ بجائے واپس جانے کے گاؤں کی طرف تیزی سے بھاگی، شجاع کو تو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ اچانک بھاگنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس نے کچھ سوچا اور بجائے بھاگ کر اس کا پیچھا کرنے کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے جا کر یہ جاننے کا فیصلہ کیا کہ ایسی جی دار لڑکی گاؤں میں ہے کس کی...... وہ پلٹ کر چند قدم چل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کے پیچھے گھوڑے کو ایڑ لگا

دی۔

گاؤں کی چوڑی گلی میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پوری گلی خالی پڑی تھی اور وہ جو چند لمحے قبل بھاگ کر اس گلی میں داخل ہوئی تھی اسے جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے نگل لیا تھا...... اپنے ہاتھ سے یوں شکار چھوٹ جانے پر اس کی سٹپٹاہٹ دیدنی تھی۔

☆☆☆

اس رات...... تمام رات، اسے ٹوٹے پھوٹے خواب آتے رہے اور اس دن کی یاد آتی رہی جس دن وہ بہ مشکل اپنی جان اور عزت اس بدنیت چوہدری کے ہاتھ سے بچا کر نکلی تھی۔ گلی کی طرف تو وہ یہ سوچ کر بھاگی تھی کہ وہاں وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو متوجہ کر سکے گی مگر جونہی وہ گلی میں داخل ہوئی اسے اپنے پیچھے چند لمحوں کے بعد گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اسے اچانک ہی ایک دروازہ کھلتا نظر آیا اور اس سے پہلے کہ وہاں سے کوئی باہر نکلتا، اس نے بھاگ کر اس گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"کون ہو تم لڑکی؟" اس مرد نے حیران ہو کر پوچھا جو دروازہ کھول کر باہر نکلنے والا تھا۔

"میں کسی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں، وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، بس آپ چند منٹ کے لیے مجھے پناہ دے دیں......" اس نے فریاد کی۔

"کون ہے وہ...... اور اس وقت دن دیہاڑے کس طرح وہ......؟"

"میں نہیں جانتی کہ وہ کیوں اس طرح دن دیہاڑے میرے پیچھے پڑا ہے!"

"ٹھہرو، دروازہ کھول کر مجھے باہر جا کر دیکھنے دو کہ کون ہے، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں......" اس آدمی نے کہا۔ "تم اندر چل کر بیٹھو...... وہاں میرے بچے ہیں، تمہیں میرے گھر کے اندر سے تو کوئی مائی کا لال نہیں لے کر جا سکتا!" اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا۔

"نہیں نہیں...... دروازہ نہ کھولیں، وہ خود ہی چلا جائے گا!" اس نے اسے روکا۔ "آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔"

"ابھی تو تم نے کہا کہ تم اس آدمی کو نہیں جانتیں؟"

"میں نے غلط نہیں کہا......" اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائی صاف نظر آ رہی تھی۔

"میں نے غلط نہیں کہا مگر اس نے اپنا تعارف خود کو چوہدری شجاع کہہ کر کروایا تھا...... اور چوہدری شجاع کو کوئی جانتا ہو یا نہیں...... اس کے کارناموں کو بہت سے لوگ جانتے ہیں، کسی غریب کی بیٹی کو انسان نہیں سمجھتے یہ لوگ!" اس عمر کی لڑکی کے منہ سے ایسی گہری بات سن کر وہ فقط اسے دیکھ کر رہ گیا۔

ایک گہری خاموشی پورے ماحول پر چھا گئی تھی، گلی میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہولے ہولے نزدیک آ کر دور جاتی معلوم ہوئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی...... اس نے اپنی رکی ہوئی سانسیں بحال کیں اور اس آدمی کا شکریہ ادا کر کے دروازہ کھول کر گلی میں جھانکا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا، اس نے باہر نکلنے کو قدم بڑھائے۔

"ٹھہرو...... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اکیلے باہر مت نکلو، ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں گلی کے آخر میں چھپا بیٹھا ہو اور تمہیں اکیلے دیکھ کر......"

"میں چلی جاؤں گی اور یوں لڑکیوں کا پیچھا کرنے والے گلیوں کے آوارہ کتے اتنے بہادر نہیں ہوتے۔" اس نے کہا۔

"بدقسمتی ہے چوہدری مراد علی کی کہ جس کے ہاں شجاع جیسا آوارہ بیٹا پیدا ہوا، باپ بے چارہ تو انتہائی شریف آدمی ہے۔" اس نے کہا۔ "نیکوں کے گھر بد اور بدوں کے گھر نیک پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں......"

"بہت شکریہ آپ کا، میں چلتی ہوں!"

"چلو...... میں بھی گھر سے نکل ہی رہا تھا!" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔ "جہاں تک ہمارا ساتھ ہے وہاں تک میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں بیٹا...... اس کے بعد تم اپنی راہ پر چلی جانا!" وہ دونوں آگے پیچھے نکلے...... گلی کی منزل اپنا گھر تھا، گاؤں کے آخری سرے تک وہ آدمی اس کے ہمراہ رہا اور باقی فاصلہ گلی نے تقریباً بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔

☆☆☆

اچار کے ساتھ رات کی سوکھی روٹی کا ناشتا حلق سے چائے کے ساتھ اتارتے ہوئے بھی گلی مسلسل رانی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رانی کو اپنے ساتھ پیش آنے والے اس دن کے واقعے کا بھی بتائے گی اور اسے اس کے چوہدری اکبر علی سے ملنے کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی...... اگر اس نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اس کی ماں سے کھیتوں سے واپسی پر بات کرے گی۔

ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی، اب وہ گھر سے نکلتے وقت بھی محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ لیتی تھی کہ کوئی شکاری گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو۔ اسے تو اس روز کے واقعے کے بعد سبق حاصل ہو گیا تھا کہ اس کے بعد اکیلے کام پر نہیں جانا، اسی لیے وہ گھر سے نکلی تو یہی مقصد تھا کہ وہ اور رانی اکٹھے چلی جائیں گی۔ جب سے نگی نے رانی کو منع کیا تھا چوہدری اکبر علی سے ملنے سے تب سے رانی اس سے بگڑی سی تھی۔ اب اسے اس کو منانا ہی تھا کہ رانی کا نخرہ بھی تھا، حسن ہو تو نخرہ بھی آ ہی جاتا ہے...... یوں بھی نگی کا مزاج صلح جو تھا۔

''بڑے دنوں کے بعد آئی ہو آج نگی تم تو......'' رانی کی ماں سکھاں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہو گئی ہے؟''

''بس خالہ! کچھ خاص مصروفیت تو نہیں مگر گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہی دن گزر جاتا ہے!'' اس نے شرمندگی سے وضاحت دی، کہاں تو وہ ہر وقت ایک دوسرے کے گھروں میں گھسی رہتی تھیں اور کہاں ذرا سی ناراضی کے باعث کئی دن سے وہ آپس میں ملنا بھی چھوڑے بیٹھی تھیں۔

''بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں!'' رانی نے باہر نکلتے ہی طنز کرنا ضروری سمجھا۔

''چھوٹے لوگ نہ آئیں تو پھر بڑوں کو ہی آنا پڑتا ہے......'' نگی نے بھی اس کے طنز کے جواب میں طنز کیا۔

''جواب تمہارے پاس گھڑے گھڑائے ہوتے ہیں!'' رانی کے لہجے میں خفگی تھی۔

''کیا بات ہے، تم سہیلیاں ناراض لگ رہی ہو ایک دوسرے سے؟'' سکھاں نے ان دونوں کے مابین تناؤ کو محسوس کیا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''کچھ نہیں خالہ...... تمہیں تو پتا ہی ہے کہ اس کا مزاج کیسا ہے، لمحے میں دماغ گرم ہو جاتا ہے!'' نگی نے فوراً کہا۔ رانی خاموش رہی، سکھاں نے نگی کو چائے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر سے ناشتا کر کے نکلی تھی اور رانی کو کام پر ساتھ لے کر جانے کے لیے آئی تھی۔

''تم جاؤ......'' رانی نے روکھے پن سے کہا۔ ''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے!''

''کیا ہوا تمہیں، دیکھنے میں تو ٹھیک لگ رہی ہو؟'' نگی نے حیرت سے پوچھا۔

''ضروری تو نہیں کہ تمہیں نظر آئے کہ مجھے کیا ہوا ہے......'' رانی کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''تم کہہ رہی ہو نگی کہ کوئی بات نہیں ہے اور اس کا مزاج تو آسمان پر پہنچا ہوا ہے!'' رانی کی ماں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں خالہ، سہیلیوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے......'' نگی نے پھر بھی نرمی سے کہا ورنہ رانی کا مزاج دیکھ کر تو اس کو اپنی صاف بے عزتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صلح کا پرچم لہرانے کے بجائے اٹھ کر چلی جائے مگر یہی اس میں اچھی بات تھی کہ وہ فوری ردِعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی۔

''مجھے نہیں جانا آج کام پر، میں گھر پر ہی آرام کرنا چاہتی ہوں!'' اس نے بے نیازی سے کہا تو نگی نے اجازت لی اور چل دی، باہر نکلنے تک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں، اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور سوچ میں پڑ گئی کہ اکیلے چلی جائے یا کہ نہیں...... آخر اس نے واپس مڑ جانے کا فیصلہ کیا اور گھر کی طرف چل دی۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟'' سکھاں نے رانی کے روکھے انداز کو بھی محسوس کیا تھا اور نگی کی آنکھوں میں وہ آنسو بھی دیکھے تھے جنہیں روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا مگر اس سے کچھ کہہ کر اس نے اسے شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''بس میرا جی نہیں چاہ رہا تھا اس کے ساتھ جانے کو......'' اس نے رکھائی سے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سکھاں کو برا تو لگا مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ ان دونوں کے بیچ کچھ ہوا ہے اور وقت گزرے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اپنے معمول کے کام کر رہی تھی کہ اس نے رانی کو باہر آتے دیکھا، اس نے صاف ستھرا جوڑا پہن رکھا تھا اور آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں خوب بھر بھر کر لگا رکھی تھیں۔

''کہاں جا رہی ہو تم یوں بن ٹھن کر؟'' اس نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

''کھیتوں میں کام پر...... اور کہاں!'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''کھیتوں میں کام کے لیے یوں جاتے ہیں؟'' سکھاں نے کہا۔ ''میں تو سمجھی کہ کسی کے بیاہ پر جا رہی ہو۔''

''کس کے بیاہ پر جاؤں گی میں اکیلے......'' اس نے دوبدو جواب دیا۔ ''ذرا سا منہ دھو لیا تو کیا بیاہ پر جانے والا حلیہ ہو گیا ہے میرا......'' سکھاں تو نظر بھر کر اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی، جانتی تھی کہ وہ ایسی ہی تھی، ذرا سا منہ بھی صابن سے مل کر دھو لیتی تو اس کے چہرے پر گلابیاں چھلکنے لگتیں۔

''زیادہ بک بک نہ کر میرے ساتھ اور اپنا منہ دھو کر کام پر جا، کوٹھے والیوں کی طرح آنکھوں میں سرمہ انڈیل رکھا ہے تو نے......'' سکھاں نے سختی سے کہا تو اس نے ماں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا...... اس کی نظر میں کیا تھا، سکھاں کو سمجھ میں نہ آیا، وہ پاؤں پٹختے ہوئے اندر کمرے میں گئی اور واپس لوٹی تو اس کی

آنکھوں سے سرمہ غائب تھا مگر سکھاں کو کیا معلوم کہ سرمہ دانی اس نے اپنے پاس چھپا رکھی تھی۔
سکھاں نے اس کی طرف دیکھ کر مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، اسے لگا کہ جوان بچی ہے کہیں پلٹ کر جواب دے دے تو رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی تو اس کا رخ کھیتوں کے بجائے چوہدری اکبر علی کے ڈیرے کی طرف تھا...... اس دن کا اس سے وعدہ جو کر رکھا تھا، راستے میں رک کر اپنی سہمی ہوئی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیر کر اس نے سرمے دانی کو پھر چھپا لیا تھا، اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی...... اس کی چال میں انوکھا سا غرور تھا۔

☆☆☆

جہاں آرا نے اپنا ٹھکانا بدلنے کے بجائے دلاور کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کروا کر اسے ہاسٹل میں رکھنے کا سوچا اور اس سے بات کی تو وہ بپھر گیا، ماں سے دور تو وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا، منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔
''میں نہیں کہیں بھی جانے والا...... ان کو بھیج دو اماں، وہ سات ہیں، ان میں سے ایک چلی جائے گی تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا، میں تو ایک ہی ایک بیٹا ہوں تمہارا اور گھر میں کسی مرد کا ہونا بہت ضروری ہے!'' اس کے کہنے پر ماں کو ٹوٹ کر اس پر پیار آیا اور اس نے بے ساختہ اس کا منہ چوم لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ قد کاٹھ میں ٹھیک تھا اور ایسا جوان نکل رہا تھا کہ اس پورے علاقے میں کوئی اس جیسا نہ تھا، جہاں آرا کے تصور میں اس کے باپ کا سراپا گھوم گیا، وہ بھی تو ایسا ہی تھا، خوب صورت اور جوان...... اس پر اس کے چہرے پر مستقل سی سوچ!
''میں کہاں بھیجنا چاہتی ہوں تمہیں کہیں میرے لال اگر کچھ پانے کے لیے تو یہ جدائی عارضی ہے نا......''
اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، اس کے باپ کی یاد نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ کچھ تو تھا اس میں کہ جہاں آرا کے دل کا سکون اور قرار لٹ گیا تھا، وہ اپنا آپ بھلا بیٹھی اور اس پر لٹا بیٹھی تھی۔ زمانے بھر سے ٹکرا لے کر اس سے بیاہ رچایا اور......
''اگر تم نہیں بھیجنا چاہتیں تو کیا تمہیں کوئی مجبور کر رہا ہے کہ مجھے بھیجو؟''
''ہاں، کر رہا ہے مجبور......'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے سہانے مستقبل کا خواب...... تمہارے لیے آنے والے بہتر وقت کا تصور، میں تمہیں بہت بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں دلاور......'' جب سے دلی نے بتایا تھا کہ گلی کے لڑکے ''دلی'' نام کی مناسبت سے اسے دلال کہتے تھے، تب سے اس نے اسے دلاور کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا اور اس کی ساری بہنوں کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اسے اس کے نام سے پکاریں۔ ان سب کو معلوم تو تھا کہ دلی ان کا بھائی نہیں مگر بچپن سے ساتھ تھا اور پھر جہاں آرا کا بیٹا تو تھا ہی نا، جس نے انہیں ماں بن کر ہی پالا تھا۔
''اماں یہ الماس اور روبی آج کل شام کو کہاں چلی جاتی ہیں؟'' اچانک دلاور کے ذہن میں سوال آیا تھا۔
''وہ...... وہ دونوں ٹیوشن پڑھنے جاتی ہیں، انگریزی بولنا سیکھ رہی ہیں!''
''کہاں ٹیوشن پڑھنے جاتی ہیں؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ ''کیا گھر پہ کوئی انہیں پڑھانے کے لیے نہیں آ

سکتا؟''
''بیٹا گھر پر کوئی آئے یا وہ جا کر پڑھیں، بات تو ایک ہی ہے نا......'' جہاں آرا نے بات کو ٹالنا چاہا۔
''مگر انہوں نے انگریزی پڑھ کر کیا کرنا ہے، کس سے بولنی ہے انگریزی انہوں نے؟'' اس نے بحث کی۔ ''اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی انہوں نے، گھر بیٹھے پانچ پانچ جماعتیں پڑھ کر سمجھا ہے کہ بڑا کارنامہ کر لیا ہے!''
''بس بیٹا، بڑی چاروں کے معاملے میں تو غفلت ہو گئی، کچھ اس وقت لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہ تھا مگر اب چھوٹیوں کو تو سوچ رہی ہوں کہ اسکول میں بھیج کر پڑھاؤں گی......'' اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''آج کل انگریزی بولنے کا بڑا رواج ہے بیٹا اور معاشرے میں ان لوگوں کی عزت کی جاتی ہے جن کو انگریزی بولنا آتی ہے!''
''اب یہ بڑی ہو گئی ہیں اماں، اب ان کے بیاہ کی فکر کریں...... انگریزی بول کر انہوں نے کیا کرنا ہے؟'' اس نے ماں سے یوں بحث کی جیسے وہ بہت عقل مند ہو گیا ہو اور اسے اپنی بہنوں کی بہت فکر ہو۔ جہاں آرا کو اس کا اس طرح بات کرنا بہت اچھا لگا اور اسی بحث میں اصل بات دلاور کے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔
دلاور کے جانے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک تو اس کے ذہن پر اسی خوشی کا خمار رہا کہ وہ جوان اور ذمے دار ہو گیا تھا یہی اندازہ اس کی بات چیت سے ہو رہا تھا...... مگر اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے تو ہر بات کا مطلب اور اس کے در پردہ راز کی بابت پوچھے گا۔ بڑی دونوں لڑکیوں کو وہ بھجوا تو اس لیے رہی تھیں کہ وہ ماڈرن لڑکیوں کی طرح چلنا پھرنا، لباس پہننا اور انگریزی بول کر مخاطب کو متاثر کرنا سیکھ لیں کہ اب پرانے انداز میں پیشے کا رجحان گھٹتا جا رہا تھا۔ ان کے محلے سے آہستہ آہستہ لوگ ہجرت کر کے شہر کے ان علاقوں میں جا رہے تھے، جہاں متمول لوگ رہتے تھے اور وہاں ''کام'' کرنے کا انداز بھی جدا تھا۔

☆☆☆

کیسے بھول سکتی تھیں وہ دن......
''مجھے کیسے معلوم ہو کہ یہ بچہ......؟'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ مجھے کیسے یقین آئے کہ یہ بچہ میرا ہی ہے؟'' اس کا دل دھک سے رہ گیا اور اس نے شکوہ کناں نظر سے اسے دیکھا تھا۔
''کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔
''تمہارے تو کئی خواہشمند اور کئی واقف کار ہوں گے......''
''اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں!'' اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔
''تو پھر مجھے کیا علم کہ یہ بچہ ان میں سے کسی کا نہ ہو؟'' ان کے لہجے میں دنیا جہان کی فکر کا سا انداز تھا۔
''بڑا دکھ ہے مجھے کہ آپ کو آدمی کی پہچان کرنا ہی نہیں آتی!'' اس نے شکوہ کیا۔ ''جہاں آرا کے دل کی مسند پر آج تک کوئی براجمان ہوا نہ کسی کی اتنی مجال کہ وہ جہاں آرا کو چھوئے بھی، یہ اختیار جسے دیا، وہی ہم پر شک کرے...... بڑا دکھ ہوا مجھے کہ میں نے دل لگایا بھی تو کس کے ساتھ۔ جسے مجھ پر اعتبار ہی نہیں!''

”میں نے یہ تو نہیں کہا......“ وہ ذرا سا ہکلائے، جہاں آرا ناراض ہوں...... یہ کیسے کوئی برداشت کرتا، انہیں کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ جہاں آرا ان چھوئی کلی تھی، ابھی کم سن اور نادان بھی تھی جو اپنے پیشے کے اسرار و رموز بھی نہ سمجھتی تھی۔

”تو کیا کہا آپ نے، کیا جو کچھ میرے کانوں نے سنا وہ کسی اور بات کی بازگشت تھی؟“ اس نے منہ پھلا کر کہا۔

”اصل میں جہاں آرا...... میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں......“

”آپ شادی شدہ آدمی ہیں اور باپ بننے سے ڈر رہے ہیں، کچھ میرے بارے میں بھی سوچیں جو شادی شدہ بھی نہیں اور ماں بننے جا رہی ہے......“ اس نے منہ پھلا کر کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ختم کر دو اس قصے کو!“ انہوں نے صلاح دی۔

”یہ قصہ تو میں نہیں ختم کرنے والی، آپ میں اگر جرأت نہیں ہمیں اپنانے کی تو آج کے بعد اس در پر نہ آیئے گا!“ اس نے غصے سے کہا۔ ”ہم یہی سمجھیں گے کہ ہم ہی اس قابل نہ تھے......“ وہ ان خوب صورت آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی جن آنکھوں میں ڈوب کر کئی لوگوں کو اپنے غم بھول جایا کرتے تھے۔

”ہمیں سوچنے کا موقع دو......“ انہوں نے جہاں آرا کو دلاسا دیا، دل میں یہی سوچا کہ اگر وہ اس سے شادی کر بھی لیں تو کیا حرج ہے، آخر انہوں نے اس سے محبت بھی تو کی تھی، جسمانی تعلق بھی تو قائم کیا تھا۔ اس کے ہاں ان کی پیدا ہونے والی اولاد ان کے نام کے بغیر پیدا ہوئی تو وہ طوائف کی اولاد ہی کہلائے گی...... اور اگر وہ بیٹی ہوئی تو......! یہ اتنا بڑا سوال تھا جو اُن کی نیند اڑا دیتا تھا۔ انہیں جس بات کا شک تھا، اس کے متعلق تو وہ ان کو قرآن پر قسم دینے کو تیار تھی اور پھر انہوں نے خود بھی یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں دیکھا تھا۔

”آپ کو سوچنے کے لیے کتنا وقت چاہیے؟“ اس نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں کل آؤں گا......“ کہہ کر وہ رکے نہیں...... اور اس کے بعد وہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں مگر وہ کل نہ آئی تھی، ماں کی مخالفت کے باوجود اس نے الماس کو جنم دیا اور جب وہ کئی مہینوں کے بعد آئے بھی تو ان کے پاس مجبوریوں کی داستانیں، خاندان کی مخالفت کے بہانے اور کیا کچھ تھا...... جہاں آرا نے ان سے پیار کیا تھا، ان کی مجبوریوں کو سچ مان کر اسے پھر اپنے دل کی مسند پر بٹھا لیا، وہ آتے رہے اور برسا برس تک اپنی مجبوریوں کے الاپ الاپتے رہے، یہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ان کی دکھوں بھری زندگی سے چند دنوں کا فرار فراہم کرتیں اور جب دلاور ان کی گود میں آیا تو الماس جوانی کے سن میں تھی اور اس کے علاوہ اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے انہوں نے جن لڑکیوں کو خرید کر زیرِ تربیت رکھا ہوا تھا، ان کی تعداد بھی برس کے برس بڑھتی رہی۔ سب کو وہ یہی بتاتیں کہ وہ ان کی اپنی بیٹیاں ہیں۔ الماس ان کا خاص مہرہ تھی اور باقی لڑکیاں ان کے خیال میں ان کی الماس کے لیے سہارا بنیں گی۔

اس کے بعد تو انہوں نے الماس کی تربیت میں جس سبق کو کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، وہ مردوں کی بے وفائی تھی مگر ان کی بدقسمتی نے الماس کے کام کے اولین سالوں میں ہی، جب وہ اس کے دام کھرے کرنے کا سوچ رہی تھیں، ان کے اہم ترین سبق کو بھلا کر نہ صرف ایک مرد پر اعتبار کیا تھا بلکہ اسے اپنا آپ بھی سونپ دیا تھا، اپنا آپ...... ایک ان چھوا وجود...... جو ایک طوائف کی سب سے بڑی دولت ہوتا ہے۔ جہاں آرا کو یہی دکھ مارے دیتا تھا کہ ان کی بیٹی نے انہیں وہ قیمت نہ وصولنے دی تھی جس کی وہ حقدار تھیں۔ انہوں نے کبھی اسکول کی شکل دیکھی ہوتی تو کبھی یہ سبق پڑھا ہوتا کہ تاریخ خود کو دُہراتی ہے۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کو ان کی ماں نے تربیت ہی جس پیشے کی دی تھی انہوں نے وہی کیا مگر جس کام سے انہوں نے الماس کو دور رہنے کو کہا تھا، اس بے وقوف نے وہی کیا تھا۔

ان کے ہاں ہر رنگ کی لڑکیوں کے حوالے سے لوگوں کے مختلف مفروضے تھے، کچھ کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ انہوں نے الماس کو خود جنا تھا اور کچھ کا کہنا تھا کہ ان میں سے کئی ان کی اپنی تھیں، جو کوئی بھی اور جو کچھ بھی کہے، اس سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اچھی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنے پیشے کی استاد تھیں اور باقی سب کو ان کے مشوروں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، اسی لیے ان کے منہ پر کھل کر کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ دلاور ان کی لاکھ کوشش کے باوصف پڑھنے کے لیے کہیں نہ گیا اور گزرتے وقت کے ساتھ وہ خود بخود اسی رنگ میں رنگ گیا تھا، جو ایسی جگہوں پر پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والوں کے نصیب ہوتے ہیں۔

☆☆☆

”ارے، ارے...... رکیے صاحب، کہاں بھاگے جاتے ہیں؟“ سیڑھیوں پر ہی انہیں الماس کے بھائی دلاور نے روک لیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ انہوں نے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی، اس شخص سے ان کی شروع سے ہی نہیں بنی تھی، انہیں زہر لگتا تھا اس کا صاف ہاتھ پھیلا کر قبل از وقت وصولی کرنے کا انداز...... پکا دلال لگتا تھا وہ۔

”اماں ملنا چاہتی ہیں جناب آپ سے......“ اس نے خباثت سے کہا تو قائم علی واپس مڑے۔ ”ارے وہاں نہیں، ہمارے ساتھ آئیں!“ وہ آگے آگے سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ بھی اس کی تقلید میں خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ بائیں طرف چل پڑا، اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ ان کے چوبارے سے بیس بائیس مکانات کے فاصلے پر جا کر رکے، ایک نیلے رنگ کے دروازے والا مکان تھا، جس کے دروازے پر دلی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ ایک لمحے کو قائم علی کو ڈر بھی لگا کہ وہ کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔

اگرچہ جہاں آرا ان کے آگے بچھ بچھ جاتی تھیں مگر جب سے یہ نئی صورتِ حال سامنے آئی تھی وہ اس سے بے اعتنائی سے پیش آتیں، ان کے خیال میں بے پروائی قائم علی کی طرف سے ہوئی تھی، وہ ایک جہاں دیدہ اور شادی شدہ شخص تھا۔ جس ہیرے کو وہ اپنی زندگی بھر کا اثاثہ سمجھ کر تراشتی آ رہی تھیں اور اس کی ایسی دیکھ ریکھ کر رہی تھیں جیسے کوئی آبگینوں کی کرتا ہے...... وہ ایک عام سے آدمی کی بے پروائی کی نذر ہو گیا تھا۔ اپنی بیٹی کی جو قیمت وہ وصولنا چاہتی تھیں وہ دینا (ان کے خیال میں) قائم علی کے بس کا کام نہ تھا۔

حالانکہ اگر غیر جانبداری سے دیکھا جاتا تو وہ تو گاہک تھا، رقم دے کر سکون خریدنے آیا تھا کیونکہ وہ اتنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ جہاں آرا کی بیٹی ہی اگر اس پر مرمٹی تھی اور اپنا آپ اسے سونپ دیا تھا تو اس میں اس

کا کیا قصور تھا۔ اللہ نے اسے وجاہت تو دی تھی کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی اس پر اس وقت بھی دل ہار بیٹھی تھی جب وہ چٹا ان پڑھ اور ایک چھوٹا سا کاروباری آدمی تھا۔

"یہاں کیوں لے کر آئے ہو تم مجھے؟" دلی نے دستک دینا بند کی تو اس نے پوچھا۔

"ذرا صبر کر لیں جناب، دروازہ کھلے گا تو آپ کو خود ہی علم ہو جائے گا کہ یہاں پر کیوں آئے ہیں آپ!" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ دروازہ ایک جوان سی لڑکی نے کھولا، اسے دیکھ کر دلی نے سیٹی بجائی اور تصدیق کی کہ اماں پہنچ گئی ہے کہ نہیں...... اس نے بتایا کہ اماں اندر ہے اور انتظار کر رہی ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر ہٹ کر ان دونوں کو راستہ دیا اور خود ان کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند کرنے لگی۔

"چلیں......" اس نے اندرونی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ چلیں صاحب...... اماں اندر ہی ہے، میں ابھی آتا ہوں، مجھے ذرا اس کا ایک ادھار چکانا ہے!" دلی نے اس لڑکی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا، وہ بھی اسی کی منتظر نظر آتی تھی، قائم علی نے منہ پھیر لیا۔ خود ایسی حرکتیں کرتا پھرتا تھا اور کسی اور کو دیکھ کر خصوصاً دلی کو۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا، وہ وہیں کمر پھیر کر کھڑا رہا...... ان دونوں کی دبی دبی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دونوں اس کی موجودگی کا احساس رکھتے ہوئے بھی واہیات باتیں کر رہے تھے اور ان کی آواز بہت آسانی سے تو نہیں مگر اس تک پہنچ رہی تھی۔

"اگر تم مصروف ہو تو میں چلتا ہوں......" اس نے کہا تو دلی چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔

"آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں؟"

"تو اور کہاں جاتا میں؟" انہوں نے غصے سے دانت کچکچائے۔

"چلیے صاحب......" اس نے بادلِ ناخواستہ اس لڑکی کو چھوڑا اور قائم علی کو اپنی ہمراہی میں لے کر اندر کی طرف چلا، وہ لڑکی بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہی تھی۔

"آئیں، آئیں جناب......" جہاں آرا نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ "آج تو بڑے دنوں کے بعد یوں آپ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا ہے......" درست ہی تو کہہ رہی تھی وہ، شروع میں جب آنا شروع کیا تھا تو آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم علی ہمیشہ جہاں آرا کو سلام کر کے اس سے الماس سے ملنے کی اجازت طلب کرتا تھا مگر پھر ایسا وقت آ گیا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ سراپا انتظار دروازے پر ہی کھڑی ہوتی اور وہیں سے وہ اسے اپنے کمرے میں لے جاتی تھی، یہی ملاقاتیں اور کمرے میں طویل تنہائی کے مواقع وہ رنگ لائے تھے جنہوں نے نہ صرف انہیں بلکہ جہاں آرا کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔

☆☆☆

رانی جتنی بھی بے اعتنائی برتتی، نگی کی محبت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا تھا، وہ ایک سمجھدار لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ رانی کی عمر میں جنون ایسا ہی ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کام پر بھی اس لیے نہیں گئی تھی کہ اکیلے جانے سے کترا گئی اور واپس لوٹ کر آئی تو سکون ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ رانی کے پاس جا کر کچھ وقت گزارے...... ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکلی کہ رانی بیمار ہے اور وہ اس کا پتا کرنے جا رہی ہے۔

راستے میں بھی وہ سوچتی رہی کہ رانی کو منا کر رہے گی چاہے اس میں اس کی کتنی ہی بے عزتی کیوں نہ ہوتی ہو، بھلا سہیلیوں، سہیلیوں کے بیچ میں کیا بے عزتی والی بات ہوتی ہے...... وہ خود ہی سوچ کر مسکرا دی۔ سوچوں میں راستہ کیسے کٹا، اسے اندازہ بھی نہ ہوا۔

''ہیں...... وہ تو تیرے پیچھے ہی تیرے جانے کے تھوڑی دیر بعد کام کے لیے نکل گئی تھی......'' رانی کی ماں نے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

''مگر میں تو یہاں سے نکلی تو گھر ہی چلی گئی تھی، اکیلے کام پر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا!'' اس نے بتایا۔

''مجھے رانی کے اکھڑے اکھڑے رویّے سے اندازہ تو ہو رہا تھا کہ تم دونوں سہیلیوں کے بیچ کوئی بات ہوئی ہے مگر مجھے دخل اندازی کرنا اور پوچھنا اچھا نہ لگا کہ جو بھی ہے تم دونوں خود ہی ٹھیک ہو جاؤ گی......'' سکھاں نے کہا۔ ''تمہارے جاتے ہی شاید اسے اپنی زیادتی کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ تمہارے پیچھے ہی تھوڑی دیر کے بعد نکل گئی تھی......''

''میں تو گئی ہی نہیں ماسی......'' اس نے ملال سے کہا۔ ''وہ بیچاری اکیلے ہی کام کر رہی ہو گی!''

''کافی دیر سے گئی ہوئی ہے، اب تو لوٹنے والی ہی ہو گی تم اس کا انتظار کرو، میں اپنا کام کاج نمٹا لوں!'' سکھاں نے پرات میں آٹا ڈالا اور اسے گوندھنے لگی، نگی تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر اس کے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگے، اسے اپنی کیفیت کی خود بھی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ اگر وہ بیٹھ کر رانی کا انتظار کرتی تو وہ جانے کب آتی اور آتی بھی تو اس کا مزاج گرم ہوتا کیونکہ اسے اکیلے کام پر جانا پڑا تھا۔

''میں چلتی ہوں ماسی...... رانی کو آئندہ کام پر اکیلے نہ بھیجنا!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے، اکیلے وہ جاتی کب ہے، تیرے ساتھ کی وجہ سے چل پڑتی ہے ورنہ تجھے پتا ہے کہ کام کرنے سے اس کی جان جاتی ہے......'' سکھاں نے آٹا گوندھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جانے اگلے گھر جا کر کیا کرے گی؟'' اس نے ساتھ ہی اپنی تشویش کا اظہار کر دیا۔

''سب ٹھیک ہو جاتا ہے ماسی، جب سر پر پڑتی ہے تو اچھے اچھوں کے مزاج سیدھے ہو جاتے ہیں!'' وہ ہنسی۔

''تیرے لیے تو تیری ماسی کا بیٹا ہے نا نگی، پر اس کے جوڑ کا تو ذات برادری میں ہے ہی کوئی نہیں، جانے اس کے نصیب اسے کہاں لے جائیں گے......''

''اللہ سب سے بڑا ہے ماسی اور وہی ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے، اس کے لیے بھی اس نے کچھ بہت اچھا طے کر رکھا ہو گا......'' نگی نے خلوصِ دل سے کہا۔

''تو اسے جانتی تو ہے مگر اتنا نہیں جتنا میں اس کی ماں اس کو جانتی ہوں......'' سکھاں نے آٹا گوندھ کر رکھ دیا تھا اور اب نگی کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ''اس کے اندر بغاوت کا بیج ہے، اسے اپنا ماحول پسند نہیں، گھر نہیں پسند...... غرض اسے جو کچھ میسر ہے اس پر وہ ناخوش ہے۔ اس کی خواہشات بہت بڑی بڑی ہیں، ان کا کوئی انت نہیں ہے!''

''زیادہ تو نہیں ماسی مگر اتنا جانتی ہوں کہ وہ ناخوش رہتی ہے، اس میں قناعت نہیں ہے، وہ بہت کچھ پانا چاہتی ہے جو ہم جیسی لڑکیوں کو عمر بھر نہیں ملتا......'' نگی نے کہا۔ ''اس کے سپنے پورے کرنے کی طاقت شاید ہمارے طبقے کے کسی جوان میں نہیں ہوگی، ہم تو نسل در نسل بکے ہوئے لوگ ہیں، کسی ایک جگہ ٹھکانا نہیں، جو ہماری قیمت ادا کر کے ہمیں خرید لے، ہم اسی کے خدمت گار...... ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہماری نسل پر چڑھے ہوئے سود در سود قرض کا آغاز کس نے کیا اور اس کا اختتام کب ہوگا......''

''تو تو بہت سیانی ہے بیٹی، اسے بھی کچھ سمجھایا کر، اپنے جیسی سوچ اسے بھی دے دے......''

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہی تھی ماسی کہ تو اس کو سمجھا......'' نگی نے تہیہ کیا کہ وہ اس کی ماں کو کسی حد تک بتا کر خبردار کر دے گی۔ ''اسے سمجھا کہ چھوٹے دلوں میں بڑی بڑی خواہشات نہیں بسانی چاہئیں......''

''کون سی خواہشات کی بات کر رہی ہو بیٹی؟'' سکھاں کے انداز میں تشویش تھی۔

''یونہی کہہ رہی تھی ماسی......'' اس نے اس وقت اتنا بتانا ہی کافی سمجھا اور چل دی...... کاش وہ تھوڑی سی دیر اور رکتی، سکھاں کو تھوڑا سا اور اشارہ دیتی...... جو وہ رکتی تو دیکھتی کہ اس کی پیاری سہیلی اپنی خواہشات کی کیا قیمت چکا کر گھر لوٹی تھی...... وہ ذرا سا اور ٹھہرتی تو دیکھتی کہ سکھاں بیٹی کو دیکھ کر بھی نہ جان پائی تھی کہ اس کی بیٹی کہاں سے آ رہی تھی اور کیا کر کے آ رہی تھی۔

☆☆☆

شاکر نے ارادہ کیا کہ وہ بچی کو کچھ دنوں کے لیے سلمٰی کے حوالے کر کے گاؤں کا چکر لگا آئے گا، دکان تو اس نے چھوٹے سے پیمانے پر شروع کر دی تھی اور انہی کی بیٹھک میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگا تھا، کرایہ بھی اس نے سلمٰی کو زبردستی یہ کہہ کر ادا کیا تھا کہ وہ اسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا اور بہنوں کا بھائیوں پر حق ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وہ کوئی سودا سلف اپنی جیب سے لے آتا اور کبھی بچوں کو تفریح کروانے کے لیے باہر لے کر جاتا تو انہیں ٹافیاں وغیرہ لے کر دے دیتا۔ بچیاں گھر پر ہی رہتی تھیں، ان کے لیے بھی آتے ہوئے کچھ نہ کچھ لے کر آتا تھا۔

سعید منع ہی کرتا رہ جاتا مگر شاکر کا جواب اسے لاجواب کر دیتا کہ وہ ان بچوں کا ماموں ہے اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ سعید لاجواب ہو جاتا اور اس کے اس احسان کو اس کے سوا کسی طرح نہ چکا سکتا تھا کہ سلمٰی اور ناہید کو بار بار تاکید کرتا کہ اس کی بچی کا اچھی خیال رکھا کریں۔ اس روز بھی رات کے کھانے کے وقت سعید اور شاکر دونوں ہی تھے، بچے بھی پاس ہی تھے البتہ ناہید عدت میں ہونے کے باعث سامنے نہ آتی تھی۔ سلمٰی روٹی لے کر آئی تو شاکر، سعید سے اپنے گاؤں جانے کی بات کر رہا تھا۔

''کیا آپ ہمیشہ کے لیے جانے کی بات کر رہے ہیں شاکر بھائی؟'' سلمٰی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ واپس نہ آؤں......'' اس نے جانے کیسے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ''کچھ رکے ہوئے کام کرنا تھے!''

''کہیں شادی وادی تو نہیں کرنے جا رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ممکن ہے......'' مرد ہو کر بھی اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا' سعید اس نوجوان کو دیکھ کر رہ گیا تھا جس

میں شہر کے نوجوانوں جیسی ہوشیاری چالاکی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اب تو دیہات میں بھی ایسی سادگی کمیاب تھی۔

''تو شادی کر کے اسے بھی شہر لے آئیں، اب آپ نے شہر میں نئی نئی دکان شروع کی ہے، لوگ دیہات سے شہروں کی طرف آ رہے ہیں اور آپ......''

''ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا آپا!'' شاکر نے کچھ عرصے سے اسے آپا کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''گاؤں جا کر ہی حالات کا علم ہوگا!''

''کوئی ہے آپ کی نظر میں؟'' سلمٰی نے پھر استفسار کیا۔

''کہہ سکتی ہیں......'' شاکر اس لیے بھی محتاط تھا کہ عورتیں بال کی کھال اتارتی ہیں، اسے اشارہ بھی دے دیتا تو پھر وہ مزید جاننے پر اصرار کرتی اور وہ ابھی اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''کب جانے کا ارادہ ہے؟'' سعید نے پوچھا۔

''دو تین دن میں نکل جاؤں گا!'' شاکر نے کہا۔

''دکان کا کیا کرو گے، کیا بند کر جاؤ گے اتنے دنوں کے لیے؟''

''جلد آنے کی کوشش کروں گا، تاہم دکان تو بند ہی کر کے جانا پڑے گی، البتہ مال آپ کو امانت کے طور پر سونپ جاؤں گا!'' شاکر کا ارادہ یہی تھا کہ اب وہ پلٹ کر گاؤں میں کاروبار نہیں کرے گا، تھوڑے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر میں ترقی کے مواقع کہیں زیادہ تھے۔ اس بات کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ زرتاج مانے گی یا کہ نہیں...... اس بچی کے ساتھ تو وہ اس گاؤں میں یوں بھی نہیں رہ سکتے تھے، گاؤں میں لوگوں کو اس کا کیا جواز دیتے۔

زرتاج کی یاد دل میں اترتے ہی اس کے اندر ٹھنڈی ٹھنڈی پھواری پڑنے لگی، کتنے دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے...... اب چند دن کا فاصلہ ان کے بیچ میں رہ گیا تھا، پھر وہ اسے بیاہ کر لے آئے گا، معراج بی بی سے اب اسے یہ کہنا تھا کہ وہ اب شہر میں ہی اپنا کاروبار بھی کرے گا اور زرتاج کو بھی اپنے ساتھ شہر لے آئے گا...... سوچتے ہی اسے کچھ یاد آیا۔

''سعید بھائی...... اب کے واپس آؤں گا تو چاہوں گا کہ اپنے لیے کرائے پر کوئی اور گھر دیکھ لوں!'' اس نے کہا۔

''خیر سے جاؤ اور خیریت سے لوٹو تو سب دیکھا جائے گا......'' سعید نے مسکرا کر کہا تھا۔

''سیما کو بھی ساتھ لے کر جاؤ گے کیا؟'' سعید نے پوچھا۔

''لے تو جاؤں مگر کشمکش میں ہوں کہ اسے کس طرح سنبھالوں گا......'' شاکر نے حسبِ عادت سر جھکا کر کہا مگر جو وہ دیکھ پاتیں کہ اس کی آنکھوں میں امید کے کیسی جوت جگمگا رہی تھی۔

''اسے چھوڑ جائیں، میں سنبھال لوں گی......'' سلمٰی نے پیشکش کی۔

''میں آپ کا ممنون ہوں گا!'' شاکر نے تشکر بھرے انداز میں کہا۔ رات بھر اس سہانے تصور میں گزری کہ اگلے روز اسے گاؤں کے لیے روانہ ہونا تھا، وہ اپنی منصوبہ بندی کیے بیٹھا تھا مگر قدرت نے اس کے لیے کیا سوچ رکھا تھا، اسے معلوم نہ تھا...... جس روز اسے نکلنا تھا، سیما رات بھر الٹیاں کرتی رہی تھی اور نڈھال پڑی

تھی۔ اس کی اتنی فکر نہ تھی، اس کا کون سا اس سے کوئی خونی رشتہ تھا مگر اس گھر کے نفوس کیا سوچتے، اس نے انہیں تو یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے، وہ سوچتے کہ کس طرح کا باپ ہے اسے اس بیماری میں چھوڑ کر چلا گیا۔ ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا، قدرت کی طرف سے اس کے لیے رکاوٹ حائل ہو گئی تھی، اسے کچھ دن صبر کرنا تھا۔ وہ چند دن ...... جو اس کی زندگی کا رخ ہی موڑنے والے تھے۔

☆☆☆

''اماں......!''

''ہوں......؟'' ہلکی سی غنودگی بھری آواز تھی۔

''سو گئی ہیں کیا؟'' زرتاج نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟'' معراج بی بی نے پوچھا۔

''اماں ایک بات کہنا تھی آپ سے......''

''کہو؟''

''اماں...... یہ ہم سب لڑکیوں کے نصیب ایسے کیوں ہوتے ہیں، مردوں کے معاشرے میں کسی نہ کسی طرح پستی رہتی ہیں؟'' اس نے ماں سے عجیب سا سوال کیا۔

''تاجی! تجھے یہ آدھی رات کو کیا سوجھی......؟'' بہت کم اماں اسے تاجی کہتی تھی لیکن جب کہتی تو اس میں یا پیار ہوتا یا غصہ، اسے اس وقت سمجھ میں نہ آیا کہ ماں کے بے تاثر لہجے میں کیا تھا، چہرہ تو اسے اندھیرے کے باعث نظر ہی نہیں آ رہا تھا، شاید اماں غصے میں ہوں گی...... ابا کے بعد اماں کو غصہ بھی تو بہت آتا تھا۔

''اماں یہ کلثوم کو ہی لے لے، گھوٹو جیسا شخص، جسے کوئی منہ نہ لگاتا چاہے...... وہ بے چاری اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے، اس لیے کہ وہ سزا کے طور پر اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا، وہ بھی چاہتی اماں تو اس کے ساتھ بیاہ کرنے کے بجائے کنویں میں چھلانگ لگا دیتی مگر...... بات تو ایک ہی ہے نا!''

''مجھے تو تیری بات کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا، کہنا کیا چاہتی ہے تو؟'' اماں کے لہجے میں اب صاف خفگی تھی۔

''اماں کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ لڑکیوں کو پیدا کرتے ساتھ ہی ان کے نصیب لکھنے کا اختیار ماں باپ کو دے دیتا!'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے اس وقت، کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے؟'' معراج کی کوشش ہوتی تھی کہ زرتاج کو کسی ایسے موضوع پر نہ ہی آنے دے جس سے اس کو ماضی کی یادیں ستانا شروع کر دیں۔

''اماں آپ کو نیند آ رہی ہے کیا؟'' اس نے چڑ کر پوچھا۔ ''ویسے تو آپ رات رات بھر جاگ کر گزار دیتی ہیں!'' معراج کے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا، نیند تو جانے کب سے اس سے یوں روٹھی تھی کہ ٹکڑوں اور ٹوٹوں میں تھوڑی سی دیر کو اونگھ آتی اور پھر آنکھ کھل جاتی تو رات بھر آنکھوں میں ہی کٹ جاتی۔

''تم سو جاؤ اب اور اس طرح کی باتوں کو اس وقت مت سوچو!'' معراج نے اسے ٹالا۔ ''چلو اب آیت الکرسی پڑھو اور آنکھیں بند کر کے کوئی اچھی بات سوچو......'' اس کے پاس سوچنے کے لیے کون سی اچھی بات تھی

''جانے یہ شاکر اب کی بار شہر گیا ہے تو اتنے دن کیوں لگا دیے ہیں......'' اماں بڑبڑائی تھیں تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی، وہ اور اماں ایک وقت میں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔

''اماں آپ کو بتانا تھا کہ اس روز جو لوگ ہمارے گھر چھت سے کود کر آئے تھے......''

''کیا ہوا ان کو؟'' معراج اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں میں نے ان میں سے ایک آدمی کو چوہدری سراولی کی حویلی میں دیکھا تھا، فیضی نام کا آدمی...... اور مجھے رابعہ بی بی نے بتایا تھا کہ وہ چوہدری شجاع کا خاص آدمی تھا، چوہدری شجاع، چوہدری صاحب کا منجھلا بیٹا ہے......''

''تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟'' معراج نے خفگی سے کہا۔

''پہلے مجھے کون سا علم تھا......'' اس نے صفائی پیش کی۔ ''وہ تو اس روز حویلی میں، میں نے اسے دیکھا اور رابعہ بی بی سے پوچھا تھا!''

''اس کا مطلب ہے کہ چوہدری شجاع نے تجھے کہیں دیکھا ہے......'' یہ کہتے ہوئے معراج بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''مجھے اس کی بابت چوہدرانی سے بات کرنا ہی ہو گی!'' خلا میں گھورتے ہوئے معراج نے کہا۔

''کیا اس وقت بات کرنے جائیں گی اماں؟'' زرتاج نے حیرت سے پوچھا۔

''مگر اس نے تمہیں کہاں دیکھا ہو گا؟''

''ممکن ہے کہ اپنی حویلی میں کہیں سرسری سا دیکھا ہو، میں نے تو اسے شاید ایک بار ہی دیکھا ہے!'' زرتاج نے اپنی صفائی دی۔

''اگر تم نے اسے ایک بار دیکھا ہے تو اس نے بھی شاید تمہیں ایک بار ہی دیکھا ہو...... مگر وہ اتنا کمینہ صفت انسان ہے کہ وہ کسی کی بیٹی پر اچھی نظر ڈال ہی نہیں سکتا......'' معراج نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں نے تمہیں ہمیشہ چھپا چھپا کر رکھا ہے، میں نے تین بیٹیاں گنوائیں زرتاج...... شوہر کا پیار اور اعتبار کھویا...... اب میرے پاس تمہارے سوا بچا ہی کون ہے، میں تمہیں کسی بھی طرح نہیں کھو سکتی۔ تمہیں کچھ ہوا تو میں یونہی مر جاؤں گی......'' وہ رو رہی تھی، آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ توڑ کر باہر آنے لگے۔ ''میں کچھ دن انتظار کروں گی شاکر کا، اگر وہ نہ لوٹا تو میں تمہیں تمہارے گھر کا کر دوں گی، اس سے پہلے کہ ان خبیثوں کی تم پر دوبارہ بری نظر پڑے......''

معراج کا یہ کہنا تھا کہ زرتاج کے آنسو بھی بہنا شروع ہو گئے، وہ کس طرح کسی اور کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ قیامت تک شاکر کا انتظار کر سکتی تھی، وہ اس کی کنواری آنکھوں کا خواب تھا، اس کی تعبیر کوئی اور کیسے ہو سکتا تھا...... ''اللہ نہ کرے کہ اماں کو مجبور ہو کر میری شادی کسی اور سے کرنی پڑ جائے، میں کسی اور کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتی......'' اس کے ماموؤں کے بیٹے اس سے بھی چھوٹے تھے اور اس کے علاوہ ان کا خاندان کہاں تھا اور کون تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

''جانتی ہوں میں کہ شاکر اور تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو مگر اس سے پہلے کہ ہمارے ہاتھ میں وقت نہ رہے اور تیری جوانی ان درندوں کی بھینٹ چڑھ جائے......'' وہ پھپھک پھپھک رونے لگی، زرتاج حیران تھی

کہ کیسے اس کی ماں اس کے دل کے حال سے بھی واقف تھی پھر بھی اس کے ساتھ ایسی باتیں کر رہی تھی۔ معراج نے تو جوانی میں خود کو کسی کی محبت میں مبتلا ہو کر تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، وہ کس طرح غافل ہو سکتی تھی اپنی بیٹی کی امنگوں سے مگر غربت از خود اتنی بڑی مجبوری ہوتی ہے کہ اس کے آگے دنیا کی تمام مجبوریاں ہیچ ہوتی ہیں۔ غریب آدمی کی امنگوں اور آرزوؤں کی کسی کی نظر میں کیا وقعت......

☆☆☆

کلثوم اگلے ہی روز صبح بغیر چوں چرا کیے کام کے لیے نکل گئی، یہی چاہتا تھا نہ وہ کہ اسے کام نہ کرنا پڑے، اس نے بھی اس سے پوچھا تک نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ راستے میں وہ معراج بی بی کے پاس گئی اور انہیں بتایا کہ جہانداد نے اسے کہیں سے کوئی پڑیا لا کر دی تھی، اس میں اس کے بقول وہ دوا تھی جو کلثوم کی متلی کی کیفیت کو ختم کر دیتی مگر کلثوم کو شک ہو گیا اور اس نے وہ دوا کیسے طریقے سے ضائع کر دی تھی، اس وقت تو زرتاج کی ہنسی نکل گئی تھی، کلثوم نے کیسی چالاکی دکھائی تھی مگر دل میں اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ اگر جہانداد نے اس پر زبردستی کی تو کہیں اس بے چاری کو اپنی جان سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔

معراج اور زرتاج تو اس کے لیے ماسوا اس کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں اسے سمجھائیں کہ وہ جہانداد کے کہنے پر کوئی دوا نہ کھائے۔ وہ بھلا کب چاہتا ہوگا کہ وہ بستر پر پڑ جائے اور اس نکمے کو کام کرنا پڑے۔

''اس بھک منگے کو شرم بھی نہ آئی تمہاری زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہوئے......'' معراج نے کلثوم سے کہا تو وہ روہانسی ہو گئی، بھلا اس بے چاری کا اس میں کیا قصور مگر معراج کا یہی ڈانٹنا تھا کہ جس سے سب لوگ ڈرتے تھے۔

''اماں...... وہ کیا خود اس کو کہہ رہی ہے کہ اس کو ایسی فضول دوائیں لا لا کر دے؟'' زرتاج نے ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا، کلثوم کو ذرا سی ڈھارس بندھی۔

''ماسی...... میں نے تو اس سے زبردستی کی شادی کے بندھن کو بھی یہ سمجھ کر قبول کر لیا کہ یہ میرے اللہ کی طرف سے ہی ہے، اس لیے اس میں میرے لیے کوئی بہتری ہوگی، مجھے اس سے جتنی بھی کراہت محسوس ہوتی ہے میں اس کو برداشت کرتی ہوں کہ اس کے علاوہ دنیا میں میرا ہے بھی کون...... مگر جس دن سے مجھے یہ خوش خبری ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی نعمت دینے کا فیصلہ کیا ہے...... یقین کریں ماسی میرے قدم ہی زمین پر نہیں ٹکتے، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کوئی تو میرا اپنا ہوگا، میرے جسم کا ٹکڑا......'' اس نے جذباتی انداز میں کہا تھا۔ ''میں جیسے تیسے بھی ہوا اس کو پال بھی لوں گی مگر جانے کیوں وہ اس کے پیچھے پڑا ہے!''

''اللہ نے تمہیں اولاد دینی ہے تو وہ ضرور دے گا، مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ طاقت ور ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں مگر اپنی سی احتیاط ضرور کرنا، وزن وغیرہ اٹھانے سے پرہیز کرنا!'' معراج نے کہا۔ ''میں تو اس کے لیے ہدایت کی دعا ہی کر سکتی ہوں...... بے ہدایتا نگوڑ مارا!'' اماں کے یوں کہنے پر زرتاج کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''کلثوم...... اگر وہ کبھی اماں کو نظر آ گیا نا تو، تو دیکھنا......'' وہ کھی کھی کر کے ہنسی تو معراج کو غصہ آ گیا۔

''زیادہ فالتو باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، خوامخواہ!'' معراج نے کہا۔ ''میں کوئی پاگل ہوں جو راہ چلتے دیکھ کر اس کا سر پھاڑ دوں گی؟''

''چلتی ہوں ماسی......'' کلثوم اٹھ کر چل دی، زرتاج نے اس کے پیچھے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر ماں کے پاس آ کر بیٹھی تو اس کی نظر ناگاہ اس جگہ پر پڑ گئی جہاں کچھ دیر پہلے کلثوم بیٹھی تھی۔

''اماں......'' چیخنے کے انداز میں اس نے ماں کو پکارا، جس نے اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تو سراسیمہ ہو گئی، پاؤں میں چپل اڑسے اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھولا تو اسے وہ ذرا دور نظر آ گئی، اس نے پوری آواز سے اسے پکارا، کلثوم نے مڑ کر دیکھا تو معراج اسے واپس آنے کا اشارہ کر رہی تھی، وہ ٹھٹک کر وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، گلی کے کئی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

''کام ہے ذرا تجھ سے......'' معراج نے لوگوں کی نظروں کے محور بننے پر اس بے چاری کو شرمندگی سے بچانا چاہا۔ ''میری بات سن کر چلی جانا!'' کلثوم واپس اس کے گھر کی طرف ہولی، گلی کے لوگوں کی توجہ اب اس پر سے ہٹ گئی تھی اور معراج کھڑی اس کے قدم گن رہی تھی، اس کا ایک ایک قدم اٹھانا خطرناک تھا...... مگر کیا کرتی، کسی کو یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے اٹھا کر اس کے گھر تک چھوڑ جائے۔

''سب خیر ہے نا ماسی، ابھی تو میں یہاں سے اٹھ کر گئی ہوں......'' اس نے قریب پہنچ کر حیرت سے پوچھا۔

''یہاں تو سب خیر ہے......'' معراج نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کی طرف کھینچا۔ ''تیرے ساتھ خیر نہیں لگتی مجھے......''

☆☆☆

عباس کو زہرہ کی باتیں بدزبانی لگنا شروع ہو گئی تھیں، اس کے دل میں ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ کر آ گئی ہے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی اور ملے تو وہ اسے چھوڑ کر اس کے ساتھ چل دے۔ وہ اسے اتنے کڑے پہرے میں رکھتا تھا اور گھر سے باہر جاتا تو اب باہر سے تالا لگا کر جاتا تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے اور کسی کو گھر میں نہ آنے دے۔ اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ جب کمروں میں روزن چھوٹے ہوں تو آندھی کا دباؤ زیادہ شدت سے ہوتا ہے۔

زہرہ اس کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آ تو گئی تھی مگر اب اسی کی نظر میں بے اعتبار ہو گئی تھی۔ اسے عباس عجیب سا لگنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ بچی کا نام اس نے کیا سوچ رکھا تھا تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ زہرہ کا منہ دیکھنے لگا...... ''تم نے کچھ سوچا ہوگا، مجھے تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی!''

''میں کیوں سوچتی نام، بچی تمہاری ہے، نام بھی تم سوچتے اور نام سوچنے کے لیے کتنی فرصت درکار ہوتی ہے بھلا؟'' اس نے مصنوعی ناراضی سے منہ پھلایا۔

''کلثوم رکھ لو......'' اس نے تجویز دی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں عباس؟'' وہ چڑ کر بولی۔ ''کلثوم اس کی پھوپی کا نام ہے!''

''تو کون سا پھوپی اور بھتیجی ایک ہی جگہ رہ رہی ہیں!'' اس نے جواز پیش کیا۔

''پھر بھی کبھی نہ کبھی تو اکٹھے ہوں گی نا......!'' اس نے غصہ دبانے کی کوشش کی، دل میں خیال آیا کہ اس

طرح کے کام غالباً عورتیں ہی کرتی ہوں گی، مردوں کو بھلا کیا پتا اور خاص طور پر لڑکیوں کے ناموں کا۔ وہ تو غریب دن بھر محنت اور مزدوری کرتا رہتا ہے اور تو اور اسے وہ عشق بھی بھول گیا ہے، جس نے ہم دونوں کو اپنے اپنے گھروں سے نکالا تھا۔

دنیا اور آخرت کی خواری بھی مول لی، اب میں بیٹی کا نام رکھنے کے لیے خواہ مخواہ اس سے توقع کر رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی نام بتائے اور وہ مجھے پسند ہی نہ آئے...... وہ سوچے جارہی تھی اور خود ہی سوال و جواب کر رہی تھی۔ یوں بھی وہ یوں بات بے بات بگڑتا تھا کہ وہ ڈر جاتی تھی۔

''زرینہ نام کیسا رہے گا؟'' اس نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پسند ہے تو اچھا ہے......'' اس نے بھی نرم لہجے میں کہا۔ ''یہی رکھ لو!''

''کتنے عرصے کے بعد تم نے نرمی سے بات کی ہے مجھ سے عباس......'' زہرہ نے شکوہ کیا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

''کیا کروں زہرہ......؟'' اس نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ''نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو جاتا ہوں۔ حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے، ورنہ تم سے کتنا پیار ہے یہ تو تم جانتی ہی ہو......''

''یہ کیسا پیار ہے عباس، جو ایک سال میں ہی کم ہو گیا ہے......'' وہ اس کے ساتھ لگ کر سسک اٹھی۔

''پیار تو کم نہیں ہوا!'' عباس نے اسے پیار سے کہا۔ ''بس پیٹ کے دھندے نے سب کچھ بھلا دیا ہے......''

''تم مجھ پر شک کرتے ہو اور سختی بھی...... یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمہیں مسائل ہیں یا کوئی دکھ ہے تو ویسا ہی دکھ میرا بھی تو ہے، اگر تم پچھتا رہے ہو تو اور بات ہے۔'' اس نے موقع دیکھ کر شکوہ کیا۔

''پچھتا نہیں رہا...... پچھتا رہا ہوتا تو بہت عرصے پہلے ہی کچھ فیصلہ کر لیتا، اب تو ہم اولاد کی مضبوط ڈور میں بھی بندھ گئے ہیں!'' اس نے اسے یقین دلایا۔ ''بس کسی کسی وقت کچھ سوچ کر ڈر جاتا ہوں......''

''مت سوچا کرو ایسی غلط سلط باتیں......'' زہرہ نے اس سے لگاوٹ سے کہا۔ ''ذرا پکڑو زرینہ کو، میں ذرا گھر کا کام کاج کر لوں۔''

''اچھا بابا لاؤ، دے دو ہمیں زرینہ بی بی کو!'' اس نے بیٹی کو اس کے ہاتھ سے لیا اور ڈرتے ڈرتے اٹھایا، اسے بھلا کہاں عادت تھی ایسی نرم و نازک چیز کو پکڑنے کی، ذرا سی دیر میں ہی گھبرا کر زہرہ کو بلایا اور بچی کو اس کے حوالے کر دیا۔ زہرہ کو کم از کم اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اس سے اس روز پیار سے بات کی تھی اور بچی کو بھی اٹھایا تھا، اس کی تسلی کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ اظہار کرے نہ کرے مگر اس کے دل میں اس کے لیے پیار تو تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اجڑی ہوئی شکل کے ساتھ اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سکھاں نے دل تھام لیا۔ ''کہاں سے آرہی ہو، کیا کھیتوں پر گئی تھی، تھک گئی ہو یا......'' ایک ساتھ کئی سوال داغتی ہوئی ماں اس وقت رانی کو ایسی مصیبت لگ رہی تھی جس سے جان چھڑانا آسان نہ تھا مگر ماں نے بولتے بولتے اسے خود ہی اشارہ دے دیا تھا اور اسے اس مصیبت سے نمٹنے کا طریقہ خود ہی مل ہی گیا تھا۔

''بہت تھک گئی ہوں اماں......'' اس نے مختصراً کہا۔ ''آرام کرنا چاہتی ہوں!''

''اگر ہمت نہیں تھی تو گئی ہی کیوں تھی کھیتوں پر کام کرنے......؟'' سکھاں نے پیار سے کہا۔ ''تیرے پیچھے نگی پھر آئی تھی تیرا معلوم کرنے۔'' رانی کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔

''کیا کہتی تھی؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''تیری طبیعت کا معلوم کرنے آئی تھی، تم نے صبح کہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں......''

''میری اتنی فکر کیوں ہے اسے......'' رانی نے بے اعتنائی سے کہا۔

''سہیلی ہے تیری، اس لیے فکر کر رہی ہے، وہ بیمار ہو گی تو کیا تجھے فکر نہ ہو گی!'' سکھاں نے اسے سرزنش کی۔

''اچھا اماں اب آرام کرنے دے مجھے، کیا فضول کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہے......'' اس کے انداز میں ایسی گستاخی تھی کہ سکھاں اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ اتنے گستاخانہ انداز میں تو اس نے کبھی ماں سے بات نہ کی تھی، پھر بھی سکھاں نے اس کی تھکاوٹ اور اس کی نگی سے ناراضی پر محمول کیا تھا۔ رانی اٹھ کر اس چھوٹے سے گھر کے اندرونی کمرے کی طرف بڑھی تو سکھاں کو اس کی ٹانگوں میں لرزش محسوس ہوئی تھی، اس کے دل میں ترس اور ہمدردی جاگی اور وہ اس کے پیچھے دودھ گرم کر کے ایک گلاس لے گئی، وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس نے آواز دی تو اس نے ہولے سے ہوں کیا۔

''اٹھ کر دودھ پی لو......'' اس نے پیار سے اسے پکارا۔

''رکھ دو اماں، ٹھہر کر پی لوں گی!'' اس نے بیزاری سے کہا تھا۔

''اٹھ کر پی لو میری بیٹی!'' اس نے اصرار کیا۔ ''ٹھنڈا ہو جائے گا تو پھر کیا فائدہ......''

''کہا ہے نا اماں کہ پی لوں گی، رکھ دو کہیں!'' اس نے پھر اسی گستاخی سے کہا تھا جسے سکھاں پہلے بھی نظر انداز کر رہی تھی مگر اسے اب بھی غصہ نہیں آیا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے مزاج کا علم تھا جسے بگڑنے کے لیے ایک منٹ سے بھی کم وقت درکار ہوتا تھا۔ اس نے خاموشی سے دودھ کا گلاس اس کے سرہانے کی طرف نیچی سی چوکی رکھ کر اس پر رکھ دیا اور خود باہر چلی گئی، ابھی اسے رات کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اس کے باہر جانے کے بعد رانی نے کروٹ بدل کر دیکھا... اور اٹھ کر دودھ کا گلاس پی لیا، اسے بہت ناطاقتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بار تو یہ بھی دل چاہا کہ اٹھ کر ماں کا ہاتھ بٹا دے مگر اس میں ہمت نہ تھی اور نہ ہی اس بات کی طاقت کہ وہ ماں کی نظر میں نظر ڈال کر بات کر سکے، اس لیے وہ خاموش رہی۔

اسے یہ بھی علم تھا کہ ماں کی نظروں سے اوجھل رہ کر تو وہ اپنے راز کو راز رکھ سکتی ہے مگر یہاں سے اٹھ کر باہر گئی تو ماں کی کھوجتی نظروں سے اپنا بھید زیادہ دیر کے لیے چھپا نہ پائے گی...... وہ لیٹی چھت کے شہتیروں کو گنتی رہی اور جانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گئی، جہاں اس کی نظروں کے سامنے چوہدری اکبر علی کا سراپا تھا، وہی چوہدری اکبر علی جو کچھ دیر پہلے تک اس کی خواہشات کا وہ چاند تھا جسے پانے تو کجا، چھونے کی تمنا بھی ایک خواب کے مانند تھی۔ اب اسے اس نے اسے پا لیا تھا، یوں کہ نہ صرف وہ اس کے وجود بلکہ دل کی

گہرائیوں تک بھی اتر گیا تھا۔ وہ کیا تھی اور اس کی حیثیت کیا، یہ پاتال تھی تو وہ آسمان، وہ ایک ایسا پارس پتھر تھا، جس نے اسے چھو کر سونا بنا دیا تھا...... ابھی تک وہ اس سے ملن کے نشے میں تھی اور اس کے علاوہ اس کا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی رہے۔

☆☆☆

"تجھے آرام کی بہت ضرورت ہے کلثوم!" معراج نے اسے دیکھ کر بتایا۔

"آرام کیسے کر سکتی ہوں میں ماسی؟" اس نے بے بسی سے کہا۔ "میں آرام کروں تو کام کون کرے گا؟"

"تو چوہدرانی سے بات کر کے وہیں حویلی میں پڑی رہا کر، گھر نہ لوٹا کر، چار دن روٹی نہیں ملے گی تو کوئی ہاتھ پاؤں تو مارے گا ہی نا......" کلثوم کے حلق میں پھندے سے پڑنے لگے، اسے معراج کے لہجے میں اس وجود کی سی فکر مندی جھلکتی سنائی دی تھی، جو ماں کا ہوتا ہے وہ ماں جو اپنی اولاد کو زمانے کے سرد اور گرم سے بچانے کی خاطر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتی ہے...... اگر اس کی ماں ہوتی تو کچھ اس کے حصے کے عذاب خود پر لے لیتی بلکہ وہ ہوتی تو ایسی زندگی اس کا مقدر تو نہ ہوتی۔

"میں کیسے حویلی میں پڑی رہ سکتی ہوں ماسی، کام کرنے کی ہمت نہیں تو کیا ان کے بھیک کے ٹکڑوں پر پڑی رہوں!" اس نے اس آہ کا گلا گھونٹا جو اس کے لبوں پر آیا ہی چاہتی تھی...... اس کے اندر انا تھی جو اسے بھیک مانگنے پر آمادہ نہ ہونے دیتی تھی اور پھر حویلی میں پڑے رہنے کی بات تو وہی کر سکتا ہے جسے یہ علم نہ ہو کہ ان حویلیوں میں اس جیسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لیے قدم قدم پر خطرات منہ کھولے ہوتے ہیں...... مگر اسے حیرت تو یہ ہو رہی تھی کہ حویلی میں جاتے رہنے کے باوجود، معراج ماسی اسے حویلی میں پڑے رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

"اگر احتیاط نہیں کرو گی تو خود اپنی جان کو خطرے میں ڈال لو گی!" معراج نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ "اس بدبخت کو سبق سکھانا بہت ضروری ہے، چند دن کے لیے اس کے ہوش ٹھکانے لانے کے لیے تم کام کاج چھوڑ دو اور دیکھو کہ کیا کرتا ہے وہ......"

"کیا کرے گا وہ، اس کی نشے کی لت پوری نہیں ہو گی، روٹی نہیں ملے گی تو اس کا سارا نزلہ مجھی پر گرے گا، مار کٹائی کرے گا...... اور کیا ہو گا ماسی!" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، معراج کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لے، اس کی زرتاج جیسی ہی تو تھی، کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکتی، کاش وہ اسے اس کے دکھوں سے نجات دلا سکتی مگر اسے کون نجات دلا سکتا تھا سوائے اللہ کی ذات کے......

"چلو تم اپنی پوری احتیاط کرو، اس نامراد کے کہنے پر کچھ بھی مت کھانا پینا، وہ اپنی نسل کا دشمن ہوا بیٹھا ہے، اسے تو اللہ ہی ہدایت دے سکتا ہے مگر تمہیں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے!" معراج نے اسے سمجھایا۔ "بعض اوقات انسان کی غفلت اور بے پروائی اسے عمر بھر کے پچھتاووں میں مبتلا کر دیتی ہے، ایسا نہ ہو کہ اللہ کی دی جانے والی نعمت کی قدر نہ کرو تو وہ تمہیں اس نعمت سے آئندہ کبھی نہ نوازے!"

"میں نے تو کبھی بھی نہیں چاہا کہ ایسا ہو بلکہ میرے لیے تو میری اولاد اہم ہے، جہانداد جیسا بھی ہے، میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی کیونکہ وہی میرا نصیب ہے اور نصیب لکھنے والا تو اللہ ہے نا......" کلثوم نے

کہا۔ "مجھے اس نے اس نعمت کے قابل سمجھا، میری گھٹن زدہ زندگی میں یہ بچہ ہوا کے جھونکے جیسا ہے!"

"اللہ کرے کہ خیریت کے ساتھ تمہارا وقت پورا ہو اور ٹھیک ٹھاک بچہ پیدا ہو!" معراج نے اسے دل سے دعا دی تھی اس پر زرتاج نے آمین کہا۔ "اب کہاں جاؤ گی؟" معراج نے پوچھا تھا۔

"کام پر......" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"تمہاری کوئی حالت نہیں کام پر جانے والی......" معراج نے سختی سے کہا۔ "یہیں پر آرام کرو تم، گھر جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، شام کو گھر لوٹ جانا!"

"مگر جہانداد کو علم ہوا تو......"

"اسے کیسے علم ہو گا، اس کے لیے تم روٹی ہی لے کر جاتی ہو نا، وہ لے جانا......" معراج کا انداز حتمی تھا۔

"مجھے کہیں جانا ہے اور زرتاج گھر پر اکیلی ہے، تم اس کے پاس دن گزارو اور شام کو اس کے لیے روٹی لے کر چلی جانا۔" اب اسے انکار کی تاب نہ تھی، زرتاج نے خوشی کا اظہار کیا کہ کلثوم اس کے پاس ہو گی۔

☆☆☆

چوہدرانی جی کافی مصروف تھیں اور معراج بیٹھی اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کب وہ فارغ ہوں اور وہ ان سے بات کر سکے، ان کے پاس سے ایک اٹھ کر جاتی تو دوسری کسی نہ کسی مسئلے کو لے کر آن بیٹھتی۔ اسی انتظار میں معراج کبھی کسی کام والی کے پاس جا بیٹھتی اور کبھی کسی کے پاس۔ خدا خدا کر کے مختلف مسائل والیوں کا جھرمٹ چھٹا تو وہ اٹھ کر عابدہ بی بی کے پاس آ بیٹھی، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ہی اس کو مقصد کی بات کی طرف آنا تھا مگر جونہی اس نے بات شروع کرنا چاہی، اس کے منہ سے بات ہی نہ نکل پائی۔

"کیا بات ہے معراج...... کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہو، رک کیوں گئی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"چھوٹا منہ بڑی بات چوہدرانی......" اس نے کہا اور دل سے ایک ٹیس اٹھی کہ کبھی وہ بھی کسی گاؤں میں اس اہم منصب پر ہوتی تھی کہ لوگ اس سے اسی عزت اور احترام سے بات کرتے تھے اور وہ لوگوں کے مسائل کے حل میں مدد و معاون ہوتی تھی۔ "بات ایسی ہے کہ جرأت نہیں ہو پا رہی!"

"ایسی کون سی ضرورت آن پڑی ہے معراج کہ تمہارا منہ ہی نہیں کھل رہا، کہو جو بھی کہنا ہے بلا جھجک کہو!" وہ یہی سمجھی تھیں کہ اسے کوئی پیسے دھیلے کی ضرورت پڑ گئی ہو گی، ممکن ہے زرتاج کے بیاہ کا سوچ رہی ہو۔

"ضرورت تو نہیں......" اس نے ہوا میں دیکھتے ہوئے کہا، کچھ دیر سوچا۔ "مگر یہی سمجھ لیں کہ میری ایک مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے!"

"کیا چاہیے معراج، کھل کر بات کرو......" عابدہ بی بی کو شاید معلوم نہ تھا کہ معراج انا کی پکی ہے، کتنی بھی مجبور ہو اپنے پیٹ سے کپڑا نہیں اٹھائے گی۔

"عزت کی حفاظت کی طلب گار ہوں چوہدرانی جی!" اس نے مبہم سی بات کی تو وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

"میں کچھ سمجھی نہیں......"

"آپ کو تو ہم اپنی عزتوں کے رکھوالے سمجھتے ہیں چوہدرانی جی......" معراج نے ڈرتے ڈرتے بات

شروع کی۔ ”مگر جب رکھوالے ہی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیں تو کیا کریں ہم جیسے غریب لوگ!“

”خیر تو ہے معراج..... کس نے کچھ غلط کیا ہے؟“ وہ ہول گئیں، معراج کا سنجیدہ لہجہ انہیں دہلا گیا۔

”جرأت ہی نہیں ہے کہ نام لوں مگر معاملہ ایسا ہے کہ آپ سے ہی بات کر سکتی ہوں!“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، اسے بھی علم تھا کہ شجاع..... عابدہ بی بی کی دکھتی رگ تھا، اس کے ساتھ انہیں ساری اولادوں سے زیادہ پیار تھا، اس لیے کہ چوہدری صاحب اس سے نالاں رہتے اور وہ ہمیشہ ان کے زیرِ عتاب رہتا بلکہ وہ تو اس سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ یہی عابدہ بیگم کے مطابق ان کی غلطی تھی کہ ان کا تفریق کا رویّہ ہی شجاع کو باغی کیے ہوئے ہے۔

”وہ چوہدری شجاع.....“ اس نے عابدہ بیگم کے چتون چڑھتے ہوئے دیکھے تو فوراً رک گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ اب بات شروع بھی کر دی ہے تو اس کو مکمل کیسے کیا جائے۔

”کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“ انہوں نے پوچھا تو معراج کو اندازہ ہوا کہ دنیا کی ہر ماں کے دل میں تڑپ ہوگی تو اپنی اولاد کے لیے ہی ہوگی۔

”اللہ کرے کہ ان کو کچھ ہو.....“ معراج نے کہا۔ ”میں تو آپ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ ان کے خاص آدمی گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزتوں پر بری نظر رکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے لوگ چوہدری شجاع کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے!“

”کون لوگ ہیں جو بری رائے رکھتے ہیں میرے بیٹے کے بارے میں؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر معراج کو دیکھا۔ ”اور گاؤں کی کس بہو بیٹی کی طرف سے شکایت لے کر تم آئی ہو؟“

”میں کسی کی کیا شکایت لے کر آؤں گی چوہدرانی جی..... چوٹ اپنے جسم پر لگتی ہے تو ہی درد ہوتا ہے، کسی اور کی چوٹ کا ہمیں کیا احساس!“

”کیا کسی نے زرتاج سے کچھ کہا ہے؟“ انہیں تو یہی بات سمجھ میں آئی تھی۔

”زرتاج کو بھی کچھ کہہ سکتے ہیں اور جو چاہے اس کے ساتھ کر سکتے ہیں.....“ اس کے انداز میں درد ہی درد تھا۔ ”میں تو پہلے ہی زخموں سے چور ہوں، مزید کسی زخم کو سہنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں!“

”ہوا کیا ہے معراج، پہیلیاں نہ بجھواؤ.....“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہمارے پاس ایک عزت ہی کی تو دولت ہے چوہدرانی جی..... اس پر بھی چوہدری شجاع کے آدمیوں نے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے، ہمارے غریب خانے کی چھت سے کود کر وہ ہمارے صحن میں اترے تھے، میں گھر پر نہ تھی، اگر محلے والے مداخلت نہ کرتے تو میرا بڑا نقصان ہو جاتا.....“

”تمہیں کیسے علم ہے کہ وہ شجاع کے آدمی تھے؟“ انہوں نے تیخ پا ہو کر کہا۔

”ان میں سے ایک کا نام فیضی ہے اور زرتاج اس کو پہچانتی ہے، اس نے اس آدمی کو آپ کی حویلی میں خود دیکھا ہے.....“ اس نے ہمت کر کے فقرہ مکمل کیا۔

”میں دیکھتی ہوں کہ کیسے کوئی اتنی جرأت کرے کہ میرے بیٹے کے ٹکڑوں پر پلے اور اسی کا نام بدنام کرے.....“ اس وقت عابدہ بیگم کے چہرے پر جس جوش اور غصے کی لہر تھی اس کا سایہ تک بھی ان کے چہرے

پر اس سے قبل معراج نے نہ دیکھا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ مالکوں کی مرضی کے بغیر تو ان کے ملازم اتنی جرأت نہیں کر سکتے مگر نہ کہہ سکی، زرتاج نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی ساری گفتگو میں بار بار اپنے مالک کا نام لے رہے تھے، اس کا مطلب تو یہی بنتا تھا کہ وہ اپنے مالک کی مرضی سے آئے تھے مگر اس وقت عابدہ بیگم یہ بات نہیں سن سکتیں، یہی سوچ کر وہ چپ ہو گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ شجاع سے ضرور استفسار کریں گی، اس کی تسلی کے لیے یہی کافی تھا کہ ان تک بات پہنچ گئی ہے۔

اس کا آنا جانا دونوں حویلیوں میں تھا، اب اس کا ارادہ تھا کہ کسی وقت شکیلہ بی بی تک بھی یہ بات پہنچا دے تاکہ چوہدری نور علی کے کانوں تک بھی پہنچے اور اگر کبھی دوبارہ شجاع کی طرف سے ایسی کوشش ہو تو وہ ان سے مدد طلب کر سکے۔ اس وقت تو وہ گھر کی طرف چلی جہاں سے سامان لے کر اسے کہیں جانا تھا، اس کے نکلتے وقت بلاوا آیا تھا اور اب اس بات کو کافی وقت ہو چلا تھا، وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چلی، گھر والی گلی مڑتے ہی اسے دور سے اپنے گھر کا کھلا دروازہ نظر آیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا، وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

☆☆☆

”ہاں تو صاحب..... ہماری زندگی کی سب سے بڑی دولت ہتھیانے کو تل گئے ہیں آپ؟“ جہاں آرا کا انداز کاروباری تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں آپ کی زندگی کی کوئی بھی دولت ہتھیانے کا!“ اس نے اپنے اندرونی اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”الماس تو بچی ہے اور بے وقوف ہے، آپ اچھے خاصے سمجھدار انسان ہیں، آپ کو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے.....“ انہوں نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

”ایسی بچی بھی نہیں ہے وہ اور شادی کرنا اس کی ضد ہے..... میری نہیں، میں ایک شادی شدہ اور بال بچے دار آدمی ہوں، میں تو اس سے شادی کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا!“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اگر بال بچے دار ہو تو پھر یہاں کس لیے آتے ہو؟“ دلی نے بدتمیزی سے پوچھا۔ ”اب بھی سنبھل جاؤ اور اپنے بال بچے پروصیان دو، کل سے تمہارا تھوبڑا یہاں نظر نہ آئے مجھے.....“ اگر جہاں آرا نہ ہوتیں تو ممکن ہے کہ وہ قائم علی کو ایک آدھ گھونسا بھی لگا دیتا۔

”تم خاموش رہو دلاور.....“ انہوں نے اسے ڈانٹا۔ ”جب میں بات کر رہی ہوں تو تم بیچ میں باپ بننے کی کوشش مت کرو!“ دلی نے پھنکار کے انداز میں سانس لی اور ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا مگر دل ہی دل

میں وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ الماس ضدی ہے اور اس نے اس بات پر خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دے رکھی تھی، صاف صاف الفاظ میں اس نے ماں اور بھائی کو بتا رکھا تھا کہ اگر کسی نے اس کو اس بچے کو ضائع کرنے کو کہا یا کسی نے قائم علی کو یہاں آنے سے منع کیا، کسی نے اسے گزند پہنچانے کی کوشش کی یا اس سے شادی نہ کرنے پر سودا بازی کرنے کی کوشش کی تو وہ خود کو ختم کر لے گی۔ اسی وجہ سے تو قائم علی سے ملاقات کے لیے اس جگہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔

''کیا چاہتی ہیں آپ؟'' قائم علی نے نرمی سے پوچھا۔

''میں کیا چاہوں گی...... کیا میری اوقات!'' اس نے ایسی بے چارگی کی اداکاری کی کہ قائم علی جیسے سیدھے اور شریف آدمی کو دل ہی دل میں اس کی بے بسی پر دکھ محسوس ہوا۔ ''بھکاریوں کے پاس حق انتخاب نہیں ہوتا...... اس وقت ترپ کے سارے پتے آپ کے ہاتھ میں ہیں؟''

''آپ یوں نہ کہیں، اپنا مطالبہ بتائیں......'' اسے معلوم تھا کہ انہوں نے اسے وہاں بے مقصد نہیں بلوایا تھا بلکہ اپنی مجبوری اور اپنی بیٹی کی ضد کو وصولنے کے لیے ہی بلایا تھا، غالباً وہ لوگ ان کی مالی حالت سے ناواقف نہ ہوں گے کیونکہ انہوں نے کھلا ہاتھ رکھا تھا ہمیشہ۔ وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کی محبت اور ضد کی کیا قیمت لگاتے ہیں۔

''جب ہماری اپنی بیٹی ہی ہمارے کہے میں نہیں صاحب تو ہم آپ کو کیا الزام دیں...... وہ باؤلی اپنا دل آپ پر ہار بیٹھی، ہم نے تو سوچ رکھا تھا کہ کبھی بھی اس کی شادی نہیں کریں گے، وہ تو ہیرا ہے اور ایسا ہیرا کہ جس کا مول اس بازار میں کوئی نہیں لگا سکتا......'' انہوں نے اسے بتایا۔ ''ہم تو اسے کچھ انوکھا ہی بنانا چاہتے تھے، ایسا کہ جیسا کوئی اور نہ ہو اور اس کا کام چلتا رہے، میں نے اس مقصد کے لیے چھوٹی چھوٹی ... بچیاں خرید کر ان کو اس کی منہ بولی بیٹیاں بنا کر پال رہی ہوں، یہی بچیاں کل کو اس کا کاروبار سنبھالتیں...... مگر ہوا یہ ہے کہ الماس خود کو ہی نہیں سنبھال سکی!'' ان کے لہجے میں ناکامی کا رنج بھی گھلا ہوا تھا اور الماس جیسے ہیرے کی ماں ہونے کا غرور بھی......

''میری اس میں کیا غلطی ہے اور اب میں اس کا ازالہ کس طرح کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا کوئی ازالہ نہیں مگر اب موجودہ صورت حال میں اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں کہ آپ الماس سے شادی کر لیں......'' جہاں آرا نے دو ٹوک بات کی۔ ''ہاں مگر اس شادی کی ساری شرائط ہماری تجویز کردہ ہوں گی، ورنہ......''

''ورنہ کیا......؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''ورنہ آپ برے پھنس سکتے ہیں صاحب......'' اس نے چتون چڑھا کر کہا۔ ''ہماری معصوم بچی کو ورغلانے ...... یا زنا کے الزام میں!'' قائم علی کو اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس ہوئی۔ ''اور اگر اس نے کچھ کر کرا لیا تو اس کے قتل کے الزام میں......'' اس کے گلے میں جیسے کسی نے پھندا ڈال کر اس کے دونوں سرے زور سے کھینچے تھے۔

''کون سا کام ہے اماں، بتاؤ میں کر دیتی ہوں......'' اس نے کاہلی سے کہا، ماں کی طبیعت کو جانتی تھی اس لیے اس وقت اس کی ناراضی مول نہ لے سکتی تھی، یوں بھی اکبر علی سے ملن کا نشہ اب ٹوٹ رہا تھا اور اس کا من پھر اس سے ملنے کو چاہ رہا تھا، ماں کو منائے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، اس روز بھی اس نے ماں کو کام کے پیسے بھی نہیں دیے تھے، کام کیا ہوتا تو پیسے ملتے۔ اس نے تو فقط اکبر علی کو خوش کرنے کا کام کیا تھا اور اس کے صلے میں جو کچھ اسے اکبر علی نے دیا تھا اسے تو وہ خود سے چھپاتی پھر رہی تھی......اس کی مرحومہ بیوی کے کانوں کے بندے وہ کس طرح پہن سکتی تھی یا کسی کو بتا سکتی تھی کہ اسے کہاں سے ملے تھے اور کیوں......

اس دن سے اب تک وہ راتوں کی تنہائی میں، جب گھر کے سبھی لوگ نیند کی گہرائی میں ہوتے، وہ ان بندوں کو نکال کر انہیں ہاتھ میں پکڑ کر چھو کر محسوس کرتی' اندھیرے کی وجہ سے انہیں دیکھ تو نہ پاتی تھی مگر اسے ان کا ایک ایک نگ اور موتی یاد تھا......ان بندوں کو چوہدری اکبر علی کے ہاتھ کے لمس کے بعد اس کے کانوں کا نصیب بننا اسے اس کی اپنی نظروں میں بلند کر دیتا تھا' ان لمحات کو سوچ کر ایک سکون اور خوشی کا احساس اس کے وجود کی گہرائیوں میں اترنے لگتا۔ اسے بار بار چوہدری اکبر علی سے ملاقات کی خواہش ہوتی۔

''تمہیں دیکھ کر تو ہم ہوش ہی کھو بیٹھے ہیں رانی!'' اس کے کان کے پاس ہی سرگوشی ہوتی......''ہمارے دل کی سلطنت کی رانی بن گئی ہو تم رانی!'' اسے ایک خوش کن احساس چھو کر گزرتا......''تم نے ہمیں وہ خوشی دی ہے رانی کہ جس کو ہم اپنی بیوی کے مرنے کے بعد سے ترس ہی گئے تھے!'' ایک اور خوشگوار فقرہ اس کے کانوں کو چھوتا......وہ سب کچھ لٹا کر بھی اس احساس سے بے نیاز تھی کہ وہ کیا کھو بیٹھی ہے۔

اس کا کسی کام میں دل لگتا تھا نہ کسی سے بات کرنے کو، وہ اپنے دل کی الگ دنیا بسائے بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ نگی کو بتائے کہ اسے کون سی دولت مل گئی تھی، اسے اکبر علی کے دل کی مسند پر وہ مقام مل گیا تھا جس کی خواہش کرتے کرتے لڑکیوں کی عمریں گزر جاتی ہیں......اور وہ لڑکیاں جو اس جیسے نصیب لے کر غریب گھروں میں پیدا ہوتی ہیں، وہ کہاں اس مرتبے کو پہنچ پاتی ہیں مگر ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ اماں سے بات کر دیتی تو اماں اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیتی۔ اماں کو خوش رکھنا ضروری تھا تا کہ کسی نہ کسی طرح اکبر علی سے ملاقات کے راستے کھلے رہیں۔

اس کا سرہانہ ہی اس کے سارے رازوں کا امین تھا، اسی سے وہ اپنے دل کی ساری باتیں کرتی، اسی کے پھولوں کی کڑھائی والے غلاف میں اس نے وہ بندے چھپا رکھے تھے، جو اس نے فقط چند لمحوں کے لیے پہن کر اکبر علی کو دکھائے تھے اور اس نے اسے ایسی نظر سے دیکھا تھا کہ وہ خود اپنی نظر میں بھی معتبر ہو گئی تھی۔ اس نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا، اس نے کب اکبر علی کی ایسی قربت کا سوچا تھا......کب اس نے خواب میں بھی سوچا تھا کہ اکبر علی اس ٹاٹ کے ٹکڑے کو مخمل کی طرح بنا دیں گے؟

''مجھے اکبر علی کا ساتھ چاہیے......چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد سے گزرنا پڑے، کسی کا خون کرنا پڑے، ماں باپ کو ناراض کرنا پڑے اس کے لیے مجھے جائز اور ناجائز میں کوئی تمیز نہیں!'' وہ بڑبڑائی تھی۔

''یہ تو کیا آدھی رات کو بڑبڑ کر رہی ہے؟'' اس کی ماں کی باہر برآمدے سے آواز آئی تو وہ چونک اٹھی اور ان بندوں کو فوراً چھپا لیا۔

”کہیں جو ماں اندر آ جاتی تو، اللہ کا شکر ہے کہ بچت ہوگئی ورنہ......“ اسے سوچ کر بھی جھرجھری آ گئی۔

☆☆☆............☆☆☆

ستارہ اب بغیر سہارے کے چلنے لگی تھی، جونہی مریم اسکول سے لوٹتی وہ اس کی طرف لپکتی، مریم اپنی باہیں وا کرتی اور وہ بھاگ کر ان میں سما جاتی...... مریم کے اندر ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا، جینا اس کی خوش بختی پر رشک کرتی جسے مریم جیسی محبت کرنے والی ماں ملی تھی۔ دن بھر جینا اس کا خیال رکھتی تھی مگر ذرا جو اس سے کوتاہی ہوئی ہوتی، وہ فوراً شکایت کی صورت مریم تک اپنی توتلی زبان میں پہنچاتی...... ”ماسی نے کیلا نہیں دیا...... ماسی نے میرے منہ پر صابن لگایا......“ مریم جینا کو مصنوعی انداز میں ڈانٹتی اور اس بات پر مریم کی گڑیا مریم سے لپٹ جاتی۔ ”اماں اچھی، ماسی گندی......“

”اونہوں بیٹا...... ایسے نہیں کہتے، ماسی بہت اچھی!“ مریم اسے پیار سے کہتی تو وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی۔ ”گڑیا بولے گی، ماسی بھی اچھی!“

”ماسی تھوڑی سی اچھی......“ وہ ہتھیار پھینکنے کے انداز میں کہتی تو جینا اور مریم کی ہنسی نکل جاتی۔

مریم اس کے لیے اچھی اچھی تصویروں والی کتابیں لے کر آتی، کھلونوں سے زیادہ گڑیا کو کتابوں سے دلچسپی تھی۔ اسے بہلانے کے لیے سب سے بہترین کھلونا نئی کتاب ہی ہوتی تھی۔ اپنی عمر کے حساب سے وہ انتہائی احتیاط سے کتاب کو کھولتی، اس کی ہر ہر تصویر کو غور سے دیکھتی اور مریم سے اس کا نام پوچھ کر اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتی۔ مریم کو اس کی دلچسپی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں سیکھنے کی بہت صلاحیت ہے۔

”جو تم نہ ہوتیں جینا تو سچ مانو مجھے اس بچی کو سنبھالنے کے لیے اپنی ملازمت چھوڑنا پڑتی!“ مریم دل سے جینا کا احسان مانتی تھی۔ اس کی بری عادتیں جو بھی ہوں گی سو ہوں گی مگر مریم کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ اس بچی اور اس کے گھر کا خیال رکھتی تھی اور آج تک کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی تھی، گڑیا کو وہ اسی طرح پیار کرتی تھی جیسے مریم خود کرتی تھی، اس ایک ننھے وجود سے دو عورتوں کی پیاسی ممتا سیراب ہوتی تھی۔ مریم کے سر پر کسی کسی وقت یہ بوجھ آن پڑتا کہ جس وجود سے اس کی ممتا کی تسکین ہوتی ہے، اس کی اپنی ماں کا کیا حال ہوگا! شاید اس کے بہت سے بچے ہوں گے اور وہ اس معصوم کو پھینک گئی ہوگی مرنے کے لیے، ممکن ہے کہ اس کے شوہر نے بیٹی کی پیدائش پر اسے طلاق کی دھمکی دی ہو اور وہ اسے گھر سے لے کر نکلی ہوگی کہ کہیں چھوڑ آئے اور اس کے ہاتھوں سے بچی گر گئی...... شاید بچی گر کر بے حس و حرکت ہوئی ہوگی تو اس کو مرا ہوا سمجھ لیا گیا ہوگا...... ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بچی بارہ چودہ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک بے ہوش رہی تھی۔ کبھی اگر جا کر اس جگہ سے پڑتال کروں تو کوئی نہ کوئی سراغ اس کے گھر والوں کا مل ہی جائے گا مگر اگلے ہی لمحے وہ یہ سوچ کر اپنی سوچ کو جھٹک دیتی کہ وہ گڑیا کے بغیر کیسے رہ پائے گی......

”ویسے میرا مشورہ مانیں مریم باجی!“ جینا نے کہا۔ ”اب یہ سمجھدار ہوگئی ہے، اب اسے آپ اپنے ساتھ اسکول لے جایا کریں، میں تو ویسے بھی گندی ہوں، اس کو تنگ کرتی ہوں۔“

”نہیں، میں نے نہیں اسکول جانا، گھر پر رہنا، ماسی گندی نہیں۔“ وہ رونے لگی اور مریم نے ہنس کر دُہرے ہوتے

ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”تنگ نہ کرو جینا ہماری گڑیا کو!“ اس نے منہ بسورتی گڑیا کا بوسہ لیا۔ ”یہ تو اپنی اماں کی جان ہے اور اماں اسے بہت اچھے اسکول میں داخل کروائیں گی!“ اس نے کہا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی اماں!“ وہ ٹھنکی۔

”اچھے بچے اسکول جاتے ہیں اور پڑھ لکھ کر بڑے لوگ بنتے ہیں!“ گڑیا کو اس نے پیار سے سمجھایا۔

”کل جاؤں گی، آج نہیں!“ اس نے معصومیت سے کہا جیسے کل حالات کوئی مختلف ہو جائیں گے۔

”ٹھیک ہے، جب گڑیا خود کہے گی، تب ہم گڑیا کو اسکول لے کر جائیں گے......“ مریم نے اس کو تسلی دی۔

”گڑیا جب کہے گی، تب اماں اسکول لے کر جائیں گی......“ اس نے جینا کو جتلانے والے انداز میں کہا۔

”کتنی ذہین ہے باجی!“ جینا نے کہا۔ ”فوراً بات بنالی ہے اس نے......“

”بیٹی کس کی ہے آخر؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور جینا اس کا اور وہ جینا کا منہ دیکھنے لگی، جینا تو اس کی سادگی پر حیران تھی مگر اس کا اپنا دماغ جیسے لمحوں میں کہیں اور چلا گیا تھا...... ”کس کی بیٹی ہے یہ آخر......“ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی تھی۔

☆☆☆............☆☆☆

”دیکھیے صاحب......“ انہوں نے چتون چڑھا کر کہا۔ ”بات سیدھی سی ہے، اگر ہمارا نقصان ہوا ہے تو آپ ہی ہمارے آنسو پونچھ سکتے ہیں فقط!“ ان کا لہجہ کاروباری تھا مگر قائم علی فطرتاً سیدھا آدمی تھا، شہری اور خصوصاً ایسی عورتوں کے چلتر کیا سمجھتا، اسے دل سے اس بات کا دکھ ہوا کہ اس کی وجہ سے جہاں آرا کے مستقبل کی امید دم توڑ گئی تھی۔ یہ احساس نہ صرف اسے جہاں آرا کے رویے نے دلایا تھا بلکہ اس کے اپنے دل میں احساسِ گناہ بھی تھا اور اس کا ازالہ بھی کرنا چاہتا تھا۔

”کھل کر بات کریں آپ......“ قائم علی نے الجھتے ہوئے کہا۔

”مروت مارے ڈالتی ہے ورنہ بات تو کھل کر ہی کرنی چاہیے!“ ان کے انداز میں بیگانگی سی در آئی تھی جسے وہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

”اماں جلد بات ختم کرو......“ ولی نے مداخلت کی، اتنی دیر سے وہ یوں خاموش تھا جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے شاید دخل اندازی نہ کرنے کی ہدایت پر عمل کرنا برا لگ رہا تھا۔ وہی ولی جو کتنی تہذیب سے بات کرتا تھا، اب اپنے ماحول کی کھلی عکاسی کرتا تھا، جب تک اسکول جاتا تھا اس کی بات چیت میں اور اس کی اب کی گفتگو میں زمین آسمان کا فرق آ گیا تھا، یہی وہ وجہ تھی کہ جس کی وجہ سے جہاں آرا اسے اس گھر اور اس کی سرگرمیوں اور اس ماحول سے دور رکھنا چاہتی تھیں مگر اپنے ہم جماعتوں کے مسلسل تنگ کرنے سے اس نے اسکول جانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ جو آنکھوں میں اسے کوئی بڑا آدمی بنانے کے خواب سجائے بیٹھی تھی اس کے سارے خواب کرچی کرچی ہوگئے تھے۔ وہ نہ صرف گھر پر بیٹھ گیا تھا بلکہ وہی بن گیا تھا جو وہ اسے بنانا نہیں چاہتی تھی۔“

”اگر لڑکی ہوئی تو ہماری صاحب اور لڑکا ہوا تو لے تُنک آپ لے لیں......“ انہوں نے آغاز کیا۔ ”یہ ہماری

پہلی شرط ہے......''

''یہ کیا شرط ہوئی......'' قائم علی نے ناراضی سے کہا۔ ''اگر میں الماس سے شادی کرتا ہوں تو جو بھی کچھ ہو گا وہ ہمارا ہی ہوگا!''

''کیا تمہارا خاندان اس بات کو قبول کرلے گا؟'' انہوں نے طنز سے پوچھا۔ ''کیا بتائیں گے آپ اپنے خاندان والوں کو الماس کے بارے میں اور کس طرح اسے وہ مقام دلا سکیں گے جس کی وہ حق دار ہوگی...... آپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے؟''

''وہ میرا مسئلہ ہے!'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''مجھے اپنے خاندان والوں سے کس طرح بات کرنا ہوگی اور کس طرح ان سے نمٹنا ہوگا، اس کے لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت نہ ہوگی!'' جہاں آرا کو یہ بتانے کی انہیں ضرورت نہ تھی کہ ان کا خاندان فقط ایک بیٹی اور ایک ایسی بیوی پر مشتمل تھا جو اُن کے ساتھ بھی نہ تھی۔

''شادی کرکے الماس آپ کی ملکیت تو بن جائے گی مگر وہ رہے گی یہیں پر......'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس جگہ سے رخصت ہوکر جانے والیاں جلد ہی لوٹ کر آجاتی ہیں، اس دنیا سے باہر ایک اور دنیا ہے صاحب اس دنیا کے مکینوں کے ظرف اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ تائب ہوجانے والی طوائف کی سات نسلوں تک کو طوائف کی اولادیں کہتے ہیں...... ہم اپنی بیٹی کو اس رسوائی سے دوچار نہیں ہونے دیں گے!''

''مگر......'' قائم علی نے کچھ کہنا چاہا۔

''ہماری آخری شرط یہ ہے کہ آپ شادی سے قبل اپنی جائداد اپنے بچے کے نام لگائیں گے......'' انہوں نے منہ پھیر کر کہا۔ ''اور ہاں یہ نہ سمجھیے گا کہ ہمیں آپ کی دولت کا لالچ ہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ جائداد آپ کو الماس کے نام لگانے کو کہتے! اور اگر آپ کو یہ سب شرائط منظور ہوں تو......''

''تو؟'' انہوں نے نظر اٹھا کر اس عورت کی طرف دیکھا جو اس وقت ان کے ساتھ ایک مجبور عورت کی حیثیت سے بات کررہی تھی مگر حقیقت میں وہ خود کو مجبور اور محصور محسوس کررہے تھے۔

''تو اگلی دفعہ نکاح کا بندوبست کرکے، جائداد کے کاغذات ساتھ لے کر آئیں!'' انہوں نے جیسے نکاح کا دن مقرر کردیا۔ ''اب آپ جاسکتے ہیں......'' وہ اٹھے اور چل دیے ''اور ہاں!'' انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

''ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ ہماری یہ ملاقات خفیہ ملاقات ہے، الماس کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے......'' انہوں نے خاموشی سے اس عورت کے اس مطالبے پر سر ہلایا، جس نے ابھی ان کے سامنے اپنی شخصیت کی کئی پرتیں اتاری تھیں اور باہر کی طرف چل دیے۔

☆☆☆............☆☆☆

''اِدھر آ لڑکی......'' انہوں نے اسے پکارا۔ ''تو کیا سارا دن دالیں صاف کرتی رہتی ہے، اِدھر آ!'' وہ خاموشی سے دال کی پرات رکھ کر اٹھی اور ان کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ ''کھڑی کیا ہے، یہ تیل پکڑ اور میری کمر پر مالش کر!'' وہ متذبذب سی کھڑی اس نیم عریاں شخص کو دیکھ رہی تھی، یہ چوہدری نور علی تھا، وہ کئی بار دوسری ملازماؤں کو یہ فریضہ سرانجام دیتے دیکھ چکی تھی اور دل ہی دل میں اس پر کراہیت محسوس کرتی تھی اور اب وہ خود کو کسی شکنجے میں پھنسا ہوا، بے بس محسوس کررہی تھی۔

''جی...... میں؟'' وہ ہکلائی تھی۔

''تو نہیں تو کیا تیرے فرشتے......'' انہوں نے غصے سے کہا۔ ''تیرے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں کیا؟''

''مگر میں کیسے آپ کو مالش کرسکتی ہوں؟'' اس نے ہمت کرکے کہا۔ ''آپ کوئی میرے محرم تو نہیں ہیں!'' انہوں نے دیکھا کہ صحن میں کام کرتی تمام ملازمائیں بظاہر اپنے کام میں مگن مگر کن انکھیوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ہاہاہاہا......'' وہ بے ہودگی سے منہ پھاڑ کر ہنسے۔ ''محرم بننا چاہتی ہے تو میری...... بیاہ کرلوں کیا تجھ سے؟'' وہ غرائے۔

''نہیں جی، بیاہ تو میرا ہوچکا ہے......'' اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ صحن میں کام کرتی ہوئی باقی ملازمائیں دوپٹوں کے پلو منہ میں دبا کر کھی کھی کرکے ہنسنے لگیں۔

''اچھا......'' انہوں نے اسے گھوری ماری۔ ''کس سے ہوا ہے تیرا بیاہ؟'' وہ سر سے پیر تک اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ''کون ہے تیرا خصم...... میرا مطلب ہے کہ تیرا محرم؟''

''وہ جی......'' وہ جھجک کر بولی۔ ''جہانداد سے جی!''

''کون جہانداد، کس گھر کا لال ہے، کس گھر کا ہے؟'' انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''گھوٹو جی......'' ایک ملازمہ نے اس کی مشکل آسان کی، اپنے منہ سے بول کر تو وہ کبھی بھی گھوٹو نہ کہنا چاہتی تھی اور جہانداد کے نام سے اسے جانتا کوئی نہ تھا۔

''اوہو...... گھوٹو......'' انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''تو تو حافظ کرم اللہ کی بیٹی ہے؟'' انہیں کب شک تھا کہ حافظ کرم اللہ کی بیٹی اتنی خوب صورت اور کمسن ہوسکتی ہے، ورنہ اسے گھوٹو کی بیوی بنانے کے بجائے اپنی بیوی بنانے کی سزا دیتے۔

''جی!'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تو کیا گھوٹو نے تجھ سے کہہ رکھا ہے کہ چوہدری صاحب کو مالش نہ کرنا؟'' انہوں نے بے ہودگی سے سوال کیا۔ جس کا جواب اس کے پاس تو یہی تھا کہ گھوٹو اتنا غیرت مند کہاں...... مگر وہ خاموش رہی۔ اسے چوہدری صاحب کا بار بار گھوٹو کہنا۔ ان کے فضول سوالات اور صحن میں کام کرتی ہوئی ملازماؤں کا متوجہ ہوکر دبی دبی ہنسی ہنسنا، سب کچھ اتنا برا لگ رہا تھا کہ وہ اس منظر سے غائب ہوجانا چاہتی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے......'' اس نے بے سوچے سمجھے بنا کہہ دیا۔

''کیا ہوا تیری طبیعت کو جو مالش کا سن کر اچانک خراب ہوگئی ہے؟'' انہوں نے طنز سے کہا۔

''وہ جی دو جے جی سے ہے یہ......'' اچانک کسی ملازمہ نے غالباً اس کی جان چھڑوانے کو کہا مگر اس کے بعد جس نظر سے انہوں نے اسے دیکھا، وہ آنکھیں بند کرکے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی، کیا ضرورت تھی ان جیسے آدمی کے سامنے اس کی حالت بیان کرنے کی۔

''چل دفعان ہوجا......'' انہوں نے حقارت سے اسے دیکھا۔ ''مر جا کر اپنا کام کر!'' ان کی اتنی نفرت اور اپنی سب کے سامنے ہتک ہوتے دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ وہ آئندہ کبھی یہاں کا رخ نہ کرے مگر مرتی کیا نہ کرتی۔ کسی روبوٹ کی طرح وہ مشینی انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل دی۔ ہمیشہ سے وہ زنان

خانے کے اندرونی حصوں کی طرف کام کرتی تھی، جانے آج اس کی یہ بے عزتی ہونا تھی جو وہ صحن میں کام پر مامور کردی گئی تھی۔ آنسو اس کی لاکھ کوشش کے باوصف بھی آنکھوں کے اندر نہیں رک رہے تھے، وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے جا کر باورچی خانے کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی، ان آنسو بھری آنکھوں سے وہ چوہدرانی صاحبہ کے سامنے بھی نہیں جاسکتی تھی۔

''کاش...... کاش میرے اللہ تو نے ہی میری کچھ نہ کچھ مدد کی ہوتی، لالہ اتنا غلط کام نہ کرتے یا اماں نہ مرتیں یا میرے لیے سزا کے طور پر گھوٹو کو نہ چنا جاتا مگر اب یہ ساری خواہشات کاش بن کر رہ گئی تھیں...... اس کے نہ چاہنے کے باوجود یہ سب کچھ ہوچکا تھا۔

☆☆☆..........☆☆☆

سیما کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ شاکر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، سب سے زیادہ تو یہ فکر ہوگئی تھی کہ اگر بچی مر گئی تو وہ زرتاج کو کیا جواب دے گا، جس نے اس پر اتنی بھاری ذمے داری ایک افتاد کی طرح ڈالنے سے قبل ذرا دیر کو بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کس طرح اس کو نبھا پائے گا۔ سلمیٰ نے پہلے تو گھریلو ٹونے ٹوٹکے کیے اور اس کی حالت نہ سنبھلی تو شاکر سے کہا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ شاکر خود ہی اس کو لے کر نکلنے والا تھا کہ سلمیٰ اس کی مجبوری کو جان کر سعید کو بتا کر ساتھ ہولی کہ وہ کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے گا، جاتے ہوئے اس نے فرید کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ڈاکٹر نے بچی کو ڈرپ لگا دی تھی اور کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں جو کہ ڈرپ کے ساتھ ہی لگائی جانا تھیں، شاکر نے جھٹ لی اور دوائیں لینے چلا گیا۔ بچی کے پاس سلمیٰ اور فرید رہ گئے تھے، نماز کا وقت نکل رہا تھا، فرید کو بٹھا کر سلمیٰ وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ شاکر دوائیں لے آیا تو وہ دوائیں ڈرپ میں شامل کردی گئیں اور آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے اسپتال سے فارغ کردیا گیا اور ڈاکٹر نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ اسے ماں کے دودھ کے سوا کچھ اور نہ دیا جائے۔

ناہید کو دو دو بچیوں کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھ کر سلمیٰ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ خود کمزور ہو رہی تھی، اس لیے اس نے سیما کو تھوڑا سا اوپر کا دودھ دے دیا تھا اور یہی اس کی اس اچانک بیماری کی وجہ بن گئی تھی۔ اس کی اس خودغرضی نے اس بے چاری کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا...... ایک بار اس کے دل میں آیا بھی تھا کہ کہیں بچی بیمار ہی نہ ہو جائے مگر ناہید کی صحت کا خیال کر کے ہی اس نے ایسا کیا تھا، اگر جو شاکر کو علم ہوتا تو کیا سوچتا، وہ سوچ کر پچھتائی۔

گھر آ کر بھی بچی کا خاص خیال رکھنا پڑ رہا تھا کیونکہ ایک بار اسے ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگ چکا تھا اور اب دوبارہ جو وہ بیمار پڑتی تو شاید سنبھل ہی نہ پاتی۔ اسی وجہ سے شاکر نے اپنا گاؤں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا، کچھ شادیوں کا جیسے موسم شہر میں اتر آیا تھا کہ محرم سے پہلے دھڑا دھڑ شادیاں ہو رہی تھیں اور اس کا کام کافی بڑھ گیا تھا۔ گاؤں میں تو شادیاں فقط فصل کی کٹائی کے بعد ہوتی تھیں جبکہ شہر میں ماسوائے محرم کے سارا سال ہی شادیاں ہوتی رہتیں۔ کام میں اس کی صفائی اور دیانت داری نے جلد ہی اسے سارے بازار میں مشہور کر دیا تھا، چھوٹے پیمانے پر شروع کیا جانے والا کام دنوں میں بڑھ رہا تھا۔

رات تھک ہار کر اپنے بستر پر لیٹتا تو اس کی یاد چھم سے اس کے من آنگن میں اتر آتی اور پھر اسے خبر تک -

نہ ہوتی کہ کب صبح ہوئی، وہ اتنا مست ہو کر سوتا کہ بسا اوقات سیما کے رونے سے بھی اس کی آنکھ نہ کھلتی۔

☆☆☆..........☆☆☆

"میں سوچ رہا ہوں بابو جی کہ شجاع کو شہر لے جاؤں۔" جہانگیر نے کہا۔ "شہر جائے گا، ماحول کا فرق پڑے گا تو اس کا ذہن تبدیل ہونے میں بھی مدد ملے گی!"

"ہرگز نہیں......" بابو جی کے منہ سے بے اختیاری میں نکل گیا۔

"کیا......!" وہ حیران ہوا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو جی اور اس میں اتنا طیش میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں...... میرا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ میری نظروں کے سامنے رہے، میں اسے اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہوں، اسے میرا ذرا سا ڈر تو ہے۔ شہر جائے گا تو اور بھی آزاد سمجھنا شروع ہو جائے گا خود کو!" انہوں نے بات سنبھالی۔

"میں بھی اس پر نظر رکھ سکتا ہوں اور میں بھی اس کی کڑی نگرانی کر سکتا ہوں بابو جی!" جہانگیر نے جرح کی۔

"آپ تو گھر سے نکل ہی نہیں پاتے...... آپ اس کی کیا نگرانی کریں گے!" چوہدری مراد علی اس وقت ایسے پھنسے تھے کہ انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

"تم خود کون سا شہر میں ٹک کر رہتے ہو پتر جو اُس کی نگرانی کرو گے......" انہوں نے کہا۔ "کبھی تم شہر میں ہوتے ہو، کبھی گاؤں آ جاتے ہو!"

"جب میں شہر میں نہیں ہوں گا تو اچھا ہے کہ وہ گھر پر رابعہ کے پاس ہوا کرے گا!" اس نے فوراً جواز پیش کیا۔

"رابعہ کے پاس شیر علی ہے، ہمارے خاص ملازمین ہیں......"

"بابو جی...... شیر علی تو پھر بچہ ہی ہے نا!" اس نے زور دے کر کہا۔

"کیا ہم اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا سکتے ہیں؟" انہوں نے حتمی انداز میں کہا تھا، گویا وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتے تھے، جہانگیر کے ذہن میں الجھن سی تھی، وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ بات کرے گا اور بابو جی اس کے اس اچھوتے خیال پر خوش ہو جائیں گے مگر بابو جی اس موضوع پر بات کرنے سے کترا رہے تھے...... "کیا وجہ ہو سکتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ رابعہ نے بابو جی سے بات کی ہو...... مگر وہ کیسے بات کر سکتی ہے، جب سے وہ شہر گئی ہے اس کے بعد سے اس کی بابو جی سے بات ہی نہیں ہوئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس خیال سے کہا ہو کہ اماں اس بات کی اجازت نہ دیں گی، میرے اور شیر علی کے شہر چلے جانے کے بعد ایک وہی تو رہ گیا ہے ان کے پاس...... ضرور یہی بات ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆..........☆☆☆

"جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو تم میری؟" وہ بہ آواز بلند بول رہا تھا، اس کے بار بار اس طرح کہنے کو وہ فراموش نہیں کر سکتی تھیں۔ شاید وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا، انہوں نے نفسیات پڑھ رکھی تھی اور سمجھ رہی تھیں کہ کوئی الجھن ہے ان کے بیٹے کے دل میں۔ بگر بار ہا پوچھنے پر بھی وہ ٹال مٹول کر دیتا تھا۔

"کیا بات ہے سہیل بیٹا؟" انہوں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس سے پوچھا۔ اندر سے کوئی

جواب نہ پا کر انہوں نے دروازہ ہلکا سا وا کیا تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ سو رہا تھا اور سوتے میں بڑبڑا رہا تھا، وہ اس کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے، میری جان چھوڑ دو...... میری غلطی کو معاف کر دو!" وہ پھر کہہ رہا تھا، اس کے سرہانے جلتے ہوئے ہلکی پاور کے بلب کی روشنی میں وہ اس کی آنکھوں کے گوشوں پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو بھی دیکھ سکتی تھیں۔ ان کے دل میں کھینچ سی پڑی، ان کے بیٹے کو کیا دکھ تھا، اس سے کیا قصور سرزد ہو گیا تھا جو کہ اس کو سونے بھی نہیں دیتا۔"

"سہیل......" انہوں نے پھر اسے ہولے سے پکارا مگر وہ ذرا سا کسمسایا، جاگا نہیں۔ انہوں نے اس کے ماتھے کو چھوا، اس پر ہلکی ہلکی پسینے کی نمی تھی، اس ٹھنڈے موسم میں بھی؟ انہوں نے سوچا اور اس کے اوپر کمبل سیدھا کر کے باہر نکل آئیں کیا بات ہو سکتی ہے جو اسے اتنا پریشان کیے ہوئے تھی، پوچھوں گی اس سے۔"

ان کا اپنا اندازہ تھا کہ یہ سراسر اسلم کی سختی کا نتیجہ تھا۔ "کیا تھا کہ اگر وہ فیل ہو گیا تھا...... بہت سے بچے فیل ہوتے ہیں۔ اس کے اتنے قریبی دوست اور مددگار کی عین امتحانات کے قریب ہونے والی موت کا حادثہ اس کے لیے گہرے صدمے کا باعث تھا، یہ بات اس کے باپ کو بھی سمجھنی چاہیے۔ مجھے اس سے کسی وقت اس اہم معاملے پر بات کرنا ہو گی۔ جس بچے کی خاطر ہم نے اپنی زندگیاں عذاب کر ڈالیں، اس بچے کو ہم اگر نہیں سنبھال سکتے، اس کا خیال نہیں کر سکتے، اس کی تربیت نہیں کر سکے تو ہمیں کیا حاصل ہوا؟ خود بھی تہی دست رہے اور اس کی شخصیت کو بھی نامکمل بنا دیا۔"

"پلیز مجھے معاف کر دو!" دروازہ بند ہونے سے پہلے انہوں نے اس کی التجا سنی، انہیں یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ اس کا بڑبڑانا اپنے باپ کے لیے نہ تھا۔

☆☆☆..........☆☆☆

"بات تو بہت اہم ہے چوہدرانی مگر صرف میرے لیے......" اس نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

"جلد کہو بھئی معراج، میرے دل کو تو اختلاج ہونے لگا ہے......" انہوں نے گھبراہٹ زدہ انداز میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں کہ آپ خود پر اختلاج طاری کر لیں، بات فقط رازداری کی ہے اور میرا ذاتی معاملہ ہے، اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو میں دروازہ بند کر لوں......" معراج نے ان سے درخواست کی، ان کے سر ہلانے پر اٹھ کر دروازہ نہ صرف بند کیا بلکہ اندر سے کنڈا بھی اٹکا دیا تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ جائے۔ انہیں بھلا کیا اندازہ تھا کہ کان بند دروازوں کے ہوتے ہیں، کھلا دروازہ تو شاید ان کے اور چوہدرانی کے مابین ہونے والی گفتگو سے متعلق کسی کو تجسس میں مبتلا نہ کرتا مگر بند دروازہ...... کئی لوگوں کو باہر کان لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"اب کہو ذرا جلدی سے......" شکیلہ بی بی نے اس کے بیٹھتے ہی کہا۔

"اصل میں بات میرے گھر کی عزت کی ہے، جس پر کسی نے بری نظر ڈالی ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے گھر کی پرانی نمک خوار بھی ہوں، ہم غریبوں کے پاس سوائے عزت کے ہوتا بھی کیا ہے؟" اس نے تمہید باندھی۔

"اے ہے، سیدھی بات کرو معراج، کیوں ہولائے دے رہی ہو؟" انہوں نے چہرے پر بیزاری کا

لیپ کیا ہوا تھا جیسے......

"بی بی...... ہمارے گھر میں چند دن پہلے کچھ آدمی چھت سے کود کر آئے تھے، میں گھر پر نہ تھی، میری بیٹی
سے کہا کہ وہ اس کو مالکوں کے کہنے پر عزت سے لینے آئے ہیں......" وہ بتا رہی تھیں اور شکیلہ بی بی ہمہ تن گوش
تھیں۔ "اب اس گاؤں میں طاقت ور گھر تو آپ کا ہے یا چوہدری مراد علی کا......"

"کیا کہنا چاہتی ہو تم، کیا تم میرے کسی بیٹے پر الزام لگا رہی ہو؟" جہانوں کے چھٹے ہوئے بدمعاش بھی
اپنی ماں کو شریف لگ رہے تھے۔

"یہ میں نے بھلا کب کہا......" وہ جان بوجھ کر نہ بتا رہی تھی کہ وہ آدمی کس کے بھیجے ہوئے تھے۔

"گاؤں میں سارے غلط کام کیا میرے پتر ہی کر سکتے ہیں......" ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔ "وہ
بھی تو ہے ایک...... بے حیا، شجاع......" معراج نے چونک کر ان کے چہرے کو دیکھا، کیا انہوں نے یونہی بات کی
تھی یا اسے کہیں سے سن گن ملی تھی۔ کیا گاؤں میں کسی نہ کسی طرح یہ بات پھیل چکی تھی کہ اس کے گھر میں کچھ
لوگ کودے تھے؟ اگر ایسا تھا تو بڑی بدنامی کی بات تھی۔

"چوہدرانی...... آپ خوامخواہ طیش میں آ رہی ہیں......" معراج نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے ہرگز ایسا
نہیں کہا کہ آپ کے بیٹے کے آدمی تھے یا شجاع کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ عین ممکن ہے کہ اسی کے آدمی ہوں،
میں تو آپ سے فقط یہ درخواست کرنا چاہ رہی تھی کہ میری بیٹی کو اللہ نے ایک بار بچالیا ہے، آپ تو جانتی ہی ہیں
کہ وہ کیسی سیدھی سادی اور شریف بچی ہے......"

"ہاں میں تو جانتی ہوں......" انہوں نے طنز سے کہا۔ انہیں تو اس سے انتقام کا ایک موقع ہاتھ آیا تھا، اگر
تو یہ کام ان کے بیٹوں کا ہے تو وہ ہرگز مداخلت نہیں کریں گی مگر اگر شجاع کی نظر اس پر ہے تو میں اپنے بیٹوں سے
کہوں گی کہ شیر کے منہ سے بھی نوالہ چھین کر لانا پڑے تو لے آنا...... میں اس لڑکی کو اپنے قدموں پر جھکا ہوا
دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں کسی حد تک بھی جا سکتی ہوں...... وہ سوچ رہی تھیں۔ "تو فکر نہ کر
معراج...... تیری بیٹی ہماری بیٹی جیسی ہے، اس کی عزت پر آنچ بھی نہ آنے دیں گے ہم!" انہوں نے معراج کو
یقین دلایا، وہ احسان مندی کے ساتھ اٹھی اور اس سے قبل کہ وہ دروازہ کھولتی، دروازے کے باہر سے کوئی فوراً
ہٹ کر پرے ہوا، اس ہٹنے والے کا رخ چوہدری اکبر علی کے کمرے کی طرف تھا۔

☆☆☆..........☆☆☆

"شجاع بیٹا......" عابدہ بیگم نے شجاع کو پیام بھیج کر بلوایا تھا، وہ اس کے ساتھ خاص بات کرنا چاہ رہی
تھیں۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا بیٹا اس حد تک بے پروا ہو سکتا ہے اور اس کے کارندے اتنے بااختیار کہ
لوگوں کے گھروں میں چھتوں سے کود کر جانا شروع کر دیں گے......"

"کیا بات کر رہی ہیں آپ اماں؟" اس نے دنیا بھر کی معصومیت ماں کے سامنے چہرے پر سجائی، اسی
معصومیت سے اس کی ماں ہمیشہ دھوکا کھا جاتی تھیں۔ "میں آپ کی اس ادھوری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"مجھے کہیں سے علم ہوا ہے کہ فیضی کسی کے گھر کی چھت پھلانگ کر اس گھر میں اترا ہے......" لمحے کے
ہزارویں حصے میں اسے معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ "بیٹا تمہارے کسی کامے کا کسی گھر میں چھت سے کودنا...... اس

کے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے بدنامی کا باعث ہو سکتا ہے!" انہوں نے رسان سے کہا۔

"پوچھ لوں گا میں اس الو کے چرخے سے، اتنی جرأت اس کی کہ وہ......" اس کے لہجے میں وہ غصہ تھا جس
سے اس کی ماں بھی ڈرتی تھی۔

"تحمل سے بیٹا، جو آدمی تمہارا جتنا خاص آدمی ہوتا ہے، قریبی اور راز دار ہوتا ہے، اسے دشمن میں مت
بدلو کہ ایسا دشمن سب سے خطرناک دشمن ہوتا ہے......" انہوں نے اس کے کندھے تھپک کر اسے سمجھایا۔

"آپ کہتی ہیں تو میں اسے چھوڑ دوں گا، سمجھاؤں گا اور آئندہ کے لیے خبردار کر دوں گا، ورنہ اماں آپ
جانتی ہیں چوہدری شجاع کو......" اس نے ماں کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

"میں تو کہتی ہوں کہ کچھ وقت گزرے تو اسے نکال دینا......" انہوں نے کہا۔ "جو ملازم اتنا منہ چڑھا ہو
جائے کہ مالکوں کی مرضی کے خلاف چل پڑے اور ان کی بدنامی کا باعث بنے اس ملازم کے ہوتے ہوئے کسی
دشمن کی کیا ضرورت ہے......" وہ خود بھی الجھی ہوئی تھیں، ابھی ذرا دیر پہلے کچھ کہہ رہی تھیں اور ذرا سی دیر میں
ان کی سوچ کیا ہو گئی تھی۔ شجاع دل ہی دل میں اپنی اداکاری کو داد دے رہا تھا، کیسے اس نے اپنی ماں کو بے
وقوف بنا ڈالا تھا اپنی باتوں سے۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماؤں کے دماغ اتنے کھوکھلے نہیں ہوتے، وہ اپنی اولاد کے حروف اور بین الحروف
کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اپنی ڈھکی چھپی باتوں سے انہوں نے اپنی دانست میں اسے سمجھا دیا تھا مگر وہ تو اس
کے پہلے فقرے کی ادائیگی کے وقت اس کی نظر چرانے کی ادا سے ہی سمجھ گئی تھیں کہ فیضی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ
معراج بی بی کی بیٹی کو اٹھانے کے لیے چھت سے کودتا اگر اس میں شجاع کی رضا نہ ہوتی تو...... وہ بھی کسی
مصلحت کے تحت خاموش ہو گئی تھیں، ان کا خیال تھا کہ وہ جہانگیر کو اس معاملے کی خبر کر کے اسے کہیں گی کہ
بھائی کو سمجھائے، چوہدری مراد علی سے کہتیں تو معاملہ بگڑ جاتا، وہ تو ہر وقت ویسے بھی اسے عاق کرنے کو تیار
بیٹھے ہوتے تھے۔

☆☆☆..........☆☆☆

جاوید کی موت کی خبر...... مریم کو سن کر جانے دکھ ہوا تھا یا نہیں، وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے جانا چاہیے یا
نہیں...... جاوید جیسا بھی گھٹیا انسان تھا اور جیسے بھی اس نے اپنا آپ اسے دکھایا تھا مگر اسے تو اگر جانا تھا تو اس
لیے جانا تھا کہ سائرہ باجی اس وقت کس تنہائی، غم، کرب اور دکھ کا شکار ہوں گی۔ ان کی تنہائی اور غم کا سوچ کر ہی
اس نے پشاور جانے کا ارادہ کیا۔ جینا کو اس نے کچھ ضروری کام سمجھائے جو اس کی عدم موجودگی میں کرنا تھے۔

"اگر آپ کہیں تو میں بھی ساتھ چلوں......" جینا نے پوچھا۔ "میں بھی تو اس عظیم عورت کو دیکھوں جس
نے اپنے جگر کا ٹکڑا آپ کو دے دیا......" قریب تھا کہ مریم اس خیال سے اسے ساتھ لے لیتی کہ گڑیا کو سنبھال
لے گی، اس کی بات سن کر جیسے ہوش میں آ گئی، اس طرح تو اس کا سارا پول کھل جائے گا، اس نے سوچا اور
اسے کام سمجھانے لگی۔

"میں سائرہ آپا سے کہوں گی کہ عدت پوری ہو جائے تو وہ یہاں کا چکر ضرور لگائیں!" مریم نے اس سے
کہا۔ "اور تم بھی چل پڑیں تو میرے گھر کا خیال کون کرے گا اور باقی گھروں میں کام کا کیا ہوگا تمہارا؟" مریم

نے اسے کئی بھولے ہوئے کام یاد دلائے۔

”جیسا آپ کہیں باجی مگر اس کے بعد آپ کبھی پشاور گئیں تو میں بھی آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گی، سنا ہے وہاں پر کپڑا بہت اچھا اور بہت سستا ملتا ہے......“ جینا نے فہمائشی انداز میں کہا۔

”وہاں پر کپڑا سستا نہیں بلکہ مفت ملتا ہے......“ مریم نے ہنس کر کہا۔

”ہیں...... سچ باجی؟“ جینا اس کے اس مذاق کو نہ سمجھ پائی تھی۔

”ہاں!“ مریم ہنسی۔ ”بلکہ منتیں کر کر کے دکان دار گاہکوں کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ آکر کچھ مفت میں ہی لے لیں......“

”مجھے معلوم ہے کہ آپ مذاق کر رہی ہیں۔“ جینا نے منہ بسورا۔

”اچھا چلو، اب باتیں چھوڑو، مجھے چار بجے والی ریل سے نکلنا ہے......“ مریم نے کہا۔ ”اور آج تو چھٹی ہے، کل مائیکل کو میری یہ درخواست دینا اور کہنا کہ اسکول پہنچا دے!“ اس نے اپنی درخواست لکھ کر ایک لفافے میں ڈالی اور اسے جینا کے حوالے کیا۔

☆☆☆............☆☆☆

کلثوم کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے اور بھی بگڑتی چلی جا رہی تھی، اس کا گھر سے کام کے لیے نکلنا محال ہو گیا تھا، گھوٹو کو اس بات پر بہت طیش آ گیا تھا اور وہ اسے گالیاں دے رہا تھا، وہ خود تو کچھ کھاتی بھی تو وہ اسے ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ گھوٹو کے لیے ایک وقت کا فاقہ کرنا بھی محال تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو گالی گلوچ سے بڑھ کر مار پیٹ تک آتا، وہ اٹھی اور پڑوس سے ایک چھوٹے سے لڑکے کو معراج بی بی کے نام پیغام دے کر بھیجا کہ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی اور اس کے پاس چل کر آ بھی نہیں سکتی تھی اگر وہ اس کو آ کر دیکھ سکے تو...... بچے نے حرف بہ حرف اس کا پیغام معراج بی بی تک پہنچا دیا تھا اسی لیے تو وہ تھوڑی دیر میں گھبرائی ہوئی سی اس کے پاس تھی۔

صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے گھوٹو نے اسے دیکھا اور سلام کر کے منہ پرے کر لیا۔ وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اندر چلی گئی، جہاں کلثوم بستر پر نڈھال پڑی تھی۔ معراج نے اسے دیکھا، خطرے کی کوئی بات نہ تھی، ابکائیوں کی وجہ سے اس کے پیٹ میں درد تھا۔ معراج نے اسے پانی میں گھول کر دوا دی اور باہر آ گئی۔

”تو یہاں پڑا کیا کر رہا ہے، اسے کام پر کیوں بھیجتا ہے، خود کیوں نہیں جاتا تو؟“ معراج بی بی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

”میں کیا کام کروں؟“ اس نے نظر چراتے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی کر، باہر نکل تو کئی کام ہوں گے، گھر میں چل کر تو تیرے پاس کام نہیں آنے والا......“ اس نے غصے سے کہا۔

”مجھ سے نہیں ہوتا کام وام......“ اس نے کندھے اچکا کر شانِ بے نیازی سے کہا تو معراج بی بی کا پارہ گرم ہو گیا۔

”کیوں نہیں ہوتا تجھ سے کام، کیا بازو ٹوٹے ہوئے ہیں یا ٹانگیں؟“ اس نے اس کے لتے لیے۔ ”کم

بخت، حرام خور، کس طرح کا مرد ہے تو!“

”دیکھو مائی، میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے زیادہ!“ گھوٹو نے منہ پھیر کر کہا۔

”تیرے منہ......“ معراج نے غصے سے اس کی اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی، وہ غالباً گاؤں کا واحد آدمی تھا جو معراج بی بی کے غصے کو نہ جانتا تھا اور اس کا غصہ ہمیشہ درست وجہ پر ہوتا تھا۔

”رہنے دے ماسی، میں سمجھاؤں گی اس کو!“ کلثوم ہمت کر کے اٹھ کر باہر آ گئی، اسے اندازہ تھا کہ معراج کے غصے کے آگے بند باندھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

”کیا سمجھائے گی تو مجھے......“ اس نے مجھے پر زور دے کر کہا۔ ”اس بڈھی کو سمجھا جو میرے گھر میں ہی کھڑی ہو کر مجھی پر برس رہی ہے، ہمت تو دیکھو اس کی!“ اس کے لہجے میں اتنی بدتمیزی تھی کہ معراج بپھر گئی۔

”تیرا گھر ہے یہ، تیرے باپ نے بنوایا تھا؟“

”تو کیا تیرے باپ نے بنوایا تھا؟“ اس نے دوبدو سوال کیا۔ چھتوں پر سے کئی سر اس شاندار مقابلے کو براہِ راست دیکھنے کو ابھر آئے تھے۔

”تم چپ کر جاؤ چاچا ندا......“ کلثوم نے اس کی منت کی جو معراج کی بزرگی کو بھی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

”میں کیوں چپ کروں۔ زبان نہ اس سالی کی......“

وہ اٹھا، اس سے قبل کہ وہ معراج بی بی تک پہنچتا، کلثوم تن کر معراج بی بی کے سامنے کھڑی ہو گئی، چھتوں سے تماشا دیکھنے والی خواتین اب مزید خاموش تماشائی بنی نہیں رہ سکتی تھیں۔ کئی کود کر اس منظر کا حصہ بننے پہنچ گئیں۔ کسی ایک نے باہر کا دروازہ کھول دیا اور مرد بھی اندر آ گئے اور گھوٹو کو اس طرح گھوٹا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ اسی معراج بی بی کی منتیں کرنے لگا جس کی زبان کاٹنے کو وہ اٹھا تھا۔

”اگر تو کام کرے گا اور اسے گھر بیٹھنے دے گا تو ہی تیری شنوائی ہے، ورنہ یہ اس محلے کی بیٹی ہے، تجھے یہ سارے لوگ دھکے دے دے کر یہاں سے دفعان کر دیں گے، یہ تیرا نہیں کلثوم کا گھر ہے اور کلثوم کی دو روٹیاں کسی پر بھاری نہیں ہیں......“ معراج بی بی نے مناسب سمجھا کہ اگر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں تو اس کا فائدہ اٹھایا جائے۔

”کروں گا کام......“ وہ اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہو گے کروں گا، بس مجھے اب اور نہ مارنا!“

محلے والے بھی اس کی حرکتوں سے تنگ تھے اور کلثوم کی ناقدری پر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے، ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اس معصوم کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑوا سکتے اس روز معراج بی بی کے بہانے سب کو اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”اور سن......“ معراج بی بی نے اپنی انگشتِ شہادت اٹھا کر کہا۔ ”اگر تو نے اسے اس کے بعد کوئی الٹی سیدھی دوا لا کر دی کہیں سے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا اور اگر اسے یا اس کے بچے کو کچھ ہوا تو تیرے ساتھ اس سے بہت زیادہ برا ہو گا......“

”تجھ سے برا اور ہو بھی کون سکتا ہے......“ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور اتنا ڈر گیا تھا کہ ایک لفظ

کہنے کی جرأت نہ کر سکا تھا، اس کا واسطہ ہی بھلا اس گاؤں کے لوگوں سے کب پڑا تھا، ہر وقت تو وہ نشے میں دھت پڑا رہتا تھا۔

’’کچھ پھوٹے گا منہ سے یا......؟‘‘ معراج نے اسے گھورا۔

’’کہہ جو دیا ہے کہ جس طرح کہوگی، ویسا ہی ہوگا!‘‘ اس نے فوراً کہا۔

’’میرے کہنے کی اب نوبت آئی تو پھر تجھے چل پتا جائے گا، بہتر ہے کہ اپنی گھر والی کا خیال رکھ ورنہ تیرے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک ہو سکتا ہے!‘‘ وہ خاموش تھا مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس سارے معاملے کی شکایت چوہدری نور علی سے ضرور کرے گا، کسی کی کیا جرأت کہ وہ میرے گھر کے معاملے میں دخل اندازی کرے......

☆☆☆............☆☆☆

’’کلثوم......اری او کلثوم!‘‘ چوہدرانی کی پاٹ دار آواز سارے میں گونجی تھی۔

’’جی وہ تو نہیں آئی......‘‘ کسی نے انہیں اطلاع دی تھی۔

’’ہیں، وہ کیوں نہیں آئی، میں نے تو کل اسے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ آئے تو مجھے ملے؟‘‘ انہوں نے چتون چڑھا کر بتانے والی سے پوچھا تھا۔

’’جی کل تو آئی تھی اور ٹھیک بھی تھی، جانے......‘‘ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے اس کے نہ آنے کی وجہ معلوم تھی۔

’’کیا کچھ کہا کسی نے اس سے، جو وہ آج نہیں آئی؟‘‘ انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

’’ج......جی! کوئی کیا کہے گا اسے......‘‘

’’پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ایسا ہوا ہوگا نا!‘‘

شکیلہ بی بی بال کی کھال اتارنے والیوں میں سے تھیں اور یوں بھی بات کرنے والی ان کی خاص الخاص مخبروں میں سے تھی، جن کے گھر کے چولھے ہی ان کی اضافی بخشش پر چل رہے تھے۔ ’’وہ جی چوہدری صاحب......‘‘ وہ رکی۔

’’کیا کیا چوہدری صاحب نے؟‘‘ انہوں نے فوراً سوال داغا۔

’’وہ جی ان بے چاروں نے کیا کرنا ہے، وہ تو کہہ رہے تھے......‘‘ ملازمہ نے ذومعنی انداز میں بات بھی کر دی اور فوراً پانسہ پلٹا۔

’’بہت بے چارے ہیں وہ، اچھی طرح جانتی ہوں میں ان کی بے چارگی کو!‘‘ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ’’ان کی بے چارگی نے ہی تو مجھے یہ دن دکھائے ہیں۔‘‘

’’انہوں نے تو جی صرف اس سے یہ کہا تھا کہ انہیں تیل کی مالش کر دے مگر وہ جواب میں کہنے لگی......‘‘ وہ سانس لینے کو رکی تو شکیلہ بیگم نے اسے گھورا، انہیں بات کو طول دے کر کرنے والے لوگ بہت ناپسند تھے۔ ’’کہنے لگی، آپ کون سا میرے محرم ہیں......‘‘

’’ہاہاہاہا......‘‘ شکیلہ بیگم کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا تھا۔ ’’خوب کہا اس نے......‘‘

’’پر جی بات تو ہمارے چوہدری صاحب نے بھی لاکھوں کی کی تھی!‘‘ ملازمہ نے ان کی ہنسی میں شریک ہو کر کہا۔ ’’چوہدری صاحب کہنے لگے جی، تو چاہتی ہے کہ میں محرم بن جاؤں تیرا......‘‘ وہ بھی منہ پھاڑ کر ہنسی تو شکیلہ بی بی کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی، انہیں احساس ہوا کہ وہ ملازمہ کو زیادہ لفٹ کروا گئی تھیں اسی لیے وہ اپنی حد پھلانگ گئی تھی۔

’’کیا مطلب ہے اس بات کا؟‘‘ شکیلہ بی بی نے پوچھا۔

’’وہ جی......‘‘ وہ گڑبڑا گئی، ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدرانی جی کیسے منہ پھاڑ کر ہنس رہی تھیں، پل میں تولہ پل میں ماشہ......یہی انداز ہوتے ہیں ان بڑے لوگوں کے۔ ’’مجھے کیا پتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔‘‘ اس نے اپنی جان چھڑانا بہتر سمجھا۔

’’ایک تو میں اس شخص سے بہت تنگ ہوں، پوتیوں کی عمر کی لڑکیوں پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہیں آتا، اچھی خاصی کام کرنے والی، خاموش طبع اور ضرورت مند لڑکی تھی بے چاری......‘‘ انہوں نے شوہر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ’’تو جانا کسی وقت اس کی طرف اور اسے میرا پیغام دینا کہ مجھے آ کر ملے...... جانے کس طرح گزارہ کرے گی وہ......‘‘

’’وہ تو جی دو جے جی سے بھی ہے، اس لیے اس کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے!‘‘

’’جانتی ہوں میں، اسی لیے تو میں چاہ رہی تھی کہ اس کا گزارہ چلتا رہے!‘‘ انہوں نے ایسی نرم دلی کا مظاہرہ کیا جو اس سے قبل کسی نے نہ دیکھا تھا۔

’’کمزوری تو ہے، اس سے کام کاج ہوتا بھی نہیں، یونہی کبھی کہیں گرتی پڑتی ہے......‘‘

’’بس میں بھی یہی چاہ رہی تھی کہ اسے گھر بیٹھے کوئی اناج وغیرہ بھیج دیا کریں، کام کاج نہ کرے وہ، اس کا ہم سب پر حق ہے۔ حافظ کرم اللہ کی بیٹی ہے وہ آخر، اس کے باپ اور ماں کے اس گاؤں والوں پر بہت احسانات ہیں، سب کو قرآن کی تعلیم دی ہے انہوں نے......‘‘ حقیقت بھی یہی تھی کہ کلثوم کو دیکھ کر، اس کے حالات جان کر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ ہندوؤں کی ہمدردی میں ان کے شوہر نے اس بے چاری کے ساتھ زیادتی کر دی تھی، معصوم سی بچی کو اپنے نکھٹو شوہر کو بھی کما کر کھلانا پڑتا تھا، وہ جس کی پرچھائیں بھی کبھی اس کی ماں کی زندگی میں کسی نے نہ دیکھی تھی۔ جس کا حق تھا کہ کوئی اسے چار دیواری کا تحفظ دے، عزت سے روٹی کما کر دے، وہ اپنی زندگی کو کس کسمپرسی سے جی رہی تھی۔

’’میں آپ کا پیغام تو اسے دے دوں گی مگر مجھے علم ہے کہ وہ بڑی خوددار ہے، گھر بیٹھے اناج لے کر ہرگز نہیں کھائے گی، چاہے اسے فاقوں مرنا پڑے......‘‘ ملازمہ نے کہا۔

’’ضرورت بڑے بڑوں کی زندگیوں کے اصول توڑ دیتی ہے!‘‘ انہوں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

’’تم میرا پیغام تو اس تک پہنچانا، پھر دیکھتے ہیں کہ اس کی مدد کس طرح کی جائے کہ اس کی خودداری بھی قائم رہے......‘‘ زرتاج کی خودداری کو پیروں تلے روندنے کی خواہش رکھنے والی شکیلہ بی بی، اسی جیسی ایک اور نوجوان لڑکی کی خودداری کو قائم رکھنے کی بات کر رہی تھیں۔ ان کی خاص ملازمہ اپنی مالکن کے اس خاص انداز کو ایک خاص نظر سے دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اس بات کا تھا کہ زرتاج نے ان کی اور کلثوم نے ان کے شوہر

کی انا کو چوٹ پہنچائی تھی اور اپنے شوہر کو نیچا دکھانے کی خاطر...... ان کی انا کو چوٹ پہنچانے والے کی اس سے زیادہ پذیرائی بھی کر سکتی تھیں۔

☆☆☆..........☆☆☆

نگی کو رانی کے اطوار کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور وہ اس بات پر حیران تھی کہ مائیں تو اولاد کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو رانی کی ماں کو کیوں نظر نہیں آتا تھا کہ وہ کن راہوں پر چل رہی تھی۔ گھر سے کام کا کہہ کر نکلنے والی رانی اسے کبھی کبھار کھیتوں پر نظر نہ آتی تو وہ واپسی پر اس کے گھر ضرور پوچھنے جاتی مگر معلوم ہوتا کہ وہ کام پر گئی تھی، معاوضہ بھی لے کر آئی تھی اور بڑی سو رہی ہے۔ اس کی ماں جو ہمیشہ سے گھر داری اور بچے پالنے کی ذمے داری میں مصروف رہتی تھی، اسے کیا علم کہ وہ کس کام کا معاوضہ لا کر اسے دیتی تھی۔

اسے جو چاہیے تھا، وہ اسے مل گیا تھا، اس کی اس خواہش کا وہ کیا خراج وصول کرتا تھا، اسے بھی وہ اپنے لیے اعزاز ہی سمجھتی تھی۔ وہ ایک گھاک شکاری اور یہ ایک معصوم خواہشات کو پالنے والی چڑیا...... جسے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر وہ اپنا قیمتی ترین جوہر بھی لٹا بیٹھی تھی۔ اسے ہر وہ شخص برا لگتا جو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، اس کی سہیلی نگی ہو یا وہ کرخت چہرے والا منشی، جو یہی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی بچ جائے...... مگر جسے خود مصیبت میں پھنسنے کا شوق ہو رہا تھا اسے کوئی کیسے بچا سکتا تھا۔ منشی جان گیا تھا کہ گھر سے کام پر آنے والی، اس کے پاس حاضری کے لیے نام لکھوا کر کس وقت اور کس سمت کو چل پڑتی ہے اور اس کے کتنی دیر کے بعد چوہدری اکبر علی کو کوئی ضروری کام یاد آ جاتا تھا۔

منشی نے ہی نگی کو بتایا تھا کہ اس کی سہیلی کیا کر رہی تھی، نگی کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ عشق میں اس حد تک اندھی بھی ہو سکتی ہے۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی، منشی صاحب!“

”جو شکل ایک بار دیکھ لیتا ہوں اسے بھولتا نہیں ہوں، نام چاہے نہ یاد رہے مگر اس کا حوالہ اور تعلق یاد رہتا ہے۔ مجھے تمہارا نام یاد ہے نہ اس کا مگر میں اسے دیکھتا تو تمہارا تصور آتا اور تمہیں دیکھا ہے تو فوراً اسے پہلے یاد آ جاتا ہے کہ تم اور وہ مجھے اکٹھی ملی تھیں......“ اس نے وضاحت کی۔

”میں پوچھوں گی اس سے......؟“ اس کا اب بھی یقین کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔

”پوچھ مت......“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اسے سمجھا! اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک لے، اس سے پہلے کہ اسے ایسے انجام سے دوچار ہونا پڑے، جیسے کہ......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس کی اماں سے بات کروں گی!“

”مجھے اس کے باپ کا نام بتا، میں اس سے بات کرتا ہوں!“

”نہیں نہیں...... اس کا ابا تو اس کے ٹوٹے ہی کر دے گا!“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”ہر دو صورتوں میں ٹوٹے تو اس کے ہونے ہی ہیں، اپنے باپ کے ہاتھوں یا چوہدریوں میں سے کسی کے ہاتھوں......“ منشی نے ایسا الم ناک انجام بتایا تھا کہ وہ کانپ گئی۔

”کاش تو یہیں پر رک جائے رانی...... کاش تجھے ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی عقل آ جائے!“ اس نے دل سے دعا کی۔ ”میں اس کی اماں سے بات کروں گی!“ اس نے منشی سے کہا مگر جب بھی وہ وہاں اس مقصد سے

گئی، رانی کی موجودگی کے باعث بات نہ کر سکی، رانی کی اس سے ناراضی ابھی تک چل رہی تھی، اس کی ناک سے غصہ اترا ہی نہ تھا اور اب تو اسے اور بھی زیادہ غصہ آتا تھا نگی کو دیکھ کر۔ نگی اس کے ماضی کا ایک ایسا باب تھا جسے وہ بھول جانا چاہتی تھی، اسے لگتا تھا کہ اکبر علی کے دل کی مسند پر بیٹھ کر وہ اتنی بلند ہو گئی تھی کہ نگی جیسی لڑکیاں اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔

☆☆☆..........☆☆☆

”بال بال بچ گئے ہیں فیضی مگر دوبارہ تم نے ایسی کوتاہی کی تو پھر مجھ سے رحم کی توقع نہ کرنا......“ شجاع نے فیضی کو اپنی ماں کی ساری گفتگو بتائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اس نے بہ مشکل ماں کے شک کو اب کی بار ختم کیا ہے۔ فیضی کی کیا جرأت تھی کہ وہ ایسا کام اس کے علم میں لائے بغیر کرتا بلکہ اس نے تو اسے اس کام سے روکنے کی بھی کوشش کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اپنے گاؤں سے باہر جو بھی کام وہ بتائے، فیضی بلا جھجک کر دے گا مگر اپنے گاؤں میں اس طرح کا کام کرنا مناسب نہیں اور پکڑ لیے جانے کا احتمال رہتا ہے۔

”اس نے مجھے پہچان لیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر سے باہر دیکھ سکتی تھی......“ فیضی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”مگر وہ یہ کیسے جان گئی کہ میں فیضی ہوں اور آپ کا خاص آدمی ہوں؟“

”ہیں......“ شجاع چونکا۔ ”یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں، واقعی اگر تم کہتے ہو کہ تم نے کبھی اس کو دیکھا تک نہیں تو پھر وہ تمہیں کیسے جانتی ہے جبکہ وہ اس گاؤں کی ہے بھی نہیں......“

”مجھے ایک شک ہے فیضی!“ اس نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

”کس پر جناب اور کیسا شک......؟“ اس نے حیرت سے چوہدری کو دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ کسی اندر کے آدمی نے اماں کو شکایت کی ہے، ورنہ وہ لڑکی تمہیں کیسے پہچان سکتی تھی، وہ کون سا تمہیں جانتی ہے...... چاہے وہ اندر سے درز سے تمہیں دیکھ بھی رہی ہوتی!“ اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”بات تو آپ کی سولہ آنے صحیح لگتی ہے جناب......“ اس کا انداز خوشامدی تھا۔ ”لاتے تو سرکار آپ ہمیشہ دور کی کوڑی ہیں مگر یہ گھر کا بھیدی کون ہو سکتا ہے؟“ فیضی نے مکاری سے سوال کیا۔

”تم جانتے ہو فیضی کہ گھر میں کون ہماری جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتا ہے، کس کے مفادات کی بنیاد ہماری مخالفت پر ہے، کون ہے جو خود بابو جی کی نظروں میں اچھا بنا ہوا ہے اور ہمیں ہر وقت ان سے پھٹکار پڑتی رہتی ہے!“ شجاع کا لہجہ شک اور نفرت سے بھرپور تھا۔

”ارے نہیں سرکار...... ماں باپ کی ڈانٹ بھی کوئی ڈانٹ ہوتی ہے، وہ تو ہمارے بھلے کو ہی کہتے ہیں اور آپ تو کیسے خوش قسمت ہیں کہ ماں اور باپ، دونوں کا پیار نصیب ہے آپ کو!“ فیضی نے لہجہ بدل لیا۔ ”ایک ہم ہیں، کیسے بدنصیب کہ نہ ماں کی دعائیں ہیں، نہ باپ کا سایہ...... مگر سرکار آپ ہیں نا ہمارے مائی باپ۔ اللہ سائیں آپ کو سلامت رکھے ہمیں تو کبھی ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے نا باپ کی......“ اس کی انہی باتوں کی وجہ سے تو شجاع ہمیشہ چکر میں آ جاتا تھا۔

”بس اب ذرا تو کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہو جا......“ شجاع نے نرمی سے کہا۔ ”یوں کر کہ کہیں شہر چند دن رہ کر آ جا، یار تیرے بغیر کام تو اپنا بھی نہیں چلتا مگر یہ کرنا بھی ضروری ہے......“

”جیسا سرکار کا حکم......“ اس نے سرتابعداری سے جھکا کر کہا۔ ”میں تو آپ کے ڈیرے پر بھی چھپ کر بیٹھ جاؤں تو کسی کی نظر میں کئی دن تک نہ آؤں!“

”نہیں نہیں......“ شجاع نے فوراً گھر کا۔ ”جیسا کہا ہے، ویسا ہی کر، تو غائب ہو جا، بابو جی نے اپنے کتے چھوڑ دیے تو سب سے پہلے تیری بو سونگھتے وہ میرے ڈیرے پر ہی آئیں گے اور یوں بھی ڈیرا تو ہر وقت لالہ کی کڑی نظروں میں رہتا ہے، جانے کون ہے جو انہیں اندر کی خبریں دیتا ہے...... کوئی ہے ہمارا دشمن فیضی...... کوئی ہے ہمارے اندر چھپا ہوا، ہمارا بن کر ہمیں ہی دھوکا دیتا ہوا! مگر جس دن وہ میری پکڑ میں آ گیا اس کا انجام دنیا دیکھے گی......“ غیظ وغضب سے بولتے ہوئے شجاع کے چہرے کی طرف دیکھ کر فیضی کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

☆☆☆..........☆☆☆

”سرکار شکایت لے کر آیا تھا آپ کے پاس اپنی گھر والی کی......“ گھوٹو نے خود پر پڑنے والی چوہدری صاحب کی سوالیہ نظروں سے گھبرا کر کہا۔ ”مانتی ہی نہیں میری جناب......“

”تیری نہیں مانتی...... میری نہیں مانتی...... تو کس کی مانتی ہے؟“ چوہدری صاحب نے طنز سے پوچھا۔ ”کوئی اور یار ہے اس کا جو اسے پٹیاں پڑھاتا ہے!“

”نہیں سرکار...... ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے تو میری تابعداری کرتی ہے اور کوئی اور نہیں ہے ایسا...... بس ذرا اڑی کرنا شروع کر دی ہے اس نے، کام پر نہیں آنا چاہتی، کہتی ہے تھکاوٹ ہو جاتی ہے!“ وہ تو اپنی دانست میں چوہدری صاحب کی ہمدردیاں وصول کرنا چاہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ چوہدرانی جی سے کہلوا کر ذرا اسے ڈانٹ ڈپٹ کروا دیں گے تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔

”اگر وہ اڑی کرتی ہے تو بچہ کیسے ہونے والا ہے اس کا؟“ چوہدری صاحب نے شک سے اسے گھوری ماری۔ ”کیا بچہ......؟“

”نہیں نہیں سرکار...... ایسی ہرگز نہیں ہے وہ، وہ بچہ میرا ہی ہے، مجھے پورا یقین ہے۔ مگر اب وہ بچے کو لے کر گھر کا کوئی کام بھی نہیں کرتی اور اس نے سرکار کے گھر پر کام کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے......“ اس نے جیسے شکایت لگائی۔

”سب سمجھتا ہوں، تیری صفائیاں میں نہیں ماننے والا...... پہلے اسے کہتا ہے کم بخت کہ چوہدری صاحب غیر محرم ہیں، انہیں مالش نہ کرنا...... اور جب سمجھا کہ میں تجھے عزت افزائی کے لیے بلانے ہی والا ہوں تو خود ہی آ گیا تو میرے پاس، کسی چور کی اولاد......“ انہوں نے منہ سے غصے کے باعث آ جانے والا کف صاف کیا۔

”وہ کیا ہوتا ہے سرکار...... غیر محرم؟“ اسے عمر بھر ہندوؤں کے گھروں میں رہ کر کہاں محرم اور غیر محرم جیسے الفاظ کا مطلب آتا تھا مگر چوہدری صاحب کو اس کی یہ بات اداکاری لگی اور مزید طیش آ گیا۔

”بتاتا ہوں ابھی تجھے...... بڑا محرم ہے نا تو اس کا، بد بخت تیرا منہ تو ایسا ہے کہ گلی کا کتا بھی تجھے دیکھے تو منہ پھیر کر گزر جائے، محرم اس کا!“ غصے میں جو کچھ ان کے منہ میں آتا گیا وہ بولتے چلے گئے۔ ”جوتے لگاؤ اس گندی نالی کے کیڑے کو، چلا ہے برابری کرنے، محرم بنا پھرتا ہے!“ ان کے حکم کی تعمیل میں گھوٹو پر لاتوں اور مکوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ فریاد لے کر آیا تھا، الٹا چوہدری صاحب کو اسے دیکھتے ہی کلثوم کا وہ انداز یاد آ گیا

اور وہ ہتک جو انہیں ملازماؤں کے سامنے محسوس ہوئی تھی۔

”جوتے مار مار کے اس کا کچومر نکال دو...... محرم کہیں کا!“ وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے اندر کو چلے اور وہ اس جرم کی پاداش میں پٹنے لگا جس کا اسے علم ہی نہ تھا، محرم جانے کتنی بری شے کو کہتے ہیں، وہ دل ہی دل میں سوچتا اور ہر ٹھڈے پر بلکتا رہا۔

☆☆☆..........☆☆☆

”وہ اچھا آدمی نہیں تھا مریم!“ ان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ ”اس نے مجھے ساری زندگی اس پہلو سے دکھی رکھا مگر میں نے سب کچھ اولاد کی خاطر برداشت کیا۔ اس کی فطرت میں قناعت تھی ہی نہیں، وہ مجھے خود دوسری عورتوں سے تعلقات کے قصے سناتا تھا مگر کوئی عورت اس کی زندگی میں چند دن سے زیادہ نہ رہتی تھی......“

”حیرت ہے!“ مریم نے کہا۔ ”اگر وہ ایسے تھے تو انہوں نے آپ کو عمر بھر کیسے رکھا؟“

”جگہ جگہ منہ مارنے والا آدمی اصل میں کہیں کا نہیں ہوتا مریم...... اسے کوئی نہ کوئی آسرا چاہیے ہوتا ہے۔ کوئی ٹھکانا، کوئی گھر اور ایک گھر والی بھی!“

”یہ سب کس لیے آیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”باہر کی عورت مرد کا پیٹ نہیں بھر سکتی، اسے پکا کر کھلاتی ہے نہ کپڑے دھو کر دیتی ہے اور نہ ہی اس کی تھکن سمیٹتی ہے، منہ بات بات پر بے عزتی کرواتی ہے، جس دن مرد کی جیب خالی ہو اس دن وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی۔ بیوی اس کی خدمت گار ہوتی ہے، اس کے بچوں کی ماں، اس کی باورچن، دھوبن اور اس کی فرمانبردار کنیز......“

”ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا تجزیہ غضب کا ہے!“ مریم نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تم بتاؤ یہ بچی کون ہے؟“ دن بھر تو بچوں کے سامنے فرصت نہ ملی تھی، رات کو دونوں ایک ہی کمرے میں تھیں اور کھل کر بات کر سکتی تھیں۔

”یہ بچی......“ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ ”میری ہے...... اور مجھے آپ نے دی ہے!“

”ہیں......؟“ انہوں نے حیرت سے کہا تو مریم نے انہیں کچھ سچ اور کچھ جھوٹ ملا کر انہیں کہانی بنا کر سنا دی، جس کے مطابق وہ بچی اسے ریل میں کسی غریب اور بیوہ عورت نے دی تھی جو اس بچی کو پال نہ سکتی تھی اور مریم نے وہاں اپنے اڑوس پڑوس میں بتایا تھا کہ یہ بچی اسے سائرہ باجی نے دی تھی۔

”بڑی ذمے داری لے لی تم نے مریم، کوئی اتا پتا تو کرتیں کہ کون عورت تھی، کہیں کسی کی بچی اغوا کر کے نہ لائی ہو یا ناجائز بچی نہ ہو......“ انہوں نے خدشے کا اظہار کیا۔

”جائز یا ناجائز ہونے میں بچوں کا کیا اختیار ہوتا ہے آپا......“ اس نے رسان سے کہا۔ ”بچے تو معصوم ہوتے ہیں اور یوں بھی میں نے پتا کروایا تھا، اس عورت اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں!“ اسے معلوم تھا کہ سائرہ باجی بال کی کھال اتاریں گی۔ ان سے یہ بھی بعید نہ تھی کہ وہ اس سے اس شخص کا اتا پتا پوچھتیں جس سے اس عورت کا حدود اربعہ معلوم کروایا تھا۔

”مگر جب یہ بچی تمہیں کسی اور عورت نے دی ہے تو پھر اڑوس پڑوس میں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے تمہیں وہ بچی دی ہے؟“ انہوں نے شک بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”آپا! لوگوں کو بے مقصد باتوں کے بتنگڑ بنانے کی عادت ہوتی ہے، کئی بے مقصد سوالوں کے جوابات دینے سے بہتر ہے کہ میں انہیں ایسی بات کہہ دوں جس پر لوگوں کے منہ بند ہو جائیں......“ اس نے تاویل پیش کی۔

”چلو...... جو تمہیں ٹھیک لگا، تم نے اپنے اڑوس پڑوس میں بتا دیا!“ ان کی تسلی ہو گئی تھی۔ ”اور اچھا کیا کہ مجھے بھی بتا دیا۔ کبھی میں جو اچانک آ جاتی وہاں تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے کیا کہانی لوگوں کو سنا رکھی ہے!“

”اللہ نے مجھے بہت پیاری مصروفیت دے دی ہے، اب زندگی کے مصائب کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا!“ مریم نے ان کے ساتھ لپٹ کر کہا۔

”مریم......“

”ہوں؟“

”تم سے ایک درخواست کرنا تھی؟“ انہوں نے ہوا میں جیسے کچھ تلاشتے ہوئے کہا۔

”آپ بڑی ہیں مجھ سے، درخواست کیوں، حکم کریں!“ مریم نے ان سے پیار سے کہا۔

”تم انہیں معاف کر دینا......“

”کس کو؟“ جتنی دیر میں اسے سمجھ میں آتا، اس کے منہ سے بات پھسل چکی تھی۔

”جانے ان سے کیا کیا غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ہیں اور جانے کتنے ہی لوگوں کے مجرم تھے وہ، ان میں سے ایک تم ہی ہو جسے میں ذاتی طور پر جانتی ہوں اور کہہ سکتی ہوں کہ انہیں معاف کر دینا تاکہ ان کی سزاؤں میں کچھ تخفیف ہو سکے......“

”مجھے تو اللہ نے بچانا تھا جو میں بچ گئی۔ مگر میرا رشتوں اور ناتوں سے اعتبار بری طرح ٹوٹ گیا تھا، اتنا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو میں کبھی بھی پلٹ کر آپ کے گھر نہ آتی، آپ کہتی ہیں تو میں انہیں معاف کرنے کی کوشش بھی کروں گی!“ اس نے ان سے وعدہ کیا۔

”تم بہت اچھی ہو...... میں خود کو تمہاری مجرم سمجھتی ہوں اور اگر تم نے دل سے انہیں معاف کر دیا تو میں سمجھوں گی کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے!“

”ایسے شخص کے لیے آپ کو کیا ضرورت ہے معافیاں طلب کرنے کی جس نے آپ جیسی نیک اور پارسا بیوی کو بے وفائی کے دکھ دیے؟“ اس نے حیرت سے اُن کا منہ دیکھا۔

”وہ میرا شوہر تھا، اس کے ساتھ میں نے عمر بتائی ہے...... اس کی برائیاں اپنی جگہ مگر میرے حقوق اس نے اسی طرح ادا کیے ہیں جیسا کہ اس کا فرض تھا۔ وہ میرے بچوں کا باپ تھا اور میرے لیے یہ بات تکلیف دہ ہے کہ وہ جانے کس عذاب میں ہوگا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

”آپ دعا کیا کریں آپا، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آنے والے وقت میں اولاد کی طرف سے آسانیاں پیدا کرے......“ اس نے خلوص دل سے کہا۔ ”آپ اولاد کا سکھ دیکھیں، بچوں کی خوشیاں دیکھیں!“

”کاش میں تمہارے سکھ اور خوشیاں بھی دیکھ سکتی...... تم بھی تو میری بیٹی جیسی ہو!“ انہوں نے اس کو اپنے

ساتھ لپٹا لیا۔ ”تمہاری زندگی میں بہت سے دکھوں کا باعث شاید ہم ہی ہیں......“

”آپ دیکھ رہی نا میری خوشیاں، یہ ہے نا میری زندگی میں آنے والی خوشی جس کی اصل ماں لوگوں کی نظر میں آپ ہی ہیں......“ وہ ہنسی۔

”پیاری بچی ہے اور نام بھی تم نے اس کا پیارا رکھا ہے، ستارہ!“ انہوں نے سوئی ہوئی بچی کے ماتھے سے بال ہٹائے۔

”گڑیا کہتی ہوں میں اسے پیار سے......“ اس نے انہیں بتایا۔

☆☆☆............☆☆☆

”پرویز یار میں تو عجیب سے مسئلے میں پھنس گیا ہوں......“ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”کیا ہو گیا ہے میرے یار؟“ اس نے اس سے کہا۔

”یار میں......“ اس نے الف سے یے تک ساری بات اسے سنا دی۔ ”میں تو بہت برا پھنس گیا ہوں۔ اس سے شادی کروں تو بھی علی اعلان نہیں کر سکتا اور نہ کروں تو وہ خودکشی کی دھمکی دے رہی ہے......“

”یہ تو ہے یاؤ...... اور اگر اس نے خود کو کچھ کر لیا تو تمہیں اندازہ نہیں کہ جہاں آرا کے ہاتھ کتنے دراز ہیں، وہ کس طرح تمہیں مشکل میں ڈال سکتی ہے!“ اس نے اسے مزید ڈرایا۔ ”شادی تو تمہیں اس سے کرنا ہی پڑے گی چاہے بعد میں چھوڑ دینا......“ اس غریب کو کیا علم تھا کہ طوائفوں کے دلال صرف ولی جیسے بھائی ہی نہیں ہوتے بلکہ پرویز جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس طرح کے معصوموں کو پھانس کر اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔

”تم کچھ صلاح دو، مجھے تم سے بڑی امید تھی......“

”کہہ تو رہا ہوں کہ شادی کر لو، ایک بار اس کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا اور اس کے بعد جب دل چاہے اسے چھوڑ دینا......“ پرویز نے مکاری سے کہا۔

”تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے کہ یہ بڑی آسان بات ہے، جواب خودکشی کی دھمکی دے رہی ہے کیا بعد میں......“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو باؤ اور بے فکر ہو جاؤ......“ وہ آنکھ مار کر ہنسا۔ قائم علی کو کچھ عجیب تو لگا مگر کیا...... اسے علم نہ تھا، وہ اپنی سادگی میں پرویز کو پھر اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں اس بات کا خیال بھی آیا کہ اگر موجی نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے تو اسے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے، شاید وہ ایک طوائف کو تائب ہونے میں مدد کر کے نیکی کما سکے۔ شاید قدرت نے اس کے نامۂ اعمال میں اس اچھے کام کو لکھ رکھا ہو......

”تو پھر چلو گے میرے ساتھ، اکلوتے براتی بن کر؟“ قائم علی نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں...... میرے جگر!“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”ویسے انہوں نے تم سے کوئی ناجائز مطالبہ تو نہیں کیا؟“ یہ سوال پوچھ کر اصل میں وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جہاں آرا نے اس آسامی سے کیا کچھ بٹورا ہے اور کیا اس میں سے اس کو حصہ دینے میں ڈنڈی تو نہیں مارے گی۔

عباس ابھی ایک بیٹی کی پیدائش کے بوجھ سے نہ سنبھلا تھا اور اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ لوٹ کر گاؤں جائے اور بی بی جی سے معافی مانگے، ان کو بتائے کہ دیا نے اس کی خاطر مذہب تبدیل کرلیا تھا اب وہ زہرہ تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی، بی بی جی کی پوتی...... زرینہ! کہ زہرہ نے اسے پھر سے امید سے ہونے کی خبر سنادی۔ محنت مزدوری کر کے وہ بہ مشکل گھر کی گاڑی کھینچ رہا تھا، اب کس طرح گھر میں ایک کے بعد ایک جی آئے چلا جارہا تھا اور اخراجات بڑھ رہے تھے۔ ایک بچی کی پیدائش کا خرچہ ہوا اس کے کئی اور اخراجات اور اب دوسرے بچے کی آمد کے باعث اس کا ماں کا دودھ چھوٹا تو دودھ کا مستقل اور اضافی خرچ بڑھ گیا تھا۔

وہ چڑچڑا سا ہو گیا تھا، زہرہ بات کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتا، بچی روتی تو اسے یوں ڈانٹتا جیسے وہ سب سمجھ رہی ہو...... الٹا وہ اور بھی چلانے لگتی اور اس کا بس نہ چلتا کہ اس کا گلا گھونٹ کر اس کو مار ہی ڈالے، اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردے۔ زہرہ اس سے بات بے بات الجھتی، اس کا بھی اس سارے معاملے میں اتنا ہی قصور تھا جتنا عباس کا تو پھر فقط وہ کیوں سزاوار ٹھہرتی؟ وہ بھی دوبدو بحث کرتی اور بات بڑھتی چلی جاتی۔

اس روز بھی عباس اس سے جھگڑا کر کے بغیر ناشتا کیے بلکہ ناشتے کی سینی کو ٹھوکر مار کر ہر چیز کو گراتا ہوا گھر سے یک بیک کرتا نکلا تھا، وہ بیٹھی دھواں دار رو رہی تھی اپنی بے بسی کو...... اس بچی کی قسمت کو اور آنے والے کو بھی۔

وہ چلائے جارہی تھی بغیر اس بات کا احساس کیے کہ اس کی ماں جانے کون کون سے دکھوں کو رو رہی تھی، وہ بھوک سے چلا رہی تھی اور زہرہ آنسوؤں کے گولے حلق سے اتار رہی تھی۔ اس روز بھی اسی بات پر جھگڑا شروع ہوا تھا کہ بچی کی ضرورت کے لیے دودھ ناکافی ہوتا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر عباس اپنا سگریٹ کا خرچہ کم کر دے تو بچی کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔

''اس کے بعد تم کہوگی کہ روٹی کھانا چھوڑ دوں تاکہ وہ بھی بچی کھالے......'' اس نے چلا کر کہا تھا۔

''بچی صرف میری نہیں ہے عباس، تمہاری بھی ہے، اس کے لیے میں نے تو نہیں کمانا، تم ہی گھر سے کمانے کے لیے نکلتے ہو اور پھر سگریٹ کون سا کوئی اچھی چیز ہے جو تم درجنوں کے حساب سے پھونک ڈالتے ہو!'' اس نے کوشش کی تھی کہ نرمی سے بات کرے۔

''تو کیا سگریٹ کا خرچ تمہارا باپ دیتا ہے......؟'' اس نے ناشتے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

''اچھا چلو اتنا غصہ ٹھیک نہیں...... ناشتا کرلو!'' اس نے کہا تو وہ اور بھی بپھر گیا، اس کے چمکارنے پر ناشتے کی ٹرے کو غصے کے اظہار کے طور پرپرے پھینکا۔ وہ اس کے جانے کے بعد بھی رزق کی اس بے قدری پر روتی رہی، خود وہ رات کی بچی کچھی کھا کر بھی اپنا پیٹ بھر لیتی تھی مگر اسے تازہ ناشتا بنا کر دیتی کہ وہ محنت مزدوری کرتا تھا اور اسے ضرورت بھی تھی کہ مرد تھا اور وہ اس رزق کو اس طرح پھینک کر گیا تھا کہ اسے گھر میں کوئی دوسرا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

رو دھو کر وہ اٹھی اور روٹی اٹھا کر اسے جھاڑا، جہاں زیادہ مٹی لگ گئی تھی ان حصوں کو توڑ کر الگ کیا اور اچار کے ساتھ اسے زہر مار کرنے لگی، زرینہ روئے جارہی تھی۔ اس نے اسے گود میں لیا اور اپنی حالت کی پروا کیے بغیر اس کی بھوک مٹانے کو اسے اپنے سینے سے لگالیا، وہ چپ ہوگئی۔ ماں ایک بچی کچھی، سوکھی روٹی کھا کر اس پر تین نفوس کو پال رہی تھی، آنسو بہہ بہہ کر اس کا دامن بھگو رہے تھے...... اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ماں باپ

کی بد دعاؤں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

اس نے بچی کو سلایا اور دل میں تہیہ کیا کہ وہ گھر سے نکل کر کوئی نہ کوئی ایسا کام محلے میں پکڑ لے گی کہ جس سے اس کے حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔ اپنی بادامی رنگ کی چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا، اس کا ارادہ یہی تھا کہ خود تو گھر گھر نہیں جائے گی، اپنی پڑوسن کے پاس جا کر اس سے کہے گی کہ اسے گھر بیٹھے کام لا دیا کرے۔

بچی کو اچھی طرح سرہانے تکیے رکھ کر محفوظ کیا، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں اسے لوٹ آنا تھا۔ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے وہ دروازے کے پاس پہنچی، اسے ہلکا سا دھکیلا، اس کے خیال میں تو اس دروازے کو عباس کے جانے کے بعد کھلا ہی ہونا چاہیے تھا مگر دروازہ بند تھا۔ اس نے ذرا زور سے دھکیلا، اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا، دروازہ باہر سے بند تھا، اسی طرح جیسے وہ پہلے پہل بند کر کے جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے سے اس نے باہر سے دروازہ بند کرنا بند کر دیا تھا، جب سے اس زہرہ نے اس سے کہا تھا کہ کسی وقت کوئی اچانک ضرورت پڑ سکتی ہے۔

''تو کیا اسے مجھ پر اعتبار نہیں رہا......'' اس نے سوچا اور دروازے سے ٹیک لگا کر رونے لگی۔

☆☆☆

کلثوم چوہدرانی کے بلاوے پر ان کے پاس گئی تو انہوں نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اناج وغیرہ بھجوا دیں گی تاکہ اسے اس حالت میں کام نہ کرنا پڑے۔

''میں ایسے کیسے آپ سے مدد لے سکتی ہوں، میرے ماں باپ نے عمر بھر محنت کی کمائی کھائی اور ہمیں بھی یہی درس دیا، قسمت سے دن خراب آ گئے ہیں، میں تب بھی فاقے کر لوں گی مگر خیرات میں کچھ نہیں لوں گی!'' اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکا۔ کیسی بے بسی کا عالم اس پر آ گیا تھا، باپ کو تو اس نے ہوش سنبھال کر دیکھا ہی نہ تھا۔ ماں نے عمر بھر مرغی کی طرح پروں تلے چھپا کر رکھا۔ بھائی نے اسے اتنا مان دیا کہ اس پر کسی کی عمر بھر بری نظر نہ پڑی تھی اور اب کہاں تھا وہ بھائی...... اسے عمر بھر کے لیے سزا دے گیا تھا، کاش وہ دیکھ سکتا کہ وہ کیا کیا بھگت رہی تھی، جس گھوٹو کو دیکھ کر لوگ دور سے راستہ بدل لیتے تھے، جس کے پاس سے آنے والی ناگوار بو سے سارا گاؤں بھاگتا تھا، اس گھوٹو کے ساتھ کو وہ کس طرح برداشت کرتی تھی، ایک ایسا زہر جو اسے اپنے بھائی کے کیے کی سزا کے طور پر پینا تھا، وہ جو اس کا بھی دشمن تھا اور ایک ایسے سانپ کی طرح تھا جو اپنے بچے کو بھی کھا سکتا تھا۔

''خیرات سمجھ کر تھوڑی دے رہے ہیں ہم یہ سب، یہ تو تمہارے ماں، باپ کے ان احسانات کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہم پر کیے ہیں......'' انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کون سے احسانات؟'' وہ کچھ نہ سمجھی تھی۔

''ارے ہم سب اور ہمارے بچے اور ان کے بچے...... سب نے قرآن پاک تمہاری دادی پھر تمہارے ابا اور پھر بی بی جی سے ہی تو پڑھا ہے......'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''اور یہ ان کا ایسا احسان ہے کہ ہم پر ان کی بیٹی کی نگہداشت فرض ہو جاتی ہے!''

''انہوں نے جو کچھ کیا اس کے بدلے میں یقیناً اس وقت ان کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا رہا ہوگا چوہدرانی جی! جیسے میں نے اپنے ہوش میں اماں کو دیکھا ہے کہ ان کا کپڑا لتا، اناج وغیرہ سب آپ ہی لوگ مل کر کرتے تھے

سارے گاؤں والے...... اب میں کس چیز کے بدلے یہ سب کچھ لوں؟''

''باؤلی ہوئی ہو کیا، معراج بتا رہی تھی کہ تم ٹھیک نہیں رہتی ہو، بس تم گھر بیٹھو...... بے فضول کی بحث نہ کرو!'' انہوں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''آپ کے مجھ پر پہلے کون سا کم احسانات ہیں......'' اس نے ہولے سے کہا۔

''اس میں احسان کی کیا بات ہے، حافظ کرم اللہ کے خاندان کے ہماری پشتوں پر احسانات ہیں!'' انہوں نے جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر کہا جس میں محبت نہیں بلکہ دنیا دکھاوے کا زیادہ عمل دخل تھا۔

''آپ کا یہ احسان ہی کافی ہے کہ مجھے عمر بھر کے لیے پل صراط پر چلنے پر مجبور کر دیا آپ لوگوں نے......'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

''کچھ کہا تم نے؟'' انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''جی......'' وہ چونکی۔ ''میں نے...... میں نے تو کچھ نہیں کہا!'' اگر جو وہ اس کی بات سن اور سمجھ لیتیں تو اس وقت شاید ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔ ''چلتی ہوں......'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اناج بھجوا رہی ہوں، اسے لوٹانا مت...... ہماری بے عزتی ہوگی!'' اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

☆☆☆

''یار ذرا سانس لے کر بولو، ہولے سے بات کرو تو مجھے کچھ سمجھ میں آئے کہ تم کہہ کیا رہے ہو؟'' منشی نے آنے والے کو گھر کا۔

''وہ جی ہے نا وہ لمبا سا لڑکا......'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہی پھر بات شروع کر دی۔

''کون لمبا سا لڑکا؟''

''وہ جی جو نیا آیا ہے، گورا سا......'' پھر وضاحت کی گئی۔

''کیا ہوا اس کو؟'' منشی نے غصے سے پوچھا۔

''وہ جی چھت سے گر گیا ہے، کوئی پھٹا ٹوٹا ہوا تھا، اس پر اس کا پاؤں پڑا اور......''

''او ہو!'' وہ جھٹکا کھا کر اٹھے۔ ''کون سا لڑکا ہے یہ، نام کیا ہے اس کا؟'' انہوں نے اس مزدور کے ساتھ بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''باسا جی...... باسا نام ہے اس کا!''

☆☆☆

''سچ کہہ رہی ہوں سرکار......'' اس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے چوہدری صاحب کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو یہ حرکت کی نہیں......'' ان کا انداز کچھ سوچنے والا تھا۔ ''اگر بابر نے ایسا کیا ہے تو مجھے اس کو جتانا پڑے گا کہ اس پر میری نظر ہے اس لیے وہ میرے راستے سے ہٹ جائے...... اور اگر یہ حرکت تائے کے بیٹوں کی ہے تو پھر بہت بڑا فساد ہونے کا خطرہ ہے......''

''پر سرکار انہیں کیسے معلوم کہ سرکار کی اس پر نظر ہے......'' اس نے خوشامدی لہجے میں کہا تھا۔

''نظر......'' انہوں نے اسے گھورا۔ ''نظر نہیں کم بخت...... میں نکاح کرنا چاہتا ہوں اس سے!''

"وہی تو......" اس نے سہم کر کہا۔ ان مالکوں کے انداز ایسے ہی تھے، ذرا سی بات پر پل میں تولہ سے ماشہ ہو جاتے تھے۔ ذرا دیر پہلے کتنی لگاوٹ سے اس کے کندھوں پر ان کا ہاتھ دھرا تھا، اس سے قبل ان کے ساتھ کتنے ہی قربت کے لمحات بھی آئے تھے اسی لیے تو وہ ان کی سر چڑھی ملازمہ کے طور پر جانی جاتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اکبر علی کی خاص ملازمہ کو کچھ کہہ سکتا۔ کام بھی وہ اپنی مرضی سے کرتی اور یہاں تک کہ اسے فاخرہ بھی کچھ کہتی تو وہ مصروفیت کا بہانہ پیش کر دیتی۔

"تو کسی طرح جا کر اس سے پوچھ سکتی ہے کہ سارا معاملہ کس طرح ہوا تھا؟" اکبر علی نے اپنا لہجہ بدل لیا تھا۔

"مم...... میں...... میں کیسے جا سکتی ہوں وہاں؟" اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"کیوں، تیرے پیروں میں چھالے ہیں کیا؟" غصے میں پوچھا گیا۔

"وہ سرکار...... مجھے اس کی اماں سے بہت ڈر لگتا ہے، بہت غصے والی ہے وہ!"

"تجھے شاید میرے غصے کا اندازہ نہیں ہے۔" اور اس کو درست اندازہ کروانے کے لیے انہوں نے ایک زوردار لات اسے رسید کی، وہ ان سب کی عادی تھی، اسے معلوم تھا کہ یہی لات رسید کرنے والا کسی وقت اس کے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو بھی پونچھتا ہے۔

"جو حکم سرکار......" اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ہاں" انہوں نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔ "مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر تمہیں جان سے بھی مار دیا جائے تو تم نے یہ نہیں بتانا کہ تمہیں میں نے یہ سب دریافت کرنے کو کہا ہے۔"

"جانتی ہوں سرکار۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "آپ کی پرانی نمک خوار ہوں!" اور اس کی اسی بات پر تو اکبر علی کو سب کچھ بھول جاتا تھا یہ بھی کہ وہ ان کی ملازمہ تھی اور اس کا تعلق نیچ خاندان سے تھا، تھوکے ہوئے کو چاٹتے وقت وہ اس بات کو ہمیشہ بھول جاتے تھے۔ برآمدے میں قدموں کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے اس کو فوراً پرے دھکیلا، وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے بغلی دروازے سے باہر نکل گئی۔

"اکبر علی۔" چوہدرانی شکیلہ کو ہمیشہ سے دستک دیے بغیر سب کمروں میں جانے کی عادت تھی۔ "ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں تم سے بیٹا!" انہیں وہ ضروری بات اس سے قبل ہی معلوم ہو چکی تھی تاہم ماں کے منہ سے سن کر وہ لاعلمی کے تاثرات چہرے پر سجائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

"عمران کتنا چڑچڑا ہو گیا ہے۔" جہانگیر اسے کافی دیر سے بہلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے مگر وہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا، ریں ریں کیے جا رہا تھا۔

"دودھ چھڑوانے سے بچے اس طرح ہو جاتے ہیں!" رابعہ نے شوہر کو بتایا۔

"تو کیا اس کا حل یہ ہے کہ مائیں بچوں کو عمر بھر دودھ پلاتی رہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ارے نہیں بھئی، ہو جاتے ہیں بچے چڑچڑے پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ہم دونوں اناڑی ہیں، اس لیے ہمیں اس کو سنبھالنا نہیں آ رہا......"

"تو پھر کسی سیانے سے پوچھو کہ کس طرح اس کی چڑ کم ہو۔" انہوں نے تجویز دی۔ "میرا بیٹا تو رونے والا بچہ ہی نہیں تھا!" انہوں نے پیار سے اسے اپنے سینے سے لگالیا، وہ چپ ہونے کے بجائے اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

"لائیں اِدھر مجھے دے دیں۔" رابعہ نے اسے لے لیا۔

"کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے اسے دودھ پلا ہی دو جب تک ممکن ہو، اس طرح تو رو رو کر اور اوپر کا دودھ نہ پی کر یہ کمزور ہو جائے گا!" انہوں نے تشویش سے کہا۔

"میں خود کو بہت کمزور محسوس کرتی ہوں اور اوپر سے الٹیوں نے میری طبیعت نڈھال کر رکھی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی......"

"کیا سوچ رہی ہو تم؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ اس کی دادی اماں کو بلالیں، ان سے یہ سنبھل بھی جائے گا اور مجھے بھی کچھ آسرا ہو جائے گا۔"

"اپنے آرام اور اپنی سہولت کی خاطر ہم بابو جی کو کیوں تکلیف میں ڈالیں، میں ان سے بات کرتا ہوں اور تم ماں بیٹے کو گاؤں بھجوا دیتا ہوں تھوڑے عرصے کے لیے......" انہوں نے تجویز دی۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" رابعہ نے فوراً خوشی سے کہا مگر ساتھ ہی اسے اپنی بابو جی سے آنے سے قبل آخری ملاقات یاد آ گئی جب انہوں نے اس کو بتایا تھا کہ جہانگیر نے ان سے شجاع کو ساتھ لے جانے کی بات کی ہے اور انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ شجاع کی کارروائیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور اسی کے خاص آدمی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کے مرحوم منشی کی جوان بیٹی پر اس کی نظر تھی اور وہ اسے اغوا کروانا چاہتا تھا۔ یہی بات اسے زرتاج سے بات کر کے بھی معلوم ہوئی تھی کہ اس کا خاص آدمی فیضی اس غرض سے زرتاج کے گھر کی چھت سے کودا تھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ...... وہ چاہتا تو کامیابی سے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچالیتا جو اس کی اپنی رضا اس میں شامل ہوتی۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرح کام کیا کہ اردگرد کے لوگ خبردار ہو گئے۔ وہ کامیاب ہو جاتا تو...... وہ تو سوچ کر ہی کانپ گئی تھی کہ اس معصوم چہرے والی لڑکی کا کیا ہوتا، عزت بچانے کی خاطر شاید وہ اپنی جان پر کھیل جاتی یا پھر بے عزت ہو کر خودکشی کر لیتی۔

رابعہ نے اپنے گاؤں کے کئی ایسے قصے سن رکھے تھے جن میں ان بااختیار چوہدریوں کے ہاتھوں رسوا ہونے والی لڑکیوں کا انجام کیا ہوا تھا، وہ خودکشی کر لیتیں یا پھر ان کے ماں باپ ان کا گلا گھونٹ کر انہیں مار ڈالتے...... کئی واقعات میں ماں باپ اپنا منہ چھپانے کی خاطر گاؤں بدر ہو گئے تھے اور جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ اسے یاد تھا وہ واقعہ بھی جس میں ایک گھرانے کی تو جوان لڑکی تعلیم کے حصول کے شوق میں شہر گئی تھی اور بھی پلٹ کر نہ آئی تھی...... وہ ایک عیسائی گھرانہ تھا اور پھر اس لڑکی کے گھر والے سب کچھ بیچ باچ کر ملک ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر کاجل اور دیا کے واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا بھلا۔

"مگر مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھی میں بابو جی سے بات کرتا ہوں کہ وہ شجاع کو شہر بھیج دیں یا تم لوگ گاؤں آ جاؤ تو بابو جی ناراض ہونے لگتے ہیں...... مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے ان سے کچھ کہا ہے یا وہ خود ہی سمجھتے ہیں کہ تم شجاع کو پسند نہیں کرتی ہو!"

"میں نے کب ایسی کوئی بات کی ہے؟" اس نے جہانگیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"یہ تو میں نے نہیں کہا کہ تم نے کوئی بات کی ہے..... صرف ایک خیال ظاہر کیا ہے!" جہانگیر نے فوراً کہا۔ "مگر جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم شجاع کو ناپسند کرتی ہو....."

"اور کیا؟" اس نے تنک کر کہا۔ "کہہ لیں اور بھی جو کچھ کہنا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تو جہانگیر کو اپنی بات کی منفی شدت کا احساس ہوا۔ اسے اگر اس بات کا شائبہ بھی تھا کہ رابعہ، شجاع کو کسی وجہ سے ناپسند کرتی ہے تو اسے اس کے لیے کسی مناسب طریقے سے بات کرنی چاہیے تھی۔ شجاع کے لیے رابعہ کی سب سے بڑی بہن کی بیٹی کا رشتہ پوچھے جانے کا ارادہ تھا مگر رابعہ نے منع کر دیا تھا، اس کا کہنا تھا کہ وہ بچی مختلف ماحول کی پلی بڑھی ہے اور اگر رشتہ بھجوا کر ان کی طرف سے انکار ہوا تو شجاع اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لے گا۔

رابعہ کی اس رائے سے کسی کو بھی اتفاق نہ تھا اس لیے انہوں نے رابعہ کو ہی یہ ذمے داری سونپی کہ وہ اپنے طور پر اپنی بہن نادرہ سے بات کر کے اس کی رائے جان لے تو... رابعہ نے بجائے نادرہ کے اپنی ماں سے بات کی اور انہوں نے نادرہ سے اور جواب وہی تھا جو کہ رابعہ پہلے بتا چکی تھی، نادرہ تو اس بات پر بپھر ہی اٹھی تھی کہ اس کی معصوم سی بچی کے لیے ممانی کو اپنا وہ چھٹا ہوا بدمعاش بیٹا مناسب کیسے لگا..... مگر ماں نے سمجھایا کہ بیٹیوں کے لیے دستِ سوال کوئی بھی دراز کر سکتا ہے، رشتہ دینا یا نہ دینا ان کے ماں باپ کی اپنی مرضی ہوتی ہے مگر ایسی بات کہنا کہ کسی کی مجال کیسے ہوئی یا اپنا آپ نظر نہ آیا، درست رویہ نہیں ہے۔

رابعہ کی ماں کا خیال یہ بھی تھا کہ رابعہ اپنے گھر میں سکھی تھی اور ایسا نہ ہو کہ کوئی اور رشتہ طے ہو جو کہ نہ نبھ سکے تو رابعہ کے گھر کے حالات بھی خراب ہوں۔ وہ تو خود اس حق میں نہ تھی اور اس نے نادرہ کا جواب جہانگیر کو بتا دیا تھا مگر جہانگیر کے دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی کہ رابعہ کا اپنا ارادہ ہی نہ تھا اس لیے اس نے بہن کے ساتھ بات ٹھیک سے نہیں کی ہو گی۔

جہانگیر، رابعہ سے بہت محبت کرتا تھا مگر ایک عادت اس میں بری تھی کہ لمحوں میں وہ اس کے بارے میں منفی رائے قائم کر لیتا تھا، اس کی وجہ کا رابعہ کو علم نہ تھا۔ جانے کیوں وہ ذرا ذرا سی بات پر شک میں مبتلا ہو جاتا یا کوئی نہ کوئی ایسا مفروضہ قائم کر لیتا کہ وہ اس کا دل ہی صاف نہ کر پاتی۔ خاموش ہو جاتی اور کچھ وقت گزرتا تو اس کا ذہن خود ہی صاف ہو جاتا تھا یا شاید وہ بھول جاتا تھا کہ اس نے کس طرح اپنے الفاظ سے رابعہ کو تکلیف پہنچائی تھی۔ رابعہ بہت صابر اور سمجھ دار لڑکی تھی، شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھی اور ایسی کسی بات سے دل میں رنجش آتی بھی تو چہرے سے اس کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی۔

"جو آپ کو مناسب لگتا ہے کر لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں، بابو جی اور اماں سے بات کر لیں، جس طرح وہ کہتے ہیں اسی طرح کر لوں گی....." اس نے فرمانبردار بیویوں کی طرح کہا تو جہانگیر کو اپنی چند لمحے قبل کی بات پر پچھتاوا ہوا اور وہ شرمندگی کا اظہار کرنے لگا۔

"کوئی بات نہیں، کون سا ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے یا اس کے بعد نہیں ہوگا!" اس نے مسکرا کر کہا، اسے شوہر کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات دیکھنا بالکل پسند نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ایک عادت کے علاوہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔

"لاؤ میں اسے لٹا دیتا ہوں۔" عمران ماں کی گود میں سو گیا تھا، جہانگیر نے اسے اٹھایا اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور اسے اس کے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ "لیٹ جاؤ تم بھی آرام کر لو!"

"آپ نہیں لیٹیں گے کیا؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"نہیں...... میں ذرا منڈی تک جا رہا ہوں اور یوں بھی دوپہر کی نیند مجھے پسند نہیں!"

"قیلولہ کرنا تو صحت کے لیے اچھا بھی ہے۔" رابعہ نے تاویل دی۔

"ہم لوگ کون سا قیلولہ کا مطلب سمجھتے ہیں، لیٹتے ہیں تو گھنٹوں کی خبر لاتے ہیں...... یوں بھی دن اللہ نے کام کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے کے لیے!"

"مگر آپ تو رات کو بھی آرام نہیں کرتے......" اس نے شرارت سے کہا۔

"تم آرام کرنے ہی نہیں دیتی ہو!" جواباً وہ بھی شوخ ہوئے۔

"اچھا اب آپ جائیں اور ہمیں آرام کرنے دیں!" اس نے انہیں دھکیلا۔

"میں نکلتا ہوں تو تم دروازے اندر سے بند کر لو۔" جہانگیر نے کہا۔

"کوارٹر میں ملازم ہیں نا......"

"ملازم ہیں پھر بھی تم گھر کا خیال رکھا کرو اور خاص طور پر جب تم نے آرام کرنا ہے تو دروازے کھلے نہ چھوڑا کرو...... برے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا، جانے کب کس کی نیت خراب ہو جائے!" وہ کہہ رہا تھا اور رابعہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

اس سے زیادہ کون اس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ کھلے دروازے، بدنیتوں کے لیے آسان ہدف ہوتے ہیں...... مگر وہ یہ بات اپنے شوہر کو کیسے بتا سکتی تھی، اس کا وہی شوہر جو اس بات پر اس سے نالاں رہتا تھا کہ وہ شجاع کو ناپسند کرتی ہے، جو اسے علم ہوتا کہ شجاع کو کس وجہ سے ناپسند کرتی ہے اور اب کیوں اس سے دور بھاگتی ہے تو وہ شاید بھائی کو مارنے پر ہی تل جاتا...... بھائی جو حیوانیت کے اس درجے پر تھا کہ اسے اپنے محترم رشتوں کی پہچان ہی نہ رہی تھی۔

"چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تم جانے کہاں کھوئی ہوئی ہو؟"

"جی......؟" وہ چونکی۔ "میں...... میں یہیں ہوں!"

☆☆☆

"دیکھیں پرویز میاں......" انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے انتباہ کیا۔ "جہاں آرا سب کچھ برداشت کر سکتی ہیں، بدتمیزی اور بدتہذیبی نہیں!"

"میں بدتمیزی کر رہا ہوں نہ بدتہذیبی!" پرویز نے لہجے میں نرمی برقرار رکھی، اسے اندازہ تھا کہ اس کا پالا ایک دبنگ عورت سے پڑا ہے اور اس کے گرگے اسے اس کے گھر سے اٹھا کر باہر بھی پھنکوا سکتے ہیں۔ "پوچھ رہا ہوں کہ قائم علی سے کیا ڈیل ہوئی ہے، آخر میں اس میں برابر کا حصے دار ہوں، اسے یہاں میں ہی پھانس کر لایا تھا!" اس نے دعویٰ کیا۔

"تم قائم علی کو نہیں، ہمارے لیے شامت اور مصیبت کو دعوت دے کر یہاں لائے تھے، جانتے ہو تم کہ

اس نے کیا کیا ہے؟"

"بائی جی...... قائم علی تو ایک عام اور دکھی سا مرد ہے اور ایسے ہی لوگ آسانی سے ہمارا شکار بنتے ہیں مگر تمہاری بیٹی اس غلطی میں برابر کی شریک ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ہی قائم علی کو مجبور کر لیا۔" پرویز نے اسے آئینہ دکھایا جس پر انہیں سر سے لگی اور پاؤں پر بجھی۔

"تم بھی تو ہمارے ہاں آتے رہتے ہو، شکل صورت میں قائم علی سے بڑھ کر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہو، تم پر کیوں نہیں کبھی کسی کا دل آیا؟" انہوں نے چوٹ کی۔

"بائی جی...... یہ میرا کاروبار نہ ہوتا تو شاید ایسا بھی ہو جاتا مگر مچھلی بیچنے والا مچھلی سے محبت کرنے لگے تو روٹی کیا وہ دریا کے کیچڑ سے کھائے گا؟" جوابی چوٹ اس سے بڑھ کر تھی۔

"جو کچھ بھی ہوگا...... لکھت پڑھت کے ساتھ ہوگا، جو کچھ ہمیں ملے گا، اس کا آدھا تمہارا ہوگا!" جہاں آرا نے مزید اس کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا۔

"کوئی ترپ کی چال نہ چلنا بائی جی......" اس نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ "جو کچھ تمہیں ملے گا، اس کا نصف نہیں بلکہ جو کچھ بھی قائم علی سے لیا جائے گا، اس کا نصف...... خواہ وہ الماس کے نام پر ہو، تمہارے یا پھر الماس کے بچے کے نام پر۔" اس نے کہا تو وہ چونکیں، اس کا مطلب ہے کہ اس کی ملاقات قائم علی سے ہو چکی ہے اور وہ اسے ساری تفصیل بتا چکا ہے۔

پرویز کے کمیشن سے ہی تو بچنے کے لیے انہوں نے جائداد بچے کے نام پر لگانے کو کہا تھا...... وہ ان کے اندازے سے زیادہ چالاک نکلا تھا، وہ خود کو دنیا میں سب سے زیادہ گھاگ سمجھتی تھیں مگر اب تک انہوں نے پرویز کو سمجھا ہی نہ تھا، نہ ہی اس سے قبل قائم علی جیسا شکار ہاتھ آیا تھا۔

"ابھی تو یہ بھی علم نہیں کہ لڑکا ہوگا یا کہ لڑکی...... دونوں صورتوں میں حالات مختلف ہوں گے۔ ہمیں لڑکے کو رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی......" انہوں نے بات بدلی۔

"رکھ لینا لڑکا...... کام آئے گا بائی۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

"ہم نے لڑکے کا کیا کرنا ہے؟" انہوں نے نخوت سے کہا۔

"یہ تمہارا دلی تو اب گیا کام سے...... ابھی پیچھے کئی پڑی ہیں تمہاری......"

"کیوں کیا ہوا دلی کو؟" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

"دلی کو عشق ہو گیا ہے بائی...... اور یہ ایسا روگ ہے جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا!" اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا، اسے معلوم تھا کہ اس نے چنگاری چھوڑ دی ہے، اب وہ خود ہی اس سے پوچھ تاچھ کر لے گی۔

"رکو۔" اس نے پکارا۔ "کیا بات کر رہے ہو اور کس کی؟"

"میں نے جو بتانا تھا، بتا دیا...... اب باقی تفصیل اپنے دلی سے پوچھ لینا بائی، میں ذرا جلدی میں ہوں!"

☆☆☆

آنکھ کھولی تو اسے چند لوگوں کے سوا اپنے اردگرد سب مسلمان ہی نظر آنے تھے اور اپنے گاؤں میں انہی کی مسجدیں۔ آٹھ دس دیہات میں بھی کوئی گرجا نہ تھا، ہر اتوار کو ماں باپ کے اصرار پر وہ بائبل کھول کر بیٹھ

جاتی مگر اس کا ایک حرف بھی ... پڑھ اور سمجھ نہ پاتی۔ اسے اپنے محلے سے آنے والی تلاوتِ قرآن کی آوازیں مسحور کر لیتیں، مسجد سے اذان کی آواز پر اس کا دل کھنچتا، اس کا دل چاہتا کہ اپنی مسلمان سہیلیوں کی طرح وہ بھی نماز پڑھے، اللہ کو اپنے دل میں محسوس کرے مگر اس کے اور ان کے بیچ مذہب کی دیوار حائل تھی۔ اس کا گھرانہ گاؤں کے چند عیسائی گھرانوں میں سے ایک تھا۔

''اماں ہم نماز نہیں پڑھ سکتے؟'' وہ معصومیت سے پوچھتی، وہ معصومیت جو اس کی ماں کو دہلا دیتی تھی، اسے اس کی باتوں سے بغاوت کی بو آتی، اپنے مذہب سے نفرت کی۔

''نماز مسلمان پڑھتے ہیں میری اور تم مسلمان نہیں ہو......'' وہ سختی سے کہتی۔

''میں مسلمان کیوں نہیں ہوں؟'' وہ جرح کرتی۔

''کیونکہ تم ایک عیسائی کے گھر پیدا ہوئی ہو۔'' ماں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

''کسی کے گھر پیدا ہونے کا اختیار تو ہمارے پاس نہیں ہوتا مگر اپنے لیے مذہب چننے کا اختیار تو ہمارے پاس ہوتا ہے نا؟'' اس کے اس سوال پر اس کی ماں لرز جاتی۔

''تم یہ باتیں کہاں سے سیکھتی ہو، میں اس کے بعد تمہارا گھر سے نکلنا اور سہیلیوں سے ملنا جلنا بند کر دوں گی!'' ماں نے دھمکی دی مگر اسے اندازہ ہوا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو اسے اپنے مذہب کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی، وہ سب عام گھرانوں کی ایسی لڑکیاں تھیں جن کا مذہب کا علم فقط قرآن پڑھ لینے کی حد تک ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کو قرآن کے شاید ایک لفظ کے ترجمے کا علم نہ ہوتا۔

وہ تھوڑی بہت اردو پڑھ لیتی تھی اور اس کا ذریعہ بائبل کا اردو میں پڑھنا یا پھر سنیتا آنٹی کی لائی ہوئی وہ دلچسپ کتابیں ہوتی تھیں جن میں خوب صورت اور باتصویر کہانیاں ہوتیں، پریوں کی اور شہزادیوں کی۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر وہ خود کو ان کہانیوں کا ایک کردار محسوس کرتی۔ مگر اسے یہ لگتا تھا کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوئی ہے اور جس ماحول میں رہ رہی تھی وہ اس کے لیے نہ تھا...... وہ کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

اسی لیے تو اس کی ماں نے فیصلہ کیا کہ اسے اس ماحول سے نکالے، گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی شاید اسی لیے تو وہ ان سے متاثر تھی۔

''یہاں سے نکلے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس کی ماں نے اس کے باپ کو مشورہ دیا تھا۔

''مگر ہماری بیٹی ہے ہم اس کو کہاں بھجوا سکتے ہیں؟ یا تو ہم خود بھی یہاں سے چلے جائیں!'' اس نے حیرت سے کہا تھا۔

''تمہارا یہاں جما جمایا کام ہے، اسے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟'' اس نے فوراً نفی کی۔ ''شہر میں ہم کہاں نئی جگہ پر جا کر اتنی جلدی سیٹ ہو سکتے ہیں...... اسے بھجوا دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ ٹھیک ہو جائے گی تو اسے واپس لے آئیں گے!''

''مگر ہم اسے کہاں بھجوا سکتے ہیں اور کیسے؟'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''سنیتا کے ہاں کوئی اولاد نہیں، وہ دونوں میاں بیوی اسے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں، ان کے ساتھ رہ لے گی جب تک ہم خود شہر نہیں جاتے...... کہہ رہی ہوں ابھی وقت ہے اسے سنبھال لیں ورنہ یہ مذہب تبدیل کر

لے گی اور ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گی، اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں، ان کے لیے بھی مسائل ہوں گے۔'' بات تو اس کے باپ کے دل میں نہیں بیٹھی مگر اسے سنیتا آنٹی کے ساتھ شہر بھجوا دیا گیا اور شہر آ کر سب سے پہلے آنٹی نے اس کا اسکول میں داخلہ کروایا اور اس کے لیے گھر پر ٹیوٹر کا بندوبست کر دیا جس نے اسے محنت سے پڑھایا اور وہ جو عمر کے حساب سے اپنی جماعت میں کافی بڑی تھی، سال میں دو دو دفعہ امتحان دیتے ہوئے جلد ہی اسکول سے کالج میں جا پہنچی۔

سنیتا آنٹی کے ہاں ماحول بہت کھلا ڈلا تھا، پارٹیاں اور محفلیں ان کی زندگی کا اہم حصہ تھیں، ان پارٹیوں میں وہ خود کو ایک فالتو چیز کی طرح محسوس کرتی۔ آنٹی کے بے حد اصرار پر اسے ان پارٹیوں میں شرکت سے الجھن ہوتی، اس کا دل ہی نہ چاہتا کہ وہ ان مخلوط محفلوں میں تتلیوں کی طرح چہکتی پھرے۔ بی اے کا امتحان دیا تو وہ ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس دل میں جڑ پکڑتا چلا گیا کہ اسے اپنے مذہب سے نفرت اور اسلام سے محبت کے باعث دیس نکالے کی سزا ملی تھی۔ اس کے دل میں یہ محبت گھٹنے کے بجائے بڑھتی چلی گئی اور اتنی ہی اپنے ماں باپ کے خلاف نفرت...... وہ تو اس کی محبت میں کھنچے اسے ملنے کو چلے آتے تھے مگر اسے ان کی موجودگی سے الجھن ہوتی اور وہ ان سے بے رخی سے ملتی۔ سنیتا آنٹی ہنس کر اس کے ماں باپ کو کہتیں کہ اب وہ ان کی بیٹی ہے اس لیے وہ اس سے محبت کی توقع نہ کریں مگر اس کے پاس اپنے گھر والوں سے نفرت کے کئی جواز تھے۔

اسے ڈیوڈ انکل کی نظریں بری لگتیں جن میں پاکیزگی نہ تھی، ایسی پاکیزگی جو اس باپ نما شخص کی نظر میں ہونی چاہیے تھی مگر وہ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے دلوں اور گھر سے دھتکاری ہوئی ایک معصوم لڑکی تھی جس کی خوب صورتی میں سادگی تھی اور وہ اپنے حسن سے غافل بھی تھی اور اسی بات نے سنیتا آنٹی کی محفلوں کی جان...... پی۔ کے نامی اس نوجوان کا دل لوٹ لیا تھا۔

تنہائی میں اس نے کبھی یسوع مسیح کو مدد کے لیے نہیں پکارا ہمیشہ اللہ سے سرگوشیوں میں بات کرتی۔ وہ چوری چھپے اسلام کے بارے میں پڑھتی اور چاہتی تھی کہ کوئی ایسا ملے جو اس کی مدد کرے اور وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے۔ اکیلے اتنا بڑا فیصلہ کرنا ممکن ہی نہ تھا اس کے لیے اسے کسی کی مدد درکار تھی اور وہ مدد اسے سائرہ آپی کی صورت میں مل گئی تھی...... وہ تو شکر ادا کرتی تھی کہ اس کے دل میں نوکری کا خیال آیا اور سنیتا آنٹی کی لاکھ مخالفت کے باوجود بھی اس نے ایک اسکول میں ملازمت کی درخواست دے دی جہاں اس کی ملاقات سائرہ آپی سے ہونا تھی اور انہوں نے اس کی پیاس بجھانا تھی۔

نہ صرف انہوں نے اس کو معلوماتی کتب دیں بلکہ یہ بھی سمجھایا کہ یہ فیصلہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں واپسی کے راستے بند ہوں...... وہ جتنا جانتی گئی...... اسے اتنا ہی یقین ہو گیا کہ وہ دل سے ہمیشہ سے مسلمان تھی اور ایک روز وہ سائرہ آپی کے ساتھ جا کر کلمہ گو مسلمان بن گئی...... اسے نام تبدیل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ وہ پہلے سے مریم تھی۔

اس راز کو اسے اس وقت تک راز رکھنا تھا جب تک ... وہ اس قابل نہ ہو جاتی کہ سنیتا آنٹی کو بتاتی کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے تو وہ اسے گھر سے نکال دیں اور وہ سڑکوں پر نہ رُل جائے۔

اگرچہ سائرہ باجی نے کہا تھا کہ ان کا گھر حاضر ہے...... مگر وہ انہیں بھی کسی آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسے ماں باپ کی اتنی پروا نہ تھی، ان کی طرف سے اس کا دل باغی تھا کہ انہوں نے اس کی پروا کب کی تھی...... مگر اسے فکر تھی ڈیوڈ انکل جیسے کینہ پرور انسان کی طرف سے جو سائرہ آپی کا جینا محال کر سکتے تھے۔

"میں آؤں گی سائرہ آپی آپ کی طرف...... ضرور آؤں گی اگر کوئی اور چارہ نہ رہا تو مگر فی الحال میں آپ کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی کہ آپ میری محسن ہیں اور میں آپ کے احسان کے بدلے آپ کو کیونکر آزمائش میں مبتلا کر دوں؟" اس نے ان سے پیار سے کہا تھا۔

"تم میری بیٹی جیسی ہو، ثابت قدم رہنا...... اور مجھے تمہارے ساتھ کسی سزا کا حقدار ٹھہرنا پڑے تو میں اسے اپنے لیے اعزاز سمجھوں گی......" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

☆☆☆

"سلام دائی جی۔" اس نے جاہلانہ انداز میں سلام کیا تو وہ تپ گئیں۔

"تمہیں کسی نے سلام کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کیا؟" وہ غصے سے بولیں۔ "ڈھنگ سے السلام علیکم کہو!"

"سلاما لیکم جی!" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"وعلیکم السلام۔" کہتے ہوئے ان کے لہجے میں نرمی در کر آئی تھی۔ "تم حویلی کی ملازماؤں کو ادب آداب کون سکھائے اور وہ بھی تم جیسی......"

"کیا مطلب جی میرے جیسی؟" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"چل زیادہ فالتو باتیں نہ کر میرے ساتھ...... بتا کیوں آئی ہے؟" انہوں نے اس سے سوال کیا۔

"وہ جی۔" وہ ہکلا گئی، وہ تو سمجھی تھی کہ زرتاج اکیلی مل جائے گی تو اس سے بات کرنا آسان ہوگا، اس جیسی ساری ملازماؤں کے اندرونی حالات معراج کو معلوم تھے اور وہ ان سے بہت خار کھاتی تھی۔

"بات جلدی کر لڑکی، اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس، مجھے جانا ہے ابھی کہیں، کسی کا کوئی مسئلہ ہے!" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"آپ جائیں دائی جی...... میں زرتاج باجی کو پوچھ لوں گی۔" اس نے مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہوتے دیکھا تو فوراً بولی۔

"زرتاج کو بھی میرے ساتھ ہی جانا ہے تو اپنا مسئلہ مجھے بتا، زرتاج کو ابھی بہت سی چیزوں کے بارے میں علم بھی نہیں اور پھر تم نہ جانے کس قسم کے بے ہودہ کام کے لیے آئی ہوگی......" انہوں نے یہ کہہ کر اس کی امید کو غارت کر دیا تھا۔

"وہ دائی جی۔" وہ جلدی میں جھوٹی سچی کہانی بنا کر پیش کرنے لگی، گھاک تو تھی ہی مگر معراج جیسی عورت کو الجھانا اتنا آسان نہ تھا۔

"جس کام کے لیے آئی ہے، وہ بتا!" ان کا کہنا تھا کہ اس کی ہڈیوں میں گرم موسم میں بھی سردی کی لہر دوڑ گئی۔

"یونہی آ گئی تھی جی!" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہاں سے گزر رہی تھی کہ دل کیا زرتاج باجی کو بھی دیکھتی چلوں!"

"زرتاج کیا چڑیا گھر کا جانور ہے جسے دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا تجھے اور یہ کون سا راستہ ہے جہاں سے تو یونہی گزر رہی تھی؟" انہوں نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

"مم...... میں۔" وہ ہکلائی۔ "میں کلثوم کی طرف جا رہی تھی، چوہدرانی جی کا پیغام لے کر کہ وہ جب تک ٹھیک نہ ہو جائے، کام پر نہ آئے۔" اسے بہانہ سوجھ ہی گیا، معراج بی بی کو اس بات پر کوئی شک نہ ہوا۔ اگرچہ یہ بات شکیلہ چوہدرانی کی فطرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی اور اسے بتایا کہ انہیں جانے کی جلدی تھی۔

"جی میں جاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے تم نے چوہدری اکبر علی مجھے۔"

☆☆☆

"سہیل بیٹا! تمہیں کالج سے چھٹی کون سے دن مل سکتی ہے؟"

"چھٹی؟" اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ "اتوار کو ظاہر ہے!"

"اتوار کے علاوہ کسی دن کی بات کر رہی ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے تمہیں ساتھ لے کر کہیں جانا ہے، اتوار کے دن ممکن نہیں ہوگا۔"

"کہاں جانا ہے امی؟" اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

"مجھے؟" اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ "کیوں، کس ڈاکٹر کے پاس......؟"

"تم کسی دن چھٹی تو لو بیٹا، میں تمہیں لے کر جاؤں گی تو تمہیں علم ہو جائے گا کہ کیوں اور کہاں جانا ہے!"

"مگر امی۔" اس نے پھر بحث کی۔ "مجھے کوئی بیماری لاحق نہیں ہے تو پھر میں کیوں ڈاکٹر کے پاس جاؤں؟"

"بے مقصد کی بحث ٹھیک نہیں ہوتی بیٹا، ہو سکتا ہے کہ میری کوئی دوست ڈاکٹر ہو اور میں تمہیں اس سے ملوانا چاہتی ہوں......"

"آپ کی دوست ڈاکٹر ہے تو آپ اسے خود مل لیں، میں نے کیا کرنا ہے آپ کی سہیلی سے مل کر؟" اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

"ماں ہوں میں تمہاری بیٹا اور اگر میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ میری سہیلی کے گھر چلو تو تم اتنی حجت کیوں کر رہے ہو؟" وہ چڑ کر بولیں۔

"حجت تو آپ کر رہی ہیں بے مقصد۔" وہ جھنجلایا۔ "جب میں نہیں چاہتا آپ کی کسی سہیلی سے ملنا تو کیوں اصرار کر رہی ہیں آپ...... میں نہیں ملنا چاہتا کسی سے بھی، خود سے بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ نیناں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اٹھیں اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئیں، اس کا گھنے بالوں والا سر سہلانے لگیں۔

"کیا بات ہے میرے بیٹے، اپنی ماں کو تو بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے، کیا بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "میں کسی کو کیا بتاؤں، مجھے خود علم نہیں کہ

میرا مسئلہ کیا ہے۔'' وہ آنسوؤں سے رونے لگا، وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں...... سوچ رہی تھیں، یقیناً ہمارے اختلافات کی وجہ سے اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے مگر میں کیا کروں، میں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں...... اپنی ساری زندگی اس بچے کی خاطر میں نے اس شخص کے ساتھ گزار دی ہے جس نے...... انہوں نے درد سے آنکھیں میچ لیں، پرانی اور تلخ یادیں ان کے پردۂ دماغ پر اسی طرح کندہ تھیں جیسے کوئی تازہ زخم......

☆☆☆

''نینا۔'' انہوں نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹا۔ ''ہر وقت مصروف رہتی ہو اور مجھے وقت ہی نہیں دیتی ہو!''

''اسلم...... آپ کا بس چلے تو مجھے اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہ دیں، آپ کا تو رومانوی دور ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا...... اب ہمارا ایک بچہ بھی ہے، اس کے سامنے کچھ خیال کیا کریں!'' انہوں نے مسکرا کر ان کے شکوے کا جواب دیا۔

''ارے بھئی...... ابھی تو وہ اتنا ننھا سا ہے، اس بے چارے کو کیا علم کہ اس کے باپ کے دل کے کیا جذبات ہیں اور اس کی ماں ان کو کس طرح رد کر دیتی ہے......''

''یوں تو نہ کہیں اسلم، میں ذرا فطرتاً اس طرح کی ہوں کہ آپ کی طرح کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی اور ذرا......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''ذرا کیا؟'' انہوں نے شرارت سے کہا۔

''آپ جانتے ہیں اسلم میں ذرا محتاط انداز پسند کرتی ہوں، ورنہ میری محبت کسی پیمانے سے تولیں تو آپ سے زیادہ ہی نکلے گی!''

''ارے اس سے زیادہ خوب صورت اظہارِ محبت میں نے آج تک کسی کے منہ سے نہیں سنا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسے اور انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹا۔

''جگا دیا نا اس کو۔'' سہیل کے رونے کی آواز سے انہوں نے اپنا وجود شوہر کی مضبوط گرفت سے چھڑوایا اور بچے کی طرف لپکیں۔

''ایک بچے نے تمہاری ساری توجہ مجھ سے چھین لی ہے تو مزید بچے آ کر تو مجھے میرے حق سے بالکل ہی محروم کر دیں گے۔'' مصنوعی ناراضی سے منہ بنا کر اسلم نے کہا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں اسلم۔'' وہ یوں شرما گئیں جیسے ان کی کل ہی شادی ہوئی تھی، ایسا ان کی فطرت میں تھا۔ وہ اسلم جیسی کھلی ڈلی طبیعت نہ رکھتی تھیں اور اس کی شدتوں کے جواب میں بھی اپنا مخصوص انداز قائم رکھتی تھیں اور اب تو بالخصوص سہیل کے سامنے...... حالانکہ وہ چند ماہ کا تھا، وہ اتنی محتاط رہتی تھیں جیسے کہ وہ سب کچھ سمجھتا ہو۔ اس کی شرارتی آنکھوں سے یہی محسوس ہوتا تھا۔

''اب تک ہے میرے ہاتھوں میں تیرے بالوں کی مہک بسی۔'' اسلم نے رومانوی انداز میں کہا تو وہ ہنس دی۔

''یہ میرے بالوں کی نہیں بلکہ اس صابن کی خوش بو ہے جس سے میں نے بال دھوئے تھے۔'' اس نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

''نینا...... سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا...... اتنی غیر رومانوی بات کی کہ میرا منہ تو کیا حلق بھی کڑوا ہو گیا ہے!'' اس نے دل ٹوٹنے کی اداکاری کی۔

''آ گئی جناب۔'' نینا سہیل کو واپس پنگھوڑے میں لٹا کر اسلم کے پاس آ گئی۔ ''اب فرمائیں، کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''اب کچھ کہنے کا نہیں بلکہ عمل کا وقت ہے میری جان۔'' اس نے ہنس کر کہا اور نینا کی ہلکی سی ہنسی کی آواز ماحول میں جلترنگ بجانے لگی۔

''تمہارا یہ مہکا مہکا وجود مجھے بہت بھاتا ہے نینا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''مجھے تمہاری طرح صاف ستھری اور سجی سنوری عورتیں اچھی لگتی ہیں، تم ہمیشہ یونہی رہنا...... کبھی نہ بدلنا!''

''کیوں بدلوں گی میں اسلم...... میں ہمیشہ ایسی ہی رہوں گی، اگر تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہتے رہو گے تو!''

''میں بھی ہمیشہ تمہیں اسی طرح چاہتا رہوں گا نینا...... میری جان!'' اس کی محبت میں ایسی شدت تھی کہ نینا بسا اوقات گھبرا جاتی، کبھی ڈر جاتی...... کوئی کب تک کسی کو ہمیشہ اسی طرح چاہ سکتا ہے، پیار تو پانی کے جوار بھاٹے کی طرح ہوتا ہے...... زندگی میں کبھی کسی جذبے میں یکسانیت نہیں رہتی۔ اسی طرح محبت کی شدت میں بھی اتار چڑھاؤ آنا قدرتی بات ہے تو کیا اسلم کی محبت ہمیشہ ایک جیسی رہ سکتی ہے، کیا وہ اسلم کو ہمیشہ اسی طرح چاہ سکتی ہے؟

فیض نے کہا تھا اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا...... تو کیا وہ زندگی میں اسی طرح رہے گی، اسے اسلم کے علاوہ کوئی مصروفیت نہ ہوگی...... وہ تو ابھی خود کو سہیل کی طرف جھکا ہوا محسوس کرتی تھی، مزید بچے ہوں گے تو انہیں بھی اس کی توجہ چاہیے ہوگی پھر وہ اسلم کی محبت کی شدت کا جواب کیسے دے سکے گی؟

☆☆☆

''یہ اتنا پیارا سا چہرہ کہاں چھپا کر رکھا تھا آپ نے ابھی تک میڈم سنیتا؟'' اس نے نثار ہوتی نظروں سے مریم کو دیکھ کر کہا تھا۔

''پی۔ کے!'' وہ مسکرائیں۔ ''بیٹی ہے میری!''

''نہیں نہیں...... مان ہی نہیں سکتا میں، آپ کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ سے زیادہ آپ سے چند برس چھوٹی آپ کی بہن کہیں تو مان لیتا ہوں!'' اس نے کاروباری خوشامد سے کہا۔

''بہت شرارتی ہو تم۔'' ایسی تعریف کس کو بھلی نہیں لگتی حالانکہ عمر میں سنیتا مریم سے پندرہ سولہ برس بڑی تھیں مگر اس وقت پی۔ کے الفاظ نے انہیں شیشے میں اتار لیا تھا اور پی۔ کے جانتا تھا کہ وہی وقت تھا چوٹ کا۔

''ملوا تو دیں، تعارف کروا دیں اس ناچیز کا اپنی......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''بھانجی ہے میری۔'' انہوں نے کہا۔ ''آؤ ملواؤں تمہیں!'' اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس طرف بڑھیں جہاں مریم سب سے الگ تھلگ ایک نشست سنبھال کر بیٹھی تھی، سنیتا آنٹی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بیٹھو بھئی، میں ایک خاص مہمان کو تم سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔'' وہ واپس بیٹھ گئی۔ ''ان سے ملو، یہ ہیں مسٹر پی۔ کے...... اور پی۔ کے یہ ہے میری بھانجی...... مریم!''

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" پی۔کے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، جسے اس نے یوں نظر انداز کر دیا جیسے اس نے دیکھا بھی نہ ہو۔

"ہیلو۔" اس نے مختصراً کہا۔

"کیا آپ نہیں کہیں گی کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہوئی؟" پی۔کے نے شرارتی انداز سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں جھوٹ نہیں بولتی...... اور مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ آپ ہیں کون، مجھے ایسی باتوں پر خوشی کیوں کر ہو سکتی ہے؟" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ آپ میرے بارے میں جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے خوش فہمی سے کہا۔

"ارے نہیں...... ہرگز نہیں!" اس نے فوراً تردید کی۔ "صرف یہ بتادیں کہ پیکے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" اس کے پی۔کے کو پیکے کہنے کے انداز سے سنیتا اور پی۔کے دونوں کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا، کئی لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

"پرویز خان نام ہے میرا...... پی۔کے تو آپ کی آنٹی جیسے مہربانوں نے بنا دیا ہے ناچیز کو......" اس نے وضاحت کی، اب...... ہلکی سی مسکراہٹ مریم کے لبوں پر آکر دم توڑ گئی، اسے اپنا "پیکے" کہنے کا انداز انتہائی بے وقوفانہ لگا تھا۔

"معذرت چاہتی ہوں!" وہ اٹھی۔

"کوئی بات نہیں، مجھے خوشی ہوئی۔"

"کس بات کی؟" اس نے مڑ کر پوچھا تھا۔

"آپ کسی وجہ سے مسکرائیں تو اور مجھے اندازہ ہوا کہ آپ مسکراتے ہوئے بھی اتنی ہی اچھی لگتی ہیں جتنی کھوئے کھوئے انداز میں۔" وہ اس کی تعریف پر خوش نہیں ہوئی تھی، اسے معلوم تھا کہ ڈیڈ انکل کے کاروباری رابطے ایسے لوگوں سے ہی ہیں جن کا کام ہی خوشامد کر کے اپنا کام نکلوانا ہوتا ہے۔

☆☆☆

"ایسی گندی گندی ملازمائیں گھر میں رکھ چھوڑی ہیں تم نے نینا!" انہوں نے نینا سے جھنجلا کر کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ مجھے گندگی سے کتنی نفرت ہے......"

"کیا کروں اسلم، کام والی ساری اسی طرح کی ہوتی ہیں اور ہمیں ان کی صفائی یا گندگی سے کیا لینا، انہوں نے گھر کی صفائی کرنا ہوتی ہے، کون سا ہمارے برتنوں اور کھانے پینے کی اشیا کو ہاتھ لگاتی ہیں؟"

"تم کر سکتی ہو گی ان کو برداشت، میں نہیں کر سکتا۔" اس نے پھر کہا۔ "مجھے تو یہ سوچ کر ہی الجھن ہوتی ہے کہ کہیں وہ غسل خانے کی صفائی کرتے ہوئے میرے تولیے کو نہ چھوتی ہو، میرے کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاتی ہو......"

"خدا کے لیے اسلم...... اتنا وہم اچھا ہے نہ کسی سے اتنی نفرت...... وہ بے چاریاں اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں دن بھر محنت مزدوری کرتی ہیں، ان کے پاس اگر صاف ستھرے لباس ہوں یا نہانے دھونے کا وقت تو وہ کب گندا رہنا پسند کرتی ہوں گی!" نینا نے اسلم کو اللہ کے قہر سے ڈرایا۔

"کپڑے گندے بھی ہوں تو انسان خود کو تو صاف رکھ سکتا ہے نا...... نینا سچ مانو اگر میں کسی کمرے میں اس کے پاس سے گزر جاؤں تو اس کے وجود سے اٹھنے والی بدبو سے میرا سر دکھنے لگتا ہے۔" اسلم نے سر تھام کر کہا۔

"کیا ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئی ہے؟" نینا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں یہاں تو ابھی نہیں آئی مگر لگتا ہے کہ ساتھ والے کمرے کی صفائی کر رہی ہے اور اس کی بو یہاں تک آ رہی ہے......" اس کے لہجے میں اتنی حقارت تھی کہ نینا ڈر گئی، جانے اللہ تعالیٰ انسان کو یوں کسی دوسرے انسان سے نفرت کرنے پر کیسی سزا دے، سبھی اس کے بنائے ہوئے انسان ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ وہ ثریا کو سمجھائے گی کہ اپنی صفائی ستھرائی کا دھیان رکھا کرے اور اپنے کوئی پرانے کپڑے بھی اس کو دے گی کہ وہ پہن لیا کرے، کم از کم ان کے گھر پر کام کے لیے آتے ہوئے۔

"اچھا چلتی ہوں، میرا اسکول کا وقت ہو رہا ہے......" اس نے تیار ہو کر کہا تھا۔

"سہیل کو تم جاتے ہوئے اماں کی طرف چھوڑ دو گی؟" اسلم نے پوچھا تھا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے، آپ ہی دفتر جاتے ہوئے چھوڑ دیں، یوں بھی میں سائرہ کے ساتھ جاتی ہوں تو ہر روز اسے یہ کہنا اچھا نہیں لگتا کہ اماں کے گھر کی طرف سے ہوتے ہوئے چلو...... کبھی کبھار انسان مجبوری سے ایسا کر لے تو اور بات ہے!"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اسلم نے مختصراً کہا۔

"اللہ حافظ۔" اس نے لیٹے ہوئے سہیل کے گال پر پیار کیا اور نکل آئی۔ سہیل کی پیدائش کے بعد چھ ماہ کی چھٹی لی تھی اس نے اور اب اسے اسکول جانا ہی تھا۔

"اللہ حافظ۔" باہر کے دروازے کے پاس پہنچی تھی جب اسے اسلم کی آواز آئی اور وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"کیا بات ہے، کس بات پر اتنا مسکرایا جا رہا ہے؟" سائرہ نے اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔

"یونہی......" اس نے ڈرائیور کی موجودگی کے باعث مختصراً کہا تھا۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" سائرہ نے ہولے سے کہا۔

"ہاں کچھ تو ہے۔" وہ بھی جواباً مسکرائی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی گڑ گڑ گڑ کی عجیب سی آواز آنے لگی اور پھر چلتی ہوئی گاڑی جھٹکے لے لے کر رک گئی۔

"کیا ہوا اشرف؟" سائرہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں جی، دیکھتا ہوں اٹھ کر......" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، سڑک پر دور دور تک کوئی اور گاڑی نہ تھی کیونکہ شہر میں گنتی کی چند گاڑیاں تھیں۔

"دیر ہو جائے گی اور خوب ڈانٹ پڑے گی۔" سائرہ نے کہا۔

"حاضری کا رجسٹر بھی اٹھا لیا جائے گا اور ہم دونوں کی آج کی غیر حاضری لگ جائے گی......" نینا نے کہا۔

"اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ہم اسکول جائیں ہی نا۔" سائرہ نے کہا۔ "جب جا کر سارا دن کھپائی بھی کرنی ہے اور غیر حاضر بھی ہونا ہے کاغذات میں تو بہتر ہے کہ گھر واپس لوٹ چلیں۔"

"یہی ٹھیک ہے۔" نینا نے فوراً تائید کی۔

''اشرف۔'' سائرہ نے اپنی طرف کا شیشہ اتار کر ڈرائیور کو آواز دی۔ ''کچھ سمجھ میں آیا کہ کیا مسئلہ ہے؟''

''مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بیگم صاحبہ۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''گاڑی لاک کر کے کسی مستری کو یہیں لانا پڑے گا کیونکہ گاڑی تو ایک انچ بھی نہیں ہل رہی۔ میں آپ کے لیے تانگا روکتا ہوں تاکہ آپ لوگ تو اسکول پہنچ سکیں!''

''اسکول کے لیے نہیں، گھر کے لیے تانگا روکو...... اب ہم اسکول نہیں جا رہے!'' ڈرائیور سے کہہ کر اس نے شیشہ چڑھا دیا۔ ''گھر چلتے ہیں، میری طرف چل کر اچھی سی چائے پیتے ہیں......''

''ارے نہیں سائرہ...... میری طرف چلتے ہیں، اس سے پہلے کہ اسلم، سہیل کو لے کر نکل جائیں، میری طرف ہی چائے پیتے ہیں۔''

''چلو پھر چائے ادھار کر لیتے ہیں، آج میں بھی اپنی سسرال کا چکر لگا لوں، کافی عرصے سے جانا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ میری مصروفیت کا گلہ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈرائیور نے تانگا روک لیا تھا اور وہ دونوں اپنے اپنے پرس سنبھالتی نکل آئیں۔

☆☆☆

سنیتا کوئی بچی تو نہ تھیں جو پی۔ کے کی مریم پر پڑنے والی نظر کے مفہوم کو نہ سمجھتیں، وہ جانتی تھیں کہ مریم کو مہرے کے طور پر استعمال کر کے ڈیوڈ کے کاروبار کو زمین سے آسمان تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ ڈیوڈ سے بھی اس نے اس کے بارے میں بات کی۔ ڈیوڈ اور سنیتا کو علم نہ تھا کہ پی۔ کے کا کاروبار کیا ہے، انہیں صرف یہ اندازہ تھا کہ وہ کوئی موٹی آسامی ہے...... اس کا لباس، اس کے قیمتی پرفیوم، کلائی پر بیش قیمت گھڑی، ہونٹوں میں دبے مہنگے ترین برانڈ کے سگریٹ...... اس کے وجود کی ایک ظاہری قیمت بتاتے تھے جس سے ہر کوئی متاثر ہو سکتا تھا۔

وہ ان کی ہر پارٹی اور محفل کی جان ہوتا تھا، لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں اور وہ ان سے کتراتا تھا۔ سنیتا کے پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا، وجہ معلوم کرنے پر اس نے ہنس کر کہا تھا کہ اسے کوئی ملی ہی نہیں اور اس جیسوں سے کون شادی کرتا ہے...... وہ جانتی تھیں کہ وہ کسرِ نفسی سے کام لے رہا تھا۔

''یوں کیوں کہا تم نے پی۔ کے؟'' سنیتا نے پوچھا تھا۔ ''تم تو ایسے ہو کہ تم سے کوئی بھی لڑکی بغیر سوچے سمجھے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گی۔''

''کوئی بھی لڑکی......؟'' اس نے حیرت کی شاندار اداکاری کی۔

''سچ کہہ رہی ہوں...... کوئی بھی لڑکی!''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا سنیتا؟'' اس نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی۔

''شرم کرو پی۔ کے میں شادی شدہ ہوں۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا ورنہ تو اس کے دل کی کئی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔ ''لیکن اگر نہ ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا......'' اس نے پوری ایمان داری سے کہا تھا۔ پی۔ کے نے دل میں اس لال لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں اور چہرے پر عمر کے تاثرات کو میک اپ کی تہوں میں چھپاتی عورت کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔

''نوازش ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' اس نے مصنوعی احسان مندی کا مظاہرہ کیا اور سنیتا...... اور بھی بچھ گئی۔

''یوں بھی میرے اور تمہارے درمیان تو مذہب کی مضبوط دیوار بھی حائل ہے پی۔ کے......'' انہوں نے اس انداز سے کہا جیسے پی۔ کے تو ان سے شادی کرنے کے لیے مرا ہی جا رہا ہو۔

''یہی دیوار تو میرے اور مریم کے درمیان بھی حائل ہو گی۔'' پی۔ کے نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''وہ بھی تو اس بوڑھی چڑیل کی سگی بھانجی ہے!''

☆☆☆

''آ جائیں سائرہ...... ایک کپ چائے تو ہو جائے!'' نینا نے اپنے دروازے کے پاس تانگے سے اترتے ہوئے کہا، اس سے قبل کرایے میں حصہ دینے پر سائرہ سے بحث ہو چکی تھی اور وہ ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔

''چائے ادھار رہی۔ پھر کبھی سہی۔'' سائرہ کے جاتے ہی وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر کی طرف چلی، دروازہ جس طرح وہ بھیڑ کر گئی تھی، اسی طرح تھا۔ وہ اسلم کو خوشگوار سرپرائز دینا چاہ رہی تھی، اسے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوتا...... مگر اسے کیا معلوم کہ اس کی زندگی کا بدترین سرپرائز اس کا منتظر تھا۔

اس کے کمرے میں حیوانیت کا کھیل جاری تھا...... گندی عورتوں سے نفرت کرنے والا اسی گندگی میں لتھڑا ہوا...... اور ننھا سا سہیل...... باپ کے تماشے کو گھور گھور کر دیکھتا ہوا اور خوش ہو کر تالیاں بجاتا ہوا...... نینا کے دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا...... اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا شوہر...... وہ تو خیر چونکے ہی مگر نینا نے فوراً سہیل کو چیل کی طرح جھپٹ کر اٹھایا اور اس کمرے سے یوں نکلی جیسے جسم سے جان نکلتی ہے کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

اسلم ٹپٹایا اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ نینا کے سامنے کھڑا معافی مانگ رہا تھا تو اس کا جی چاہا کہ اس کے منہ پر تھوک دے۔ وہ اس کا گھناؤنا چہرہ دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی، معافی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

''میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ تم......'' اس نے چلا کر کہا۔

''نینا...... نینا ڈیر!'' اسلم نے اپنی طرف سے اسے پیار سے مائل کرنے کی کوشش کی۔

''خبردار جو تم نے مجھے ڈیر کہا تو......'' وہ دھاڑی۔ ''ڈیر وہی ہے تمہاری...... ٹریسا! جاؤ اور مرو اسی کے ساتھ!''

''اے...... ذرا زبان سنبھال کر۔'' اسلم سینہ زوری پر اتر آیا۔ ''شوہر ہوں میں تمہارا......''

''اس سے بڑھ کر میری بدقسمتی کیا ہو گی کہ تم میرے شوہر ہو، کاش یہ منظر دیکھنے سے پہلے میں مر گئی ہوتی یا تم!''

''دماغ چل گیا ہے کیا تمہارا؟'' اس نے ہاتھ بلند کیا مگر نینا نے اسے اس نظر سے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کٹے ہوئے تنے کی طرح نیچے گر گیا۔

''ہوش میں تو تم نہیں ہو...... گندی شراب کا نشہ چڑھا ہوا ہے تمہیں۔'' نینا نے سہیل کو ساتھ لگایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی، اندر سے دروازہ اس نے بند کر لیا۔

''دروازہ کھولو نینا...... میری بات سنو!''

''ختم ہو گئیں میرے اور تمہارے درمیان کی باتیں۔'' نینا نے دل پر پتھر رکھ کر کہا، اس کی آنکھیں لبریز ہو رہی تھیں مگر وہ اپنی کمزوری اسلم پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے اور کیسے

کرچیوں میں ٹوٹتا ہے، اس کا اندازہ اسے ہو رہا تھا۔ اسلم کی نظر بازی کی عادت تو تھی مگر اسے نینا کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی، مرد کی فطرت سمجھ کر نظر انداز کرتی تھی مگر اب تو اس نے حد ہی ختم کر دی تھی۔

''نینا پلیز۔'' اس نے بار ہا دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ دروازہ نہ کھلا اور اس کے بعد ان کے درمیان یہ خلیج کبھی ختم نہ ہو سکی..... نینا کو اس بات کی پروا نہ تھی کہ وہ اسے طلاق دے دے گا کیونکہ اس کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ صرف اس کے بچے کا باپ تھا اور اس کے علاوہ ان دونوں کے بیچ کوئی رشتہ نہ تھا۔ ان کے درمیان سہیل کے علاوہ کسی موضوع پر بات نہ ہوتی تھی۔ اسلم نے کتنا ہی عرصہ نینا کے دل کے بند در پر دستک دینے کی کوشش کی مگر بالآخر وہ بھی تھک گیا اور اس کی زندگی میں رنگینیوں کی کمی تو پہلے بھی نہ تھی، نینا کی مستقل ناراضی نے اس پر کوئی فرق نہ ڈالا اور عمر کے کئی سال انہوں نے ایک چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح گزار دیے تھے۔

اب نینا کو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اسلم سے علیحدگی اختیار کر لیتی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر لیتی تو شاید اسلم جیسے باپ کے زیر عتاب رہ کر آ جانے والی کجیاں سہیل کی شخصیت کا حصہ نہ بنتیں..... کیا کھویا اور کیا پایا..... حساب کرتی تو اس کے کھاتے میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

☆☆☆

''تم تو شادی شدہ ہو گئی ہو سنیتا اس لیے کوئی اسکوپ نہیں..... ورنہ میں تمہیں شادی سے پہلے ملتا تو یقین کرو..... کوئی دیوار ہمارے درمیان حائل نہ ہوتی، عمر کی نہ مذہب کی۔'' پی۔ کے کو عورت کو شیشے میں اتارنے کا فن آتا تھا، خواہ وہ عورت سنیتا ہو یا کوئی اور... مریم اسے مشکل ہدف نظر آئی تھی اس لیے اس نے سنیتا کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ سنیتا نے ہی بتایا تھا کہ وہ مختلف مزاج کی لڑکی تھی اور جلد کسی سے گھلتی ملتی نہ تھی۔

''ایک بار قابو آ جائے تو گھل مل جائے گی..... کچھ عرصہ ساتھ گزارنے کے لیے لڑکی بری نہیں، عیسائی ہے تو کیا ہوا، میں کون سا اس سے شادی کر رہا ہوں، اپنا تو اصول ہے کہ شراب جو بھی ملے اچھی ہونی چاہیے، دیسی یا بدیسی کا کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ خود سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ سنیتا کے گھر کی ہر پارٹی میں وہ سب سے پہلے موجود ہوتا تھا اور موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ مریم سے ملاقات ہو جائے..... وہ اسے آہستہ آہستہ اپنے راستے پر لے آئے گا..... اسے خود پر یقین تھا۔ مریم کی نظروں میں کس طرح سمانا ہے اسے معلوم تھا۔ اسی لیے تو جس پارٹی میں مریم سنیتا کے بے حد اصرار پر شامل ہوتی تھی اس پارٹی میں پی۔ کے کسی بھی لڑکی کو زیادہ لفٹ نہ کرواتا تھا اور بے نیازی کا رویہ رکھتا تھا..... شریف لڑکیاں کیسے لڑکوں کو پسند کرتی ہیں، وہ بخوبی جانتا تھا۔

اس کا اندازہ غلط نہ تھا، مریم اس بے نیاز سے خوبرو نوجوان کو کن انکھیوں سے دیکھتی تھی جو اُن لڑکیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا جو اس سے بات کرنے کو مری جاتی تھیں اور اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرتی تھیں۔ عمر ہی ایسی تھی کہ وہ اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

☆☆☆

''اماں۔'' وہ ہولے سے سرگوشی میں بولی تھی... مگر جواب نہ پا کر اس نے ذرا بلند آواز میں دوبارہ ماں کو پکارا، وہ کسمسائیں اور اس کی طرف کروٹ بدل لی۔

''اماں..... چھت پر کوئی ہے۔'' اس کی سرگوشی بھی بلند تھی اور الفاظ بھی ایسے کہ معراج بی بی کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ وہ جھٹ سے اٹھ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گئیں، اندھیرے میں ہی پیروں سے تلاش کر کے جوتے اڑسے اور اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ زرتاج نے پکڑ لیا۔ ''کہاں جا رہی ہیں اماں؟''

''ارے چھوڑو..... دیکھنے تو دو کہ کون ہے؟'' انہوں نے اپنا دوپٹا اس کی گرفت سے چھڑوایا۔

''اماں باہر نہ نکلیں۔'' اس نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''تو باہر جائے بغیر کیسے علم ہوگا کہ چھت پر کون ہے۔'' انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے اماں۔'' وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر ماں سے لپٹ کر کھڑی ہو گئی، اس کا وجود باقاعدہ لرز رہا تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ معراج نے اسے پیار سے ساتھ لپٹا کر اسے حوصلہ دیا، اس کا سر تھپکا۔

''تم یہیں ٹھہرو..... میں دیکھتی ہوں جا کر، میرے باہر نکلتے ہی تم دروازہ اندر سے بند کر لینا، جب تک میں نہ کہوں..... تم کسی طرح بھی دروازہ نہ کھولنا، چاہے جو بھی ہو جائے، جو کچھ بھی ہو جائے، سمجھیں!'' اسے اچھی طرح سمجھا بجھا کر وہ باہر کی طرف چلیں، زرتاج نے لپک کر ماں کو پھر پیچھے سے پکڑ لیا، انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر پھر سے تسلی دی۔

''فکر مت کرو زرتاج..... تمہاری ماں اتنی کمزور عورت نہیں ہے۔'' وہ اپنی چادر سمیٹتے ہوئے باہر نکلیں تو وہ دروازہ بند کرنے کے بجائے ماں کے پیچھے ہی باہر نکل کر کھڑی ہو گئی، معراج نے پلٹ کر دیکھا اور آہستگی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ پورے صحن میں ان کے قدموں کی چاپ کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی..... اتنا سناٹا تھا کہ زرتاج کو اپنے دل کی دھڑکن اور سانسوں کے زیر و بم کی آواز بھی آ رہی تھی، وہ دل ہی دل میں کئی آیتوں کے ورد کر رہی تھی۔

وہ سراپا منتظر تھی کہ ابھی کوئی ہنگامہ ہوگا..... ابھی کوئی بھاگتا ہوا نیچے آئے گا، وہ کسی برے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اوپر سے اماں کی آواز آئی۔

''کم بختیں۔'' انہوں نے کوئی چیز اٹھا کر کسی کو ماری تھی غالباً۔ ''آرام بھی نہیں کرنے دیتیں کسی کو۔'' بلیوں کے چوٹ کھا کر بھاگنے اور تکلیف دہ آواز میں میاؤں میاؤں کی آوازیں، زرتاج کے لیے زندگی کی نوید جیسی تھیں۔ وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر کی طرف گئی اور ماں سے لپٹ گئی۔

''جانے دیں اماں بے چاریوں کو، ہمارا کیا بگاڑتی ہیں۔ اس وقت شور کی آواز سے بے چارے پڑوسی جاگ گئے ہوں گے.....''

''تو کیوں اوپر آ گئی ہے، تجھے کہا تھا کہ کمرے میں رہنا اور ہرگز باہر نہ نکلنا، چاہے جو بھی ہو جائے۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر معراج نیچے کو چلیں۔

''اماں..... ہمارا گھر بہت غیر محفوظ ہے!'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''اللہ مالک ہے میری بیٹی، وہ ہے نا سب کا رکھوالا..... بس اسی پر بھروسا کرنے والے بہادر ہوتے ہیں!'' انہوں نے زیر لب کچھ پڑھ کر زرتاج کی طرف پھونکا۔

☆☆☆

پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو اس میں سوراخ ہو جاتا ہے، نوجوان لڑکیوں کے دل تو پتھر نہیں ہوتے، وہ تو انتہائی نرم ہوتے ہیں اور ان پر پڑنے والی پیار کی نظر جلد ہی دل تک راہ پا لیتی ہے۔ مریم کے دل میں یہ بھی تھا کہ اسے اس ماحول سے فرار کے لیے کسی مسلمان نوجوان کی ضرورت ہوگی۔ وہ جلد بازی میں کسی پر اعتبار بھی نہیں کر سکتی تھی اور بہت عرصے تک سنیتا آنٹی کے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی تھی کہ اس کا راز افشا نہ ہو جائے...... وہ چھپ چھپ کر اپنی عبادات کرتی اور چپکے چپکے اللہ سے باتیں کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ جس دن سنیتا آنٹی یا اس کے والدین کو علم ہوا کہ وہ بغاوت میں کس حد تک چلی گئی ہے اس روز کے بعد اس کی زندگی عذاب بن سکتی تھی۔ اب وہ اگرچہ پی۔ کے کی حوصلہ افزائی تو نہیں کرتی تھی مگر فرق یہ پڑا تھا کہ اتنی مردم بیزاری کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی جتنی پہلے تھی...... پہلے وہ جن پارٹیوں میں شرکت سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اپنے کمرے میں محدود بلکہ محصور ہو جاتی تھی اب وہ مارے باندھے ہی سہی مگر سنیتا آنٹی کے کہنے پر وہاں آ جاتی اور تمام تقریب کے دوران ایک کونے میں گھسی بیٹھی رہتی۔ پی۔ کے خود ہی اس تک رسائی حاصل کر لیتا تھا، اسے وہ سہمی سہمی نظروں والی لڑکی اچھی لگنے لگی تھی، شادی نہیں کر سکتا تھا تو دوستی میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔

''کیا بات ہے مریم...... کوئی پریشانی ہے کیا؟'' اس روز وہ ہمیشہ کی طرح اپنی طرف لپکتی لڑکیوں کو نظر انداز کر کے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''نہیں تو'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی پریشانی نہیں!''

''پی۔ کے اتنا نادان تو نہیں ہے مریم...... کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟''

''وہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی، ایک نظر پرویز کی طرف دیکھا کہ وہ قابلِ بھروسا ہے بھی کہ نہیں۔ اس ایک نظر نے پی۔ کے کے دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر دیا تھا، گھاک تھا...... جان گیا تھا کہ اسے کسی مسئلے کا سامنا تھا اور وہ اس کی مدد چاہتی تھی۔ ''ہم کہیں باہر مل سکتے ہیں کیا؟'' اس نے ڈرتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

''بالکل۔'' اس نے اپنے سینے میں اٹکی ہوئی گہری سانس خارج کی...... ''آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر باہر لے جاتا۔

''کب؟'' اس نے سوال کیا۔ ''اور کہاں؟''

''میں آپ کو بتاؤں گی۔''

''کب بتائیں گی؟''

''جب ہم اگلی دفعہ ملیں گے۔''

''کیا ہم پانچ منٹ کے بعد اگلی دفعہ مل سکتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں لگاوٹ تھی اور بے تابی۔

''معذرت چاہتی ہوں، اتنی جلد بازی پسند نہیں مجھے'' اس نے چڑ کر کہا تو پی۔ کے کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا، سنیتا نے دور سے یہ منظر دیکھا کہ مریم کی نظر میں کچھ مختلف تھا، جس نظر سے وہ پی۔ کے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی، اس میں ہمیشہ کی طرح بیزاری مفقود تھی۔ سنیتا کو دلی مسرت ہوئی...... اگر مریم، پی۔ کے سے دوستی کر لیتی تو اپنے مطلب کے کئی کام نکلوائے جا سکتے تھے۔

(باقی آئندہ)

بے چینی جہاں آرا کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی، دلی کو وہ ایک خاص بچہ سمجھتی تھیں، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ عامیانہ قسم کے پیار محبت میں مبتلا ہو کر ان کا نام ڈبوئے گا۔ کبھی سوچتیں کہ اس سے کھل کر بات کریں مگر جانتی تھیں کہ اولاد اور ماں، باپ کے درمیان ایک حدِ فاصل ہونا ضروری ہے۔ جس دن یہ فریقین کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے ہیں، اس دن ادب اور لحاظ کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ پرویز جو چنگاری چھوڑ گیا تھا اس میں ضرور کوئی سچائی تھی ورنہ وہ اتنے دعوے سے بات نہ کرتا۔

''بہتر ہے کہ میں خاموشی سے اس کی نگرانی کروں، اس کے اٹھنے بیٹھنے پر نظر رکھوں...... لڑکیوں کو شاید علم ہو......'' انہوں نے سوچا۔ ''نگران سے بھی کھل کر بات کی تو بات دلی تک پہنچ جائے گی۔'' یہی سوچ کر انہوں نے یہ ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ ''کتنے برس بیت گئے...... دلی اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ عشق جیسا جنجال پال لے۔ کون ہو سکتی ہے جس نے میرے معصوم لال کو پھانس لیا ہے۔'' اپنے بیٹے کو ہر ماں کی طرح معصوم سمجھتے ہوئے انہوں نے تصور میں اپنے اردگرد نظر دوڑائی کہ اپنی مجرمہ کو جان سکیں۔

لڑکیاں اپنی شام کی تیاریوں میں مصروف تھیں، الماس اپنی حالت کے باعث صرف گلوکاری کر رہی تھی۔ روبی، نیلم اور یاقوت رقص کی تربیت لے رہی تھیں...... بارہ تیرہ سالہ زمرد بھی اپنی عمر کے لحاظ سے بڑی لگتی تھی، ابھی تک اس کی رونمائی نہیں ہوئی تھی مگر رقص کرتے وقت جو لچک اور لوچ اس کے جسم میں نظر آتا تھا، وہ کسی اور میں نہ تھا۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق چاروں انگریزی بول چال کی تربیت بھی حاصل کر رہی تھیں اور اس کے علاوہ ہائی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب کی تربیت بھی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھوں کے چراغ روشن تھے کہ وہ ان کے بڑھاپے کا سہارا تھیں ــــ مرجان سات برس کی اور فیروزہ تو ابھی انتہائی کم عمر تھی۔ ''جانے میں ان کے منزل تک پہنچنے تک ہوں گی بھی کہ نہیں۔'' انہوں نے آنکھیں میچ کر سوچا۔

''اماں۔'' ایک نحیف سی آواز نے انہیں خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا۔

''کیا بات ہے روبی؟'' انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

''الماس آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اماں۔'' اس کا کہنا تھا کہ وہ کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھیں، تقریباً بھاگتے ہوئے اس طویل برآمدے کو عبور کیا اور وہ سیڑھیاں جو وہ کبھی کبھار ہی چڑھتی تھیں، انہیں کسی ہرنی کی طرح پھرتی سے سر کیا اور اوپری برآمدے تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگیں تو ذرا رک کر سانس لینے لگیں۔

''تو چل روبی بھاگ کر اس کے پاس، میں آتی ہوں!'' سانس بحال ہوئی تو انہوں نے قدم بڑھائے۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر نیم تاریکی تھی، ہولے ہولے سرگوشیوں کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا، وہ دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھیں۔ ان کی طرف ان دونوں کی پشت تھی، ایک تو دلی تھا...... اسے وہ آنکھیں بند کر کے پہچان سکتی تھیں اور اس کی گود میں سر دھرے، زمرد کے سوا کوئی اور کیسے ہو سکتی تھی۔ انہی دبے قدموں سے وہ دہلیز سے ہی مڑ کر الماس کے کمرے کی طرف چلیں...... دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ دلی کو تو ہمیشہ انہوں نے یہی بتایا تھا کہ وہ پانچوں اس کی سگی بہنیں تھیں، فقط مرجان اور فیروزہ کے بارے میں دلی کو شک تھا اور وہ اسے یقین نہ دلا پائی تھیں کہ وہ اس کی بہنیں تھیں۔

''تو کیا دلی رشتوں کی پہچان بھول گیا ہے؟'' وہ ایک مختلف انداز سے سوچ رہی تھیں، انہیں معلوم ہی نہ

تھا کہ دلی وہ سب کچھ بھی جان چکا تھا جو شاید انہیں بھی معلوم نہ تھا۔

''اس زمرد کا تو پتا صاف کرنا پڑے گا!'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے دماغ کو کوئی منصوبہ بنانے میں مصروف کرلیا...... الماس جو کچھ کر چکی تھی، وہ کسی اور کو یہ سب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ وہ الماس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ کراہ رہی تھی، غسل خانے میں اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور اس کی کمر میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔

''اچھا ہے...... خود ہی جان چھوٹ جائے گی!'' انہوں نے دل میں کہا۔

''حوصلہ کرو میری بچی، سب ٹھیک ہو جائے گا......'' اس کو ساتھ لگا کر انہوں نے تسلی دی۔

''مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو اماں۔'' اس نے تکلیف سے کہا۔

''لے چلتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''جانے یہ دلی کم بخت کہاں چلا گیا ہے، کہیں نظر ہی نہیں آ رہا ہے!''

''اماں...... وہ زمرد کے کمرے میں ہوگا، وہیں ہوتا ہے آج کل، دن رات......'' روبی نے فوراً کہا تو جہاں آرا کے دل کی کئی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔

''یہ کم بختیں بھی سب جانتی ہیں مگر مجھے کسی نے بھنک بھی نہیں پڑنے دی، اگر پرویز نہ بتاتا تو میں...... بے خبر ہی رہتی۔ میرا اپنا خون ہوتیں تو ان کے دل میں میرے لیے احساس ہوتا نا۔'' دل ہی دل میں وہ بڑبڑائیں۔

☆☆☆

''تم بہت معصوم ہو مریم...... تمہارا دل بالکل پاک اور صاف ہے اور تم ہر کسی کو سادگی سے دیکھتی ہو، تاہم اگر وہ تمہیں ٹھیک لگتا ہے تو ہم اس سے مل کر دیکھ لیتے ہیں...... جاوید بھی اس سے بات چیت کر کے اندازہ کرلیں گے کہ کیسا ہے!'' سائرہ آپا نے اس کی بات سن کر کہا تھا۔ اس وقت اسٹاف روم میں وہ دونوں ہی بیٹھی تھیں۔

''مجھے تو کوئی راہِ فرار چاہیے، گھر پر بیٹھے رہنے اور اس اسکول میں ملازمت کرنے سے تو مجھے کوئی اور ملنے سے رہا...... سیتا آنٹی کے گھر پارٹیوں میں جن لوگوں کا آنا جانا ہے، ان میں یہ مجھے سب سے بہتر لگتا ہے اور ایک بات اور بھی ہے۔'' سائرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ مجھے چاہتا بھی ہے!''

''اس نے یہ کہا تم سے؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''نہیں...... مگر میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھتی ہوں!''

''ارے...... تم تو بہت ہوشیار ہو گئی ہو، میں تو تمہیں معصوم سی سمجھتی تھی......'' سائرہ کے کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی...... اسے لگا اس سے قبل وہ کبھی اتنا کھل کر نہ ہنسی تھی۔

''اچھا اس جمعے کو چھٹی ہے، اسی روز اس سے مل لیتے ہیں!'' سائرہ نے اس سے وقت طے کرلیا اور یہ بھی کہ مریم اسے لے کر ان کے گھر آئے گی۔

☆☆☆

دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا تھا، معراج کے دل کو ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا، معراج نے زرتاج کو دیکھا جو بے نیازی سے ہانڈی بھون رہی تھی۔ اس نے ماں کو سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو

گئی۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا تو وہ اٹھ گئی۔

''تو اپنا کام کر، میں کھولتی ہوں دروازہ۔'' انہوں نے پاؤں میں سلیپر اڑسے اور پاؤں گھسیٹتے ہوئے باہر کی طرف چلیں، دروازہ کھولا اور دو اجنبی شکلوں کو دیکھ کر ان کا پورا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''ہم شاکر کی بہنیں ہیں، زینب اور زینت۔'' ان میں سے نسبتاً عمر میں بڑی نظر آنے والی نے تعارف کروایا۔ ''آپ خالہ معراج ہیں؟''

''ہاں، میں ہی معراج ہوں، آؤ آؤ اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کو کہا۔ وہ آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں، بنظرِ غور زرتاج کو دیکھا اور اسے سلام کیا۔ زرتاج نے ان کے سلام کا جواب دیا۔

''شاکر کی بہنیں ہیں۔'' معراج نے مختصراً تعارف کروایا اور شاکر کے نام سے جو لالی زرتاج کے چہرے پر گلال بن کر آئی تھی اس نے ان دونوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ زرتاج تھی، ان کے بھائی کی منگ...... ورنہ وہ پوچھنے ہی والی تھیں کہ وہ زرتاج ہی تھی۔ ویسے تو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ معراج دائی کی ایک ہی بیٹی ہے۔

''شاکر کہاں ہے؟'' معراج بی بی نے ان سے سوال کیا۔ زرتاج نے ہانڈی چولھے سے ہٹا کر دو گلاس دودھ گرم کیا تھا اور ان دونوں کے لیے سلیقے سے سینی میں رکھ کر لے آئی تھی، انہوں نے مسکرا کر گلاس لیے اور زرتاج کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''یہی پوچھنے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں، زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ہمارا بھائی ہمیں عید پر بھی ملنے نہیں آیا اور نہ ہی عرصے سے خیر خیریت پوچھی ہے۔'' ایک نے بتایا۔

''اے لو...... مجھے بھلا کیا معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا ہے!'' معراج نے خفگی سے کہا۔

''خالہ ہمارا بھائی آپ کا ہونے والا داماد ہے اور اس گاؤں میں سوائے آپ کے اس کا اور ہے بھی کون...... ہم سمجھے کہ آپ کو کچھ نہ کچھ بتا کر گیا ہوگا اور اسی لیے پوچھتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں!'' بڑی والی نے متانت سے کہا تو معراج کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا۔

''سو تو ہے...... میرا تو بیٹا ہے وہ، داماد تو بنے گا سو بنے گا!'' معراج نے اب کی بار تحمل سے کہا۔ ''لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرنے والا اتنے عرصے کے لیے بنا بتائے کہاں غائب ہو گیا ہے!'' معراج کے لہجے میں پریشانی کا رنگ تھا، وہ تو اس کی بہنوں سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ گاؤں کے حالات کے پیشِ نظر وہ تو چاہتی تھیں کہ آج شاکر واپس آئے تو کل زرتاج کو اس کے ساتھ وداع کر دیں۔

تھوڑی دیر۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر انہوں نے اجازت چاہی تو معراج نے اصرار کر کے انہیں کھانے پر روک لیا۔ گھر کا سادہ سا کھانا مگر زرتاج کا سلیقہ اور اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کا لطف ایسا تھا کہ انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور جاتے وقت دونوں نے کچھ رقم زرتاج کو دینا چاہی تو معراج بی بی نے زبردستی ان کی رقم لوٹا دی...... شاکر نے انہیں بتا رکھا تھا کہ اس کی دونوں بہنوں کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔

ان کے گھر کا، معراج کے اخلاق اور زرتاج کی مہمان نوازی کا بڑا اچھا تاثر لے کر وہ روانہ ہوئیں تو جاتے سے یہ کہنا نہ بھولیں کہ ان کا بھائی بڑا خوش قسمت ہے۔

☆☆☆

"لالہ جی..... گاؤں جانا ہے مجھے!" شیر علی نے جہانگیر سے کہا۔

"مگر گاؤں تو میں جا رہا ہوں اور اگر تم بھی چلو گے تو رابعہ اکیلی ہوگی!" جہانگیر نے کہا۔

"مگر میرا تو کبڈی کا میچ ہے لالہ جی..... مجھے جانا ہی ہوگا!" شیر علی نے اصرار کیا۔

"تو پھر اس کا کیا حل نکالا جائے؟" جہانگیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بابو جی نے مجھے ضروری کام سے بلوا بھیجا ہے اور تمہارا کبڈی کا میچ ہے..... رابعہ!" جہانگیر نے رابعہ کو پکارا۔

"جی کیا بات ہے؟" چند ہی لمحوں میں رابعہ حاضر تھی۔

"گاؤں چلو گی؟" جہانگیر کا پوچھنا تھا کہ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

"کیوں نہیں..... کب؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بار ڈاکٹر کو دکھا لو اور اگر وہ سفر کی اجازت دے تو!" جہانگیر نے صلاح دی۔

"ٹھیک ہے، میں آج ہی چلی جاؤں گی، گاڑی بھی آئی ہوئی ہے۔" جوش اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ "مگر چلنا کب ہے؟"

"تمہارا میچ کب ہے شیر علی؟"

"لالہ جی میچ تو اگلے جمعے کو ہے مگر کچھ دن پریکٹس بھی تو کرنا ہوگی نا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں اسکول سے کچھ دن کی چھٹی لے لوں گا!"

"چلو پھر تیاری کر لو رابعہ اور ہاں تیار ہو کر پہلے ڈاکٹر کی طرف سے ہو آؤ۔" جہانگیر کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"عمران کو گھر چھوڑ کر جاؤں گی!" اس نے جاتے جاتے کہا۔ "ذرا دیر کو سنبھال لیں گے نا آپ؟"

"کیوں نہیں..... میری جان ہے یہ تو، میرا شہزادہ اور پھر چاچا ہے نا اس کا یار۔" وہ ہنسا۔ "تم بے فکر ہو کر جاؤ۔" عمران باپ کی گود میں جا کر کھلکھلا رہا تھا اور ہمک ہمک کر شیر علی کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

چوہدرانی شکیلہ کے ہاں سے راشن آیا تھا، گندم، چاول اور کچھ دالیں تھیں۔ کلثوم کے دل میں شرمندگی تو بہت تھی وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ جب ٹھیک ہو جائے گی تو بلا معاوضہ چوہدرانی شکیلہ کے ہاں کام کر کے ان کے اس احسان کا بدلہ ضرور چکا دے گی۔ اس کی رگوں میں غیرت مند ماں کا خون تھا اور یوں کسی کی طرف سے امداد آنا اس کے لیے بھیک کے مترادف تھا مگر یہ سوچ کر کہ ضرورت کے وقت مردار بھی جائز ہو جاتا ہے۔ گھوٹو تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بھیجا ہے چوہدرانی نے یہ راشن؟" گھوٹو نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

"مجھ پر ترس کھا کر..... کہ میرا شوہر کچھ نہیں کرتا اور مجھے اس حالت میں بھی مشقت کرنا پڑتی ہے اور اب تو میں کچھ کر بھی نہیں سکتی....."

"یہی بات ہے کیا..... یا کچھ اور قصہ ہے؟" اس نے شک بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"اور کیا بات ہوگی؟" کلثوم نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ محرم کیا ہوتا ہے؟" اس نے ایک غیر متعلق سا سوال کیا تو کلثوم کچھ سمجھ نہ سکی۔

"میں سمجھی نہیں!"

"سمجھنے والی اس میں کیا بات ہے..... سیدھا سا سوال ہے، محرم کیا ہوتا ہے؟"

"محرم وہ رشتے ہیں جن سے آپ کا نکاح نہیں ہو سکتا اور اس کے علاوہ شوہر محرم ہوتا ہے۔" کلثوم نے اس کی ذہنی اپچ کے مطابق آسان الفاظ میں اسے سمجھایا۔

"تو کیا تو چوہدری نور علی سے نکاح کرنا چاہتی ہے یا وہ تجھ سے؟" اس نے بے وقوفانہ انداز میں کہا۔

"یہ کیا احمقانہ سوال ہے..... میں کیوں کروں گی کسی سے نکاح؟ بیوی ہوں میں تمہاری اور ایسی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں!"

"شرم مجھے آنی چاہیے یا تجھے..... جو چوہدری سے نکاح کرنے کو مری جا رہی ہے اور اس بات کو لے کر اس روز چوہدری نے میری وہ پٹائی کروائی ہے کہ ابھی تک بدن دکھتا ہے!" اس نے غصے سے کہا۔ "اور اب تجھے راشن بھیج رہا ہے، سو کر آئی ہوگی نا تو اس کے پاس۔"

"شرم کرو تم۔" وہ چیخی۔ "تمہیں اپنی بیوی سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہ اپنے اوچھے ہتھکنڈوں پر آ گیا، کلثوم کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ محلے والے کلثوم کی چیخیں سن کر دخل اندازی کیے بنا نہ رہ سکے۔ انہوں نے نہ صرف کلثوم کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑوایا بلکہ اسے کان سے پکڑ کر گھر سے باہر بھی نکال دیا۔ دو پڑوسنیں کلثوم کے پاس ہی رک گئیں، انہوں نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور اسے دودھ گرم کر کے پلاتی رہیں، تھوڑا سکون آیا تو کلثوم سو گئی۔ سونے سے پہلے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی، گھوٹو کی زندگی سے نکل جانے کا..... یا دوسرے الفاظ میں اسے اپنی زندگی سے نکال دینے کا۔

☆☆☆

حکیم جی نے کیسے صاف الفاظ میں اس کی نبض دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ اسے کسی دائی کے پاس لے جائے اور وہ وہاں موجود لوگوں کے سامنے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"مگر کیوں حکیم صاحب؟" اس نے شرمندگی چھپانے کو سوال کیا۔

"ارے کوئی زنانہ بیماری ہے، میرے پاس اس کا علاج نہیں۔" حکیم صاحب نے بھی مصلحتاً ڈھکے چھپے انداز میں اسے ٹالا تھا۔

"ٹھیک ہے جی!" وہ اٹھی، ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا، اس کے ہاتھ کی گرفت انتہائی سخت تھی، اتنی کہ اس کی سسکی نکل گئی۔ "کتنے پیسے ہوئے جی حکیم صاحب؟"

"کوئی پیسے نہیں..... جب میں نے علاج ہی نہیں کیا تو!" وہ سلام کر کے باہر نکل آئی اور اس کا رخ دائی معراج کے گھر کی طرف تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر کافی دیر تک اندر سے جواب نہ آیا تو وہ مایوس ہو کر پلٹنے والی تھی جب اندر سے گھسٹتے قدموں کی آواز آئی، وہ رک گئی، حکیم کی دکان سے لے کر یہاں تک ماں بیٹی کے مابین کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

"کون ہے؟" اندر سے پوچھا گیا تھا۔

"ماسی دروازہ کھولیں، میں ہوں سکھاں، بالے ترکھان کی بیوی۔"

"اچھا اچھا۔" ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور ماں بیٹی آگے پیچھے اس گھر میں داخل ہو گئیں۔ اندر صحن میں زرتاج دھوپ میں کھڑی اپنے بال سکھا رہی تھی، انہیں دیکھ کر سلام کیا اور بال سمیٹنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" معراج نے پوچھا تھا۔

"وہ جی۔" وہ زرتاج کو دیکھ کر ذرا سا ہکلائی تھی۔

"بے فکر ہو کر بات کرو...... میری بیٹی بھی یہی کام کر لیتی ہے بلکہ مجھ سے بہتر کر لیتی ہے۔ آج شہر جا رہی ہے امتحان دینے، اپنے ماموں کے ہاں رہے گی اور پڑھ لکھ کر اس کام کو بہتر انداز سے کرے گی!"

"جی ٹھیک ہے مگر...." وہ پھر بھی متذبذب تھی۔

"زرتاج تم اندر جاؤ...... اپنا سامان تیار کرو تاکہ گڈو تمہیں جا کر بس پر بٹھا آئے اور تم اجالے، اجالے میں شہر پہنچ جاؤ!" معراج نے اسے وہاں سے ہٹایا، وہ دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی مگر فطری تجسس کے باعث کوئی کام کرنے کے بجائے کان اس طرف لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"ماسی جی...... اس کو الٹیاں بہت آ رہی تھیں، حکیم جی کے پاس لے کر گئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس لے جاؤں!"

"کب سے آ رہی ہیں الٹیاں اور دست وغیرہ تو نہیں؟" معراج نے پوچھا۔

"نہیں جی، دست تو نہیں ہیں۔" سکھاں نے ہی جواب دیا، وہ اس سارے قصے سے بے نیاز بیٹھی تھی جیسے کسی اور کی بات ہو رہی ہو۔ اس کی شان بے نیازی پر معراج کو غصہ آ گیا۔

"خود گونگی ہے یہ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" پھر سکھاں نے جواب دیا۔

"تو خاموش رہ سکھاں اور مجھے مریضہ سے بات کرنے دے......" معراج بی بی کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

"ہاں تو بیٹیا! کس وقت الٹیاں زیادہ آتی ہیں؟"

"وقت تو کوئی مقرر نہیں جی...... ہانڈی کی خوشبو سے بھی آ جاتی ہیں اور صبح سویرے تو بہت زیادہ ہوتی ہیں!" اس نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

"اچھا چلو شاباش...... ذرا لیٹ جاؤ!" معراج کے کہنے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ معراج نے اس کا معائنہ کیا اور اپنی تسلی کی۔ "کہاں بیاہ کیا ہے تم نے اس کا سکھاں؟" رانی کا دل دھڑکا اور سکھاں حیرت سے معراج کو دیکھنے لگی۔ "بڑی پیاری بیٹی ہے تمہاری!"

"شکل صورت کا کیا ہے ماسی جی! ہماری بیٹیوں کے نصیب کھلتے بھی ہیں تو تب جب ہم پر چڑھے ہوئے قرض در قرض کم ہوتے ہیں اور بعض دفعہ تو یہی بیٹیاں قرض اتارنے کے کام آتی ہیں۔"

"کیا اس کی شادی نہیں ہوئی؟" معراج نے حیرت سے کہا۔ "مگر اس کے پیٹ میں تو بچہ ہے!" سکھاں کے سر پر بم پھٹا تھا اور وہ بھی حیران تو ہوئی مگر اس کا چہرہ یک دم بے تاثر ہو گیا۔

"آپ دوبارہ چیک کریں...... آپ کو غلطی نہ لگی ہو......"

"میرے چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... تمہاری بیٹی کا چہرہ اس کی خود ہی تائید کر رہا ہے اور میں

تو تمہیں اس کی ڈھٹائی دیکھ کر یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اس پر کوئی زور زبردستی نہیں ہوئی۔" معراج کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا۔

"کچھ کریں ماسی جی...... ورنہ ہماری بدنامی ہو گی!" سکھاں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"پہلے اس سے پوچھو...... پھر مجھ سے بات کرنا!"

"آپ کو اللہ کا واسطہ ہے ماسی جی...... آپ اس بچے کو ضائع کر دیں!" سکھاں کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ "جانے کم بخت کہاں منہ کالا کر کے آ گئی ہے...... اس کا باپ سب سے پہلے تو میرے ٹوٹے کر دے گا اور پھر اس کے......"

"خبردار......" وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جو کسی نے اس بچے کو ضائع کرنے کی بات بھی کی، یہ میرا بچہ ہے اور کسی لاوارث کی اولاد نہیں ہے۔"

"بے غیرت!" سکھاں نے اسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور اپنی لاتوں سے اسے ٹھڈے مارنے لگی۔ "اللہ کرے تو ابھی مر جائے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" ساتھ والے کمرے میں کان لگائے ہوئے زرتاج کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا، معراج نے کھینچ کر سکھاں کو علیحدہ کیا جو رانی کا گلا دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سکھاں...... میرے گھر پر یہ تماشا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اٹھا اپنی اس بے غیرت اور بدزبان بیٹی کو اور جو کچھ کرنا ہے، اپنے گھر پر جا کر کرو...... میرے گھر میں جوان بیٹی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ایسے کرتوتوں کی بھنک بھی اس کے کانوں میں پڑے۔" زرتاج فوراً دروازے کے پاس سے ہٹی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ رانی کے ساتھ یہ کس نے کیا مگر اماں نے پوچھا ہی نہ تھا مگر یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کی مرضی سے ہوا تھا۔ ان ماں بیٹی کے جانے کے بعد معراج کمرے میں آئیں تو زرتاج کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھ کر مطمئن ہو گئیں کہ اس نے کچھ نہ سنا ہو گا۔

"تیار ہو تم۔" معراج نے پوچھا۔

"جی اماں!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا آ کر دروازہ بند کر لو، میں گڈو کو بلا کر لے آؤں تاکہ وہ تمہیں ساتھ والے گاؤں سے بس پر بٹھا آئے، پہلے ہی کافی وقت نکل گیا ہے!" وہ ماں کے ساتھ باہر کے دروازے تک آئی اور دروازے کو بند کر لیا۔ چند منٹ میں ہی معراج، گڈو کو لے کر آ گئی تھیں۔ جلدی سے زرتاج کو ضروری ہدایات دے کر فارغ کیا اور گڈو کو بھی اچھی طرح تاکید کر کے اس پر آیات قرآنی کا وِرد کر کے اسے روانہ کیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی تھی، وہ سمجھی کہ زرتاج ہی کسی وجہ سے لوٹ کر آئی ہے مگر دروازہ کھولتے ہی اسے کلثوم کا مرجھایا ہوا چہرہ نظر آیا تھا، اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کم بخت نے پھر اسے دھنک کر رکھ دیا ہو گا، یہ احساس کیے بغیر کہ وہ کس حالت میں تھی۔

"آؤ، آؤ بیٹا اندر آؤ......" وہ نقاہت سے چلتے ہوئے اندر آ گئی۔ معراج نے دروازہ بند کیا اور اسے لے کر اندر آ گئیں۔ "لیٹ جاؤ یہاں!" اس نے کوئی حیل و حجت نہ کی اور لیٹ گئی۔ معراج نے اسے لٹا کر ہلکی سی چادر اوڑھائی اور باہر آ کر اس کے لیے دودھ نیم گرم کیا اور اسے زبردستی پلایا، تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔

معراج نے ابھی تک اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا، بس تھوڑا سا معائنہ کیا تھا، یہ جانچنے کے لیے کہ بچہ ٹھیک تھا۔

کلثوم سوتی ہوئی فرشتوں جیسی معصوم لگ رہی تھی، عمر میں وہ زرتاج سے چھوٹی تھی۔ ''میری ماہ تاج زندہ ہوتی تو اسی عمر کی ہوتی۔'' معراج کے سینے میں درد اٹھا اور پورے جسم میں پھیل گیا۔ وہ سوئی ہوئی کلثوم کے سر کو سہلانے لگیں، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اسے ماہ تاج کہہ کر آنسوؤں کی تسبیح رول رہی تھیں اور وہ تو جانے بے ہوش تھی کہ اسے کچھ علم نہ تھا کہ کہاں ہے اور کس حال میں...... ہاں اسے اتنی بے ہوشی میں بھی اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا، اپنی ماں کے ہاتھ کا لمس محسوس ہو رہا تھا، وہ درد سے کراہی تھی کہ معراج چونک گئیں...... اسے کندھوں تک چادر اوڑھا کر وہ باہر نکل آئیں۔ پرانی یادوں نے پھر ان کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا، جب بھی کوئی ایسا وقت آتا تو زرتاج ہمیشہ ماں کو دائیں بائیں کی باتیں کر کے بہلا لیتی تھی مگر آج درد حد سے سوا ہو گیا تھا اور اس درد کا درماں کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

خوشی خوشی سارا قافلہ گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا، سب سے زیادہ ...خوشی رابعہ کے چہرے پر تھی جو ہر وقت گاؤں کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ ہنسی مذاق، چٹکلوں اور ننھے عمران کی شرارتوں سے محظوظ ہوتے سفر کیسے گزرا پتا بھی نہ چلا اور حویلی پہنچتے ہی سب لوگ ان کی آمد کا سن کر نہال ہو گئے۔ عابدہ بیگم تو عمران کو دیکھ کر بے تابانہ اس کی طرف لپکیں اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا، وہ بھی ہمک کر دادی کی گود میں آیا اور خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

''ارے چھوٹے...... کیسا ہشیار ہے تو، دادی کی طرف تو بھاگ کر گیا ہے اور بابے سے کوئی راہ و رسم ہی نہیں جیسے!'' انہوں نے اسے اپنی طرف بلایا تو وہ دادی سے لپٹ گیا، سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا، حویلی کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ ایک بچہ پورے ماحول کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے، سب اس کے ساتھ بچے بنے بیٹھے تھے اور اس کے انداز میں باتیں کر کر کے ہنس رہے تھے۔

''چوہدری صاحب! باہر کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔'' ملازم نے آ کر اطلاع کی تھی۔

''کون ہے؟ یہیں بلا لو!''

''ساتھ والے گاؤں کے چوہدری صاحب کا کاما ہے جناب اور آپ سے ہی مل کر پیغام دینا چاہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میں دیکھتا ہوں بابو جی۔'' جہانگیر اٹھ کر باہر نکلا اور برآمدے میں کھڑے کامے کے پاس جا کر اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔

''جمعے کے دن ہمارے گاؤں میں ایک پنچایئت ہے جناب اور چوہدری صاحب پنچ ہیں، ان کا آنا ضروری ہے، اسی لیے چوہدری صاحب نے ایک ہفتے پہلے کہلوا بھیجا ہے تاکہ اگر ان کی کوئی مصروفیت ہو تو......'' اس نے وضاحت کی۔

''اچھا تم رکو! میں بابو جی سے پوچھ کر آتا ہوں۔'' جہانگیر نے کہا۔ ''اکرم! کوئی پانی لسی پلایا ہے اس کو کہ نہیں؟''

''جی چھوٹے چوہدری صاحب۔'' اکرم نے کہا۔

''بہت نوازش ہے جناب کی!'' کامے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیم دی۔ جہانگیر نے بابو جی سے پوچھا اور خود باہر جا کر کامے کو بتایا کہ بابو جی پنچایئت میں آ ئیں گے اور اندر شیر علی باپ سے الجھ رہا تھا کہ اس روز اس کا کبڈی کا فائنل میچ تھا اور ان کا وہاں آ کر اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری تھا۔

''تو یار پنچایئت کون سا دن بھر کے لیے ہوتی ہے، بس میں جاؤں گا اور جلد آ جاؤں گا...... اپنے بیٹے کا فائنل میچ میں کیسے بھول سکتا ہوں!'' انہوں نے اسے ساتھ لگا کر کہا۔ بڑے دونوں بیٹوں سے ایک تکلف کی حد تھی مگر شیر علی ان کا چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا اور اس سے وہ اپنے پیار کا اظہار اسی طرح کرتے تھے جبکہ جہانگیر کو اندازہ تھا کہ وہ اسے ساتھ لگا کر چاہے پیار نہ کریں مگر وہ اپنے سارے بیٹوں کو بے حد چاہتے تھے۔

''جہانگیر۔'' عابدہ بیگم نے بیٹے کو پکارا۔ ''کتنے دن رہو گے؟''

''اگلے جمعہ کو شیر علی کا میچ ہے، اس کے بعد چلے جائیں گے تاکہ اس کے اسکول کا حرج نہ ہو ورنہ جتنے دن بابو جی کہیں گے، انہوں نے ہی مجھے بلایا ہے!''

''اچھا آپ نے بلایا ہے اور مجھے بتایا تک نہیں، کیوں بلایا ہے آپ نے؟'' عابدہ بیگم نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں...... یونہی دل اداس تھا، عمران کو ملنے کو دل چاہ رہا تھا، گاؤں کے بکھیڑے مجھے نکلنے نہیں دیتے، اس لیے انہی کو بلا لیا ہے اور اس بدمعاش کو دیکھو، مجھے پلٹ کر دیکھ بھی نہیں رہا!''

''میں تو اس کے پاس رہی ہوں اس لیے مجھے پہچانتا ہے، آپ سے بھی دو ایک دن میں مانوس ہو جائے گا!'' عابدہ بیگم نے انہیں تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''کون جانے...... جب یہ ہم سے مانوس ہو تو ہم ہی نہ ہوں!'' سب کے منہ سے ایک ساتھ، اللہ نہ کرے کے الفاظ ادا ہوئے تھے اور چوہدری مراد علی کو ان سب کی محبت محسوس کر کے اپنے الفاظ پر شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''معاف کر دو بابا...... منہ سے غلطی سے نکل گیا!'' انہوں نے عابدہ بیگم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا تو ایک ساتھ سب ہنسے۔

☆☆☆

ایک بار نہیں...... کئی بار شاکر نے گاؤں جانے کا ارادہ کیا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی اس کے ارادے میں۔ اسے اپنی بہنوں کا خیال بھی آتا تھا مگر ایسے گورکھ دھندے میں پھنسا تھا کہ انہیں بھی بھلا بیٹھا تھا بلکہ بھلایا تو نہیں تھا بس وقت اور موقع نہیں مل پا رہا تھا کہ ان سے رابطہ کرتا۔ ان بے چاریوں کے حالات بھی اچھے نہ تھے اور بھائی مدد کرتا تھا۔ اس بار تو عید بھی ان کے بغیر ہی گزر گئی تھی، اس نے ان کی عیدی بھی نہیں بھجوائی تھی۔ گاؤں سے تو کوئی نہ کوئی ان کے گاؤں جاتا رہتا تھا اور وہ ہر آتے جاتے کے ہاتھ ان کے لیے کچھ نہ کچھ بھجوا دیتا تھا۔

''جانے کس حال میں ہوں گی......'' اس نے سوچا خود پر شرمندگی بھی ہوئی کہ کس طرح وہ سب کچھ بھلا کر ایک زرتاج کی امانت کی حفاظت کر رہا تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر اس کے قدم جماتے کاروبار نے اس کے پیروں کو بھی جکڑ رکھا تھا۔ ''زرتاج......'' منہ سے یہ لفظ ایک آہ کی صورت برآمد ہوا تھا۔ ''جانے کیا کیا سوچتی ہو گی

میرے بارے میں۔" وہ اسے سوچ رہا تھا اور اسی شہر کے ایک محلے میں وہ اپنے ماموں کے ہاں قیام پذیر تھی، اپنے امتحان کے لیے۔ شاکر کو جو معلوم ہوتا تو قریہ قریہ گھوم کر بھی اسے ڈھونڈ نکالتا۔ "بس اب اور نہیں......"
اس نے خود سے عہد کیا کہ پہلی فرصت میں یہاں سے نکلنا ہے۔ پہلے بہنوں کے پاس جانا ہے اور انہیں ساتھ لے کر مراد نگر...... جہاں اس کی دلی مراد پوری ہونا تھی۔ "اب بہت انتظار ہو گیا...... گاؤں میں گھر بنانے کی ضرورت بھی نہیں رہی، اس کی اماں سے کہوں گا کہ میں اس کی شہزادی کو شہر لے جا کر رکھوں گا، اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا، اس کی ہر خواہش پوری کروں گا، اسے کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔"

اس کا تصور ہی اتنا روح افزا تھا کہ وہ پہروں اس سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، انہی سوچوں میں وہ سو گیا تھا اور اس کے خوابوں کی رانی...... ہر لمحہ اس کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ علی الصباح...... سیما کے رونے کی آواز نے اس کے خوب صورت خوابوں کا تسلسل توڑ دیا تھا۔ اس نے غالباً اپنا بستر گیلا کر دیا تھا۔ پہلے تو شاکر اسے ماں ہی سلاتا تھا مگر خود بھی رات بھر بے آرام رہتا تھا اسی لیے اس نے اس کے لیے پنگوڑا لے لیا تھا، ایک پنگوڑا اس نے ناہید کی بیٹی ربیعہ کے لیے بھی لیا تھا۔ آخر وہ اس کی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی تو کیا وہ اس کا اتنا سا خیال بھی نہ کرتا۔

گھر کے خرچے میں بھی وہ کافی حصہ ڈالتا تھا اور سعید اور سلمٰی کے منع کرنے کے باوجود سودا سلف لے آتا تھا۔ ناہید، سیما کو دودھ تو پلا رہی تھی مگر اس کے علاوہ اس کی دیکھ بھال سلمٰی ہی کرتی تھی بلکہ ربیعہ کو بھی وہی دیکھتی تھی کیونکہ ناہید کو کمزوری کے باعث نیند بہت آتی تھی۔ گھر کے کام کاج بھی سلمٰی دیکھتی تھی اور ہر طرح سے ناہید کے آرام کا خیال کرتی تھی۔ اسے اس کے دکھ کا احساس تھا اور اس کے وجود میں ایک انتہائی حساس دل دھڑکتا تھا، ناہید کو وہ اپنی بہن بلکہ بیٹی سمجھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کی زندگی میں آنے والا خزاں کا یہ دور زیادہ طویل نہ ہو۔ اس سے متعلق اس کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال تو تھا مگر اس خیال کو اس نے ابھی تک اپنے سامنے بھی نہ دہرایا تھا۔ وہ مناسب وقت کی تلاش میں تھی اور یوں بھی ایک سمجھ دار اور دانا عورت تھی، سوچ سمجھ کر اور بات کے ہر پہلو کو نظر میں رکھ کر بات منہ سے نکالنے کی عادی۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ...... نینا! کہاں چھپا کر رکھا تھا اب تک اپنے بیٹے کو تم نے، کتنا پیارا ہے اور کیسا قد کاٹھ والا خوب صورت جوان...... اللہ نظرِ بد سے بچائے!" وہ اپنے بارے میں اپنی ماں کی سہیلی کے منہ سے تعریفی کلمات سن کر شرم سے لال ہو رہا تھا، ایسا دبو یا شرمیلا تو وہ ہرگز نہ تھا مگر یوں کوئی کھلے ڈلے الفاظ میں تعریف کرے تو......

"بیٹا یہ تمہاری آنٹی ہیں، شرماؤ نہیں۔" نینا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "بہت عرصے کے بعد میری اس سے ملاقات ہوئی ہے مگر اسکول اور کالج میں یہ میری بہترین دوست ہوا کرتی تھی۔ شگوفہ نام ہے اس کا اور صرف نام ہی نہیں، اس کا کام بھی شگوفے چھوڑنا ہی ہے۔" نینا اس طرح شگوفہ کا تعارف کروا رہی تھیں کہ جیسے ان کی ملاقات شگوفہ سے برسوں کے بعد ہوئی ہو حالانکہ ان کی ملاقات اکثر رہتی تھی۔ شگوفہ ماہرِ نفسیات تھی اور نینا نے سہیل کا مسئلہ اسے بتایا تھا اور اسی نے تجویز کیا تھا کہ اس طریقے سے اس کی ملاقات سہیل سے کروائے کہ اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ ماہرِ نفسیات ہے۔

''شکریہ آنٹی!'' اپنی تعریف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے پہلی بار غور سے اس عورت کو دیکھا تھا۔ اس کی ماں اسے بتا رہی تھی کہ وہ اس کی کلاس فیلو تھی، اس نے ان دونوں عورتوں کا موازنہ کیا...... اسے اپنی ماں شگوفہ کی نسبت زیادہ عمر کی لگی۔ مرجھائے ہوئے چہرے والی اور آنکھوں کے گرد حلقے...... جبکہ شگوفہ...... کسی شگوفے ہی کی طرح تھی، تر و تازہ اور خوشگوار احساس دلاتی۔ اس کی جبلّت جاگ اٹھی اور اس نے اس عورت کو ایک خوب صورت عورت سمجھ کر دیکھا، اسے اچھا لگا۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں آنٹی؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کیا میری عمر کا کوئی بچہ ہے آپ کا؟''

''ضرور ہوتا۔'' وہ ہنسی۔ ''اگر میری شادی ہو جاتی تو!''

''اوہو...... آپ کی شادی نہیں ہوئی!'' اس نے تاسف سے کہا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ تم جو نہیں ملے مجھے...... نہ ہی تم جیسا کوئی اور۔'' اس نے جلترنگ بجاتی ہنسی میں بات مذاق میں اڑائی، اس کی اس بات پر بے اختیار سہیل کی ہنسی نکل گئی اور نینا کے اندر سکون اترنے لگا۔

''اب تو مل گیا ہوں نا!'' اس نے بھی مذاق کا جواب مذاق میں دیا۔

''شرارتی لڑکے...... میں تو مذاق کر رہی تھی!'' وہ فوراً پینترا بدل گئی۔ ''شادی تو میری ہو گئی تھی مگر تم جیسا پیارا بیٹا نہیں ملا مجھے، فقط دو بیٹیاں ہیں میری!''

''اچھا؟'' وہ پھر ہنسا۔ ''کہیں سے لگتا نہیں کہ آپ دو بیٹیوں کی اماں ہیں!''

''تم کیا فلرٹ کر رہے ہو مجھ سے؟''

''نہیں آنٹی...... ہرگز نہیں، فلرٹ کرنا ہوا تو آپ کی بیٹیاں ہیں نا!'' اس نے حاضر جوابی سے کہا۔

''اچھا، چلو بھاگو اب یہاں سے، ہمیں چائے پینے دو اور اپنے سنہرے دن یاد کرنے دو!'' شگوفہ نے اسے چپت لگائی اور وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

''شگوفہ...... سچ مانو! میں نے بہت دن کے بعد اپنے بیٹے کو ہنستے دیکھا ہے!'' اس کے جاتے ہی نینا نے احسان مندی سے شگوفہ سے کہا۔

''یہ ضروری تھا نینا، ہم اپنے مریضوں سے یوں بے تکلف تو نہیں ہوتے مگر تمہارا بیٹا میرے لیے بیٹے جیسا ہے، مجھے تو اپنا بیٹا ہی لگا۔ جب تک وہ مجھ سے بے تکلف نہیں ہو گا کھل کر اپنا مسئلہ نہیں بتائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں دوسری ملاقات میں اس کی شخصیت کی پرتیں کھولنا شروع کروں اور اس کے اس مسئلے کو جاننے کی کوشش کروں جس نے تمہاری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔''

''میں تمہاری بہت احسان مند ہوں شگوفہ۔'' نینا نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ارے پاگل...... کیا کر رہی ہو، میں تمہاری بہن جیسی ہوں!''

''اچھا بتاؤ بیٹیاں کیسی ہیں تمہاری؟'' نینا نے بات بدلی۔

''بہت اچھی ہیں، کبھی وقت ملے تو آ کر خود ہی دیکھ لو۔''

''دیکھ ہی رہی ہو میرا مسئلہ اور پھر میرے گھر کے حالات کب چھپے ہیں تم سے!''

''تم نے اپنی زندگی خود ہی برباد کی ہے نینا، اس ایک بچے کی خاطر جسے تم اکیلے بھی پال سکتی تھیں اور کسی اچھے آدمی سے شادی کر کے بھی!''

''بس کرو...... اب ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں!'' اس نے سینے سے گہری سانس خارج کی۔ ''اب تو پانی پلوں کے نیچے سے بہت بہہ چکا، اب پچھتاوؤں کے ناگ مجھے ڈستے ہیں مگر میرے پاس اس... زہر کا کوئی تریاق نہیں۔ سچ کہتی ہو میں کسی بھلے آدمی سے شادی کر لیتی تو میرے بیٹے کی زندگی میں شاید ایسا عدم توازن نہ ہوتا!'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا، آنکھیں بند کیں تو کتنے ہی آنسو پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔ شگوفہ نے اسے تسلی دینے کو اس کا ہاتھ تھپکا۔

''کب آ رہی ہو میرے گھر؟''

''جلد آؤں گی۔'' نینا نے مسکرا کر کہا۔

''اور ہاں...... اپنے پیارے سے شہزادے کو ضرور ساتھ لانا!'' اس نے وعدہ لیا۔

نینا نے سادگی سے وعدہ کر لیا مگر اسے علم ہی نہ ہوا کہ کس طرح شگوفہ اس کے بیٹے کو دیکھ کر اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے حوالے سے سنہرے سپنے بُننے لگی تھی۔

☆☆☆

''اگر تو مجھے نہیں بتائے گی کہ وہ کون ہے تو میں تیرے باپ کو سیدھے سبھاؤ سب کچھ بتا دیتی ہوں، وہ خود ہی نمٹ لے گا تجھ سے بھی اور تیرے اس یار سے بھی، کم بخت...... تجھ جیسی اولاد کو پیدا کرنے سے پہلے میں اپنے ہاتھوں سے مار دیتی تو اچھا تھا۔ آج میرے منہ پر یہ کالک تو نہ ملتی تو۔'' وہ اسے دو ہتھڑ مار مار کر نڈھال ہو چکی تھی۔

''اماں تو مجھے جان سے مار دے...... پہلے نہیں مارا تو اب مار دے مگر مجھ سے اس کا نام نہ پوچھ! ابا کو بتانا چاہتی ہے تو بے شک بتا دے مگر میں کسی سے ڈرنے والی نہیں...... میرے بچّے کو کسی نے کچھ کرنے کی کوشش کی تو اس کا باپ خود ہی نمٹ لے گا!'' اس کے لہجے میں ایسی ہٹ دھرمی تھی کہ سکھاں بھی خوف زدہ ہو گئی۔

''کون ہے اس حرامی کا باپ؟''

''حرامی نہ کہہ اسے اماں...... یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے، وہ مجھ سے شادی کرے گا، وہ مجھے بہت چاہتا ہے!'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بول رہی تھی۔ ''ہاں اماں اگر تجھے مجھ سے ذرا سا پیار بھی ہے تو صرف چند دن ابا کو نہ بتانا، میں خود بتا دوں گی ابا کو...... صرف ایک بار میں اس کو جا کر بتا دوں گی کہ ہمارے پیار کی نشانی...... بس اماں ایک بار جانے دینا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تیری بیٹی اتنے بڑے گھر میں جائے گی کہ میرے جیسی لڑکیاں ایسے گھر خوابوں میں بھی نہیں دیکھ سکتیں!''

''اپنی اماں کو نہیں بتائے گی میری بیٹی کہ کون ہے وہ؟'' اس نے لہجے میں نرمی پیدا کی کہ جو گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے...... ''کون سے بڑے گھر میں جائے گی میری بیٹی؟''

''وہ اس گاؤں کا...... بلکہ ارد گرد کے پچاس گاؤں کا بھی سب سے خوب صورت جوان ہے اماں، اسے دیکھ کر لڑکیوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے ہیں اماں! مگر وہ کہتا ہے کہ اس کا دل مجھے دیکھ کر دھڑکنا بھول جاتا ہے۔ میں اس کے دل کی رانی ہوں، اب اس کے گھر کی رانی بھی بن جاؤں گی۔'' سکھاں کی چالاکی بھی کام نہ آئی تھی، وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔ سکھاں سوچ رہی تھی کہ کسی وقت اکیلے جا کر معراج

بی بی سے کوئی دوا لے کر آئے گی اور اسے کسی حیلے سے پلا دے گی، اس کے باپ کو علم ہونے سے پہلے......

''تم سمجھتی ہو کہ وہ تم سے شادی کر لے گا؟'' سکھاں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''لڑکیوں کو پھنسا کر اور ان سے اپنے غلیظ مقاصد پورے کر کے، انہیں رول دینا ان امیر زادوں کا مشغلہ ہوتا ہے، تیرا حسن تیرا دشمن بن گیا رانی اور مجھے تو یہ دکھ کھاتا ہے کہ تو نے اپنی مرضی سے۔'' وہ ہچکیوں پہکوں رونے لگی۔

''اماں پاگل ہو گئی ہے کیا؟ کیا کوئی ماں اس بات پر روتی ہے کہ اس کی بیٹی ماں بننے والی ہے!''

''حرام زادی۔'' سکھاں کے لہجے کی ساری نرمی ہوا ہو گئی۔ ''آنے دے اپنے باپ کو...... اگر آج ہی تیرے ٹوٹے نہ کروائے تو!'' اب تک کتنی بہادر بنی ہوئی تھی مگر باپ کا ذکر سن کر اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اگر ابا نے اس کے ٹوٹے کر دیے تو اکبر علی کیسے اس کے بغیر جی پائے گا...... اس کے تصور میں پھر اکبر علی چھن سے اتر آیا جس کے پاس وہ جلد ہی جانے والی تھی، اسے خوش خبری سنانے کے لیے۔

☆☆☆

''فقط ایک بار اماں...... ایک بار جانے دے، اس کے بعد کبھی تجھ سے نہ کہوں گی، مجھے جا کر اسے بتانے تو دے اماں!'' رانی کو اس بات سے حوصلہ ہوا تھا کہ اماں نے ابا کو نہیں بتایا تھا اس لیے اگلے ہی روز وہ اس کی منتیں اور ترلے کر رہی تھی۔

''جب تک تو مجھے بتائے گی نہیں کہ وہ ہے کون، میں کیسے تجھے جانے دوں؟'' سکھاں نے بھی اپنی ضد نہ چھوڑی تھی۔

''وعدہ کرتی ہوں اماں کہ واپس آ کر بتا دوں گی آج......'' دل میں ہزار خدشات کے باوجود سکھاں کو اسے اجازت دیتے ہی بنی۔ شاید وہ اسے منا لے نکاح کرنے پر تو اس کے باپ کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

''جا دفع ہو مر۔'' اس کا اجازت دینے کا انداز جیسا بھی تھا، رانی کے لیے غنیمت تھا۔ اس نے ذرا سی دیر بھی نہ کی اور فوراً منہ ہاتھ دھو کر آنکھوں میں کاجل ڈالا اور اپنے محبوب سے ملنے، اسے خوش خبری سنانے کو بے تابی سے چل دی۔ حسنِ اتفاق وہ اسے وہیں نظر آ گیا مگر اس کے ایک کامے نے اسے بتایا کہ چوہدری صاحب کے کوئی یار دوست آئے بیٹھے ہیں، اسے دوسرے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنا ہوگا۔ واپس تو وہ کوئی فیصلہ کن گفتگو کیے بنا جا نہ سکتی تھی، اس لیے مجبوراً دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس کمرے کا راستہ کھیتوں کی طرف سے آتا تھا، اس نے اندر سے دروازہ احتیاطاً بند کر لیا۔

ساتھ والے کمرے سے چار پانچ مردوں کی آوازیں آ رہی تھیں، ہنسی، قہقہے، فضول گفتگو، لطیفے اور پھکڑ پن کی گفتگو...... باتیں کرنے والے نشے میں بھی تھے مگر اسے کیا علم کہ شراب کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ اسے طویل انتظار نہیں کرنا پڑا، اکبر علی آئے اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی، اس کے قریب آ کر انہوں نے پورے استحقاق سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، کوئی مزاحمت نہ ہوئی...... وہ تو انہیں مالک و مختار سمجھ ہی چکی تھی، ان کے پیار کی خاطر ہی تو وہ یہاں آتی تھی۔

''کیوں آئی ہو آج، میں نے تو نہیں کہا تھا آج آنے کو؟'' انہوں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''مجبوری بن گئی تھی میرے مالک۔''

''کیا مجبوری؟ کیا اداس ہو گئی تھیں میرے بغیر یا کوئی پیسے ویسے چاہئیں؟'' وہ ہنسے اور دراز دستی کی، وہ بھی ہنس دی۔

''یہی سمجھ لیں۔''

''اچھا سیدھی بات کرو۔'' اسے ابکائی آئی، اکبر علی نے اپنا منہ اس کے چہرے کے قریب کیا تو اسے عجیب ناگوار سی مہک آئی اور اس سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔

''کس چیز کی بو ہے یہ، میری طبیعت مالش کر رہی ہے۔'' اس نے احتجاج کیا اور انہیں ذرا سا پرے دھکیلا۔

''کیا بات ہے رانی! بڑے نخرے کرنے لگی ہے، اب تیری طبیعت مجھے دیکھ کر مالش کیوں کرنے لگی ہے، کیا اس سے پہلے......''

''اب میری حالت ایسی ہے مالک کہ......''

''کیا ہوا ہے تیری طبیعت کو؟''

''ہم ماں باپ بننے والے ہیں مالک۔''

''کیا کہا؟ کون کیا بن رہا ہے؟''

''مالک میں ماں بننے والی ہوں اور آپ باپ...... اس بچے کے۔'' اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم...... میں تو بہت دفعہ باپ بن چکا ہوں مگر مجھے تمہارے بچے کا باپ بننے کا کوئی شوق نہیں اور وہ بھی ناجائز۔'' وہ سمجھی کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔

''مگر سرکار آپ نے تو مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا......'' اس نے سہم کر کہا۔

''میں نے...... کب؟'' وہ لہرا رہے تھے۔ ''میری تو شادی ہو چکی ہے!''

''مگر آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے!''

''مگر میں تم سے شادی کیوں کروں گا؟'' وہ لڑکھڑا کر دروازے کی طرف بڑھے۔ ''تمہیں شادی کا شوق ہے تو اس کا بندوبست میں کر دیتا ہوں، میری نظر میں کچھ اچھے لڑکے ہیں، تم انہیں دیکھ لو...... صرف دیکھو نہیں...... پرکھ بھی لو، جس طرح میں نے تمہیں پرکھا ہے اور اپنے قابل نہیں پایا۔'' انہوں نے درمیانی دروازہ کھولا، رانی کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کہاں کام کر رہی تھیں۔ ''تم انہیں اکیلے اکیلے پرکھنا پسند کرو گی یا اکٹھے اور ہاں پھر اس کے بعد فیصلہ کر لینا کہ کسے تم نے اس بچے کا باپ بنانا ہے جو نہ جانے کس کا ہے اور تم میرے سر مڑھنے چلی آئی ہو!'' پھر اس نے اشارہ کیا تو اکبر علی کے چار پانچ غنڈے نما دوست اس کمرے میں داخل ہوئے...... شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش...... رانی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں مگر کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بھلا بلی کہیں چلی جاتی ہے، اس ویرانے میں اس کی چیخوں کی آواز بھی کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

☆☆☆

''بالی تو بڑا ہو کر کیا بنے گا؟'' تالاب کے کنارے بیٹھے...... پانی میں کنکر پھینکتے ہوئے اچانک شیر علی نے سوال کیا۔

''بڑے ہوں گے تو دیکھیں گے!'' بالی نے مسکرا کر شرارت سے کہا۔

”کتنا بڑا ہو کر دیکھے گا تو، کیا تجھے بیل بننا ہے جو بڑا ہو کر سوچے گا۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”یار شیرو! جب تو چڑتا ہے نا...... مجھے بہت پیارا لگتا ہے!“ بالی ہنسا۔ ”بننا کیا ہے یار...... جو تو کہے گا وہ بن جاؤں گا۔ آج تک کچھا کیلے کیا ہے جو اب کرنے کا سوچوں گا؟“

”میرا دل چاہتا ہے بالی کہ میں استاد بنوں۔“ خلا میں گھورتے ہوئے شیر علی نے کہا۔

”استاد تو تو کیا بنے گا، تو وہ بن جا، سوچنے والا...... جیسے علامہ اقبال، جنہوں نے سوچا اور پاکستان بن گیا۔“

”وہ تو تو ہیں، تیرا تو نام بھی وہی ہے!“ شیر علی نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”مجھے تو استاد ہی بننا ہے!“

”استاد تو تو تھا نا میرا، ہے نا!“ بالی نے کہا۔ ”سچ شیرو، تو مجھے نہ پڑھاتا تو میں پاس بھی نہ ہو سکتا، اب تو شہر چلا گیا ہے تو میرا نہ پڑھائی میں دل لگتا ہے نہ کسی اور کام میں!“

”جماعت میں توجہ دیا کر بالی...... اگر کچھ بننا ہے تو سنجیدگی سے پڑھائی کیا کر، شرارتوں اور کھیل کے لیے تو عمر پڑی ہے۔“ شیر علی نے اسے سمجھانے کا یہ موقع بھی ضائع نہیں کیا۔

”زندگی زندہ دلی کا نام ہے شیرو، کسی شاعر نے ہی کہا ہے نا؟“ بالی نے بات کو مذاق میں اڑایا۔

”زندگی پھولوں کی سیج بھی نہیں ہے بالی، یہ بھی کسی عقلمند نے ہی کہا ہے......“ شیر علی نے ناراضی سے کہا۔

”کوئی موقع تو ضائع کر دیا کر میرے یار مجھے نصیحت کرنے کا، لگتا ہے میرے اباجی نے تجھے اس ملازمت پر رکھ لیا ہے کہ تجھے جب بھی موقع ملے تو میرے دماغ میں گھول گھول کر یہ ڈالتا رہ کہ میں بے پرواہوں، پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا، مستقبل کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوں اور اگر اچھے نمبروں سے کامیاب نہیں ہوں گا تو شہر کے کالج میں داخلہ نہیں ملے گا وغیرہ وغیرہ......“ بالی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میری طرف سے تو نہ پڑھ بالی، مجھے چاچا کیوں کہے گا یہ سب کہنے کو...... کیا مجھے خود علم نہیں کہ تم کتنے بے پرواہو۔ کیا میں اس بات پر پریشان نہیں ہوتا کہ اگر تمہیں شہر کے کالج میں داخلہ نہ ملا تو میں بھی تمہارے بغیر شہر میں دل نہ لگا پاؤں گا...... بھلا تمہارے بغیر مجھے کیا مزہ آئے گا؟“ شیر علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”اداس نہ ہو میرے یار...... بالی کسی نہ کسی طرح پاس ہو جائے گا اور تیرے پاس شہر بھی آ جائے گا!“ بالی نے عزم سے کہا۔ ”مجھے علم ہے کہ تمہارے خواب بہت دور تک جانے کے ہیں اور تم نے اپنے ہر خواب میں مجھے بھی ساتھ ضرور گھسیٹنا ہے، اس لیے میں ضرور پاس ہو جاؤں گا شیرو...... مگر یہ یاد رکھنا، اس لیے نہیں کہ یہ ابا جی کا خواب ہے بلکہ اس لیے کہ یہ تیرا خواب ہے...... بالی سب کچھ چھوڑ سکتا ہے شیرو، تیری یاری نہیں، تیرا ساتھ نہیں......“ دونوں ساتھ لپٹ کر ایک دوسرے کو دوستی کا یقین دلا رہے تھے، انہیں تو کیا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ انسان کی منصوبہ بندی کچھ ہوتی ہے، اس کے عزائم کچھ اور ہوتے ہیں اور دستِ قدرت اس کے لیے کچھ اور ہی تحریر کر رہا ہوتا ہے۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گاؤں میں تنور پر روٹیاں پکنے کی خوشبو پھیل جاتی تھی، سادہ خوراک، دال یا سبزی ہر گھر کا کھاجا تھا۔ کسی سے کوئی تکلف نہ تھا، ایسے میں گاؤں کے کسی گھر میں اچانک کوئی مہمان آ جاتا تو اس کی مدارات کے لیے زیادہ سے زیادہ گھر میں موجود انڈے بھون لیے جاتے تھے۔ فریج اور فریزر کا نہ ہونا ایک لحاظ سے نعمت ہی تو تھا کہ ہر گھر میں ہر روز تازہ کھانا بنتا تھا، کوئی بھی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا تھا۔ ایک گھر کا مہمان

پورے گاؤں کا مہمان ہوتا تھا۔ ہر گھر سے لوگ اس مہمان کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے آتے تھے، اس کا مقصد مہمان کو عزت دینا ہوتا تھا۔

گاؤں میں زندگی کی عام سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر تھیں، البتہ لوگوں میں خود شعور تھا، اس لیے انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ہی گاؤں کی صفائی ستھرائی اور بنیادی سہولیات کا بندوبست کر رکھا تھا۔ حکومت کی طرف سے کچھ عرصے قبل ہی لڑکیوں کے مڈل اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ دیا گیا تھا اور یہ خوش آئند بات تھی۔ اس سے قبل تو نوجوان لڑکے بھی دس جماعتیں پڑھ کر ہی بیٹھ جاتے تھے یا پھر شہر میں جا کر چھوٹی موٹی ملازمتیں کر لیتے تھے۔ بہت کم کسی کے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ ان کے بچے بھی شہر جا کر پڑھ سکتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ تو یہی تھی کہ کاشتکاری ان کا بنیادی پیشہ تھا، جس پر انہیں فخر تھا اور انہیں اسی سے اس قدر آمدن ہو جاتی تھی کہ جس سے زیادہ کی انہیں ضرورت ہی نہ تھی۔

چوہدری مراد علی کا یہی خواب تھا کہ وہ اپنے بچوں کو شہر بھیج کر پڑھائیں مگر جہانگیر اور شجاع کے لیے ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ وہ اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے بیٹوں کے سامنے کرتے تھے، اسی لیے شیر علی کے ذہن میں یہ بات بہت شروع سے جم گئی تھی کہ اس کا شہر جا کر پڑھنا اس کے باپ کا خواب ہے۔ بالی کے بغیر شہر جانے کا تصور بھی مشکل تھا مگر بالی کے گھر کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ شہر جا کر رہ سکتا اور تعلیم حاصل کر سکتا۔

بالی اتنا ذہین نہ تھا جیسا شیر علی تھا، استاد جماعت میں جو کچھ بھی پڑھاتے تھے اس پر بالی کم کم ہی توجہ دیتا تھا اسی لیے ہر ٹیسٹ اور امتحان میں کامیابی کے لیے شیر علی اس کی مدد کرتا تھا۔ بالی کھیل تماشوں میں خوش رہتا تھا، گلی ڈنڈا، کنچے، والی بال اور کبڈی وغیرہ...... ان کھیلوں میں سے کبڈی ایسا کھیل تھا جو شیر علی کو بھی پسند تھا۔ دونوں دوست گاؤں کی کبڈی ٹیم کے بہترین کھلاڑی تھے۔ جس میچ میں بھی وہ دونوں ہوتے تھے، اس میچ کا کسی اور ٹیم کے لیے جیتنا ناممکن...... ہوتا تھا۔ اپنے گاؤں کے علاوہ وہ اپنے گاؤں کی ٹیم کے ساتھ دوسرے دیہات میں بھی جاتے رہتے تھے۔

بالی کے گھر کی چھت پر اس روز بھی وہ اپنے معمول کی ورزش کر رہے تھے کیونکہ اگلے روز ان کا ساتھ والے گاؤں میں میچ تھا۔ ان کی ورزش ختم ہوئی تو بالی نے منڈیر سے لٹک کر اپنی اماں کو آواز دی کہ وہ کام والے لڑکے کے ہاتھ ان دونوں کے لیے دودھ بھجوا دیں۔ خود اس نے دو چارپائیاں بچھائیں اور دونوں دوست ان بغیر بستر کی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ سیڑھیوں سے کسی کے قدموں کی آواز آ رہی تھی، وہ یہی سمجھ کر لیٹے رہے کہ بخشو ہوگا۔

”بھائی!“ مترنم سی نسوانی آواز آئی...... ”اماں نے آپ کے لیے دودھ بھجوایا ہے!“

”بخشو کہاں ہے؟“ بالی نے پوچھا۔

”وہ بیمار ہے بھائی......“ وہی آواز دوبارہ آئی۔ ”اماں نے مجھے بھیجا ہے، آپ آ کر مجھ سے جگ گلاس لے لیں!“

”آ کر یہاں رکھ جاؤ، میں لیٹا ہوا ہوں!“ بالی نے وہیں لیٹے لیٹے سستی سے کہا۔ دونوں گھرانوں کے بڑوں میں آپس میں دوستی اور تعلقات کے باوجود ان گھروں کی لڑکیوں اور لڑکوں کا آپس میں آمنا سامنا نہ ہوتا تھا۔ لڑکوں کی دوستی گھر سے باہر تھی، بزرگوں کی طرف سے اس حدِ فاصل کو قائم کر دیا گیا تھا اور اس کی

پابندی بھی کرتے تھے۔ ذرا سا وقفہ آیا شاید وہ سوچ رہی تھی، بالی نے دوبارہ اس سے پوچھا کہ کیا وہ واپس چلی گئی تھی...... پھر قدموں کی آواز آئی، ہولے ہولے چلتے ہوئے وہ آگے آئی اور قریب رکھی میز پر جگ اور گلاس رکھ کر اسی خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔

وہ تو لوٹ گئی تھی، جگ اور گلاس رکھ کر...... بغیر کچھ لیے! لیکن یہ صرف ایک خام خیالی تھی، وہ کسی کا بہت کچھ ساتھ لے گئی تھی۔

"یہ نرگس تھی......" بالی نے کہا۔ "تیسرے نمبر والی، چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے، اسے پڑھنے کا بہت زیادہ شوق ہے، ابا سے کہتی ہے کہ شہر جا کر بھی پڑھنا پڑا تو پڑھے گی...... تو ہی بتا بھلا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیسا؟" شیر علی نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔

"کہاں کھویا ہوا ہے تو؟" بالی نے اسے گلاس میں شربت ملا دودھ بھر کر دیا، وہ غٹا غٹ ایک گلاس چڑھا گیا تو بالی نے اسے ایک اور گلاس بھر کر دیا۔ دوسرا گلاس چڑھا لینے کے بعد جیسے اس کے وجود میں ٹھنڈک سی اترنے لگی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا تو بالی؟" شیر علی نے پوچھا۔

"تو کیا بے ہوش تھا، جب میں تجھ سے بات کر رہا تھا؟" بالی کو اس پر تعجب ہو رہا تھا۔

"یار میرا دھیان نہ تھا تیری طرف!" شرمندگی سے شیر علی نے کہا۔

"کس طرف دھیان تھا تیرا، ذرا مجھے بھی تو علم ہو!" بالی نے چڑ کر کہا۔

"بال کی کھال نہ اتارنا شروع کر دیا کر تو، میں اپنے کل کے میچ کے بارے میں سوچ رہا تھا!" بالی سے جان چھڑانا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ "تیری تیاری ہو گئی ہے کیا؟"

"تو ساتھ ہے نا تو مجھے تیاری کی کیا ضرورت ہے......" بالی ہنسا۔ "یار مجھ سے یہ امید نہ کیا کر کہ میں کلاس میں ہونے والے ٹیسٹ بھی پاس کروں، تجھ سے وعدہ کیا ہے نا کہ سالانہ امتحان میں پاس ہو جاؤں گا، اس وقت محنت کروں گا......"

"بالی اگر تو بے پروائی کرے گا تو تجھ سے چھوٹے بھی تیری ہی تقلید کریں گے، بڑے بہن بھائی چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے چراغ کی طرح ہوتے ہیں، جن کی روشنی سے ان کی زندگیاں بھی منور ہوتی ہیں۔" کتنی سمجھداری کی بات کر رہا تھا وہ حالانکہ عمر میں وہ دونوں برابر ہی تھے۔

"اچھا اب تو مجھے بقراط بن کر نہ دکھا......" بالی نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ "یوں بھی مجھ سے چھوٹی تو ساری بہنیں ہی ہیں، جنہوں نے پانچ جماعتیں پڑھ کر گھر داری کرنی ہے......"

"کیوں؟ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ضروری ہے، اس کے لیے ہمارا مذہب مرد اور عورت میں تفریق نہیں کرتا!" شیر علی نے نکتۂ بحث اٹھایا۔

"اماں اور ابا کا خیال ہے کہ لڑکیوں کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے کہ وہ اپنے خط وغیرہ خود پڑھ سکیں......" بالی نے ہنس کر کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے بالی، کیا تم بھی لڑکیوں کے لیے اتنی ہی تعلیم کو کافی سمجھتے ہو؟" شیر علی نے امید کا ایک

سرا پکڑا۔

"لڑکیوں کے لیے؟" بالی نے قہقہہ لگایا۔ "یار میں تو کہتا ہوں کہ لڑکوں کے لیے بھی اتنی ہی تعلیم کافی ہے...... ہمیں بھی تو پڑھ لکھ کر... بالآخر کاشتکاری ہی کرنی ہے۔"

☆☆☆

"بابو جی! آپ کو معلوم تھا کہ آج ہمارا کبڈی کا بڑا سخت مقابلہ ہے...... پھر بھی آپ نے کہیں اور جانے کا پروگرام بنا لیا ہے؟" شیر علی ذرا ناراض نظر آ رہا تھا۔

"پتا تھا پتر، پتا تھا مگر کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جانا پڑتا ہے!" مراد علی نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "پر تجھ سے پکا وعدہ ہے کہ تیرا میچ ختم ہونے سے پہلے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

"پر بابو جی اگر آپ سارے کھیل کے دوران وہیں ہوتے تو ہماری زیادہ حوصلہ افزائی ہوتی، ہم نے اتنی محنت کی ہے، اتنی تیاری کی ہے......" وہ ٹھنک رہا تھا۔

"کہا ہے ناں پتر، جتنا جلد ہو سکا پہنچ جائیں گے!" مراد علی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

"ٹھیک ہے بابو جی، جلد پنچایت نمٹائیں اور آ جائیں...... زیادہ لمبی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شیر علی نے باپ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں تو بالکل نہیں بولوں گا، جلدی جلدی پنچایت نمٹا کر لوٹ آئیں گے......" مراد علی نے ہنس کر کہا۔

"اپنا خیال رکھنا بیٹا...... میچ کے دوران کسی سے جھگڑا نہ کرنا، کئی طرح کے لوگ آئے ہوں گے، ایسا نہ ہو کہ کسی اور کے پھڈے میں ٹانگ اڑا بیٹھو، شجاع تم بھی جاؤ گے نا شیر علی کا میچ دیکھنے، اس کا خیال رکھنا!" جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا، شیر علی ان سب کی نظروں میں چھوٹا ہی تھا۔

"آپ فکر نہ کریں بابو جی! میں اپنی ذمے داری کو اچھی طرح سمجھتا ہوں!" شجاع نے باپ کو تسلی دی۔

"میں سمجھتا ہوں، میرا بیٹا بہت سمجھدار ہے......" اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا تو چشمِ فلک نے بھی اس نظارے کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"کس سلسلے میں پنچایت ہے آج؟" عابدہ بیگم نے پوچھا۔

"ہے کوئی معاملہ......" انہوں نے ٹالا۔

"پھر بھی کوئی خبر تو ہو کہ کیا معاملہ ہے؟" عابدہ بیگم نے اصرار کیا۔

"چلو پتر تم تیاری کروا پئی جا کر......" مراد علی نے شیر علی کو اٹھایا۔ "کبھی کوئی بات بچوں کے سامنے نہیں بھی کرنے والی ہوتی، تم خوامخواہ اصرار کرنے لگتی ہو!" اور ہولے ہولے پنچایت والے معاملے کی بابت بتانے لگے۔

"آپ خوامخواہ میں دوسرے گاؤں کی بیٹی کے معاملے میں پڑ رہے ہیں، وہ بھی ترکھانوں کی بیٹی۔" عابدہ بیگم نے رسان سے کہا۔

"بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں، اس طرح کی بات نہیں کرتے......" انہوں نے فوراً بیوی کو سرزنش کی۔ "ترکھان بھی تو انسان ہوتے ہیں، ان کی بیٹیوں کے ساتھ کوئی زیادتی کر دے تو اسے کیا اس لیے برداشت کر لینا چاہیے کہ اس کا باپ غریب آدمی ہے...... ہمیں اللہ نے اگر اس قابل بنایا ہے کہ کسی کی بیٹی کے سر پر چادر لوٹا

سکیں تو کیا ہم اپنا فرض پورا نہ کریں؟"

"ہاں...... جیسے کل کو آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو جائے تو بالے ترکھان آپ کی مدد کے لیے آئے گا!" عابدہ بیگم جیسے بے سوچے سمجھے بول گئیں۔

"حیرت ہوتی ہے عابدہ، تمہارے منہ سے ایسی چھوٹی بات سن کر......" مراد علی نے غصے سے کہا۔ "اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ ہمیں کسی کا محتاج نہ بنائے، اس نے ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ ہم کسی کے کام آئیں تو یقین کرو کہ یہ اس کا بہت بڑا کرم ہے ہم پر اور ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

"آپ چائے پئیں گے؟" عابدہ بیگم دل سے اپنے منہ سے نکل جانے والی بے تکی بات پر شرمسار تھیں۔

☆☆☆

اسکول کا بڑا سا میدان اردگرد کے دیہات سے آنے والے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، میزبان گاؤں کے لوگ فرائضِ میزبانی ادا کرتے ہوئے خود کھڑے تھے تاکہ مہمانوں کو جگہ مل سکے۔ ڈھول کی آواز پس منظر میں چلی گئی تھی کیونکہ لوگوں کی بھنبھناہٹ ہی اتنی زیادہ تھی۔ جگہ جگہ ٹھیلے لگے ہوئے تھے اور ان پر کھانے پینے کی اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ گاؤں کے دکانداروں کے لیے یہ بھی کمائی کا ایک موقع تھا، منہ مانگے دام وصول کیے جا رہے تھے، خصوصاً شربت اور لسی بیچنے والوں کی تو اس روز چاندی تھی، گرمی اتنی شدت کی تھی، اس پر میدان بھرا ہونے سے مٹی گرد بھی اڑ رہی تھی اور لوگوں کی پیاس میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھی۔

مٹی اور گرد سے اٹے ہوئے سموسے اور پکوڑے بھی لوگ کھا رہے تھے، وہ بھی مزید ان کی پیاس بڑھا رہے تھے۔ تماشائی تو آ چکے تھے، اب انتظار تھا مہمانِ خصوصی کا...... ایک اور گاؤں کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب مہمانِ خصوصی تھے۔ جیتنے والی ٹیم کو انعامات انہی کے ہاتھ سے دیے جانے تھے۔ میدان میں ایک طرف ایک اونچی جگہ پر ایک میز رکھ کر اس پر نقرئی کپ رکھا گیا تھا جو کہ جیتنے والی ٹیم کو ملنا تھا، تیز دھوپ کی شعاعوں سے وہ کپ چمک کر دور سے نظر آ رہا تھا۔ مقابلے میں شریک ہونے والی سبھی ٹیموں کے کھلاڑی اس کپ کو دیکھ رہے تھے جو اُن میں مقابلے کی ہمت پیدا کر رہا تھا۔

کھلاڑی میدان میں ہلکا ہلکا دوڑ رہے تھے، یہ تماشائیوں کے سامنے کھلاڑیوں کے تعارف کی ایک صورت تھی۔ خوب صورت کسرتی جسم، کسے ہوئے پٹھے اور چوڑے چکلے شانے...... سبھی کھلاڑی اپنی نمائش کر رہے تھے، پس منظر میں مائیکروفون پر ان کھلاڑیوں کا تعارف کروایا جا رہا تھا، جس کھلاڑی کا نام لیا جاتا تھا، وہ میدان کے درمیانی حصے کا پورا چکر لگاتا تھا، اس دوران ڈھول کی تھاپ تیز ہو جاتی تھی اور لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر داد دے رہے تھے، لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ شیر علی کو ساتھ والے گاؤں کے لوگوں پر غصہ آ رہا تھا، جنہیں اسی روز پنچایت رکھنا تھی۔

میدان کا چکر لگاتے ہوئے جب شیر علی اس جگہ کے سامنے سے گزرا جہاں شجاع مہمانِ خصوصی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے چلا کر اسے پکارا تھا۔ "لالہ...... لالہ!" اتنے شور کے باوجود بھی شجاع کے کانوں سے اپنے بھائی کی آواز ٹکرائی تھی اور اس نے ہاتھ ہلا کر اس کو جواب دیا تھا۔

☆☆☆

"نذیر احمد! بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں...... اگر کوئی بیٹی ترکھان کے ہاں پیدا ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کی کوئی عزت نہیں...... اسے جو چاہے اور جب چاہے چٹکی میں مسل دے......" برکت علی پنچایت سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے، جو کہ بالے ترکھان کی بیٹی کے ساتھ زیادتی ہونے پر رکھی گئی تھی اور مجرمان نامعلوم تھے کیونکہ وہ نوجوان لڑکی بالکل بول نہیں رہی تھے اور سکتے کی کیفیت میں تھی، اس وقت سے جب اسے دونوں گاؤں کی سرحد سے انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اٹھایا گیا تھا۔

"جوان خون ہے لالہ! سبھی کے بیٹے یہی کچھ کرتے پھر رہے ہیں، تیرے بھی یہی کر رہے ہیں، ان کمیوں کی بیٹیوں کو چھوڑ کر کیا مزارعوں اور زمینداروں کی......" وہ بولتے بولتے رکا۔

"کچھ خدا کا خوف کر نذیر......" مراد علی نے دہاڑ کر کہا۔ "اللہ نہ کرے کہ میرے بیٹے ایسا کریں اور یقین کرو کہ اگر میرے بیٹوں میں سے کسی نے ایسا کیا اور ثابت ہو گیا تو میں انہیں اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا......" سارے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، مراد علی کی باتیں ہمیشہ اسی طرح کھری ہوتی تھیں اسی لیے تو اسے ہر پنچایت کی اہم ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ "کہاں ہے مجرم، اسے بلاؤ یہاں!"

"جو بات کرنا ہے وہ مجھ سے کریں، انہیں جو ہرجانہ لینا ہے مجھ سے لیں...... جوان لڑکوں کا خون بھی گرم ہوتا ہے، پنچایت کے ادب آداب سے واقف ہوتے ہیں نہ ہی پنچایت کے فیصلوں کو مانتے ہیں!" نور علی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

گاؤں کے دو تین لوگوں نے گواہی دی تھی کہ انہوں نے چوہدری اکبر علی کے کارندوں کو اس بے ہوش لڑکی کو وہاں پھینک کر واپس جاتے دیکھا ہے مگر نور علی اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ زیادتی اس کے بیٹے نے نہیں کی، وہ اس وقت گھر پر تھا، ڈیرے پر اس کے کچھ شہری دوست یار ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر سوال یہ بھی اٹھایا گیا کہ کوئی اس لڑکی کو اٹھا کر نہیں لے گیا، وہ لڑکی خود چل کر اس ڈیرے تک گئی تھی۔ اس بیان کو بھی درست تسلیم کر لیا گیا تھا کیونکہ چند لوگوں نے اسے خود چل کر اس ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ڈیرے کے نزدیک تو کوئی گھر نہ تھا مگر اس راستے سے گزرتے ہوئے بھی اسے کئی لوگوں نے اکثر دیکھا تھا۔

"کسی کی کھوئی ہوئی عزت کا کیا ہرجانہ ہو سکتا ہے نور علی؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ ہمارا یوں یہاں اکٹھا ہونا بالکل بیکار ہے اور تمہارا بیٹا اپنی اڑی چھوڑنے والا نہیں ہے تو پھر یہ معاملہ کورٹ کچہریوں میں طے کر لیتے ہیں...... وہاں کے فیصلوں کو تو تمہارا بیٹا مان ہی لے گا ناں؟" مراد علی کا لہجہ غصے سے بھرپور تھا اور چہرہ لال بھبھوکا......

"نہیں لالہ، میرا یہ مقصد نہ تھا، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ہرجانہ ہی دینا ہے تو مجھے بتائیں، میں ہی دوں گا...... کون سا اس لڑکی سے میرے لڑکے نے نکاح کرنا ہے جو اسے یہاں بلانے کی ضرورت ہے......" نور علی نے ڈر کر کہا۔

"اصولاً تو تمہارے بیٹے کو اس لڑکی سے نکاح ہی کرنا چاہیے تھا مگر میں اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا، جو فیصلہ پنچایت کرے گی وہ درست فیصلہ ہوگا!" برکت علی نے کہا، پھر سبھی لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر سب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، احاطے میں موجود سبھی لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ اس گاؤں کے چوہدری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مخاطب ہوئے۔

"چوہدری نور علی! یوں تو تمہارے بیٹے کا جرم ایسا نہیں کہ جس کی معافی دی جا سکے مگر یہ سوچ کر کہ تم ایک

عزت دار شخص ہو، پنچایت نے تمہارے بیٹے کے لیے ہلکی سزا تجویز کی ہے۔ ایک تو یہ کہ تم اتنی رقم بالے ترکھان کو دو گے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی عزت کے ساتھ کر سکے۔ ان اخراجات کا تخمینہ بھی گاؤں کے تین سمجھدار لوگوں کی کمیٹی کرے گی، اس کے لیے ہم نے گل محمد، ریاست علی اور محمد صغیر کے نام تجویز کیے ہیں، یہ کمیٹی اپنا تخمینہ تیار کر کے پہلے بالے ترکھان اور پھر پنچایت کمیٹی سے اس کو منظور کروائے گی......"

"یہ کیا بات ہوئی؟" نور علی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ سراسر زیادتی ہے......"

"نور علی......!" چوہدری مراد علی نے دہاڑ کر کہا۔ "آرام سے بیٹھو اور پورا فیصلہ سنو......ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں پنچایت کے فیصلے پر اعتراض ہوگا، پوری بات سن لو تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ فیصلے سے اختلاف کی صورت میں تمہارے پاس کیا صورت باقی رہ جاتی ہے......" نور علی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

"جن معاشروں میں قوانین صرف غریبوں کے لیے ہوتے ہیں اور امیر ان سے مستثنیٰ ہوتے ہیں وہ معاشرے ہمیشہ عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں، قانون اور پنچایت کے فیصلوں کا احترام ہم سب پر واجب ہے!" چوہدری مراد علی گویا تھے۔ "دوسری اور اہم بات کہ بالے ترکھان کی بیٹی کے علاج کا خرچہ بھی تم اٹھاؤ گے اور حالات و واقعات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس روز نہ سہی مگر اس سے قبل...... تمہارے بیٹے کے اس سے غلط تعلقات تھے جس کے نتیجے میں وہ ماں بننے والی تھی۔ وہ قصہ تو زیادتی کے اس گھناؤنے واقعے سے خود ہی ختم ہو گیا مگر اکبر علی نے ایک لڑکی کا استحصال کیا ہے، اس سے شادی کرنے پر پنچایت اسے مجبور نہیں کر سکتی......مگر اسے اس لڑکی سے معافی مانگنا ہوگی اور وہ بھی چار مرد گواہوں کے سامنے......"

"میں اس پنچایت کے کسی فیصلے کو نہیں مانتا...... یہ میرے خلاف سازش ہے اور میرے بیٹے کو پھنسانے کی دشمنوں کی ایک چال......" نور علی کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

"کون دشمن ہے تمہارا ایسا نور علی؟" مراد علی نے تحمل سے کہا۔

"تم سے بڑا کون دشمن ہو سکتا ہے میرا لالہ......" نور علی کے ان الفاظ سے مراد علی کو لگا کہ کسی نے ان کے سینے میں برچھی اتار دی ہو۔

☆☆☆

شیر علی کے اسکول کی ٹیم چھ مختلف ٹیموں کے ساتھ کھیل کر سیمی فائنل تک پہنچی تھی اور ان کی ٹیم کا شہرہ چہار اطراف تھا اور اس روز کے مقابلے کے لیے آنے والی ٹیم کو جیت کے لیے ہدف سخت نظر آتا تھا۔ کھچا کھچ بھرا ہوا میدان، گرمی عروج پر اور لوگوں کا شور مل کر ایک سخت ترین مقابلے کی فضا پیدا کر رہے تھے۔

دونوں ٹیمیں میدان میں اتریں اور مارچ کرتے ہوئے پورے میدان کا چکر لگایا، ان دونوں ٹیموں کے کوچ ان کے ہمراہ تھے، جو کہ یقیناً ان اسکولوں کے پی ٹی ماسٹر تھے، اس وقت ان کے سر بھی فخر سے تنے ہوئے تھے کیونکہ ان کی ٹیمیں مقابلے جیت کر فائنل تک آ پہنچی تھیں۔ اپنے کوچ کی ہمراہی میں دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں نے قطار بنائی، ان کا رخ اس طرف تھا جہاں اسٹیج بنایا گیا تھا، جس پر میز اور کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ اسٹیج پر مہمانِ خصوصی کے علاوہ مقابلے میں حصہ لینے والی دونوں ٹیموں کے اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور چند اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان بھی تھے، ان لوگوں کو جج کے فرائض بھی سر انجام دینا تھے۔

ٹیمیں قطار میں کھڑی ہو گئیں تو ڈھول کی تھاپ اور بھی اونچی ہو گئی تھی۔ ڈھول کو رکوایا گیا اور مائیکروفون پر تلاوتِ کلامِ پاک کی صدا گونجی...... پورے مجمع پر تلاوت کے احترام میں خاموشی چھا گئی۔ تلاوت ختم ہوئی پھر اس کے بعد ایک اور طالب علم نے خوش الحانی کے ساتھ نعت پڑھی۔ اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ مقابلہ شروع ہونے والا ہے، قواعد و ضوابط کا اعلان کیا گیا اور پھر ڈھول کی تھاپ پر دونوں ٹیمیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

مجمعے سے دونوں ٹیموں کی حمایت اور مخالفت میں لگائے جانے والے نعرے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس مقابلے کو جیتنا یا ہارنا زندگی کی بازی جیتنے یا ہارنے کے برابر تھا۔ "کبڈی...... کبڈی...... کبڈی...... کبڈی۔" کی آوازیں ہر آواز پر حاوی ہونے لگیں۔

☆☆☆

"میں تمہارا دشمن کیوں ہوں گا نور علی، بھائی ہو تم میرے، میں نے ابھی کہا ہے کہ اگر میرا بیٹا زیادتی کرے گا تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے......"

"یہ انتہا ہے لالہ...... آپ ان ٹکے ٹکے کے لوگوں سے میرے بیٹے کو معافی مانگنے کو کہہ رہے ہیں، ایسے لوگوں کو تو وہ منہ بھی نہیں لگانا چاہتا......" نور علی بپھرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"منہ تو خیر اس نے لگایا ہے نور علی! تم اپنی اولاد کی محبت اور حمایت میں حد سے بڑھ کر جذباتی ہو رہے ہو......" مراد علی نے بڑے تحمل سے کہا تھا۔ "اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا بیٹا بالے ترکھان سے معافی نہیں مانگے گا تو ایسا کرو کہ یہیں ہم سب کی موجودگی میں تم ان سے اپنے بیٹے کی طرف سے معافی مانگ لو...... معافی مانگنے والے کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی مگر جو تمہاری غلطی سے دکھی ہوتا ہے اس کا ذرا بھرم رہ جاتا ہے ورنہ کھوئی ہوئی عزت تو اس کی لوٹ کر نہیں آنے والی!"

"نہیں مانگتی مجھے کسی سے کوئی معافی وافی...... نہ ہی میں اس پنچایت کے کسی فیصلے کو مانتا ہوں!" نور علی کا انداز حتمی اور اکھڑ تھا۔

"پنچایت کے کسی فیصلے سے اختلاف ہونے کی صورت میں تمہارے پاس صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے نور علی، اور نہ صرف یہاں بیٹھے ہوئے بلکہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی ہمارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس سے قبل بھی پنچایت کے فیصلوں سے انحراف کرنے والوں کے لیے یہی راستہ تجویز کیا جاتا ہے اور یہی پنچایت کا فیصلہ تمہارے خاندان کے لیے بھی ہوگا...... اگلے دس دن کے اندر اندر تمہارا بیٹا اس گاؤں میں نظر نہیں آنا چاہیے...... کبھی بھی نہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے یہ گاؤں چھوڑنا ہوگا!"

"اس گاؤں کو کیسے چھوڑ سکتا ہے وہ، یہ ہمارے اور اس کے آباؤ اجداد کا گاؤں ہے......" نور علی نے احتجاج کیا۔

"یہ رسم و رواج، یہ قاعدے یہ پنچایتیں بھی ہمارے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی ہیں، اس گاؤں میں رہنے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے، جو دوسروں کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کا احساس کر سکیں......" مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، ہر کوئی توقع کر رہا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے نور علی ابھی معافی مانگ لیں گے...... مگر نور علی نے اپنی اکڑی ہوئی گردن کو مزید اکڑا لیا اور بغیر کسی کو سلام کیے دندناتے ہوئے احاطے سے باہر نکل

گئے۔ ایک عجیب سا خوف سب کے دلوں میں بس گیا تھا، آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، لوگ نور علی کے بیٹے سے خوفزدہ تھے اور انہیں اس کے گاؤں بدری کے فیصلے سے خوشی ہوئی تھی۔

لسی سے مہمانوں کی تواضع کی جا رہی تھی، چوہدری مراد علی اور سلطان نے اجازت چاہی کیونکہ انہیں اپنے بچوں کا کبڈی میچ ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنے گاؤں پہنچنا تھا، ورنہ ان کے بچوں کے دل ٹوٹ جاتے۔ ملازموں کو ان کے گھوڑے لانے کا حکم ملا تو دو منٹ میں گھوڑے پہنچ گئے۔ دونوں نے اٹھ کر اس محفل میں موجود ہر شخص سے سلام لیا، جاتے وقت ان ملازموں سے بھی ہاتھ ملایا اور اللہ حافظ کہہ کر چل دیے۔ تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ کھیتوں کی طرف سے کسی عورت کی چیخوں کی آواز آئی۔

''کچھ سنا تم نے سلطان؟'' چوہدری مراد علی نے کہا۔ ''کسی عورت کی چیخوں کی آواز آ رہی ہے!''

''آ تو رہی ہے...... مگر اب اگر ہم اس کی تفتیش کرنے چل دیں تو دیر ہو جائے گی، ہوگا کوئی کسی کا آپس کا معاملہ، خود ہی نمٹ لیں گے وہ لوگ!'' سلطان کو بالی کا مایوس چہرہ یاد آ رہا تھا، جو اس وقت ہو گیا تھا جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ اس کے ابا اس کے کبڈی میچ کے بجائے پنچایت پر جا رہے تھے۔

''ہو سکتا ہے کہ کوئی مشکل میں ہو سلطان...... میں کسی کو اس طرح مشکل میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا یار!'' چوہدری مراد علی نے کہا۔ ''اس طرح کی چیخیں سن کر کیا تمہیں یہ نہیں لگتا کہ ہمیں جا کر دیکھنا چاہیے......؟''

''چلو یار جس طرح تم کہو، ویسے تو بہت دیر ہو چکی...... بچے انتظار کر کر کے مایوس ہو چکے ہوں گے......''

دونوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا۔ اسی وقت اچانک فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ تذبذب میں تھے کہ کیا کریں...... اس طرح نہتے کیا وہاں جانا مناسب تھا جہاں تڑ تڑ گولیاں برس رہی تھیں...... ایک طویل لمحۂ فکریہ دونوں کے بیچ اترا تھا۔ فائرنگ کی آوازوں سے گھوڑے بھی بدک رہے تھے۔ اسی وقت ایک اندھی گولی آئی اور وہ ہوا جس کا ان دونوں میں سے کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

شیر علی اور بالی کی ٹیم کبڈی میچ نمایاں برتری سے جیت گئی تھی اور اس وقت میدان میں گاؤں کے لڑکے بالے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈال رہے تھے...... تھوڑی ہی دیر میں تقریب تقسیمِ انعامات ہونے والی تھی۔

شیر علی کی نظروں میں مایوسی تھی اور وہ ہر طرف دیکھ کر لوٹ آئی تھیں مگر اسے اپنے بابو جی نظر نہیں آئے تھے۔

اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ مقابلے میں شامل دونوں ٹیموں کے کھلاڑی قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں، پہلے مہمانِ خصوصی دونوں ٹیموں سے ملاقات کریں گے اور پھر ان کھلاڑیوں میں انعامات تقسیم کیے جائیں گے جنہوں نے اس میچ کے دوران نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کھلاڑی تھکے ہوئے تھے مگر جیتنے والے جیت کی خوشی میں تھے اور ہارنے والے اس احساس کے زیرِ اثر کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

''کاش بابو جی اس وقت تک یہاں آ جائیں جب مجھے بہترین کھلاڑی کا انعام ملنے والا ہے......؟'' شیر علی نے سوچا۔

اچھی خاصی دھوپ تھی اور سورج اپنی گرمی مکمل طور پر زمین پر بھیج رہا تھا کہ اچانک اندھیرا سا چھا گیا، پھر سب نے دیکھا کہ یکایک مغرب کی طرف سے لال لال آندھی اٹھی اور گرد و غبار کا طوفان چھا گیا۔

مرزا مظہر دلی کے مغل شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا اور ان کا نام شہنشاہ عالمگیر نے رکھا تھا۔ مرزا مظہر نے شاہی ماحول اپنانے کے بجائے فقیری اختیار کر لی تھی۔

ایک دن شہنشاہ ہند بہادر شاہ اول ان کے پاس گیا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ بادشاہ کو پیاس لگی۔ اس نے پانی طلب کیا' مرزا مظہر نے کہا ''دیکھو وہ گھڑا رکھا ہے پانی پیالے میں لے کر پیو۔''

بادشاہ نے پانی پیا اور پیالہ گھڑے پر رکھ دیا۔ مرزا مظہر نے دیکھا کہ پیالہ ذرا ترچھا رکھا ہوا ہے۔ وہ دیر تک ترچھی نگاہ سے پیالہ دیکھتے رہے۔ آخر ان سے ضبط نہیں ہو سکا۔ انہوں نے کہا ''جناب' بادشاہت کیا کرتے ہوں گے۔ ابھی تک خدمت گاری تو آئی نہیں کیا گھڑے پر پیالہ رکھنے کا یہی طریقہ ہے؟''

مرسلہ: سامعہ تبسم۔ ملتان

''اللہ خیر کرے...... لال آندھی تو تب آتی ہے جب کسی کا قتل ہوتا ہے......'' گاؤں کے گھروں میں بیٹھی عورتوں نے سوچا اور کچھ نے کہہ بھی دیا۔ مرد بھی یکایک یوں آسمان کا رنگ بدلتا دیکھ کر پریشان تھے۔

دھول اور مٹی کھلے میدان میں بیٹھے لوگوں کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی، ایک بھگدڑ سی مچ گئی تھی...... لوگ بھاگ رہے تھے، مٹی اور دھول سے بچنے کے لیے...... شیر علی اپنی قطار سے نکل کر ایک طرف کو بھاگ پڑا، اس کے وجود میں ایک عجیب سی بے چینی پھیل رہی تھی۔

''قتل ہو گیا ہے...... قتل! بڑا ظلم ہوا ہے، کوئی قتل ہو گیا ہے!'' مجمعے میں آوازیں پھیل رہی تھیں۔

سراسیمگی سی پھیل رہی تھی اور شیر علی کی ٹانگیں کپکپانے لگیں...... شجاع نے دور سے اسے بھاگتے دیکھا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی سمت لپکا جہاں شیر علی کھڑا تھا، قریب جا کر اس نے دیکھا وہ رو رہا تھا۔

''کیا بات ہے شیرو...... رو کیوں رہا ہے تو؟'' شجاع نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''لالہ' بابو جی نہیں آئے......'' وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''ابھی آتے ہی ہوں گے پگلے، اس میں رونے کی کیا بات ہے اور اگر نہ بھی آ سکے تو میں جو ہوں یہاں، میں دیکھوں گا نا اپنی آنکھوں سے اپنے پیارے شیرو کو بہترین کھلاڑی کا انعام ملتے ہوئے......'' اپنے ساتھ لگائے ہوئے وہ اسے واپس اس کی جگہ پر لا رہا تھا، جہاں مجمعے کے شور میں آوازیں نمایاں تھیں۔

''چوہدری نور علی کے بیٹوں نے چوہدری مراد علی کو قتل کر دیا ہے......'' شجاع کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور شیر علی بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گیا۔

☆☆☆

''اماں......'' اس کی نقاہت بھری آواز نے جہاں آرا کو جگا دیا، ابھی تو ان کی آنکھ لگی تھی۔ رات بھر وہ پلک تک جھپکے بنا اس کی پائنتی بیٹھی رہی تھیں' جب تک ڈاکٹر نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور ہر طرح سے خیریت ہے، وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پھرتی رہی تھیں۔

اولاد جیسی بھی ہو مگر جس نے جنا ہوتا ہے اس سے اولاد کی تکلیف کہاں برداشت ہوتی ہے...... چاہے کتنی ہی گستاخ اولاد ہو، چاہے ان سے دھوکا اور مکاری کر لے مگر وہ ایک ماں کا دل رکھتی تھیں جو اپنی اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی ساری زیادتیوں کو بھول جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو الماس نے ہی ان کے بھروسے کو ٹھیس

پہنچائی تھی، پھر دلی بھی...... جواُن کا اپنا تھا، ان کا خون......اس نے ایک ایسی لڑکی سے محبت کی جسے اس کی ماں نے اس کی بہن کہہ کر متعارف کروایا تھا، جانے کس نے اسے بتا دیا...... کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی بہن نہیں ہے اور وہ زمرد کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ صرف یہیں پر بس نہیں...... وہ بھی اس بات کو جانتی تھیں کہ دلی اور زمرد کے مابین کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور غافل تھیں تو وہ۔

سوئی ہوئی الماس کیسی معصوم لگ رہی تھی، فرشتوں جیسی...... جہاں آرا نے تو بہت دعائیں کی تھیں کہ اس کی کوکھ اجڑ جائے...... وہ ان کے کوٹھے کا ہیرا تھی اور ابھی کئی ماہ تک کام کے قابل نہیں ہو سکتی تھی، بچہ ضائع ہو جاتا تو اس سارے قضیے سے جان چھوٹ جاتی۔ مگر ایسے نصیب کہاں...... وہ ایک ماں تھیں، جو دعا کر رہی تھیں کہ ان کی بیٹی کی کوکھ اجڑ جائے...... وہ بچہ جو جائز نہ کہلاتا مگر اس کی حیثیت کو مستند کرنے کے لیے ہی تو پچھلے جمعہ کو نکاح ہوا تھا۔

☆☆☆

قائم علی نے ان کی ساری شرائط مان لی تھیں اور سادگی سے نکاح ہو گیا تھا، پرویز حسب پروگرام وہاں موجود تھا اور پیش پیش تھا۔ اسے اس سارے میں جو حصہ ملنے والا تھا وہ اس کی زندگی کا رخ بدلنے والا تھا۔ نکاح کے بعد قائم علی خالی ہاتھ وہاں سے روانہ ہو گیا، ظاہر ہے اس نکاح کی شرائط میں دلہن کی رخصتی کا نہ ہونا ایک اہم شرط تھی۔ اسی روز وہ اپنے گاؤں لوٹ گیا تھا، زرتاج ماں کے پاس تھی کیونکہ اس کے امتحان ہو رہے تھے۔

معراج کو علم بھی نہ ہوا کہ اس کا شوہر...... صرف اس کا شوہر نہ رہا تھا بلکہ ایک اور عورت کا شوہر بھی بن گیا تھا...... ایک بازاری عورت، اس کی زندگی کی اہم ترین ملکیت کو تقسیم کرنے کے لیے قائم علی کی منکوحہ بن گئی تھی۔ یوں بھی...... معراج نے تو قائم علی سے طلاق کا مطالبہ کر رکھا تھا اور کسی بھی وقت اس کا فیصلہ متوقع تھا۔

☆☆☆

عباس جتنی بلندی سے گرا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے اگر اس کا بچ جانا معجزہ کہا جاتا تو غلط نہ تھا۔ کتنے ہی دن وہ اسپتال میں رہا تھا اور گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ سرکاری اسپتال میں علاج معالجہ تو مفت تھا مگر اس کے علاوہ بھی سو اخراجات تھے۔ زہرہ کو تالا توڑ کر گھر سے باہر نکالا گیا تھا اور اس کی حالت جو پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی، عباس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا سن کر اور بھی خراب ہو گئی۔

چھوٹی سی بچی کے ساتھ وہ روتی پیٹتی اسپتال پہنچی، جب تک اسے دیکھ نہ لیا اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہو گا...... بھلا کوئی کسی عمارت کی پانچویں منزل سے گر کر بچ سکتا ہے مگر اسے زندہ دیکھ کر وہ جیسے خود بھی زندہ ہو گئی۔ سلامت...... ہاں سلامت وہ اتنا نہ رہا تھا۔ جا بجا چوٹوں نے اس کے جسم کو درد کا مجموعہ بنا دیا تھا، تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی، اگرچہ وہ مسکن دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔

زہرہ نے بچی کو اپنی ہمسائی کے ساتھ بھجوا دیا، اس بچی کے ساتھ وہ کہاں ماری ماری پھرتی، ہمسائی نے بھی ہمدردی کے جذبے کے تحت اسے ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی اور خود وہ عباس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ رات بھر سوتی جاگتی، خوف کے مارے عباس کو بار بار جھنجوڑ کر دیکھتی ہوئی...... ہر شب کے جلو سے سحر تو پیدا ہو جاتی ہے، سو اس رات کی بھی صبح ہو گئی، ایسی صبح جو اُن کی زندگیوں میں ایک نیا باب کھولنے والی تھی۔

(باقی آئندہ)

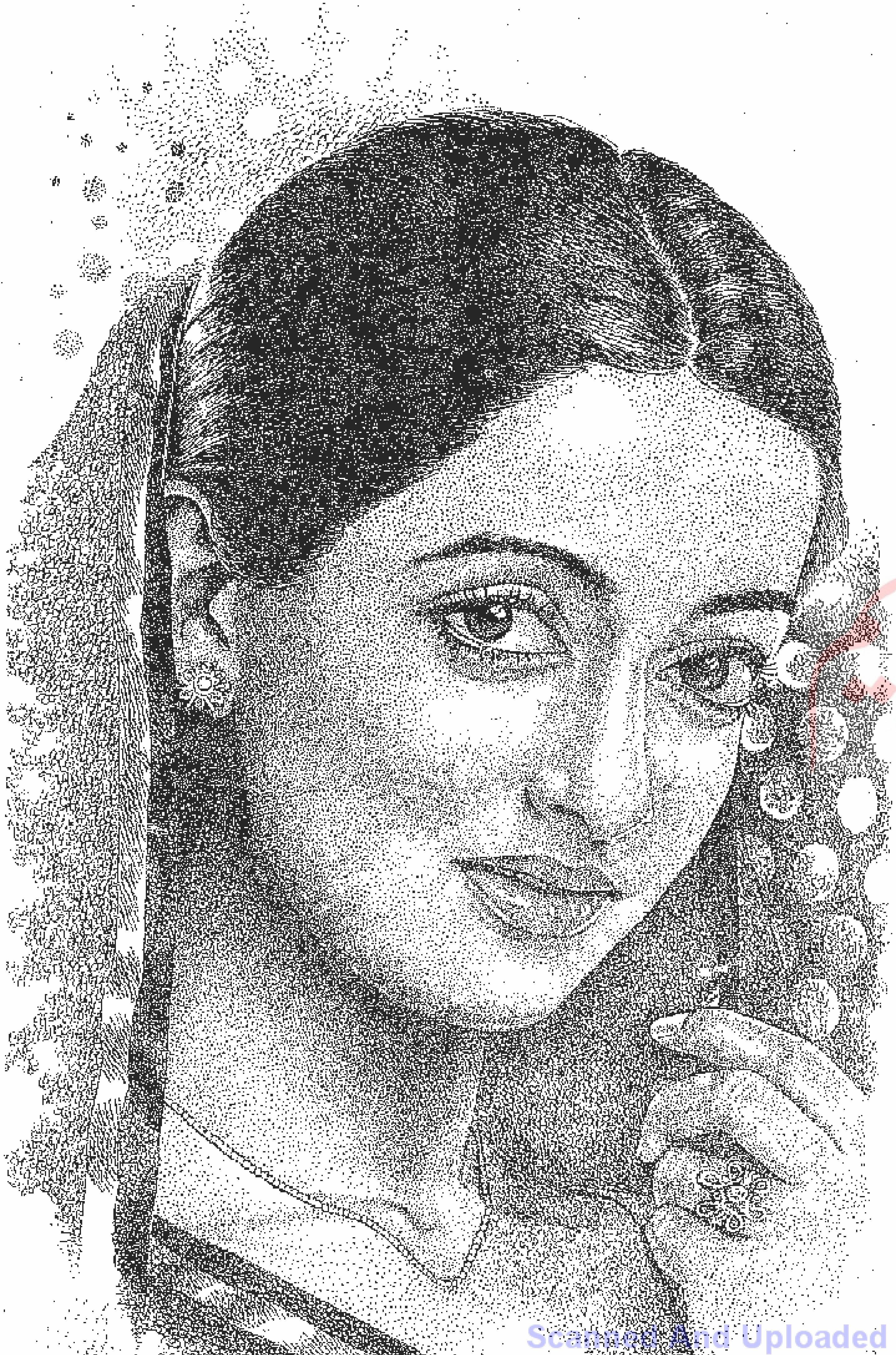
آخری قسط

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

شیریں حیدر

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہیے تھا۔ تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی۔ عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلندوبانگ دعوے کیے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آجاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے۔





سکھاں نے اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھ کر پہچانا بھی نہ تھا...... اسے لگا کہ وہ کوئی بھوت تھا، تار تار لباس، نُچا ہوا بدن، چہرے پر خراشیں، لہولہان...... اسے یہی اندازہ ہوا کہ وہ زندہ نہ تھی، مگر اس کے نحیف سے وجود سے ایک کراہ برآمد ہوئی تو اس سے لپٹ کر سکھاں اور بھی دھاڑیں مارنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے اور اس کی حالت دیکھ کر سکھاں سے ہمدردی کرنے لگے۔

کوئی بھاگ کر کسی کمپاؤڈر کو بلا لایا، اس نے اس کے زخموں کو صاف کرکے ان پر مرہم پٹی کی اور بتایا کہ اسے نزدیکی بڑے قصبے کے اسپتال میں لے جانا پڑے گا۔ مانگ تانگ کر پیسہ جمع کیا گیا اور اسے لے کر وہ اسپتال روانہ ہوئے۔

منت سماجت کرکے، اللہ اور رسول کے واسطے دیئے گئے، ڈاکٹر بھی اس کی بگڑتی ہوئی صورت حال دیکھ رہا تھا، کچھ لوگوں کے مجبور کرنے پر بغیر رپورٹ درج کروائے اس کا علاج شروع کر دیا گیا۔ بچہ تو ضائع ہوگیا تھا، جسم پر تشدد کے آثار بہت زیادہ تھے، کئی دن تک اسے غنودگی میں ہی رکھا گیا تھا کیونکہ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بہت متاثر ہوئی تھی وہ......

اس کے سپنوں کے محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگئے تھے، اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کتوں کی طرح اسے بھنبھوڑ رہے تھے، اس کی تذلیل کر رہے تھے، اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے...... ان سب سے عاری ہوگئی تھی وہ...... اسے فقط وہ الفاظ ذہن کے ایوانوں میں گونج گونج کر تحیر میں مبتلا کر رہے تھے جو اس کے دیوتا نما محبوب نے کہے تھے۔

اس نے کہا تھا...... کہ وہ جانے کس کا بچہ ہے اور وہ اسے اس کے سر مڑھ رہی تھی، اس نے کہا تھا کہ جسے چاہو اس بچے کا باپ بنالو...... کیونکہ وہ بچہ اس کا ہو ہی نہیں سکتا...... اس نے اسے بدکردار کہا تھا، اس پر الزام لگایا تھا کہ اس کے جانے کس کس سے تعلقات ہیں۔ وہ تو اندر تک ٹوٹ گئی تھی، بکھر گئی تھی، اس نے ہر کسی کی نصیحتوں کو فراموش کر دیا تھا، ماں کی، نگی کی...... نشی کی...... وہ جس راہ پر چل نکلی تھی اس پر اسے پھول ہی پھول نظر آتے تھے اور یہ سب لوگ کہتے تھے کہ وہ کانٹوں کی راہ پر چل رہی ہے۔

واہ ری قسمت...... کیا کھیل کھیلا تو نے مجھ محبت کی ماری کے ساتھ! وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

جانے کیوں نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد قائم علی کے ضمیر پر بوجھ سا پڑ گیا تھا، تنہائی میں وہ سوچتا تو اسے معراج کا قصور بھی اتنا نظر نہ آتا، جتنی اسے سزا قائم علی نے دے دی تھی۔

اس کے دل میں ابھی تک معراج کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا، اسے اس کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کا انداز بار بار یاد آتا...... ”کاش وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ نہ کرتی! میں اسے منا کر لے آتا، میں اس سے معافی مانگ لیتا۔ مگر وقت کا بہاؤ ہمیشہ آگے کی طرف رہتا ہے، ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اس بہتے دھارے کا رخ موڑ کر واپس ماضی میں چلے جائیں۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اس وقت کو واپس لے آتا جس دن میں شہر گیا تھا، نہ میں شہر جاتا، نہ معراج کسی اور جگہ...... اور ہماری بیٹیاں ہمارے پاس ہی ہوتیں۔“

ماہ تاج کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہ ملا تھا نہ کوئی اور اتا پتا، اور اس کی موت جیسی بھی بھیانک سہی مگر اس پر اب اسے صبر آ گیا تھا کیونکہ معلوم تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ نہیں صبر آتا تھا تو ماہ پارہ اور حسن آرا کی گمشدگی پر نہیں آتا تھا۔ اگر اسے اس کا دکھ تھا تو کیا معراج کو نہیں......

”میں نے اس کے ساتھ کیسا برا کیا!“ وہ سوچتا اور مزید پریشانی میں مبتلا ہوتا جاتا۔ ”ہم اکٹھے اس دکھ کو بھوگتے تو اس کی شدت کتنی کم ہوتی...... میں نے اپنے لیے مشکل راہ کا انتخاب کیا اور اسے بھی آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ تو اس آزمائش میں پوری اتری کہ کتنے برس سے اس نے آہ تک نہیں بھری اور میں...... میں کیسا کمزور نکلا کہ اپنے نفس کے ہاتھوں کس دلدل میں اتر گیا...... اب میرے لیے جانے کون سی آزمائش منتظر ہے، بیٹا ہوگا یا بیٹی! میری بیٹی اس کو تھے

کی زینت بنے گی؟ بیٹا ہوا تو وہ مجھے مل جائے گا...... مگر میں اس کو کیسے پالوں گا؟ کیا معراج لوٹ آنے کو تیار ہو جائے گی اور اس بیٹے کو پالنے کی ذمے داری قبول کرلے گی؟ کیا وہ میری دوسری شادی کا سن کر بھی لوٹ آئے گی؟ اب تو زرتاج بھی سمجھدار ہے، وہ اس سارے قصے کو جان کر کس ردعمل کا اظہار کرے گی؟ اسے ماں سے جدا کرکے میں نے اس پر اور اس کی ماں، دونوں پر ظلم کیا...... مجھے معاف کر دے میرے مولا!“ وہ چھکوں پھکوں رونے لگتا۔ ”مجھ پر میری استطاعت سے بڑھ کر آزمائش نہ ڈالنا! معراج کے دل میں میرے لیے نرمی پیدا کر دے، میرا اجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے...... اور...... میرے مولا...... التماس ہے مجھے بیٹی نہ دینا...... میں اپنی بیٹیوں کی پیدائش پر کبھی نالاں نہ تھا، تو جانتا ہے! میں تو اس بات پر خوش تھا کہ میرے نبی ﷺ کو بھی تو نے بیٹیاں دیں اور مجھ ناچیز کو، اس حقیر امتی کو بھی اس قابل جانا کہ میں ان بیٹیوں کی پرورش کرکے، ان کے فرض سے فارغ ہوکر، روزِ قیامت اپنے نبی ﷺ کی قربت پاتا، مگر میرے نصیب ایسے نہ تھے۔ شاید میرے لیے یہ آزمائش تھی اور میں اس میں صبر کا مظاہرہ نہ کرسکا۔ مجھے معاف کر دے اللہ! اور میری بیٹیاں اگر زندہ ہیں تو انہیں کسی نیک کی پناہ میں رکھنا، ہماری آزمائش کو طویل نہ کرنا اور ہمیں ان سے جلد ملا دینا!“ رو رو کر اس کی ڈاڑھی بھیگ گئی تھی، اس نے اٹھ کر وضو کیا اور مصلے پر کھڑا ہوگیا، اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

”زرتاج باجی کس چیز کا امتحان دینے گئی ہیں شہر ماسی جی؟“ اس نے پوچھا، نقاہت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”اس کے بارھویں جماعت کے دو پرچے رہ گئے تھے، پچھلی بار اس کی تیاری نہ تھی اور پھر باہر سے اس کے مامے بھی آ رہے ہیں بچوں کی چھٹیوں میں، اس لیے وہ کچھ دن اور رہے گی وہاں!“ معراج بی بی نے وضاحت سے بتایا۔ ”تو بتا اب کیسا محسوس کر رہی ہے؟“

”بہتر ہوں ماسی......“ اس نے کراہ جیسی آواز نکالی۔

”اس کم بخت نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر مارنے والے سے بچانے والی ذات بڑی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بچے کی حفاظت کی ہے جو تمہاری کوکھ میں پل رہا ہے......“

”مگر میرے پورے جسم میں بہت درد ہے...... وہ آیا نہیں، میرا پوچھنے؟“ اس نے پوچھا۔

”پڑا ہوگا کہیں نشہ کرکے......“ معراج نے غصے سے کہا۔

”میں کب تک اٹھ کر اپنے گھر جانے کے قابل ہو جاؤں گی؟“

”کلثوم...... تیرے گھر کو ہمسائے تالا لگا کر چابی مجھے دے گئے ہیں اور اسے انہوں نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے!“

”مگر وہ کہاں جائے گا، کہاں سوئے گا، کہاں سے روٹی کھائے گا؟“ اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ تو اس کے لیے پریشان ہو......“ معراج نے کہا۔ ”میں نے تیری بھلائی کے لیے کچھ سوچا ہے...... تو ٹھیک ہو جا پھر بتاؤں گی اور اب میں تجھے اس وقت تک تیرے گھر نہیں جانے دوں گی، جب تک اسے اپنی زیادتی کا احساس نہ ہو اور وہ ناک رگڑ کر تجھ سے معافی نہ مانگنے آئے......“

”ایسا دن تو کبھی نہیں آنے والا ماسی، مجھے واپس جانا ہی ہوگا، وہ جیسا بھی ہے...... میرا شوہر تو ہے اور میں اس کا خیال نہ رکھوں گی تو اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“

”لعنت ہے ایسے شوہر پر...... جانے تیرے ماں باپ کے کس گناہ کی سزا کے طور پر یہ تیرے پلے پڑ گیا ہے، تیری ماں سے میرا بڑا پیار تھا اور اس ناتے مجھے تکلیف ہوتی ہے جب میں تجھے تکلیف میں دیکھتی ہوں، تجھے دیکھ کر مجھے میری ماہ تاج یاد آ جاتی ہے......“ معراج کی آنکھیں بھر آئیں۔

”کہاں ہے ماہ تاج اب؟“ کلثوم نے پوچھا۔

”وہ مرگئی تھی......“

”کیسے؟“ حیرت سے اس نے پوچھا۔

”اسے کسی نے قتل کردیا تھا......“ معراج نے سنبھل کر کہا۔ ”سات برس کی تھی وہ، اب ہوتی تو تیرے جتنی ہوتی!“

”اس بے چاری سے کسی کی کیا دشمنی تھی جو اسے قتل کردیا؟“ حیرت سے کلثوم نے پوچھا۔

”لڑکی کا لڑکی ہونا...... اس کا کمزور ہونا ہی مردوں کو اس کا دشمن بنا دیتا ہے......“ معراج بی بی نے کہا، جسے کلثوم کچھ نہ سمجھی تھی۔

”اوہو...... بڑا دکھ ہوا سن کر...... آپ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھیں ماسی“ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میرا بھی اس دنیا میں ہے کون!“

”تو میری بیٹی ہی تو ہے، اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب تو یہاں سے اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک میں نہ کہوں“۔

”مگر میں یہاں کیا کروں گی، کیسے رہ سکتی ہوں اور کتنا عرصہ......“

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے کلثوم......“ معراج نے کہا۔ ”اب جلد ہی زرتاج کی شادی ہوجائے گی، اسے میں نے کچھ کام سکھادیا ہے اور کچھ وہ سیکھ رہی ہے۔ اپنے طور پر اس نے کوئی کیس نہیں کیا مگر اس کی مدد میرے کام کو آسان کردیتی ہے۔ مجھے تو اعتماد ہے کہ وہ اپنے طور پر کیس کرسکتی ہے مگر وہ ذرا گھبراتی ہے......“

”چلیں جب ان کے سر پر پڑے گی تو وہ خود ہی شروع کردیں گی......“ کلثوم نے کہا۔

”کلثوم! تو کتنی جماعتیں پڑھی ہے بیٹا؟“

”ماسی میں تو صرف پانچویں تک ہی پڑھ سکی ہوں......“ اس کے انداز میں شرمندگی تھی۔ ”لالے کو میرا گھر سے باہر جانا پسند نہ تھا!“

”تیرا باہر جانا اسے کیوں کھٹکتا تھا، خود تو وہ...... باہر منہ مارتا پھرتا تھا اور تیری زندگی کو عذاب بنا گیا اور تیری ماں کو بھی اسی کی حرکتیں لے ڈوبیں۔ وہ غریب تو اپنی زندگی کی بازی ہار گئی اور سزائیں ساری تیرے لیے رہ گئیں!“

”اماں کا شاید وہی وقت تھا جانے کا...... مگر میرے لیے واقعی جانے یہ کیوں قسمت میں لکھا تھا: میں نے کیا گناہ کیا تھا؟“ وہ رونے لگی، معراج نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی اور اس کے آنسو پونچھے۔

”بس میں نے سوچا ہے کہ تجھے یوں بے بسی کی زندگی نہ گزارنے دوں گی، میں تجھے اپنا کام سکھاؤں گی اور شہر سے کتابیں لاؤں گی تاکہ تو کچھ آگے پڑھ بھی سکے، زرتاج تجھے پڑھائے گی اور میں خود بھی!“

”آپ پڑھی لکھی ہیں ماسی؟“ حیرت سے اس نے سوال کیا۔

”ہاں بس...... کچھ پڑھا ہی تھا اچھے وقتوں میں!“

”کتنی جماعتیں پڑھیں آپ نے؟“

”کبھی گنی نہیں......“ معراج نے ہنس کر بات ٹالی۔

”اس کا مطلب ہے کہ بہت سی جماعتیں پڑھی ہیں آپ نے!“ وہ بھی بہت دن کے بعد کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”تو بھی بہت سا پڑھ سکتی ہے کلثوم...... اور بہت کچھ سیکھ بھی سکتی ہے، سیکھنے کے لیے عمر کی کوئی حد نہیں ہوتی!“

”پر اب تو مجھے گھر جانے دیں ماسی!“

”کیوں تو اپنے بچے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے؟“ معراج نے اسے ڈانٹا۔ ”چپکی پڑی رہ اور اب تو نے اس کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!“ ڈانٹ سن کر کلثوم سہم گئی تھی۔

☆☆☆

”آپا...... دو ایک دن کے لیے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں کسی کام سے کہیں جانا چاہ رہا تھا، سیما کو ساتھ نہ لے جا سکوں گا!“ شاکر نے سلمٰی سے بات کی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی بہنوں سے مل کر آئے اور ان کی کوئی مالی مدد...... بھی کر آئے گا، اگر سلمٰی کو یہ بتاتا کہ اپنی بہنوں سے ملنے جارہا ہے تو وہ یہ سوچتی کہ اس بچی کو لے کر وہ اپنی بہنوں کے پاس کیوں نہیں گیا۔ بہت سے سوالوں سے بچنے کا یہی طریقہ تھا جو اس نے اختیار کیا تھا۔

”کب تک لوٹ آئیں گے؟“ سلمٰی نے پوچھا تھا۔

”جتنا جلد ہوسکا...... کچھ تو سیما کی وجہ سے اور کچھ اپنے کام کی وجہ سے بہت دن کے لیے جا ہی نہیں سکتا!“ اس نے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں جلد ہی...... اب آپ اپنا گھر بسا لیں، اگر گاؤں جارہے ہیں تو اپنی شادی کا دن مقرر کرکے ہی لوٹیں، ابھی تو سیما بچی ہے اور اس کے لیے ہر اس عورت کو ماں کے روپ میں قبول کرنا آسان ہوگا، جوں جوں بڑی ہوتی جائے گی توں توں سمجھدار ہوگی اور اسے رشتوں کی سمجھ بوجھ ہوجائے گی۔ اس کے لیے جب سگی اور سوتیلی کا مفہوم سمجھنا آسان ہوجائے گا تو......“

”میں خود بھی ان باتوں کو سمجھتا ہوں آپا اور جلد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔ گاؤں جاؤں گا تو آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی، میرا گاؤں بھی دیکھ لیں گی اور باقی کام تو ہوں گے ہی!“ اس نے مسکرا کر کہا تھا مگر سلمٰی کو اس کے چہرے پر شرم کا لال رنگ پھیلتا نظر آرہا تھا، بھلا مرد بھی شرماتے ہیں، اس نے دل میں سوچا تھا۔

☆☆☆

”ہاں تو پرویز صاحب......“ گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے جاوید نے پوچھا۔ ”کیا کام کرتے ہیں آپ؟“

”ہر کام کرلیتا ہوں جاوید صاحب...... زیادہ خوشی تو مجھے آپ جیسے دوستوں کی خدمت کرکے ہوتی ہے!“ اس کی آواز معتدل تھی کیونکہ پینا اس کا روز کا معمول تھا جبکہ جاوید جیسے لوگ جو کبھی کبھار اور چھپ چھپا کر پیتے ہیں، انہیں دو تین گلاس ہوش و حواس سے بیگانہ کردینے کو کافی ہوتے ہیں۔

سائرہ نے جاوید سے کہا تھا کہ وہ پی۔ کے کے بارے میں جانچ پڑتال کرے اور اس جانچ پڑتال کے عمل میں دو تین ملاقاتوں میں ہی پرویز جان گیا تھا کہ جاوید کس کھیت کی مولی ہے۔ اسے اسی کے مزاج کے مطابق شراب و شباب کے وہ جلوے دکھائے تھے کہ وہ اس کا مرید ہوگیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سائرہ نے اسے کیا ذمے داری تفویض کی تھی اور اسے کس نظر سے پرویز کو جانچنا تھا، مریم...... جسے اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹی کہا تھا، اس کے ساتھ شادی کے لائق وہ تھا کہ نہیں؟ مگر اس نے اپنے شوق اور نشے میں انصاف سے کچھ نہ جانچا، اسے پرویز ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔ خوبرو جوان تھا، کماؤ تھا...... کمائی کا ذریعہ کیا تھا؟ یہ تو وہ پوچھتا جو مریم کا سگا ہوتا۔ وہ مریم کو خوش رکھے گا اور اس سے بے وفائی تو نہیں کرے گا؟ اس کی فکر تو اسے ہوتی جس کا مریم سے کوئی رشتہ ہوتا...... خونی یا اخلاقی۔

اور یوں ایک مریم قربان ہوگئی۔ ایک لالچی آدمی کے گھٹیا جذبات کی نذر کردی گئی، وہ جو اسے زیر کرنا چاہتا تھا، اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے تو شادی سے کوئی غرض نہ تھی، فقط چار دن اس سے تعلق رکھتا اور پھر اسے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتا۔ مگر اسے علم ہوگیا تھا کہ وہ شادی کے بغیر حاصل ہونے والی ”چیز“ نہ تھی۔

سائرہ مطمئن تھیں مریم کے لیے، نہ صرف جاوید نے انہیں سب اچھا کی رپورٹ دی تھی بلکہ مریم بھی اس سے ملاقات کے بعد کسی شک و شبے میں مبتلا نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سائرہ اور جاوید کے مابین تعلقات بالکل ٹھیک تھے، اس وقت تک سائرہ کو علم نہ تھا کہ جاوید کن کن بری عادات میں مبتلا تھا۔ گھر اور باہر کی ذمے داریاں دونوں مل بانٹ کر چلاتے تھے اور زندگی سہل انداز میں گزر رہی تھی۔

سادگی سے شادی ہونا تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تیاریاں تو کی جانی تھیں، جو کہ خفیہ طریقے سے کی جارہی تھیں۔

سائرہ دونوں طرف کی خریداری کر رہی تھیں اور اپنے گھر پر ہی سارا سامان رکھ رہی تھیں۔ اندیشوں اور فکروں کے باوصف بھی وہ انتہائی خفیہ طریقے سے گھر پر اسکول کے تین روزہ ٹرپ کا بتا کر بے سروسامان نکلی اور سائرہ آپی کے گھر پر ہی چند لوگوں کی موجودگی میں اس کا نکاح پرویز سے ہو گیا۔ اس کے دل کو کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ ایک مسلمان کی بیوی بنی ہے اور مسلمان اولاد کو جنم دے گی۔

جب وہ رخصت ہو کر پرویز کے ہمراہ اس کے متوسط سے گھر میں پہنچی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے طور و طوار...... اس کے گھر کی حالت سے ہرگز میل نہ کھاتے تھے۔ مگر اسے ان باتوں سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ بھی تو سنیتا آنٹی کے گھر پر رہ رہی تھی اور وہ ساری شان و شوکت اس کی ملکیت نہ تھی۔ پرویز بھی اتنا امیر نہ تھا جتنا دکھائی دیتا تھا، مگر اسے اس سے کیا فرق پڑتا تھا، اسے تو فقط اپنے ماضی سے کٹنا تھا اور اس کے لیے ایک نیا طرزِ زندگی درکار تھا...... وہ اسے پرویز کی ہمراہی میں مل سکتا تھا۔

☆☆☆

”مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہیں یا تم واقعی میرے قریب بیٹھی ہو!“ اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا جو کہ حرف بہ حرف حقیقت تھا، اسے واقعی اندازہ نہ تھا کہ کبھی مریم خود اس سے تنہائی میں ملنے کی خواہش کا اظہار کرے گی۔ اپنی دلی کیفیت کا اظہار مریم کے سامنے کرنے میں اسے کوئی عار محسوس نہ ہوا تھا۔

”میں کوئی رومانوی گفتگو کرنے کے لیے یہاں آپ سے ملنے نہیں آئی...... بلکہ آپ سے کھل کر کوئی بات کرنے آئی ہوں!“ مریم نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

”میں ہمہ تن گوش ہوں......“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر عاجزی کی اداکاری کی۔

”اور میں بے حد سنجیدہ ہوں!“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، ”اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں؟“

”کس قسم کی کہانی اور کیوں...... میرا مطلب ہے کہ مجھے کیوں؟“ اسے حیرت ہو رہی تھی، وہ تو کسی اور ہی تاثر اور خواہش کے زیرِ اثر ملاقات کرنے کو آیا تھا۔

”اس سوال کا جواب میں آپ کو کہانی کے آخر میں دوں گی......“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اور جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں وہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ میری زندگی سے اس کہانی کا تعلق تو ہے ہی، ممکن ہے کہ آپ بھی اس کہانی کے کردار بن جائیں......“

”ہاں ہاں...... کیوں نہیں، تمہاری زندگی کی کہانی کا کردار بن کر مجھے خوشی ہو گی!“ اس نے باچھیں پھیلا کر کہا تھا۔

☆☆☆

لکی کی ملاقات اس نوجوان سے گاؤں کے میلے میں ہوئی تھی، وہ اپنے ماما کے پاس مرادنگر گئی تھی اور وہاں سے ان کی بیٹیوں کے ہمراہ میلے میں گئی تھی۔ بھرے میلے میں اس کا سامنا اچانک اس نوجوان سے اس وقت ہوا جب سرکس کے خیموں میں سے ان کے جانور نکل بھاگے، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور جس کا جدھر منہ آیا، بھاگ اٹھا۔ لکی کی ماموں زاد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک سمت کو بھاگی، وہ اس اچانک صورتِ حال کے لیے تیار نہ تھی اس لیے بوکھلا گئی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کا پاؤں مڑ گیا۔ سرکس کے جانور اگرچہ اتنے خطرناک نہ تھے مگر شیر جیسے جانوروں کی دہشت ہی کافی ہوتی ہے۔ تھوڑی سی دیر اس نے لکی کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر اپنی موت کے خوف نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

”کون ہو تم لڑکی اور کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں......“

”میں مہمان ہوں اس گاؤں میں اور میرا پاؤں مڑ گیا ہے......“ اس نے تکلیف سے کہا، ”میرے ماموں کی بیٹی کسی کو مدد کے لیے بلانے گئی ہے، ابھی آتی ہی ہو گی!“

”جب تک شیر پہنچ کر تمہیں کھا چکا ہو گا!“ اس نے اسے ڈرایا۔ ”اگر تمہیں منظور ہو تو میں تمہاری مدد کر دوں؟“ جان کو خطرہ لاحق ہو تو کیسے اعتراض اور کیسا اعتراض ہوتا، وہ بھی اس جیسا خوبرو نوجوان مدد کی پیش کش کر رہا ہو تو...... اس کے بعد ان کے درمیان اگلے چند دنوں میں کچھ خفیہ ملاقاتیں ہوئیں، لکی کی ماموں زاد ربیکا ان کی ان ملاقاتوں کی رازدار تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نظر ایک عیسائی لڑکی سے لڑ گئی ہے مگر عشق جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو ذات پات کو کب گردانتا ہے۔

ستاروں کے آگے کے جہاں کون کون سے ہیں، اس کا اندازہ عشق کے ابتدائی مراحل میں کب ہوتا ہے، اسی لیے وہ اپنے انجام سے بے خبر یہ مراحل طے کرتے رہے۔ لکی کو اب مرادنگر آنا اچھا لگتا تھا کیونکہ وہاں اس کی آنکھوں کی تراوٹ اور دل کی ٹھنڈک کا سامان تھا، اس کا سلطان تھا...... پھر عشق ایسا سر چڑھ کر بولا کہ ہر شے غیر اہم ہو گئی، فقط ان دونوں کی اپنی ذات اور خوشی کے سوا۔ مذہب کی دیوار قائم رہی اور باقی حدیں اور فاصلے مٹ گئے، ربیکا کی مدد سے انہوں نے لکی سے چھوٹی بہن کی ایک شہری سہیلی کو راز دار بنایا اور ان دونوں کا خفیہ نکاح ہو گیا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اسے مذہب تبدیل کرنے پر منا لے گا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر شہر چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے، اس سلسلے میں ساری تیاریاں اور انتظامات مکمل تھے کہ ان کے منصوبے کا علم سلطان کے باپ کو ہو گیا، کایا پلٹ ہو گئی۔ دودھ نہ بخشنے اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے کر اس کا عشق کافور کر دیا گیا، راتوں رات...... اس کے سارے منصوبے ملیامیٹ کر دیے گئے، اس سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا لیے گئے اور اس کا نکاح گھر میں موجود اس کی یتیم پھوپھی زاد سے کر دیا گیا، جو کہ اسی گھر میں رہ کر جوان ہوئی تھی اور اس سے بچپن سے منسوب بھی تھی۔

اس کا بچپن سے اس سے منسوب ہونا اور اس کا اس گھر میں ہمہ وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنا...... کچھ بھی سلطان کو اس کی طرف مائل نہ کر سکا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ ماں کے ترلے منتوں اور باپ کی مرنے یا مار دینے کی دھمکیوں کا شاخسانہ تھا کہ وہ اس رات اس کے پہلو میں تھا...... اس کے شوہر کی حیثیت سے!

گاؤں کے باہر ایک ٹیلے پر وہ دونوں کھڑی تھیں، چادروں سے ان کے وجود چھپے ہوئے تھے اور دور سے دیکھنے پر یہ بھی علم نہ ہوتا تھا کہ وہ مرد تھے یا کہ عورتیں۔ بارھویں تیرھویں رات کا چاند اپنی چاندنی سے بار بار ان کا راز کھولنے کی کوشش کرتا مگر وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد دبک کر بیٹھ جاتیں۔ کسی کو علم بھی نہ تھا ان کی وہاں موجودگی کا، سوائے سلطان کے کہ جس کے ساتھ یہ سارا منصوبہ طے ہوا تھا، جانے ان کا بھید سلطان کے باپ کو کیسے معلوم پڑا تھا کہ سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ لکی کے گھر پر وہ دونوں مرادنگر جانے کا بتا کر نکلی تھیں، چند کوس کا فاصلہ انہوں نے اس طرح طے کیا آہستہ آہستہ کہ وہ رات تک وہاں پہنچیں اور گاؤں سے باہر ہی انتظار کرنے لگیں، سلطان کو عشا کے بعد آ جانا تھا کیونکہ اس وقت گاؤں میں سب سو چکے ہوتے ہیں۔

رات ڈھل رہی تھی، مسجدوں سے فجر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں جب وہ دونوں آگے پیچھے مجرموں کی طرح گھر میں داخل ہوئیں...... لکی کے ماموں غضب ناک حالت میں ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ”آیا نہیں وہ تمہیں لینے؟“ سوال تھا یا بم کا گولہ...... وہ دونوں ہکا بکا ان کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

”زیادہ شور مت مچاؤ جوزف...... ان کی بے وقوفی کے بارے میں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں، اس کی ماں بھی میری بیٹی کو ہی قصوروار کہے گی اور اگر ہم اس بات کو یہیں دفن نہیں کریں گے تو تمہیں علم ہے کہ پیٹرس کتنا بددماغ ہے...... وہ اس آوارہ لڑکی سے شادی پر آمادہ نہیں ہو گا، یہ بدبخت تو یہ بھلا بیٹھی ہے کہ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے اور میں کبھی بھی اپنے بیٹے کی شادی نہ کرتی اگر اس کے بدلے میں میری بیٹی کا رشتہ اس کے بھائی کے ساتھ نہ ہوتا......“ ممانی نے اس پر گویا احسان کیا۔ ”میں اس غلطی کو صرف اس صورت میں معاف کر سکتی ہوں کہ اگر یہ تمہاری آخری غلطی ہو تو.....“

ہوتو......'' وہ کبھی اس شادی پر آمادہ نہ ہوتی جو اپنی آنکھوں سے طلاق نامہ نہ دیکھ لیتی اور اس پر مستزاد ہنگامی طور پر ہونے والی شادی کے شادیانوں کی آوازیں اپنے کانوں سے نہ سن لیتی۔ اس کی بربادی، کسی کی شادی کے جشن کے طور پر منائی جا رہی تھی۔

جلد ہی پیش بندی کے طور پر اس کے خاندان کے بزرگوں نے آپس میں بات چیت طے کی اور اس کی اور ربیکا کی شادیاں ایک ہی دن ہو گئیں۔ شادی سے قبل ہی اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ سلطان سے محبت کی امانت کی حقدار ٹھہری تھی مگر اس راز کو اس نے خود تک محدود رکھا تھا کیونکہ ربیکا سمیت سب کو یہی علم تھا کہ اس کا اور سلطان کا بندھن صرف کاغذی تھا۔ ان کے علم میں یہ نئی بات لا کر وہ اپنا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور یوں اس نے اپنی ساری زندگی پطرس کے ساتھ خلوص سے گزاری، اس طرح کہ مریم کی ذرا قبل از وقت پیدائش نے بھی کسی کو اس فکر میں مبتلا نہ کیا کہ وہ بیٹی پطرس کی نہیں۔

ایک گاؤں میں رہ کر بھی لکی نے یوں زندگی لوگوں سے کٹ کر گزاری کہ عمر بھر اس کا سامنا سلطان سے نہیں ہوا۔ جس طرح اس کی شادی کی خبر لکی کو مل گئی اسی طرح لکی کی شادی کی خبر بھی اسے ملی، جسے اس نے معمول کی خبر سمجھ کر سنا ہوگا کیونکہ وہ اپنے گھر میں اطمینان سے رہ رہا تھا، جو اسے لکی سے شادی کی صورت میں میسر نہ ہوتا۔ مریم کی پیدائش نے لکی کے دل سے باقی سب چیزوں کو نکال دیا اور وہ اپنے گھر، شوہر اور بچوں میں مصروف ہو گئی۔ مریم کے بعد چار بہن بھائی اور بھی ہیں اور آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ کس کی کہانی ہے......'' اس نے ایک طویل سانس لی۔

''لیکن میں اس میں کہاں ہوں...... اور جب لکی نے کسی کو نہیں بتایا کہ مریم، پطرس کی بیٹی نہیں تھی تو تمہیں کیسے علم ہوا؟'' اس کا سوال منطقی تھا۔

''جب مریم جوان ہوئی تو اسے اپنے مذہب کے بجائے اسلام کی محبت میں مبتلا دیکھ کر لکی کو اندازہ ہوا کہ اس کے خون میں اس مذہب سے محبت ہے اور وہ جیسے بھی چاہے گی اسے اس مذہب سے دور نہ رکھ سکے گی۔ اس لیے اس نے اسے خود سے دور، شہر بھیجنے کا ارادہ کیا جہاں سینتا آنٹی اور ڈیوڈ انکل کے پاس رہ کر اسے آزاد ماحول ملے گا جو اسے عیسائیت کی طرف راغب رکھے گا۔ شہر بھیج کر گویا انہوں نے میرے لیے آسانی پیدا کر دی تھی۔ یہاں آ کر میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا اور چوری چھپے اپنی عبادات کرتی رہی۔ اس کے بعد میں نے اپنی ماں کو اپنے قبول اسلام کے بارے میں بتایا تو تب اس نے مجھے بتایا کہ میری رگوں میں ایک مسلمان باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے بعد میری کوشش تھی کہ مجھے کوئی اچھا آدمی مل جائے...... تو میں اس سے شادی کر لوں، اس سے قبل کہ میری شادی کسی عیسائی سے طے کر دی جائے......''

''تو تمہارے خیال میں میں ایک اچھا آدمی ہوں؟'' وہ زیر لب مسکرایا۔ ''ویسے تم اچھا آدمی سے کیا مراد لیتی ہو؟''

''صرف وہ جو مجھے چاہتا ہو اور میرے ساتھ ہر مشکل میں نباہ کر سکے...... زمانے کے خلاف میری خاطر نبرد آزما ہو سکے، خصوصاً جو مشکلات اس سے شادی کرنے کے نتیجے میں درپیش ہوں گی!'' اس نے سادگی سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

''ممکن ہے کہ تم مجھ سے زیادہ توقعات وابستہ کر بیٹھی ہو، میں وہ نہ ہوں جو دکھائی دیتا ہوں......'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں اتنا امیر نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو گی!''

''مجھے کسی کے پاس کم یا زیادہ دولت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' اس نے فوراً کہا۔ ''بس اسے میرا اور میرے جذبات کا خیال ہونا چاہیے......''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں صرف میری محبت کی ضرورت ہے؟'' اس نے مریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا اور وہ بے طرح شرما گئی تھی۔

☆☆☆

چوہدری مراد علی کا قتل...... اور وہ بھی اپنے بھتیجے کے ہاتھوں، بلاشبہ مراد نگر کے علاوہ اردگرد کے دیہات کے لیے

بھی ایک سانحۂ عظیم تھا۔ شجاع تو غیظ و غضب کی حالت میں ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ عابدہ بیگم کے لیے صدموں کا کوہ گراں گرا تھا۔

سب سے برا حال تو رابعہ کا تھا، جس کے لاڈ اٹھانے والے بابا کا قتل...... اسے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ غنودگی کے عالم میں پڑی تھی، ہوش میں آتی تو حقیقت سے باخبر ہوتی اور رو رو کر نڈھال ہو جاتی۔ معراج نے عابدہ بیگم کو مشورہ دیا کہ اسے شہر بھجوا دیں ورنہ اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ عابدہ بیگم نے معراج کی منت کی کہ اس وقت وہی وہاں جا سکتی تھی۔ مگر انہیں شہر کون لے کر جاتا؟ شیر علی تو چھوٹا تھا، کسی حادثاتی صورت حال کو نہیں سنبھال سکتا تھا، جہانگیر ہرگز اس وقت گاؤں سے نہ جا سکتا تھا کہ وہ بڑا تھا اور باپ کی آخری رسومات کے وقت اس کی موجودگی سب سے اہم تھی۔ قرعہ شجاع کے نام نکلا تھا، بلکہ یہ تجویز ہی جہانگیر نے دی تھی، اس طرح اسے گاؤں سے بھیجا جا سکتا تھا۔ ماں نے منتیں کیں کہ جنازے کے فوراً بعد انہیں شہر روانہ کر دیا جائے۔ جنازے کے وقت تک رابعہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی تھی...... اتنی کہ عابدہ بیگم تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ معراج نے انہیں تسلی دی کہ بروقت شہر پہنچ گئے تو خطرے والی کوئی بات نہ ہو گی۔ رابعہ درد کے عالم میں تھی اور مندی مندی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ معراج بی بی کے بیٹھتے ہی اگلی نشست پر شجاع بھی آن بیٹھا، رابعہ کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔

''میں نے شہر نہیں جانا......'' وہ نقاہت سے بولی، معراج کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''مجبوری ہے بیٹا......'' معراج نے اس کا پسینے میں بھیگتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا، پھر ہم واپس آ جائیں گے!''

''جہانگیر کو بلائیں ماسی......'' وہ کراہی۔ ''مجھے مت بھیجیں...... اس طرح!'' وہ معراج کے سامنے یہ کہتے کہتے رک گئی، شجاع کے ساتھ۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی، میں ہوں نا تمہارے ساتھ......'' اسے ایسی کسی تسلی یا دلاسے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ درد اور مجبوری کے امتزاج کو اپنے آنسوؤں میں بہا رہی تھی۔ مگر گاڑی چل پڑی تھی...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

''میں مر جاؤں گی ماسی......'' اس نے ہولے سے فریاد کی، ڈرائیور کے سامنے چیخ بھی نہیں سکتی تھی، خاندان کی عزت اور بھرم اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔

''اللہ سے خیر مانگو میری بچی، یوں اس طرح کی باتیں نہیں کرتے......'' معراج نے کہا۔ ''درود شریف پڑھو دل ہی دل میں......'' وہ اس کی کمر پر اپنے ہاتھوں سے مساج کرنے لگی، رابعہ پھر غنودگی میں جا رہی تھی۔

اگلی نشست پر بیٹھا شجاع...... اس وقت تصور کی جس پرواز میں تھا اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ پچھلی نشست پر کون بیٹھا ہے اور کیوں...... اس وقت تو فقط وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح چوری چھپے واپس گاؤں جا کر وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکتا تھا۔ جہانگیر سے اسے کوئی توقع نہ تھی، انتقام کی آگ صرف اس کے وجود میں بھڑک رہی تھی کیونکہ جہانگیر تو ہر معاملے کو قانونی طور پر نمٹانا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

''میں ایک بار معراج سے ملنا چاہتا ہوں......'' زرتاج کو چھوڑنے آیا تو قائم علی نے نعیم سے التماس کی۔

''میں اس سے پوچھ کر بتاؤں گا......'' نعیم نے مختصراً کہا تھا۔ اگرچہ اس کے دل میں قائم علی کے لیے بڑی ناراضی تھی مگر اس نے اس امید کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا کہ اس کی بہن کا اجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے۔

''صرف پوچھنا نہیں...... میری سفارش کرنا ہو گی تمہیں!'' اس نے زور دے کر کہا۔

''اس کی زندگی کو سزا میں تم نے تبدیل کیا اور اب بھی چاہتے ہو کہ جھک اس کی طرف سے ہو؟''

"میں اس پر بہت شرمندہ ہوں......" اس نے سر جھکا کر کہا۔ "اپنے لیے نہ سہی مگر زرتاج کے لیے!"

"میری بہن کی زندگی اتنی ارزاں نہیں قائم علی کہ اسے کسی کھلونے کی طرح جب چاہے دل بہلانے کے لیے استعمال کرلیں اور جب چاہیں کسی بیکار چیز کی طرح گھر سے باہر پھینک دیں......" نعیم کے لہجے میں تلخی تھی۔ "اب بھی تم فقط اس لیے اس سے ملنا چاہتے ہو کہ تمہیں اپنی جوان ہوتی بیٹی کے لیے گھر پر ایک عورت چاہیے!"

"کوئی عورت نہیں...... معراج! صرف اس کی اپنی ماں!" قائم علی نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ نہیں کرتا کیونکہ موجی اس بارے میں بات بھی نہیں سننا چاہتی......"

"نعیم...... تمہیں میری دوستی کا واسطہ......"

"مجھے واسطہ دینے سے پہلے سوچو کہ تم نے خود اس دوستی کا کتنا مان رکھا!"

"بھابی سے کہنا میری سفارش کریں، معراج ان کی بات کو بہت اہمیت دیتی ہے!" اس نے اپنی سفارش کو مزید مضبوط بنایا۔

"میں کہہ دوں گا اس سے، تمہاری طرف سے مگر مجھے کچھ زیادہ توقع نہیں ہے......" دل میں لاکھ چاہنے اور امید رکھنے کے باوجود بھی نعیم نے قائم علی کو امید کا سرا نہ پکڑایا تھا۔

"تم میری دوستی کی خاطر میرے لیے کوشش کرنا نعیم، مجھے امید ہے کہ معراج مجھے معاف کردے گی...... اس کا دل بہت بڑا ہے!" وہ جیسے گھگیا رہا تھا۔

"کاش تمہارا دل بھی میری بہن جیسا ہوتا......" نعیم سوچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

"مما یہ کیا چیز ہے آپ کی دوست کا بیٹا؟" کرن نے چڑ کر ماں سے پوچھا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" شگوفہ نے چتون چڑھا کر سوال کیا۔ سہیل پہلے تو نینا کے ساتھ آتا تھا مگر اب وہ اکیلا بھی ان کے ہاں آنا جانا شروع ہوگیا تھا۔ نینا تو اس بات پر خوش تھی کہ چلو اسی بہانے شگوفہ غیر محسوس طریقے سے اس کا علاج بھی کرے گی۔

"بس ایسے ہی ہے گھامڑ سا......" کرن نے کندھے اچکا کر کہا۔ "یوں شرماتا ہے جیسے کوئی لڑکی ہو!"

"تو بیٹا شریف گھروں کے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں نا......" شگوفہ دل ہی دل میں اس بات پر خوش ہوئی تھی۔ "تم ذرا اسے تنگ نہ کرو نا!"

"وہ شرمیلا نہیں مما......" کچھ سوچتے ہوئے کرن نے کہا تھا۔ "کچھ عجیب سا ہے...... میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے ایسے میرا ہاتھ جھٹکا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی......" کرن کو الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔

"تم حد سے زیادہ بے تکلف نہ ہو اس سے ڈیئر......" شگوفہ نے کہا "لڑکیاں شرماتی لجاتی اچھی لگتی ہیں اور ذرا فاصلہ رکھو...... مرد ایک ایسا بچہ ہے جو عورت کو کھلونا سمجھتا ہے اور اس کھلونے کی طرف زیادہ لپکتا ہے جو اس کی دسترس میں نہ ہو!"

"اوہ مما...... میں نے اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا، بس یونہی جیسے دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں!" کرن نے کہا۔ "اور وہ...... اس کا ہاتھ کانپنے لگا مما اور صرف ہاتھ ہی نہیں، اس کا پورا جسم!"

"تو اس سے اندازہ کرلو نا کہ وہ کتنا شریف لڑکا ہے......" شگوفہ کو اپنی نظرِ انتخاب پر فخر محسوس ہوا تھا۔

"مما......" اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح اپنے خیال کی وضاحت کرے۔

"بس کرن...... بہت ہوگیا، نفسیات پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، سیدھی سادی بات میں بھی کوئی نہ کوئی الجھن کا پہلو نکال لیتی ہو!"

"آپ نے بھی تو نفسیات ہی پڑھی ہے نا!" کرن دو بدو بولی۔

"میں نے خود پر حاوی نہیں ہونے دیا نفسیات کو، اسے پڑھا اور ذریعہ بنایا معاش کا، جبکہ تم...... تم کچھ زیادہ ہی وہمی اور شکی ہوگئی ہو، سیدھی سی بات میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا نکال لیتی ہو کہ اگلا پریشان ہوجاتا ہے۔"

"پتا نہیں مما...... آپ اتنی جلدی غصے میں کیوں آگئی ہیں، میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے اور آپ جذباتی ہوگئیں، اس میں اتنا شدید ردِعمل دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"سچ تو یہ ہے کرن کہ مجھے سہیل بہت اچھا لڑکا لگا ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں نینا کو اچھی طرح جانتی ہوں، کہیں بالکل غیروں میں نکل کر رشتہ کرنے سے بہتر ہے کہ میں ایک بیٹی کا رشتہ سہیل سے کروں"...... شگوفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم بڑی ہو تو میری سوچ پہلے تمہاری طرف ہی گئی اور میں نے تم سے کہا کہ اس سے دوستی بڑھاؤ، اگر تمہیں میرے انتخاب پر اعتراض ہے تو کھل کر کہہ دو، میں کنول کے لیے......" وہ رکیں۔ "حقیقت یہ ہے کہ میں سہیل کو کھونا نہیں چاہتی!"

☆☆☆

"کیا......" حیرت سے جہانگیر نے جیسے چیخ کر پوچھا۔

"جی سرکار......" فیضی نے سر جھکا کر کہا۔ "حقیقت یہی ہے!"

"مگر کیوں، کیوں کر رہے ہیں یہ لوگ ایسا؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سرکار...... سب ڈرتے ہیں ان سے، ان کے خلاف گواہی دینے سے!" فیضی نے کہا۔ "اور پھر چھوٹے چوہدری صاحب کا لوگوں کو ڈر ہے، ان کے شہر چلے جانے سے انہیں احساس ہو رہا ہے کہ اگر وہ گواہی دیں گے تو چوہدری نور علی اور ان کے بیٹے ان کا جینا حرام کردیں گے اور آپ تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، آپ میں شرافت ایک ایسی خوبی ہے جو اچھے اچھوں کو بزدل بنا دیتی ہے!"

"یہ کیا بات ہوئی، بات قانونی کارروائی کی ہے اور اگر وہ لوگ گواہی دیں گے تو قاتل گرفتار ہوجائیں گے، پھر انہیں کس کا اور کس بات کا ڈر ہے؟"

"سرکار...... کون، کون گرفتار ہوگا...... ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا ہے اور پھر گاؤں کے لوگوں کی عزت محفوظ ہے ان کے ہاتھوں نہ جان......" فیضی نے وضاحت کی۔ "ابھی تھوڑے دن ہی کی بات ہے جو اس جوان لڑکی کے ساتھ انہوں نے کیا اور کوئی ان پر ہاتھ بھی نہ ڈال سکا...... الٹا جن لوگوں نے ان کے خلاف گواہیاں دیں......"

"کیا ہوا ان کو؟" جہانگیر نے بے اختیار ہوکر پوچھا۔

"معلوم نہیں سرکار...... وہ لوگ تو نظر ہی نہیں آئے کسی کو اس دن سے!"

"کیا؟" جہانگیر اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا ان لوگوں نے گواہوں کو مار دیا؟"

"معلوم نہیں سرکار......" فیضی نے کہا۔ "سرکار میں تو کہتا ہوں کہ آپ فوراً چھوٹے چوہدری صاحب کو واپس بلا لیں...... پھر دیکھیں کہ کون گواہی دینے کو تیار نہیں ہوتا!"

"فیضی، میں تو سارے معاملات کو قانونی طور پر ہی حل کرنا چاہتا ہوں، نہ کہ انتقامی کارروائیوں میں الجھ کر اپنی آئندہ نسل کے لیے مسائل چھوڑ جاؤں......" جہانگیر نے آہستگی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ شجاع اس وقت انتقام کی آگ میں جل رہا ہوگا، اسی لیے تو اس کو میں نے شہر بھجوا دیا ہے، میں اسے اس جہالت کے ماحول سے دور رکھنا چاہتا ہوں!"

"تو پھر سرکار آپ بھی شہر چلے جائیں اور بھول جائیں اس بات کو کہ قاتل اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں، جہاں قانون بھی بکتا ہو اور قانون کے رکھوالے بھی، وہاں آپ اس بات کی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ کوئی اپنی جان خطرے میں ڈال کر آپ کے حق میں گواہی دے گا، وہ بھی چوہدری نور علی اور اس کے بیٹوں کے خلاف......"

"کچھ بھی ہو فیضی...... میں سب کچھ قانونی طریقے سے ہی کروں گا، اور کچھ بھی ہو میں شجاع کو واپس نہیں بلاؤں گا، یہ میرا خود سے وعدہ ہے......"

☆☆☆

شجاع بخار میں پھنک رہا تھا، گھر پہنچ کر ملازموں نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے نکالا تھا کیونکہ اس کا جسم راستے میں اتنا درد کرنا شروع ہو گیا تھا کہ وہ کراہتا ہوا نیم غنودگی میں تھا۔ رابعہ دم سادھے بیٹھی تھی، اپنا خوف کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جہانگیر کا منشی شجاع کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور دوا وغیرہ لا کر دی تھی۔ رابعہ نے گھر آ کر عمران کو نہلا دھلا کر سلا دیا تھا، اسے بھی سفر کی تھکاوٹ تھی، معراج بی بی نے اس کی کمر دبائی اور اسے آرام کرنے کو کہا۔ رابعہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر معراج بی بی کی چارپائی اپنے کمرے میں لگوالی تھی۔

جس کے خوف سے اسے نیند نہ آ رہی تھی، وہ مسکن دواؤں کے زیر اثر شیر علی کے کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ اگر اسے ڈاکٹر نے نیند کی دوائیں نہ دی ہوتیں تو وہ چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ وہ تو بالکل ہوش و خرد سے بیگانہ تھا مگر رابعہ کے ہوش تو اس بات نے اڑا دیے تھے کہ آج نہیں تو کل...... وہ ٹھیک ہو جائے گا، پھر اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھے گا، جس نے اسے اچھے برے کی پہچان بھلا دی تھی۔ وہ کس طرح خود کو محفوظ رکھ پائے گی، اسے اب جہانگیر کو بتانا ہی پڑے گا...... جب تک جہانگیر کو حقیقت کا علم نہ ہوگا اس کا دل رابعہ کی طرف سے صاف نہ ہوگا، جو یہ سمجھتا تھا کہ رابعہ کسی وجہ کے بغیر شجاع کو ناپسند کرتی تھی۔ کیا دونوں بھائی ایک دوسرے کی جان کے دشمن نہ بن جائیں گے؟ اس نے سوچا۔ ماما جی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اس بات کا علم ہم دونوں کے سوا کسی کو نہ ہو...... تو کیا میں عمر بھر خوف کے تحت زندگی گزار دوں گی، نہیں نہیں...... مجھے جہانگیر کو بتانا ہی ہوگا۔ ماما جی کی وفات سے میں ان سے کیے گئے وعدے کی پابندی سے آزاد ہو گئی ہوں۔ "ماما جی......" وہ سسکی، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے کانوں کے پیالوں کو بھرنے لگے۔ ہولے ہولے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ "میرے پیارے ماما جی...... اب میں کسے ماما جی کہوں گی، میرے بچے کس کو دادا کہیں گے، آپ کے جانے سے سارا گاؤں یتیم ہو گیا ہے ماما جی، آپ باپ تو تین بیٹوں کے تھے مگر سارا گاؤں آپ کو اپنا باپ سمجھتا تھا، آپ سب کی عزتوں کے محافظ تھے ماما جی...... آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کتنا سہارا تھا......" اس کی بلند ہوتی ہوئی آواز نے معراج کو گہری نیند سے جگا دیا، وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔

"تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟" انہوں نے رابعہ کے پلنگ کی پائنتی بیٹھ کر پوچھا۔

"میرے ماما جی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے ماسی...... اب کون میرا سہارا ہے ماسی!" وہ زور زور سے رونے لگی، معراج نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اللہ مالک ہے بیٹا، پہلے پہل تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم کس طرح جئیں گے۔ مگر بیٹا تکلیف دینے والا جانتا ہے کہ ہم اس کو کس طرح برداشت کریں گے، تم حوصلہ کرو بیٹا، تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم اس طرح روؤ!"

"ماسی ان ظالموں کو ذرا ترس نہیں آیا، میرے ماما جی تو کسی چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتے تھے اور ان ظالموں نے ماما جی کو کس بے رحمی سے مار ڈالا......"

"حوصلہ کرو میری بچی......" معراج کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں، وہ کیا نہیں جانتی تھیں کہ چوہدری مراد علی کتنے شفیق انسان تھے۔ گاؤں بھر کے لیے شفیق باپ جیسے۔ ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا کوئی پُر نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے رابعہ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، وہ سوچ رہی تھیں کہ کسی کو کہہ کر رابعہ کی اماں کو بلوا لیں گی، عابدہ بیگم کے لیے تو ممکن نہ تھا کہ اس وقت شہر آتیں مگر رابعہ کی اماں بھی آ جاتیں تو بڑا حوصلہ ہو جاتا۔

عابدہ بیگم کا پورا وجود ہی غم کے اتھاہ سمندر کی طرح ہو گیا تھا، بے یقینی کی کیفیت میں وہ سب کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں، ان کا نقصان ناقابلِ تلافی تھا، شوہر کو کھو دیا تھا، اب بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے علیحدگی

میں بلا کر جہانگیر سے کہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شجاع کو شہر بھجوا دیں، جہانگیر نے رابعہ کی طبیعت کا بہانہ کر کے اسے زبردستی بھجوا دیا تھا حالانکہ رابعہ کب جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"شام کو میرے کچھ دوست آ رہے ہیں، جلدی میں نکاح پر انہیں بلا نہ سکا اور اب وہ شکوہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بھابی سے ملنا چاہتے ہیں!" پرویز نے مریم سے کہا تھا، اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کچھ تیاری وغیرہ کر لینا، چائے کے لیے کچھ لے آؤں گا، تم اپنا حلیہ وغیرہ درست کر لینا......"

"جی ٹھیک ہے......" ہولے سے اس نے کہا تھا۔ اس نے گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر فہرست بنا کر پرویز کو دی کہ وہ سامان لے آئے تو وہ چائے کے ساتھ لوازمات تیار کر لے گی۔

"کہاں تیار ہو کر باورچی خانے میں مصروف رہو گی، میں اسی وقت جا کر تیار اشیا لے آؤں گا!" اس نے محبوبیت سے کہا تھا۔ "تمہارے ہاتھ کوئی کام کاج کرنے کے لیے تھوڑی ہیں......"

"دنیا کی ہر عورت اپنے گھر کا کام کرتی ہے...... اور عورت کی اصل خوب صورتی بھی یہی ہے کہ وہ کتنی سلیقہ مند ہے نہ کہ اس کی شکل صورت کی خوب صورتی......"

"بھئی آج تو میرے یار دوست پہلی دفعہ تم سے ملنے آ رہے ہیں، انہیں تمہاری خوب صورتی سے متاثر کرنا ہے، سلیقہ شلیقہ بعد میں دکھالیں گے......" مریم اس کی اس بات پر ہنس دی تھی۔ پھر اس نے ایک نئی فہرست تیار کی ان چیزوں کی جو کہ اسے بنی بنائی لے کر آنا تھیں، پرویز نے فہرست لے کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اب آپ جا کر سامان لے آئیں نا، مغرب کی اذان ہونے والی ہے!"

"جاتا ہوں جانِ من...... آج تو تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ اٹھ کر جانے کو دل ہی نہیں کر رہا!" اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ "میرے دوست تو آج اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے......"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے دوستوں کے حواس اڑانے کی!" مریم کو بہت برا لگا تھا۔ "آپ جائیں جا کر سامان لے آئیں!" پرویز کو اس نے زبردستی گھر سے نکالا، اذان ہوتے ہی اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ جانے اس کا دل کیوں چاہنے لگا کہ وہ اس شوخ سے لال لباس کو بدل لے جو پرویز نے اصرار کر کے اسے پہنایا تھا، فقط عورتیں ہوتیں تو اور بات تھی مگر ساتھ پرویز کے دوست بھی تھے اور پرویز کا کہنا تھا کہ چونکہ انہوں نے مریم کو دلہن بنے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ ان کے سامنے پہلی دفعہ لال جوڑے میں ہی آئے۔ وہ ابھی سوچوں میں ہی گم تھی کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ دستک کا انداز پرویز کا نہ تھا، اس نے اپنا دوپٹا سر پر درست کیا اور جا کر باہر کی چٹخنی گرا دی اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آ جائیں......" اس نے آہستگی سے کہا، دروازہ کھلا اور دو سے تین لوگوں کے اندر آنے کا اندازہ ہوا، پھر کسی نے مڑ کر کنڈی بھی لگائی تھی۔ "السلام علیکم!" اس نے ہولے سے کہا۔

"سولہ آنے صحیح...... پرویز سولہ آنے صحیح کہتا تھا......" گھٹیا سے لہجے میں کسی نے کہا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا، تین خرانٹ صورت مرد کھڑے اسے دیکھ رہے تھے، کتوں کی طرح رالیں ٹپکاتے اور ان کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔

"نہیں یار...... پرویز بالکل غلط کہتا تھا، اسے اندازہ ہی نہیں کہ یہ اس کے بیان سے کہیں بڑھ کر خوب صورت ہے!" ایک اور آواز آئی تھی۔ مریم کا سارا وجود لرزنے لگا۔

"کون ہیں آپ لوگ؟" اس نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ پرویز بھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور اس نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ اس کے دوست اکیلے ہوں گے وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، میں خوامخواہ اتنا تیار ہوئی، مجھے تو اس جیسے دوستوں کے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔

"ہم وہی ہیں جن کے لیے تم لال جوڑا پہن کر تیار ہوئی ہو، پرویز کہتا تھا کہ گلاب کے پھول جیسی ہے مگر تم تو اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہو......" ان میں سے ایک نے کہا اور اس کی طرف قدم بڑھایا، وہ اس کے پیچھے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو جب سے آئی تھی خود کو اس چاردیواری میں محفوظ سمجھ رہی تھیں، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ محفوظ چاردیواری اس کے لیے قید خانہ بھی بن سکتی تھی۔ چلاتی تو کیا ہوتا، اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ سے التجا کرنا شروع کر دی۔

"میرے مالک...... میرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے اور اس بات کو صرف تو ہی جانتا ہے!"

☆☆☆

"میں کہاں ہوں......" شجاع نے غنودگی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"سرکار آپ اپنے گھر پر ہی ہیں!" ملازم نے اسے بتایا۔

"کون سے گھر پر......" اس نے بصد کوشش آنکھیں کھولیں اور کمرے کا جائزہ لیا۔ "میں نے تو یہ کمرا اپنے گھر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

"سرکار آپ اپنے شہر والے گھر میں ہیں!"

"جہانگیر لالہ کے گھر پر؟"

"جی سرکار......"

"لیکن میں یہاں کیسے آیا اور مجھے ہوا کیا ہے، کمزوری سی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟"

"سرکار......" ملازم کچھ کہتے کہتے رکا۔ "بڑے سرکار کی وفات کے بعد، آپ کو جہانگیر سرکار نے شہر بھجوا دیا تھا کیونکہ بی بی صاحبہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی...... ان کا اپنا گاؤں میں رہنا ضروری تھا اس لیے انہوں نے آپ کو بی بی صاحبہ کے ساتھ شہر بھجوا دیا اور پھر شیر علی سرکار کا امتحان بھی ہونے والا ہے...... ان کا شہر آنا بھی ضروری ہے، وہ بھی آج کل میں شہر آ جائیں گے!" جس دکھ کو وہ اپنی بیماری اور غنودگی میں بھولا ہوا تھا وہ پوری ہولناکیوں کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا، بابو جی کا قتل......

"مگر مجھے کیا ہوا تھا؟"

"سرکار آپ کو گاڑی میں ہی اتنا تیز بخار ہو گیا تھا کہ یہاں پہنچنے تک آپ اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے...... ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ گہرے صدمے سے آپ بیمار پڑ گئے تھے!"

"کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے؟" اس کی آواز میں تاسف کے ساتھ نقاہت بھی تھی۔

"سرکار...... زیادہ نہیں، بس تین دن ہوئے ہیں آپ کو یہاں آئے ہوئے!"

"تو پھر اب مجھے جانا چاہیے......" اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے بابو جی کے جنازے کو کندھا دیا تھا، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں اتارا تھا اور کس طرح بلکتے ہوئے شیر علی کو اپنے ساتھ لگا کر اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر دم لے گا۔

"ڈاکٹر نے آپ کو سفر سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دے، آپ گاؤں نہیں جا سکتے!" اس نے سہمے ہوئے انداز میں وضاحت کی تھی۔

"کس مائی کے لال میں جرات ہے کہ وہ مجھے گاؤں جانے سے روک سکے؟" اس نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر نا طاقتی اس قدر تھی کہ وہ جیسے واپس ڈھے سا گیا تھا۔

"سرکار آپ آرام کریں، جونہی آپ کا بخار اترے گا اور آپ بہتر محسوس کریں گے تو میں آپ کو خود گاؤں لے کر چلوں گا......" ملازم نے اسے تسلی دی اور دل ہی دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ چوہدری صاحب ابھی غصے سے کہیں گے کہ تو کیا

میرا باپ ہے جو مجھے لے کر جائے گا گاؤں مگر اس کو حیرت ہوئی شجاع نے جواب میں کچھ نہ کہا، خاموشی سے لیٹ کر کروٹ بدل لی۔

''آپ آرام کریں سرکار......'' ملازم نے کہا اور الٹے قدموں کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے!'' تھوڑی دیر رک کر اس نے چوہدری شجاع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا مگر جواب نہ آنے پر وہ سمجھا کہ شاید وہ سو چکے ہیں۔

☆☆☆

''دلی تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کی سب تمہاری بہنیں ہیں، پھر بھی تم نے......'' جہاں آرا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی، اس سے زیادہ کھل کر وہ اور کیا کہتیں۔

''اماں......میں جانتا ہوں کہ یہ کون ہیں سب......اور اب میں جوان ہوں اماں، اگر تم اس بات کا احساس نہ کرو تو میں کیا کروں، میں کیا اپنی جوانی یونہی ضائع کر دوں؟''

''کس نے کہا ہے تم سے بیٹا کہ یہ تمہاری بہنیں نہیں ہیں؟'' جہاں آرا نے ٹوہ لی۔ جانتی تھیں کہ کبھی نہ کبھی یہ بھید تو کھل ہی جائے گا مگر انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کس نے ان کا راز فاش کیا ہے۔ ''الماس تمہاری بہن ہے بیٹا!''

''ہاں اس لیے کہ اسے تم نے جنم دیا ہے۔ مگر اس کا باپ کون ہے اماں، کیا اس بات کا کسی کو علم ہے؟''

''تم حد سے زیادہ بدتمیز ہو گئے ہو دلی......'' ان سے اتنی براہِ راست چوٹ برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ''جانے کون تمہارے کان بھرتا رہتا ہے؟''

''میرے کان کون بھرے گا اماں......یہ تمہاری بھانت بھانت کی جمع کی ہوئی ''چیزیں'' مجھ پر مرتی ہیں اماں، میں تو انہیں بہنیں ہی سمجھتا تھا!'' خرانٹ پن اس کے انداز سے نمایاں تھا۔

''سب جانتی ہوں جو تم ان کو بہنیں سمجھتے ہو......'' دانت کچکچا کر انہوں نے کہا۔

''کہیں نہ کہیں تو میرا بھی کانٹا اٹکانا ہے نا اماں تم نے، تو انہی میں کسی سے اٹکا دو اماں، جس سے تم چاہو!'' اس نے جیسے ماں کو اپنے لیے انتخاب کا اختیار دے دیا تھا۔

''جسے تم نے چننا تھا چن چکے ہو، اب تمہیں ماں کا خیال آیا ہے......'' ان کے اندر ایک روایتی ماں نے سر اٹھایا تھا۔

''ارے نہیں اماں......'' اس نے لاڈ سے کہا۔ ''قسم لے لو اپنی جو میں نے ابھی تک کسی کو چنا ہو، ابھی تو میں ان کو باری باری جانچ رہا ہوں، شادی اسی سے کروں گا جس سے تم کہو گی!'' اس کی اس بات نے جہاں آرا کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

''کیا تم ان سب سے......'' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے پوچھیں۔

''یونہی ذرا شغل کے طور پر اماں......تیرا لال ہے ہی ایسا خوبرو جوان کہ اس پر ساری مرتی ہیں!'' اس نے اترا کر کہا۔ جہاں آرا نے اسے دو ہتڑوں پر رکھ لیا۔

''بے غیرت، بے حیا......دلال......کتے، سور......'' جو جو ان کے منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہی تھیں۔

''یہ دن دیکھنے سے کہیں اچھا تھا کہ میں مر جاتی......'' وہ تھک ہار کر رونے لگیں۔

''ایسا کیا ہو گیا ہے اماں......'' دلی نے مار کھا کر بھی ڈھٹائی سے کہا تھا، اسے بھلا ماں کے دو ہتڑوں سے کون سی کوئی گہری چوٹ لگ گئی تھی۔

''تو پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا ہے......تو نے تو میری عمر بھر کی پونجی لوٹ لی ہے دلی، کاش میں نے تجھ جیسی اولاد کو نہ جنا ہوتا، کاش میں نے اپنی ماں کے کہنے پر تجھے اپنے پیٹ میں ہی ختم کر دیا ہوتا......'' وہ اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر بین کر رہی تھیں۔ اوپر ساری کی ساری یہ سب کچھ سن رہی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نیچے آتی، الماس نے اس لمحے اپنی

ماں کے دکھ کو دل سے محسوس کیا تھا اور جانتی تھی کہ ایک طوائف کی متاع کیا ہوتی ہے۔

"میں ہر وقت ان کی اتنی نگرانی کرتی تھی، ان کا خیال بھی رکھتی تھی، انہیں سمجھاتی بھی تھی...... پھر بھی انہوں نے اماں کو دھوکا دیا......" وہ سوچ رہی تھی۔ "صرف انہوں نے ہی کیوں، میں نے بھی تو اماں کو دھوکا دیا ہے......" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپا......" نیلم کی آواز آئی تھی۔ "کیوں رو رہی ہو؟"

"اپنی ماں کے نصیب کو رو رہی ہوں...... جس نے تم سب کو سہارا دیا، ماں کا پیار دیا، تم سب کو بتایا کہ دلی تم سب کا بھائی ہے اور تم سب نے مل کر اماں کی ناک کے نیچے کیا کھیل کھیلا ہے......" وہ چلائی۔

"نہ رو آپا...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... ادھر زمرد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں!"

"کیا ہوا اسے؟" الماس نے آنسوؤں سے بھری نظر سے اسے دیکھا چاہے وہ کتنی بھی بری ثابت ہو جاتیں الماس نے انہیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھا تھا۔

"جو کچھ تمہیں ہوا ہے!" نیلم نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے تو اماں کی تکلیف اور دکھ کا سوچ کر رونا آ رہا ہے، کسی اور کو اس جیسی تکلیف کیسے ہو سکتی ہے؟" اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا......" نیلم کچھ کہتے کہتے رکی۔ "میرا مطلب اس کی حالت سے ہے، جو تمہاری طرح سے ہے!"

"کیا مطلب؟" الماس چونکی مگر کچھ سمجھ نہ سکی۔

"وہ بھی......"

"کچھ پھوٹو گی بھی منہ سے یا پہیلیاں ہی بجھواتی رہو گی؟" الماس نے چڑ کر پوچھا۔

"اسے بھی کئی روز سے الٹیاں آ رہی ہیں آپا اور اسے شک...... بلکہ یقین ہے کہ......!"

"کیا بکواس کر رہی ہو تم...... کیسے ہو سکتا ہے یہ؟" وہ اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھی، کتنی بڑی کوتاہی ہوئی تھی اس سے جو ان پر نظر نہیں رکھ سکی تھی۔

اماں کے لیے اس سے بڑی اور کیا قیامت ہوگی، وہ کیسے اس بات کو سن سکے گی...... ان تینوں پر تو اماں نے خاص محنت کی ہے تا کہ یہ بالکل خاص ہوں اور ان کے پاس وہ ہتھیار ہوں جو کسی کی سانس روک دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

میں اماں کے اس دکھ کا کیا مداوا کروں؟ وہ خود سے پوچھ رہی تھی، زیادہ دیر نہیں لگی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

شجاع کا بخار ختم ہونے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا تھا، اسی دوران جہانگیر بھی ایک چکر لگا کر گیا تھا اور اس کے ساتھ رابعہ کی اماں بھی آ گئی تھیں اور شیر علی بھی۔ شیر علی کے امتحان سر پر تھے اور اس کا اسکول جانا ضروری تھا۔ معراج بی بی...... تین چار دن کے بعد اجازت لے کر ڈرائیور کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھیں جہاں سے انہیں زرتاج کو ساتھ لے کر گاؤں چلے جانا تھا۔

رابعہ کا خوف شیر علی اور اپنی ماں کے آ جانے سے قدرے کم ہو گیا تھا اور یوں بھی اپنی شعوری کوشش کے باعث وہ شجاع کا سامنا ہی نہ کرتی تھی۔ جہانگیر دنوں باپ کے قتل کی تحقیقات کے باعث مصروف تھا، شہر آتا بھی تو الجھا ہوا ہوتا۔ اس رات بھی وہ دیر تک اپنی پھوپی (رابعہ کی ماں) کے پاس دیر تک بیٹھا رہا تھا اور مقدمے کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں بتا رہا تھا، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی میں اس کے پاس اپنے ہر

چھوٹے بڑے مسئلے کے سلسلے میں آنے والے لوگ، اس سے دوستی کے دعوے کرنے والے...... یوں اس کے آنکھیں موندتے ہی طوطا چشمی کریں گے۔

نور علی اور اس کے بیٹوں کی دہشت، اس کے ترلے منتوں سے کہیں زیادہ تھی۔ نہ صرف اس کے بلکہ تفتیشی افسر کے سامنے بھی انہوں نے اس واردات کے عینی گواہان ہونے کا اعتراف کیا تھا مگر یہ بات بھی اسی وقت واضح کر دی تھی کہ وہ عدالت میں کوئی گواہی نہیں دیں گے۔ تفتیشی افسر نے ذرا زور زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے بیان سے اس کے سامنے بھی پھر گئے تھے۔

"تم پریشان نہ ہو بیٹا...... میرا بھائی دنیا میں فرشتہ تھا، اس کو قتل کرنے والے اسی دنیا میں سزا پائیں گے، ہم اور تم دیکھیں یا نہ دیکھیں مگر دنیا دیکھے گی!"

"مگر پھوپی اماں...... میرے دل کو بڑی بے چینی ہے کہ بابو جی کا قتل کر کے ان کے قاتل دندناتے پھریں اور ہم کچھ نہ کر سکیں!" اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

"جانتی ہوں بیٹا! صرف تم ہی نہیں ہم سب بھی بہت بے چین ہیں مگر کیا کیا جائے...... انتقام لینے کا ارادہ کرو تو بھی اپنے ہی بھینٹ چڑھتے ہیں!"

"یہی تو میں نہیں چاہتا پھپو...... اور پھر ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیسے لے سکتے ہیں؟"

"بہتر یہی ہے کہ گواہوں کو کسی نہ کسی طرح مناؤ!"

"وہ اپنی جان و عزت کی خاطر ڈرتے ہیں پھپو...... کوئی اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کو تیار نہیں!"

"ہم شجاع کو ہمیشہ غلط کہتے اور سمجھتے ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے!" رابعہ کی ماں ریشم نے کہا۔

"کس لیے پھپو؟" کچھ نہ سمجھتے ہوئے جہانگیر نے پوچھا۔

"نور علی اور اس کے بیٹوں کے خوف سے لوگ گواہی دینے کو تیار نہیں ہو رہے، مگر شجاع کا گاؤں میں ہونا انہیں تقویت دے گا کہ ان کی پشت پر بھی کوئی ایسا ہے جو نور علی اور اس کے بیٹوں کی ٹکر کا ہے......"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھپو، مگر میں نے شجاع کو اس سارے قصے سے اسی لیے تو باہر رکھا ہے کہ بات بڑھ نہ جائے!"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شجاع انتقام لے۔ مگر شجاع کے گاؤں میں ہونے سے نور علی اور اس کے بیٹوں کی ہیبت کم ہو جائے گی...... اگر ایک قتل پر کچھ نہ ہوا اور وہ سستے چھوٹ گئے تو ان کا اگلا نشانہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، ان لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز ہے نہ انہیں اپنے پیارے اور خونی رشتوں کا کوئی احساس......"

"میں ڈرتا صرف اس بات سے ہوں کہ شجاع جذباتی ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ خود کو خطرے میں ڈال لے یا قانون کو ہاتھ میں لے لے......"

"مجھے یقین ہے کہ تم اسے ساری بات بتاؤ گے اور اسے سمجھاؤ گے تو وہ سمجھ جائے گا، اسے بھی علم ہے کہ ہم نے اتنا بڑا نقصان اٹھایا ہے مزید نقصان کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے اور پھر بھابی جان سمجھائیں گی اسے!"

"چلیں دیکھتا ہوں، اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو میں کچھ دنوں میں آ کر اسے لے جاؤں گا!" ریشم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ جذباتی سا ہو گیا...... "پھپو...... مجھے تو خود یقین آتا ہے نہ صبر، میں کسی کو کیسے صبر کرنے کو کہوں، سب ٹوٹے بکھرے ہوئے ہیں، اماں، شجاع، رابعہ، شیر علی...... آپ!"

"حوصلہ کرو میرے بیٹے...... تم تو بہت بہادر ہو، تم نے اب لالہ جی کی گدی سنبھالنی ہے، ان کی جگہ اس خاندان اور اس گاؤں کے لوگوں کا خیال رکھنا ہے!" اس کا سر انہوں نے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "میرا بچہ!" باپ کی موت

کے بعد پہلی بار اس کا غم آنسو بن کر اس کی آنکھوں کے بند توڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

"تم نے تو مجھے اور بچی کو مارنے کا پورا بندوبست کر دیا تھا عباس......" اس نے اس کے کندھے دباتے ہوئے شکوہ کیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ "میں تو کمزوری سے بے ہوش پڑی تھی جب محلے والوں نے باہر سے تالا کھول کر ہمیں قید سے نجات دلائی تھی......" اس نے اس کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

جانے اماں مجھے معاف کریں گی کہ نہیں؟ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا...... ان کا دل بہت بڑا ہے اور وہ مجھے فوراً معاف کر دیں گی۔ جانے اماں نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو گی مگر کہاں ڈھونڈتیں، ہم نے تو جانے کتنے ہی ٹھکانے بدلے ہیں۔ میں نے ان کا کتنا دل دکھایا ہے...... سوچ سوچ کر وہ نادم ہوتا۔

زہرہ نے اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود محلے میں لوگوں کے گھروں میں چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے گھر کا چولھا جلانے کی کوشش جاری رکھی۔ محلے والے غریب جان کر یوں بھی مدد امداد کر دیتے تھے اور اب تو عباس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے لوگوں کو عباس کا پرانا رویہ بھی بھلا دیا تھا۔

میں نے خواہ مخواہ زہرہ پر اتنی پابندی لگا رکھی تھی، اسے گھر میں قید کر دیتا تھا، جو میں مر جاتا تو وہ تب بھی تو جو چاہے کرتی پھرتی...... میں کون سا پلٹ کر آ کر اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس حادثے نے نہ صرف اس کا ذہن تبدیل کیا تھا بلکہ اس کا اعتبار بھی بادلِ ناخواستہ سہی مگر زہرہ پر تھوڑا سا قائم ہوا تھا۔

کچھ اس تکلیف کے دوران زہرہ نے اس کی اتنی خدمت کی تھی کہ وہ اس کی قدر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اللہ کا کرم اور ڈاکٹروں کی محنت اور زہرہ کی دعائیں...... ان سب نے مل کر اسے ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑا تو کر دیا تھا مگر اب وہ مزدوری کی مشقت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو کر...... اس کمزور اور نحیف سی کلثوم نے ایک بچے کو جنم دیا تھا جس کی صحت بھی ماں کی صحت سے بڑھ کر نہ تھی۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ماں کو اچھی خوراک ملی تھی نہ آرام جس کے باعث بچہ بھی کمزور سا تھا اور ماں بھی۔ مگر کلثوم کی خوشی دیدنی تھی، وہ معراج کے گھر پہ ہی تھی، معراج نے اس کے گھر جا کر زچگی کروانے سے انکار کر دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ وہیں آ جائے۔ اپنی پڑوسن کی مدد سے وہ معراج کے گھر پہ ہی آ گئی تھی، وہیں بچہ پیدا ہوا تھا، معراج نے کلثوم کا اتنا خیال رکھا کہ اس کی ماں بھی ہوتی تو اس کا اسی طرح خیال رکھتی۔

زرتاج اپنی سہیلی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی مگر بچے کی ولادت خیریت سے ہو جانے پر بہت خوش تھی۔

"اس کے باپ کم بخت کو اطلاع کروانا ہو گی...... مگر اس وقت کیا فائدہ۔ آدھی رات بیت چکی ہے یوں بھی وہ نشہ کر کے پڑا ہو گا!" معراج نے اپنا غصہ نکالا تھا۔ زرتاج نے دودھ گرم کر کے اس میں دیسی گھی ملایا اور زبردستی کلثوم کو پلایا۔ بچے نے رو کر اپنی بھوک کا اظہار کیا، معراج نے پہلے کلثوم کو اس کے لیے گھٹی دی، جو کلثوم نے اصرار کر کے زرتاج کے ہاتھوں سے دلوائی اور پھر اللہ کا نام لے کر بچے کو دودھ پلانا شروع کیا۔ بچہ اس کی آغوش میں ہی سو گیا تھا، اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے۔ معراج نے اسے تسلی دی اور رونے سے منع کیا۔

"اچھا چلو بتاؤ اس کا نام کیا سوچا ہے تم نے؟" زرتاج نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا۔

"مجھے تو کبھی یہ سوچ ہی نہیں آئی کہ یہ دنیا میں آ بھی سکے گا اور آ گیا تو اسے کوئی نام بھی دینا ہو گا!"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" زرتاج نے بے یقینی سے کہا، ابھی چند دن قبل ہی تو وہ شہر سے لوٹی تھی جہاں اس کی چھوٹی ممانی کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی تھی اور ہمہ وقت مختلف ناموں پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ وہ لوگ انگلینڈ سے آئے تھے اس لیے ممانی کو تو یہ بھی علم تھا کہ بیٹا آنے والا تھا۔ مگر زرتاج کو یہ بھی علم تھا کہ شہر اور انگلینڈ میں بہت فرق

تھا اور اسی طرح گاؤں اور شہر میں بھی۔

"جو نام تم بتاؤ گی باجی، وہی رکھ لیں گے!" کلثوم نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں اچھا سا نام سوچ کر بتاؤں گی!" زرتاج نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں مزے کی ایک بات بتاؤں کلثوم......" زرتاج نے اس سے کہا۔ "میرے ماموں لندن سے آئے ہیں، تین ماہ کے بعد ان کے ہاں بچے کی ولادت متوقع ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں پر ایسی مشینیں ہیں جن کے ذریعے انہیں یہ علم ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں بیٹا ہو گا!"

"ہیں...... کیا واقعی؟" حیرت سے کلثوم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟" معراج نے حیرت سے پوچھا، "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"واقعی اماں...... سچ کہہ رہی ہوں!" زرتاج نے جوش سے کہا۔ "اور انہوں نے تو سب کے ساتھ مل کر اس کا نام بھی سوچ کر فیصلہ کر لیا ہے اور اب سب لوگ اس آنے والے بچے کو اسی نام سے پکارتے ہیں......"

"یہ موئی میموں کے چوچلے بھی عجیب ہی ہیں، جانے کیسی کیسی کفر کی باتیں کرتی ہیں!" معراج نے خفگی سے کہا، انہیں یہ بات بہت بری لگی تھی۔

"ایسا نہیں کہتے اماں! انہوں نے ماموں سے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور باقاعدگی سے نماز بھی پڑھتی ہیں اور باقی سارے احکامات کی پابندی بھی کرتی ہیں۔ سچ اماں...... ہم سب کا روزہ ہوتا تھا اور انہیں معافی تھی مگر وہ ہم سب کے ساتھ اٹھ کر سحری کھاتی تھیں اور دن بھر کچھ نہیں کھاتی تھیں، اگر کچھ کھاتی بھی ہوں گی تو کسی کو علم بھی نہیں ہوتا تھا!" زرتاج نے تفصیل سے اپنی ممانی کی تعریف کی۔

"اچھا؟" کلثوم بہت متاثر ہوئی تھی۔ "ان کا نام کیا ہے؟"

"ان کا اسلامی نام عائشہ ہے!" زرتاج نے کہا۔ "اور وہ اس پر بہت فخر محسوس کرتی ہیں!"

"اور ان کے بیٹے کا کیا نام ہو گا، آنے والے بیٹے کا؟" کلثوم نے تجسس سے پوچھا۔

"اس کا نام......" وہ ہنسی۔ "اس کا نام حاتم ہو گا، انشاء اللہ!"

"بہت پیارا نام ہے......" کلثوم نے تعریف کی۔

"تو یہ کیسا اسلام قبول کیا ہے اس نے اور اسے شرم نہیں آتی یوں سب کے سامنے اشتہار لگاتے ہوئے؟" معراج نے ناراضی سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے اماں کہ ماموں کے ہاں ان کی شادی کے کتنے برسوں کے بعد اولاد کی امید بندھی ہے اور اس لیے وہ بہت پُرجوش ہیں، کسی کی خوشیوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تنقید نہیں کرتے!"

"اچھا اب تم مجھے نہ زیادہ سمجھاؤ......" معراج نے کہا۔

"جب سب لوگ بہت سے نام تجویز کر رہے تھے تو مجھے جواد نام بہت اچھا لگا تھا!" زرتاج نے کہا۔ "میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ کلثوم کے اس چھوٹو کا نام ہم جواد رکھ لیں؟"

"ارے رہنے دو...... ایسے لگتا ہے کہ جیسے کوئی بڑا سا آدمی ہو!" معراج نے فوراً اس تجویز کو جھٹلایا۔ "اچھا چلو جو نام بھی کلثوم کو پسند ہو......" معراج نے کہا۔

"بہت پیارا نام ہے ماسی اور آسان بھی، بس یہی رکھ لیتے ہیں......" کلثوم نے فوراً کہا۔

"اس کا مطلب ہے، سخی!" زرتاج نے کلثوم کو بتایا۔

"بہت اچھا مطلب بھی ہے اس کا......" کلثوم نے پیار سے اپنی گود میں سوئے ہوئے، ہونٹ بسورتے بچے کو دیکھا، جس نے اسے چند گھنٹوں میں ہی سمجھا دیا تھا کہ کلثوم کی زندگی کا کوئی مقصد تھا۔ "جواد......" وہ زیرِ لب بڑبڑائی،

اس کے سارے وجود میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ زرتاج نے اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی، کیسے اس عورت کی زندگی کی ساری پریشانیاں اور زندگی کے مسائل پس پشت چلے گئے تھے، صرف ممتا کا نور اس کے چہرے پر نظر آ رہا تھا اور محبت کا سمندر اس کے وجود میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

☆☆☆

آنکھیں موند کر اس نے دعا کی اور محسوس ہوا کہ اس کا اللہ اس کے پاس ہے، وہ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا، اس نے صرف چند لمحے سوچا اور آنکھیں کھول دیں۔

"آپ یقیناً پرویز کے دوست ہیں......" اس نے بات کرتے ہوئے ذرا سا ہٹ کر خود کو اس شخص سے بچایا جو کسی بری نیت سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "پرویز نے آپ سب کی بہت تعریف کی ہے اور آپ لوگوں کے لیے چائے کے لیے لوازمات لینے کے لیے گئے ہیں......" اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ ان تینوں کے سامنے مزاحمت میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اس لیے کسی نہ کسی طرح انہیں باتوں میں لگا کر اپنی حکمتِ عملی مرتب کرے۔

"اچھا...... پرویز نے بتایا ہے تمہیں؟" وہ خباثت سے ہنس کر پوچھ رہا تھا۔

"تو پھر کیسے لگے ہم لوگ تمہیں؟" مریم کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"آپ لوگ آئیں نا، آپ کا اپنا گھر ہے!" اس نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا۔ "میں سمجھی کہ آپ سب کی بیویاں بھی آپ کے ساتھ ہوں گی......"

"تمہارے ہوتے ہوئے ان کی کیا ضرورت ہے!" اس نے ایک آنکھ میچ کر کہا تھا۔

"چلو جی......" ایک نے کہا۔ "چلتے ہیں اندر، اپنا ہی تو گھر ہے......"

"جس طرح تیری مرضی یار...... تو استاد ہے!" باقی دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ "چلو بھابی جی، اندر چلتے ہیں!" مریم نے خاموشی سے اس کی تقلید کی اور ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے بھائی صاحب؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں...... کیوں نہیں!" ایک نے ٹانگیں صوفے پر پھیلائیں اور دوسرے کو آنکھ مار کر اشارہ کیا کہ وہ مریم کے ساتھ باورچی خانے میں چلا جائے۔ مریم چائے بناتے ہوئے ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح بیرونی دروازے تک جا سکے یا کسی اور طرح بھاگنے کی کوشش کرے۔

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ "میرے اللہ نے میری سن لی!" وہ بڑبڑائی، اس نے چونک کر مریم کی طرف دیکھا اور مریم نے اس کی طرف...... "پرویز ہوں گے، چائے کا سامان لینے گئے تھے، میں دروازہ کھولتی ہوں!"

"چپکی کھڑی رہ......" اس نے اسے ڈپٹا۔ "میں دیکھتا ہوں، خبردار جو تم باورچی خانے سے باہر آئیں یا کوئی آواز نکالی......" اسے دھمکا کر وہ باہر نکلا تو مریم کا ذہن اور ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے، اس نے فوراً باورچی خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگالی، بڑی سی میز کو جلدی سے کھینچ کر دروازے کے آگے رکھا اور اس پر وزنی چیزیں رکھنے لگی، مٹی کے تیل والے چولہے کی تیل والی ٹنکی اٹھا کر اس میز اور دروازے پر تیل ڈالا اور اگلے ہی لمحے باورچی خانے کے اندر آگ کے شعلے لپکنے لگے۔

آگ کی لپٹیں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں، اندر ایک کونے میں مریم دم سادھے زمین پر بیٹھی تھی، اسے اس وقت کا انتظار تھا جب آگ اس تک پہنچ کر اس کے اس وجود کو جلا ڈالتی جسے پامال کرنے کو تین شکاری باہر کھڑے تھے، وہ اللہ سے مدد کی بھیک مانگ رہی تھی...... اور تھا بھی کون جس سے مانگتی!

☆☆☆

شجاع کے لیے خود کو شہر میں روکے رکھنا ممکن نہ تھا، اسے اندازہ تھا کہ گاؤں میں جہانگیر یقیناً مقدمے کی کارروائی

میں مصروف ہوگا مگر اس کے اندر تو اور ہی طرح کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ تو اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا چاہتا تھا بلکہ اس کا ارادہ تھا کہ شیر علی اس تمام کارروائی میں اس کے ہمراہ ہو۔ جہانگیر اس کے گاؤں واپس جانے پر تو مان گیا تھا، اس میں زیادہ ہاتھ ریشم پھپھو کا تھا جنہوں نے جہانگیر کو سمجھایا تھا اور وہ اسے گاؤں لے جانے پر تیار ہوا تھا ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ جب تک ممکن ہو اسے شہر میں رکھے۔ اس کے گاؤں جانے کے فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی اور سکون رابعہ کو ملا تھا۔ شیر علی کے سالانہ امتحانات بھی سر پر تھے جو کہ اس کے گاؤں نہ جانے کا بڑا اہم جواز تھے، شجاع نے سوچا کہ اسے اس کے امتحانوں کے بعد لے کر جائے گا۔

رابعہ کی اماں کو بھی واپس جانا تھا اس نے جہانگیر سے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں، مگر اس کی اماں کو اس بات سے اختلاف تھا۔ وہ اسے یوں اس حالت میں اکیلا چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں......

"آپ جائیں بے فکر ہو کر اماں! چند دنوں تک میں زرتاج کو بلوا لوں گی!" اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی، وہ بھی جانتی تھی کہ معراج بی بی اس طرح زرتاج کو بھی اکیلے شہر نہ بھیجیں گی۔

"اماں بھی عدت میں ہیں......" جہانگیر نے کہا۔

"اچھا، میں نادرہ سے بات کروں گی اگر وہ چند دنوں کے لیے آ جائے، جب تک جہانگیر واپس نہ آ جائے، لالہ جی کے چالیسویں کے وقت تک......"

"ٹھیک ہے اماں!" رابعہ نے ماں سے کہا اور یوں وہ ذرا اطمینان سے واپس لوٹیں۔ گاؤں تک کے سفر میں جہانگیر نے مختصراً شجاع کو مقدمے کی بابت بتایا۔

"آپ ہی چاہتے تھے کہ اس مسئلے کا قانونی حل ہونا چاہیے، میں جانتا ہوں لالہ جی کہ اس طرح کے لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے......" اس نے غصے سے لال ہوتے ہوئے چہرے سے کہا۔

"میں کسی قسم کا دنگا فساد نہیں چاہتا شجاع......" جہانگیر نے سرزنش کی۔

"لالہ جی...... دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ دس لوگوں کے سامنے میں اپنے باپ کے قاتلوں کو ماروں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی کوئی میرے خلاف گواہی دینے کو تیار نہ ہو...... پھر میں ان لوگوں کو دیکھوں!" اس کی آواز میں جوش تھا جو جہانگیر کو خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

"تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہے ہو......"

"لالہ میں جس آگ میں جل رہا ہوں، اس کی تپش سے آپ واقف نہیں ہیں!"

"تحمل سے میرے بھائی! میں اب بھی کوئی غیر قانونی قدم اٹھانے کو تیار نہیں، تمہیں گاؤں بلانے کا فقط ایک مقصد ہے کہ تم چشم دید گواہوں کو کوئی ضمانت دو تا کہ وہ گواہی دینے کو تیار ہو جائیں......"

"گواہی تو ان کا باپ بھی دے گا لالہ......" اس نے جوش سے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتا دیں کہ کون لوگ ہیں جنہوں نے یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگر ایسا کوئی آدمی نہیں بھی تو مجھے بتائیں لالہ کہ کتنی گواہیاں میرے باپ کے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوں گی؟"

"جب سچے گواہ موجود ہیں تو کسی جھوٹی گواہی کی کیا ضرورت ہے!" جہانگیر نے کہا۔

"میں جلد از جلد اپنے باپ کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کو اپنے انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں قانون کو ہاتھ میں لے رہا ہوں یا قانون مجھے ہاتھ میں لیتا ہے......" اس نے جس عزم سے کہا تھا اس نے جہانگیر کو اس پچھتاوے میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اسے شہر سے گاؤں لے آیا ہے۔

☆☆☆

سیما کو سلمیٰ کے پاس چھوڑ کر شاکر چند دنوں کے لیے اپنی دونوں بہنوں سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ مگر شاکر بہت سی

باتیں دونوں بہنوں سے چھپا گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر جب سب لوگ لیٹنے کو چلے گئے تو دونوں بہنیں بھائی کے پاس آ بیٹھیں۔

''اب تم شادی کرلو شاکر......''

''آپ لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی اور بات آتی ہے کہ نہیں؟'' وہ ہنسا تھا۔

''ہم دونوں گئے تھے گاؤں تمہاری خیریت پوچھنے کو......''

''اچھا، کب؟'' شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں تمہارا گھر بند تھا تو ہم معراج خالہ کی طرف چلے گئے تھے، زرتاج کو بھی دیکھا ہم نے!''

''اچھا؟'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ''کیسی تھیں خالہ؟'' بے چینی کے باوصف وہ ان سے سیدھے سبھاؤ زرتاج کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا۔

''خالہ تمہاری طرف سے پریشان بھی تھیں اور گاؤں کے حالات سے خوفزدہ اور چاہ رہی تھیں کہ تم جب بھی لوٹو تو وہ زرتاج کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں!''

''کیسی لگی زرتاج آپ لوگوں کو؟'' اس نے ان سے سوال کیا۔

''بہت پیاری ہے لالہ! سچ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ فوراً سے پہلے اسے اپنے گھر لے آؤں!'' چھوٹی بہن نے کہا۔

''بس اب کوئی بہانہ چلے گا نہ عذر......'' بڑی بہن نے کہا ــــ ''کسی ماں کی جوان بچی یوں گھر میں بیٹھی ہو تو اسے پریشانی تو ہوتی ہے نا اور پھر تمہیں علم ہے کہ گاؤں کے چوہدریوں نے کیا گند مچا رکھا ہے!''

''سب جانتا ہوں آپا! مگر شہر میں کاروبار جمانے میں مجھے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ اب کام چل نکلا ہے تو پہلی فرصت میں گاؤں جاؤں گا اور سارے معاملات طے کرلوں گا!''

''میں سونے کے کنگن لوں گی بھیا!'' چھوٹی بہن نے کہا۔

''ہاں وہ تو دونوں بہنوں کا حق ہے، ضرور ملے گا......'' نکلتے وقت اس نے کچھ رقم دونوں بہنوں کو زبردستی تھما دی، جانتا تھا کہ ان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ کافی تحائف لایا تھا مگر پھر بھی نقد رقم ان کی کئی ضرورتیں پوری کرسکتی تھی۔

''جب میرا گاؤں جانے کا پروگرام بنے گا تو آپ لوگوں کو خط لکھوں گا، آپ لوگ بھی جائیں تو خالہ سے بات کر لیں گے!''

''جس طرح تم کہو گے میرے بھائی!'' بڑی بہن نے وعدہ کیا، ''کیا رکو گے نہیں آج؟''

''نہیں رک سکتا آپا، کام بہت ہے......'' چاہتے ہوئے بھی وہ بہنوں کو اپنے راز میں شریک نہیں کرسکا تھا۔ وہ ان سے رخصت ہو کر آیا اور واپسی کے سفر میں انہی خیالوں میں رہا کہ اگلا مرحلہ اب اس کی اپنی شادی کا ہے جس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انہی سوچوں میں گم اسے نیند آنے لگی اور چھم سے سیما کا خیال آ گیا جانے منّلی آپا کو تنگ نہ کر رہی ہو...... یہ میں کیوں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بارے میں اسی طرح سوچتا ہے جیسے کہ وہ اس کی بیٹی ہو، اتنے عرصے سے وہ اس کے ساتھ تھی...... اتنا عرصہ تو جانور بھی ساتھ ہو تو اس سے مانوسیت ہونے لگتی ہے۔

''کتنا اچھا لگتا ہے جب وہ اپنی توتلی سی آواز میں مجھے ابا کہتی ہے......'' وہ سوچ کر مسکرایا۔

☆☆☆

باہر کوئی محلّے دار تھا اور نیاز دینے کے لیے آیا تھا، اس نے حیرت سے اس مکروہ صورت آدمی کو دیکھا جو اس سے قبل کبھی اس محلے میں نظر نہیں آیا تھا۔

''کیا آپ اس گھر میں رہتے ہیں؟'' آنے والے نے پوچھا۔

''نہیں تو...... ہاں ہاں!'' دروازہ کھولنے والا ہڑبڑا گیا تھا۔

''اور کون کون رہتا ہے اس گھر میں؟''

''تم نیاز دینے آئے ہو یا تفتیش کرنے؟'' اس نے جھلا کر کہا۔

''لڑنے کو کیوں آ رہے ہیں بھائی صاحب، محلے دار ہوں، پوچھ رہا ہوں!'' آنے والے نے تحمل سے کہا......

''چلو جاؤ اب، برتن بعد میں آ کر لے جانا!'' اس نے اسے ٹالا۔

''برتن تو مجھے ابھی چاہیے......'' اس نے جان بوجھ کر کہا۔

''پکڑو یار اسے، ابھی واپس لے جاؤ......'' اس نے بدتہذیبی سے برتن اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں نہیں...... میرا ہرگز یہ مقصد نہ تھا!'' اس نے فوراً صفائی دی۔ ''یہ آپ کے سامنے والے کمرے سے دھواں کیوں نکل رہا ہے؟'' گھبرا کر اس نے مڑ کر دیکھا اور چیخ کر اندر والوں کو پکارا۔

''رشید...... غفور...... بھاگو!'' پڑوسی کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے ورنہ اگر کسی آدمی کے گھر میں آگ لگی ہو تو وہ بجائے آگ بجھانے کے کیا بھاگنے کا کہتا؟ اس نے باہر گلی میں کھڑے کھڑے چلا چلا کر لوگوں کو متوجہ کیا اور جونہی یہ تینوں گھر سے بھاگنے کو نکلے، لوگوں نے انہیں مکوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اندر سے ڈری ڈری نسوانی چیخوں کی آواز نے انہیں معاملے کی سنجیدگی کا احساس دلایا۔

''دروازہ کھولو بہن......'' ایک نوجوان نے کہا۔ ''ہم تمہاری مدد کو آئے ہیں!''

''کون ہو تم لوگ؟'' مریم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

''ہم تمہارے ہمسائے ہیں، دروازہ کھولو......''

''میں دروازے تک نہیں پہنچ سکتی......'' اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''اندر ہر چیز کو آگ لگ چکی ہے!'' اس کی آواز سے اردگرد سنسنی پھیل گئی، آگ کے شعلے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

''دروازہ توڑ دو......'' ایک آواز آئی اور اندر مریم کا دل دھڑ دھڑانا شروع ہو گیا۔

☆☆☆

وہی عباس تھا جو ہر روز زہرہ کو تالے میں بند کر کے جاتا تھا اور اب ہر روز زہرہ اسے گھر پر چھوڑ کر کام کرنے کو جاتی تھی، نہ نکلتی تو گھر میں فاقوں کی نوبت آ جاتی۔

چند دن کے بعد جب لوگوں کا ترس کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا تو گھر میں ٹھنڈا چولہا زیادہ شدت سے ٹھنڈا لگنے لگا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' خاموش نگاہوں سے وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے، مگر کوئی جواب نہ پاتے۔ ابھی تو یہ بھی شکر تھا کہ عباس کے علاج کے اخراجات اس تعمیراتی کمپنی نے اٹھائے تھے جہاں وہ کام کرتا تھا، ورنہ ان سے تو علاج کروانا بھی ممکن نہ ہوتا۔ ''میں کچھ کام وام کرلوں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے عباس سے پوچھا تھا۔ عباس نے جس نظر سے اسے دیکھا تھا، وہ اندر تک سہم گئی تھی۔

''تم کیا کام کرو گی؟'' اس کے لہجے میں شکست تھی۔

''کچھ بھی کرلوں گی!'' اس نے نظر نیچی کی، عباس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی تاب کہاں تھی اس میں۔

''ہے بھگوان......'' اس نے سوچا۔ ''عباس کو جلد ٹھیک کردے!'' جب بھی وہ کسی مصیبت میں ہوتی، اسے مانگنا فقط بھگوان سے ہی آتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر رہی تھی، شکر ہے کہ اس کی بڑبڑاہٹ عباس نے سنی تھی نہ وہ اس کی سوچوں تک رسائی رکھتا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' عباس نے پوچھا۔

”دعا کر رہی تھی تمہارے لیے......“ اس نے کہا۔ ”اللہ تمہیں صحت دے، جلد ہی تم اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ!“

”کیوں...... تم میری ننھی چاپلی سے تھک گئی ہو؟“ طنز میں ڈوبا ہوا انداز، سڑا ہوا لہجہ...... ”دفع ہو جاؤ تم کہیں اگر تمہیں بوجھ لگنے لگا ہوں میں!“

”میں نے یہ کب کہا......“ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”جانتا ہوں، سب جانتا ہوں......“ اس کی آواز میں بھی کچھ بھیگا بھیگا سا تھا۔ ”بوجھ بن گیا ہوں میں تجھ پر، تنگ آ گئی ہے تو میری بیماری سے......“

”نہیں نہیں...... بالکل نہیں عباس......“ اس نے اٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”کاش میں اپنا دل چیر کر تمہیں دکھا سکوں، میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں!“ عباس کو دل سے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر وہ اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔

”روٹی لے گی کیا؟“ اس نے ایک بالکل بے تکی سی بات کی۔ زہرہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور رسوئی کی طرف بڑھی۔

”تو پھر میں کہیں کام کے لیے چلی جایا کروں؟“ اسے روٹی دے کر وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھی تھی۔

”کہاں؟“ اس نے روٹی سے دھیان بھی نہ اٹھایا تھا۔

”ساتھ والی خالہ سے کہوں گی تو وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیں گی!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا کام آتا ہے تجھے؟“ اس نے سوال کیا۔

”مشین پر سیدھا سادہ سلائی کا کام تو آتا ہے مجھے، مگر آہستہ آہستہ ہاتھ کھل جائے گا، تب تک کوئی اور کام کر لوں گی!“

”اور کیا کام؟“ اس نے جرح کی۔

”یہ تو خالہ سے بات کر کے ہی علم ہوگا نا کہ وہ کیا کام دلوا سکتی ہیں؟“ اس نے اپنے اندر ابھرنے والے غصے کو دبایا۔

”اچھا اس سے پوچھنا، پھر مجھے بتانا...... میں پھر ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا!“ اتنے شاہانہ انداز سے کہہ رہا تھا جیسے کوئی نواب ہو اور اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔

”ٹھیک ہے!“ اس سے بہتر اور تسلی بخش جواب اس کے پاس اور کوئی نہ تھا۔

”اور ہاں......“ اس نے کہا، ”کوئی ایسا کام نہ ہو جہاں تو آدمیوں سے آنکھ مٹکے کرتی پھرے!“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جو عورت اس کی خاطر اپنے اتنے پیار کرنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر آ گئی تھی، اب اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھی جا سکتی تھی...... ”میں کبھی قابلِ اعتبار نہ ٹھہروں گی عباس تمہاری نظر میں!“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

”کیسا پیارا ہے کلثوم تمہارا بیٹا......“ زرتاج نے اسے گود میں اٹھا رکھا تھا۔

”پیارا تو ہے مگر ہے کیسا بدقسمت کہ جس کے باپ کو علم ہی نہیں کہ اس کا بیٹا پیدا ہوا ہے!“ کلثوم نے کہا۔

”پتا نہیں کم بخت کہاں جا مرا ہے......“ معراج بی بی نے غصے سے کہا۔

”آپ نے کسی سے کہہ کر پتا کروایا ہے ماسی؟“ کلثوم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”کسی ایک سے نہیں کلثوم! میں نے بہت لوگوں سے پوچھا ہے پتر......“ معراج نے کہا۔ ”کسی نے اسے چند دن پہلے کچھ لوگوں کے ساتھ دیکھا تھا جو اس گاؤں کے نہیں تھے!“

”تو کون لوگ تھے وہ؟“

”ہوں گے کوئی اسی کی طرح کے نشئی......“ معراج نے تسلی دی۔ ”تو فکر نہ کر، جائے گا کہاں، لوٹ کر یہیں آئے گا نا!“

”وہ تو ہے ماسی، مگر......“

”اگر مگر کچھ نہیں، جانتی ہوں میں کہ تو کیا سوچ رہی ہے، چپکی پڑی رہ، جب تک وہ نہیں آتا تو آرام سے یہیں رہ اور ٹھیک ہو جائے گی اور وہ لوٹ آئے گا تو تو چلی جانا!“ اس کے بعد کلثوم کی بحث کرنے کی مجال نہ تھی، خاموش ہو گئی۔ اسے جواد زندگی کی ایسی خوشی بن کر ملا تھا کہ اسے سارے دکھ ہیچ نظر آ رہے تھے...... گھوٹو کی ساری زیادتیاں بھلا کر وہ دل سے منتظر تھی کہ ایک بار آ کر اپنے بیٹے کو دیکھے۔ شاید وہ اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ وہ سدھر جائے گا، بیٹے کو دیکھے گا تو اس کا دل خود بخود کام کرنے کو چاہنے لگے گا۔

”ماسی میں اپنے گھر چلی جاتی ہوں، ممکن ہے کہ وہ وہاں کسی نہ کسی وقت آ جائے، اگر وہ آئے تو اسے کیسے علم ہوگا کہ میں یہاں ہوں؟“

”سارا گاؤں جانتا ہے کہ تو یہاں ہے اور وہ کسی سے پوچھے گا تو اسے علم بھی ہو جائے گا!“ معراج نے اسے گھُرکا۔

”مگر خالہ......“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

”اگر مگر کیا لگا رکھی ہے تم نے؟“

”میں کب تک آپ پر بوجھ بن کر رہوں گی خالہ؟“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، آنسو جو ہر وقت اس کی پلکوں پر ستاروں کی طرح سجے رہتے تھے۔

”آفرین ہے بیٹا، شاباش...... میں تو تمہیں اپنی بیٹی کہتی ہوں اور تم نے بتا دیا کہ تم میری بیٹی نہیں ہو!“ معراج نے تاسف سے کہا۔

”ارے نہیں خالہ...... ایسی بات نہیں ہے!“ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ ”مجھے معاف کر دیں خالہ اگر میں نے آپ کا دل توڑا ہے!“

”چل اب زیادہ ڈرامے بازیاں نہ کر، اس کو دودھ پلا...... ہر وقت چیختا رہتا ہے، پورا باپ پر پڑا ہے!“ معراج نے بات ٹالی اور اسے اپنے ہمیشہ کے انداز میں ڈانٹا۔ زرتاج اور کلثوم کھلکھلا کر ہنسیں، جواد بلند آواز میں رو رہا تھا۔ معراج تو اصل بات جانتی تھی کہ گھوٹو کو اس کے کسی نشے باز یار بیلی نے غصے میں آ کر کسی تیز دھار آلے سے قتل کر دیا تھا مگر یہ بات تو وہ لڑکیاں تب سن پاتیں جو وہ پچھلے کئی روز سے گھر سے باہر نکلی ہوں، کچھ قریبی لوگوں کو معراج نے منع کر دیا تھا کہ یہ خبر فی الحال کلثوم تک نہ پہنچے کہ اس کا دل دکھے گا، جیسا بھی تھا، تھا تو اس کا شوہر۔

☆☆☆

رانی کا غلیظ سا وجود لوگوں کو کسی بھوت کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس سے خوف کھانے لگے تھے اور اس کے سامنے آ جانے سے کتراتے اور اپنا راستہ بدل جاتے تھے۔ وہ ہر کسی سے سوال کرتی تھی، چوہدری اکبر علی کے بارے میں، لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا مجرم چوہدری اکبر علی ہے مگر کوئی اس کے لیے کیا کر سکتا تھا...... قدرت ہی اسے سزا دے سکتی تھی، اس کے گرد دائرہ تنگ ہو رہا تھا مگر کس وقت اس پر گرفت ہونا تھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

چوہدری شجاع ایسا نہ تھا کہ وہ اکبر علی اور اس کے بھائی بابر کو اپنے باپ کا خون یوں ہضم کرنے دیتا، اس کے اندر کی آگ بھڑک رہی تھی۔

شکیلہ...... جو کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اب دوسروں کے رحم و کرم پر پڑی تھی۔ فالج نے اس کے پورے جسم کو بری طرح متاثر کیا تھا، صرف اس کا ذہن کام کرتا تھا جس میں کبھی بھولے سے بھی اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی

مانگنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ کتنے جرائم، کتنی سازشیں اور کتنے قتل اس کے کھاتے میں درج تھے مگر اسے ان کا احساس تک نہ تھا، یہ احساس ہوتا اور توبہ کی توفیق...... اس کے نصیب میں نہ تھے۔

اس کا شوہر جو اپنے باپ جیسے بھائی کے جنازے پر بھی نہ گیا تھا، اسے کوئی ان دیکھا پچھتاوا گھیرے ہوئے تھا، کہیں بھی بیٹھا ہوتا تو اپنے وجود سے کوئی ان دیکھے تاگے کھینچ کھینچ کر نکالتا رہتا، یہ تاگے اس کے وجود سے لپٹے وہ گناہ تھے جن کا کوئی کفارہ تھا نہ ان معصوم اور مظلوموں کی آہیں اور چیخیں اسے اس سے نجات دلاسکتی تھیں۔

☆☆☆

کوئی گواہ تھا نہ کوئی بیان دینے والا...... نہ کسی پر کوئی شک ظاہر کرنے والا۔ بظاہر تو یہی لگا کہ دونوں بھائیوں کے مابین جھگڑا ہوا اور دونوں نے بیک وقت فائر کیے کیونکہ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور انہی کی انگلیوں کے نشانات ریوالور پر پائے گئے تھے۔ پولیس کو تفتیش کے لیے کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا کیونکہ جن پر شک کیا جاسکتا تھا وہ تو اپنے باپ کے قتل کے مقدمے کی پیروی تمام تر قانونی تقاضوں کے مطابق کر رہے تھے۔ پولیس معمول کے سوالات جوابات کرنے کو آئی، دونوں بھائیوں سے کچھ سوالات کیے گئے اور تسلی بخش جوابات کے بعد روانہ ہوگئے۔

''تم نے ایسا کیوں کیا فیضی؟'' جہانگیر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کیا سرکار؟''

''فیضی، میں نے تمہیں دس برس کی عمر سے لے کر اب تک دیکھا ہے، میں تمہاری ہر ہر حرکت کا مطلب سمجھتا ہوں...... کاش تم ایسا نہ کرتے!'' فیضی کے پاس اس کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، شجاع نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی کہ لالہ نے فیضی کو اس کا ذمے دار سمجھا تھا، اس پر شک نہیں کیا تھا۔ جہانگیر کیا کرتا، جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا اور شجاع کو نہیں جتلایا کہ وہ جانتا تھا کہ فیضی کس کے حکم کا بندہ تھا اور کس کے اشاروں پر اس نے یہ کام کیا تھا۔ گاؤں کے حالات اب اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہاں رہا جاتا، ہجرت کا وقت آن پہنچا تھا، اب گاؤں کی گدی شجاع کو ہی سنبھالنا تھی اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔

''اصولاً تو تمہیں پولیس کی تحویل میں چلے جانا چاہیے فیضی...... مگر میں اس کا فیصلہ شجاع پر چھوڑتا ہوں، ان معاملات کو وہ مجھ سے بہتر سمجھتا ہے......'' جہانگیر نے کہا تو شجاع کو اپنا آپ اہم محسوس ہوا۔

''اسے ایک موقع دے کر دیکھنا چاہیے لالہ جی، مجھے امید ہے کہ یہ اس کا آخری جرم ہوگا!'' شجاع کی یقین دہانی پر اسے اعتبار کرنا ہی تھا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

''ماں جی کا خیال رکھنا شجاع...... میں بھی آتا جاتا رہوں گا!''

''آپ فکر ہی نہ کریں لالہ جی......'' دونوں بھائی ایک عرصے کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملے تھے۔

''آپ شیر علی کا خیال رکھیں، اسے بہت بڑا آدمی بنانا ہے، اس کے اخراجات کی فکر نہ کریں یہ سب کچھ اسی کے لیے ہے۔''

☆☆☆

جہانگیر کے دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تو مدت کے بعد حویلی میں خوشیاں جاگیں، انہی خوشیوں کے بیچ عابدہ بیگم نے رابعہ کے کہنے پر ایک اور خوشی کی خواہش کا اظہار کیا۔ امید تو نہ تھی کہ وہ مانے گا مگر شاید وہ بھی اندر سے تبدیل ہو چکا تھا، ایک سادہ سی تقریب میں شجاع کا نکاح کلثوم سے کر دیا گیا۔ شجاع دنیا میں ہر شخص سے اکھڑ ہوسکتا تھا مگر اپنی ماں سے نہیں اور پھر انہوں نے اسے اپنی ممتا کا واسطہ دیا تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد ماں کو ہر وقت دکھ کی کیفیت میں دیکھتا تھا، اسے ماں کے چہرے کی مسکراہٹ کی یہ قیمت بڑی نہ لگی، بیاہ تو اسے کسی نہ کسی سے کرنا ہی تھا۔

ایک دفعہ اس کے دل میں آیا کہ وہ ایک برتی ہوئی عورت تھی مگر اگلے ہی پل جیسے اس کا اپنا ضمیر بول اٹھا۔ ''تم کیا

ہو......'' باپ کی موت اور ذمے داریوں کے احساس نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔

اتنا کہ اس نے رابعہ کے پیروں میں گر کر اپنی غلطی کی معافی مانگی، رابعہ کا دل تو یوں بھی بہت بڑا تھا، اس نے اتنے برس اس بات کو اپنے شوہر سے بھی چھپایا تھا، اپنے ماموں کا مان رکھا تھا۔

''تم کلثوم کا خیال رکھنا، وہ بہت دکھی ہے...... اس پر بہت ظلم ہوا تھا!'' رابعہ نے اس سے درخواست کی۔ ''اس کے بیٹے کو اپنے بیٹے جیسا نہ بھی سمجھ سکو تو اسے دھتکارنا نہیں، وہ ایک یتیم بچہ ہے جس کا اس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں!''

شجاع نے اس کی بات تحمل سے سنی اور وعدہ کیا کہ وہ اچھا شوہر اور اچھا باپ ثابت ہونے کی کوشش کرے گا۔ ماں کو شجاع اور کلثوم کے ساتھ چھوڑ کر وہ مطمئن ہو کر شہر لوٹے تھے جہاں ایک نیا جہاں ان کے لیے اپنی بانہیں وا کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

''اماں جب میں پچھلی دفعہ شہر آئی تھی اور امتحان دے رہی تھی تو امتحان کی ایک نگران مجھے بہت غور اور حیرت سے دیکھ رہی تھیں، بلکہ مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میرا نام کیا ہے اور میرا تعلق کہاں سے ہے۔'' زرتاج ماں کو بتا رہی تھی۔

''ہوتی ہیں شکلوں جیسی شکلیں......'' معراج نے بے دھیانی سے کہا۔ ''کئی لوگوں کو یوں بھی عادت ہوتی ہے خوامخواہ ایسے سوال کرنے کی اور شہر کی عورتیں تو یوں بھی جہاں پیاری شکل دیکھی، اس کا اتا پتا پوچھنے بیٹھ جاتی ہیں!''

''نہیں اماں...... وہ ایسی نہیں لگتی تھیں اور ہاں یاد آیا......''

''کیا یاد آیا۔'' معراج نے پوچھا۔

''وہ پوچھ رہی تھیں کہ خوشحال نگر سے تمہارا کوئی تعلق ہے......'' زرتاج نے کچھ یاد آنے پر بتایا۔

''اچھا......'' معراج متوجہ ہوئی۔ ''پھر تو تم پوچھتیں اس سے، شاید وہ وہاں کی رہنے والی ہو!''

''آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ اجنبیوں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے!'' زرتاج نے فوراً کہا۔

''اچھا چل اب باتیں چھوڑ اور اپنے امتحان کی تیاری کر......'' معراج نے کہا۔ ''پڑھائی ختم ہوتے ہی اب تیری رخصتی ہونے والی ہے!'' زرتاج شاکر کے تصور میں کھو گئی، جس کا چہرہ اب اسے کتابوں میں نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

''جالی......'' الماس نے اپنی ملازمہ کو بلایا۔ ''جا ذرا دکان سے چوہے مارنے والی گولیاں تو لیتی آ، اب تو کمروں میں جا بجا چوہے نظر آنا شروع ہوگئے ہیں!''

''آپی میں کھیر بنا رہی ہوں، اماں نے خاص طور پر کہا تھا کہ بے پروائی نہ کرنا!''

''تو جا...... میں دیکھ لیتی ہوں!'' الماس نے اسے اٹھایا اور خود اس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی جالی چوہے مار گولیوں کا پیکٹ لے آئی۔

''دکان دار نے کہا ہے کہ آٹے اور چینی میں ملا کر جگہ جگہ رکھ لیں اور اپنے ہاتھوں کو نہ لگنے دیں، بہت زہریلی ہے......'' اس نے پیکٹ الماس کے حوالے کیا۔ ''اب اٹھیں اور مجھے کھیر بنانے دیں!''

''کام میں کر لیتی ہوں جالی، تو میرے کپڑے تو ذرا حل کر سکھا دے......'' الماس نے اس سے کہا۔

''اماں مجھے جوتے ماریں گی جو انہوں نے آپ کو کام کرتے دیکھ لیا!'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''میں کہہ دوں گی اماں سے...... تو فکر نہ کر، جا جلدی سے میرے کپڑے حل دے، میں کھیر پکا کر چوہوں کے لیے کھانا تیار کر دیتی ہوں وہ جگہ جگہ رکھ دینا......'' اس کی بات پر جالی کھلکھلا کر ہنسی۔ جالی کے جاتے ہی اس نے پیکٹ کھولا۔

''اماں...... ہم سب نے تجھے بہت دکھ دیے ہیں، ہمیں جینے کا حق نہیں، کسی کو بھی نہیں، ہم میں سے جو بھی جوانی کی دہلیز کو چھوئے گی وہ تجھے اسی طرح دکھ دے گی، ہماری عمر کے تقاضے اور تیرے کاروبار کے تقاضے آپس میں میل نہیں کھاتے اماں......'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ کھیر میں اس نے اور بھی چینی کا اضافہ کر دیا تھا۔

پیالوں میں اس نے کھیر ڈالی، سادہ آٹے کی گولیاں بنائیں اور انہیں جالی کے حوالے کر کے وہ اپنے
کمرے میں آ گئی۔ رات کے کھانے سے پہلے اس نے مصلیٰ بچھایا اور اپنے اللہ کے حضور سجدے میں گر
گئی، اپنے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگی جو وہ کر چکی تھی اور جو وہ کرتے جا رہی تھی۔
رات کے کھانے کے لیے بلاوا آ رہا تھا، سب اس وقت اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد سب کو کھیر کھانا
تھی۔ وہ دستر خوان پر کھانا کھاتے ہوئے کھوئی کھوئی سی تھی، ماں نے پوچھا بھی کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے وہ چونک
گئی۔ وہ انجانے میں ان سب صورتوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ اپنے بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی...... آخری بار...... اس
کے بعد اسے یہ سب کہاں دیکھنا تھا۔ ماں اپنے ہاتھوں سے کھیر کے پیالے بھر بھر کر سب کو تھما رہی تھی، اس نے اپنا پیالہ
پکڑا اور اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے، اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روک لو...... سب کو روک لو مگر اس
وقت دل و دماغ کی کٹھن جنگ تھی اور اس میں کون جیتنے والا تھا...... اس کا فیصلہ لمحوں میں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

مریم اس روز پرویز کے گھر ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی سے بھی نکل گئی تھی، یہ بھی شکر تھا کہ ان کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا
ورنہ ایک بے قصور نفس زندگی کو سزا کے مانند بھگتنے آ جاتا۔ پرویز کئی بار اسے ڈرانے دھمکانے آیا مگر وہ اپنے ارادوں
میں اٹل رہی، ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر اس نے ملازمت کی تلاش کی اور اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے لگی۔ باہر
کی دنیا میں بڑے بھیڑیے اور عفریت سہی مگر جو اللہ کا نام لے کر زندگی گزارنا اپنا مقصد بنا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے
لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔
اس روز کمرہ امتحان میں اس نے جس چہرے کو دیکھا اس نے اسے گھنٹے بھر تک کشمکش میں مبتلا رکھا تھا مگر اچانک
اس کے ذہن میں جھماکا ہوا...... ہاں...... وہ لڑکی ستارہ جیسی لگ رہی تھی...... بغیر سوچے سمجھے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس
کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔
"کیا تمہارا تعلق خوشحال نگر سے ہے؟" اسے یاد تھا کہ اس اسٹیشن کا نام یہی تھا۔
لڑکی نے جواب میں خاموشی اختیار کی تو وہ سمجھ گئی کہ وہ لڑکی اس نام کی کسی جگہ کو جانتی نہ تھی مگر اس کی مشابہت
حیرت انگیز تھی۔ "کیا میں اس سے پوچھوں کہ اس کی کوئی بہن......" اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر پھر اپنی سوچ پر
اسے ہنسی آ گئی، کیسی عجیب سی بات لگے گی جیسے کوئی کہانی ہو یا ڈراما۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔
چند تہ پوچھے گئے سوالات پوچھ لیے جاتے تو حالات مختلف ہوتے مگر قدرت کو معراج سے اس کی کھوئی ہوئی بیٹیوں کو ملانا
مقصود ہی نہ تھا، نہ زندہ نہ مردہ......

☆☆☆

پورے شہر میں اس خبر کا شہرہ تھا، اس وقت میڈیا اتنا "باخبر" اور طرار نہ تھا مگر پھر بھی قائم علی ایک عزت دار آدمی تھا
اور اس بات سے بچنا چاہتا تھا کہ اس خبر سے اس کا تعلق کسی بھی طرح ظاہر ہو۔ چند دن قبل ہی تو معراج واپس آئی تھی اور
وہ چاہ رہا تھا کہ وہ نہ شہر میں رہے نہ خوشحال نگر میں...... کسی اور جگہ، جہاں ماضی کی یادیں نہ ہوں۔
اس گھر سے اس کا ایسا تعلق تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے وہاں گیا، ساری لاشیں تدفین کے لیے تیار تھیں، سات
پیاری پیاری صورتیں، ان کا اکلوتا بھائی اور ان کی ماں اور وہ ملازمہ...... جو باورچی خانے میں بیٹھی کھیر سے لطف اندوز
ہو رہی تھی، اس کی موت نے تو اس خاندان کی موت کو معما ہی بنا دیا تھا۔ ایک دکان دار نے بتایا تھا کہ وہ چوہے مار گولیاں
لینے کے لیے آئی تھی، مگر اسے ان گولیوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا...... کس کو علم تھا؟
آخری لاش کے پاس پہنچ کر قائم علی ٹھٹک گیا تھا، چھوٹی سی بچی، معصوم سا چہرہ مگر جس چیز نے قائم علی کی توجہ کھینچ لی تھی
وہ اس کا کفن سے باہر نکلا ہوا ہاتھ تھا۔ وہ ہاتھ اس کے لیے نا امیدی کی ایک علامت تھی، وہ معصوم چہرہ...... اتنے برسوں کے بعد

اس کے لیے آشنا نہیں رہا تھا مگر اس ہاتھ کو وہ خوب پہچانتا تھا جس کی پشت پر نیلے رنگ کا چاند کھدا ہوا تھا۔ نین تارا اور حسن آرا جڑواں تھیں اور ان کی شکلیں بھی بالکل ایک جیسی، اسی لیے معراج نے ان کی پشت پر چاند اور تارا بنوائے تھے۔ نین تارا کے ہاتھ پر چاند بنا ہوا تھا اور حسن آرا کے ہاتھ پر تارا...... اسی لیے حسن آرا کا نام مریم نے ستارہ رکھا تھا۔ نیلے چاند والا وہ ہاتھ اسے بتا رہا تھا کہ اس نے اس اجتماعی قتل کی واردات میں ایک بیوی، ایک بیٹی اور ایک ایسا بچہ کھویا تھا جسے دنیا میں آنا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ اس غم کو اپنے دل میں ہی لے کر رہ گیا، معراج کو نہیں بتا سکتا تھا نہ اسے سمجھا سکتا تھا۔ ان دونوں کے مابین عمر کے وہ تین چار برس آئے تھے جنہوں نے ان سے بہت کچھ چھین لیا تھا، اب اعتبار اس طرح قائم نہیں ہو سکتا تھا، اس کی دوسری شادی قدرت کو راز میں رکھنا مقصود تھی ورنہ وہ طلاق کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

"میں تم سے کچھ مانگوں شاکر؟" سعید نے سر جھکا کر اس سے سوال کیا تھا۔

"بھائی صاحب...... شرمندہ کیوں کرتے ہیں!" شاکر نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں جو کچھ تم سے مانگ رہا ہوں، اگر تمہیں برا لگے تو مجھے معاف کر دینا......"

"یوں نہ کہیں بھائی صاحب! مجھے خود پر شرمندگی ہو رہی ہے......"

"میری بہن کو سہارا دے دو شاکر......" انہوں نے رک رک کر کہا۔ "اس کی لاوارث بیٹی کو باپ اور تمہاری بیٹی کو ماں مل جائے گی!"

"وہ...... وہ!"

"میری بہن بہت اچھی ہے شاکر، اسے قدر کرنے والے لوگ نہیں ملے......"

"وہ بات نہیں ہے بھائی صاحب......"

"مجھے افسوس ہے شاکر، میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی سوچ لیا کہ تمہیں میری اس تجویز سے کوئی اختلاف نہ ہوگا، تاہم اگر تم برا نہ مناؤ تو کیا میں اس انکار کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"میں نے انکار نہیں کیا......" وہ ہکلایا۔ "اصل میں......" وہ رکا۔ "آپا جانتی ہیں کہ کیا وجہ ہے!" اس نے جھجک کر کہا۔

"مجھے سلمیٰ نے بتایا تھا مگر......" سعید نے کہا۔ "تم اس سے بات کر لو اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو، میری بہن دکھی ہے، تمہارے گھر کے کسی کونے میں پڑی رہے گی شاکر، مجھے تم جیسا اچھا آدمی کہاں سے ملے گا!"

"میں سوچ کر بتاؤں گا بھائی صاحب......" شاکر تذبذب میں تھا۔ اسے ناہید اچھی لگی تھی، اس کے بھائی کے گھر کا ماحول بھی اچھا تھا مگر اتنے عرصے وہاں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس نقطۂ نظر سے سوچا تک نہ تھا۔ 'کیا زرتاج کسی عورت کا وجود برداشت کر سکے گی؟' اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے ناہید کو سہارا دینے پر اعتراض نہ تھا...... مگر وہ زرتاج کو کیونکر بھول سکتا تھا، وہ تو جیسے ایک 'سی سا' پر بیٹھا تھا جس پر کبھی کوئی اوپر جاتا تھا کبھی کوئی۔

☆☆☆

"لازم نہیں کہ تم اسے پڑھائی پر مجبور کرو نینا...... اگر اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تو اسے کسی اور کام میں لگا دو!" ڈاکٹر شگوفہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"کون سا کام ہے جو وہ کرے گا، کیا کوئی دکان کھولے گا یا ریڑھی لگائے گا؟" نینا نے زچ ہو کر پوچھا۔

"دکان یا ریڑھی کوئی ایسے معیوب کام نہیں ہیں نینا، کم از کم اس ملازمت سے بہتر ہیں جو تمہارا شوہر کرتا ہے اور حرام کی کمائی اس کے وجود میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اسے کوئی کام حرام نہیں لگتا!"

"مگر اس دور میں لوگ باگ لڑکوں کی ملازمت کا سب سے پہلے پوچھتے ہیں!"

"اگر تمہیں میری کرن کو بہو بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے تمہارے بیٹے کے دکان دار ہونے پر کوئی اعتراض

نہیں......" نینا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں!"

"کرن شادی کر لے گی سہیل سے؟" نینا نے پوچھا۔

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے منانا میرا کام ہے!" دونوں کے مفادات اس رشتے سے وابستہ تھے، شگوفہ کی ایک بیٹی ٹھکانے لگ جاتی اور سہیل کو ایک ایسی بیوی مل جاتی جو کہ اس کی نفسیاتی معالج بھی تھی۔

"میں تمہارا یہ احسان کبھی بھی نہ بھولوں گی، تم نے اپنی بیٹی کو میری بیٹی بنانے کا سوچا!" نینا نے احسان مندی سے مغلوب ہو کر کہا۔

"اصل میں یہ ترکیب میں نے استعمال کی ہے تمہارے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانے کے لیے......" اس رشتے کی نیم رضا مندی سے دونوں سہیلیاں کھلکھلا کر ہنسیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

☆☆☆

"مجھے کسی کے گھر پر کام مل رہا ہے......" زہرہ نے اسے استفسارانہ انداز میں اطلاع دی۔

"گھروں پر کس طرح کا کام ہوتا ہے، تمہیں علم ہے نا......" اس نے فوراً اعتراض کیا۔ "میری بیوی ہو کر تم لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچھا کرو گی؟"

"بچوں کو سنبھالنے کا کام ہے......" اس نے آہستگی سے کہا۔

"بس تب تک جب تک میں اپنے قدموں پر نہ کھڑا ہو جاؤں!" اس نے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی، "جس دن میں خود کام پر جانے لگا تو تمہیں کام چھوڑنا ہوگا!"

"جب تم کام کرنے لگو گے تو پھر میں کیوں کام کروں گی؟" اس کے چہرے پر سکون اتر آیا۔

اگلے ہی روز ساتھ والی خالہ اسے ایک قریبی گھر میں لے گئیں، جہاں اسے دو بچوں کو سنبھالنے کا کام کرنا تھا کیونکہ ان کی ماں کے ہاں تیسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ کبھی کبھار بچے سوئے ہوتے تو وہ بیگم صاحبہ کی کمر وغیرہ دبا دیتی تھی، جو وہ منع کرتیں کہ اس کی اپنی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ کام کر سکتی۔ مگر وہ بیگم صاحبہ اس کا بہت خیال رکھتیں، ان کے چھوٹے شریر بچے جب تک جاگ رہے ہوتے تھے تب تک اسے بہت مصروف رکھتے تھے۔ صاحب سے اس کا سامنا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اس کے آنے سے قبل گھر سے جا چکے ہوتے تھے اور اس کے لوٹ آنے تک واپس نہ آتے تھے۔

مگر اس روز آنے والے مہمانوں کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی...... بلکہ آنے والی مہمان ہی اسے دیکھ کر چونکی تھی کیونکہ زہرہ تو شاید اسے یوں اچانک راہ چلتے دیکھ کر پہچان بھی نہ پاتی۔ "دیا؟" اس تعارف کو تو وہ خود بھی بھول چکی تھی۔

"مم......" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"یہ میری دیورانی ہے کلثوم......" رابعہ نے تعارف کروایا جس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ زہرہ اسے پہچان گئی تھی......

"اور یہ زہرہ ہے!" زہرہ کا اس تعارف پر زمین میں سمانے کو دل چاہنے لگا، کلثوم ایک لمحے کو ٹھٹک گئی۔ اس کے دل کے اندر کتنے ہی زخموں کے ٹانکے اُدھڑنے لگے۔ اس کی زندگی کی کتنی ہی سختیاں اور تلخیاں اس کی مرہونِ منت تھیں۔

"کہاں ہوتی ہو آج کل...... لالہ کہاں ہے، کیا تمہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا یا تم اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ آ گئی ہو......" سوال تھے یا نشتر۔

"کیا بات ہے کلثوم! سانس تو لو...... کیا تم جانتی ہو اس کو؟" رابعہ نے اسے تھاما جس کا وجود بگولوں کی زد میں نظر آ رہا تھا۔ "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور اس کا شوہر بیمار ہے......" رابعہ کچھ کچھ بات کو سمجھ گئی تھی مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ زہرہ 'دیا' ہے اور اس کا زخمی شوہر عباس ہے یا کوئی اور۔

"اب تک سانسیں رکی ہوئی تھیں رابعہ آپی...... میں نے اس لمحے کا کب انتظار نہیں کیا، جب میں اس کا گریبان

تھام سکوں..... میں نے ان کے کیے کی سزائیں بھگتی ہیں!''

''اچھا بیٹھو ذرا سکون سے، تم جاؤ زہرہ بچوں کے پاس.....''

''میں گھر چلی جاتی ہوں!''

''ہرگز نہیں.....'' کلثوم اٹھی۔ ''تم نہیں جاؤ گی، مجھے میرے سوالوں کے جواب دیے بغیر!''

''اپنے سوالوں کے جواب کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا!'' اب زہرہ نے اعتماد سے کہا۔ ''تمہارا بھائی معذور ہو کر بستر پر پڑا ہے اور یہی سزا ہمارے لیے کافی ہے۔'' کلثوم بھائی کا سن کر تڑپ اٹھی اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر زہرہ کے ساتھ ہولی۔

گلے شکوے..... معافی تلافی ہوئی اور اس کے بعد تو عباس کے لیے آسانیاں اور خوشیاں تھیں، جس کے لیے گاؤں واپس جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کے سر پر پورے مان سے ہاتھ رکھا۔ ''میں اب جا کر تمہارے میکے کے گھر کا دروازہ کھولوں گا!''

☆☆☆

''آپ کو کیوں لگا کہ میرا ظرف اتنا چھوٹا ہے؟''

''ماسی سے بات کی تو انہوں نے تو صاف انکار کر دیا تھا!'' اس نے کہا۔

''ان کا اعتراض بھی بجا تھا، کوئی بھی ماں اپنی بیٹی کو دوسرے رتبے کی حیثیت میں دیکھنا پسند نہیں کرتی!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر تم نے کس طرح اس حیثیت کو قبول کر لیا؟'' شاکر نے پیار سے پوچھا۔

''محبت.....'' وہ ہنسی۔ ''مجھے آپ سے محبت ہے اس لیے مجھے آپ کا ساتھ قبول تھا اور جس عورت نے اپنا خون سینچ کر اس بچی کو پالا جو اس کی نظر میں آپ کی بیٹی تھی حالانکہ وہ بچی میری امانت تھی آپ کے پاس۔ جس طرح آپ نے اس امانت کا پاس رکھا اور اس نے پیار سے اسے پالا اسے اپنا دودھ تک پلایا..... کیا میرے دل میں اس کے لیے کوئی خاص مقام پیدا ہوتا کوئی انہونی بات ہے؟''

''مگر ماسی کو کس طرح منایا تم نے؟''

''ماسی کو علم ہے کہ جب کوئی لڑکی کسی کو اپنے دل میں بسا لیتی ہے تو پھر اسے پا کر ہی دم لیتی ہے!''

''ماسی کو کیسے علم ہوا؟'' شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

''ماسی بھی کبھی لڑکی تھی نا.....'' وہ ہنسی، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

''تم رو رہی ہو کیا؟'' اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''میں کیوں روؤں گی؟'' اس نے پھر سر جھکا لیا۔

''تم اپنے کیے پر پشیمان تو نہیں ہو؟'' شاکر نے سوال کیا۔

''ہرگز نہیں.....'' زرتاج نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اس کا پیشہ ہی مسیحائی تھا اور اسے علم تھا کہ بیماروں کی مسیحائی تو کوئی بھی کر سکتا ہے، شیشوں کی مسیحائی مشکل کام ہے..... عورتیں جو شیشوں کی طرح نازک ہیں، آبگینوں کی طرح جلد ٹوٹ جانے والی..... انہیں مرد توڑتا ہے اور وہی جوڑ سکتا ہے مگر بھی شیشوں کی مسیحائی صنف نازک کے ہاتھوں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ شاکر کی بانہوں میں تھی اور ساتھ والے کمرے میں ناہید دونوں بچیوں کو اپنی آغوش میں لیے گہری نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔ دو بچیوں کو باپ مل گیا تھا اور اسے چھت..... جس چھت تلے سکون ہی سکون تھا اور اس میں رہنے والوں کے دل بہت بڑے تھے..... جن میں دوسروں کے لیے پیار ہی پیار تھا..... کون کہتا ہے کہ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں..... کبھی کبھار شیشے ہی شیشوں کو جوڑنے کے کام آتے ہیں!

(ختم شد)